دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جولائی 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS — CPNE

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 42 • شمارہ 07 • جولائی 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

جولائی 2012ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے... گزشتہ ماہ بڑی اُتھل پتھل رہی۔ وزرائے اعظموں کی آنیاں جانیاں... بجٹ کی پیش بیانیاں... عدالتِ عظمیٰ میں انوکھی قانونی موشگافیاں... سچ پوچھیں تو اب ان سب میں کوئی ایسی بات نہیں رہی کہ جس پر حیرانیاں ہوں یا پریشانیاں! درحقیقت ہم پر مشکلیں اتنی پڑیں کہ مشکل، مشکل ہی نہ رہی... البتہ دو واقعات ایسے بھی ہوئے جو کسی لحاظ سے قومی سانحات سے کم نہیں... ایک طرف برِصغیر کی موسیقی کے دیوتا مہدی حسن جہانِ فانی کو الوداع کہہ کر منزلِ آخرت کو سدھارے تو دوسری طرف علم و دانش کی ممتاز شخصیت عبیداللہ بیگ دنیا چھوڑ گئی اور اسی شہر میں آسودۂ خاک ہوئی۔ ایسے معاشرے میں جہاں علم و دانش اور ہنرمندی کا بحران بلکہ قحط ہے، وہاں ان دونوں کا چلے جانا کسی قومی المیے سے کم نہیں، وہ ہماری تہذیب و روایات، فن و ثقافت اور علم و دانش کی پہچان تھے۔ ان دونوں کی پہچان پاکستان تھا اور وہ خود پاکستان کی پہچان بن چکے تھے۔ ربِ ذوالجلال سے دعا ہے کہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے... آمین... اب ایک مختصر مگر بڑی بات کا تذکرہ... اس برس پھر مون سون کے جم کر برسنے کی نوید ہے۔ اسے تو برسنا ہی ہے مگر تشویش کی بات یہ ہے کہ بارشیں پندرہ فیصد زیادہ ہونے کی پیش گوئی ہے۔ سالِ گزشتہ میں مون سون کے جم کر برسنے کا نتیجہ زیریں سندھ میں بدترین سیلاب کی صورت نمودار ہوا تھا۔ اس بار بھی خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ مون سون کو خوش آمدید کہنے والی بارشیں شروع ہو چکی ہیں۔ صاحبانِ اختیار کچھ پیش بندی کر لیں کہ پچھلے سال کے سیلاب متاثرین کی بڑی تعداد اب تک عالمِ دربدری میں ہے۔ کئی علاقوں میں زرعی زمینیں اب تک جھیلوں کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تاریخ پھر خود کو دہرانا شروع کر دے... اللہ تعالیٰ سب کو اپنی امان میں رکھے... آمین...

اس کے ساتھ ہی اب رخ کرتے ہیں بزمِ یاراں کا، جہاں ایک سے بڑھ کے ایک شہ سوار موجود ہے...

ضلع قصور سے کاشف علی مہران کا جھونکا ''گو جاسوسی سے تعلق تو 12 سال پرانا ہے مگر محفلِ یاراں میں دوسری بار حاضر ہو رہے ہیں۔ (اتنے لمبے وقفے اب دوبارہ نہیں ہونے چاہئیں... ہر ماہ شامل ہونا ہے) سب سے پہلے سرورق کے بارے میں چند جملے۔ اگرچہ میں سرورق پر کبھی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ ذاکر انکل کی بے پناہ مہارت کا ثبوت ہوتا ہے مگر اس بار تو ذاکر انکل نے کمال کر دیا۔ (شکریہ!) چینی، نکتہ چینی میں سب کے کھٹے میٹھے تبصرے پڑھتے ہوئے ارادہ تھا... فیورٹ رائٹر کی للکار کی جانب جانے کا مگر محی الدین نواب کی ابتدائی صفحات کی زینت کے پہلے صفحے پر جا ٹھہرا اور یہ پہلے جملے ''کسی جاگیردار کا ذکر کرنا چاہو تو...'' نے جو اپنے سحر میں جکڑا تو ہوش تب آیا جب کہانی اپنے اختتام پر جا پہنچی۔ ویل ڈن نواب صاحب، کیا کہانی تھی۔ کردار، مکالمہ بازی اور منظر نگاری کے ساتھ ساتھ تھرل اور ایکشن بہت مزہ آیا کہانی پڑھ کر۔ واقعی ہمارے پنجاب کے جاگیردار ایسے ہی سنگ دل اور کٹھور واقع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مختصر مگر مؤثر سلیم انور کی قطرہ خون سائنس کے کرشمات کو انصاف کے بول بالے کے لیے نہایت خوب صورتی سے استعمال کیا گیا۔ کہانی پسند آئی ہمیں۔ سیریناراض کی فیشن گزیدہ میں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ قتل کے کیس پر مبنی کہانی کا نام فیشن گزیدہ کیوں رکھا گیا؟ (کچھ خود بھی سوچیں!) میمونہ عزیز کی نادیدہ قاتل ایک اچھوتی اور منفرد تحریر تھی جو مغربی معاشرے کی بے حسی کی عکاس تھی۔ اب بات ہو جائے اسما قادری صاحبہ کی گرداب کی۔ قسط وار سلسلے تو بہت سے پڑھے مگر حالاتِ حاضرہ پر مبنی ایسا سلسلہ پہلی بار پڑھنے کو مل رہا ہے۔ کہانی کے ٹیمپو میں تھوڑی سی تیزی آئی ہے۔ اسما جی سے گزارش ہے کہ کہانی کو مثبت رکھتے ہوئے ہماری انٹیلی جنس سے بھی کچھ کارنامے کروائیں کیونکہ کہانی تو کہانی ہی ہوتی ہے اگر یہ بھی حقیقت کی طرح تلخ ہو جائے تو دل و دماغ مزید بوجھل ہو جاتا ہے۔ جمال دستی کی مختصر مگر چونکا دینے والے انجام کی تحفہ اتنی کم جگہ پر مؤثر تحریر ثابت ہوئی ہے۔ للکار میں عمو کے دلچسپ مکالمے، جلالی کے فارم ہاؤس پر ہونے والی روح فرسا واردات اور بدھا کے مجسمے کی واپسی کا ٹوئسٹ... مغل صاحب بدھا کے مجسمے نے پہلے ہی کرداروں کو انڈیا میں بہت الجھائے رکھا ہے، اب خفیہ باکس میں سے کچھ اور نکلوا ڈالتے۔ مجموعی طور پر اس ماہ کی قسط نہایت تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور رہی۔ ویل ڈن مغل انکل! کیپ اٹ اپ۔ مختار آزاد کی خونی کارٹون نے سیاست کی میلی گنگا کی عکاسی کرتے ہوئے آخر تک الجھائے رکھا کہ گورنر کو دھمکیاں دینے والا کون ہے۔ ویسے ہم تو آج تک یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے سیاست داں ہی ایسے کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ فریب کار پڑھتے ہوئے دماغ پلپلا ہو گیا۔ انتہائی بچکانا انداز میں لکھی گئی تحریر جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ نہ مکالمہ بازی، نہ کوئی مرکزی خیال اور انتہائی کمزور پلاٹ، مجموعی طور پر جون 2012ء کی سب سے فلاپ ترین تحریر ثابت ہونے میں کامیاب رہی۔ سرورق کا دوسرا رنگ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی جیسے منجھے ہوئے مصنف کی کامیاب کاوش تھی۔ اجل شناس ایک مکمل جاسوسی تحریر تھی۔ اسٹوری آف دی منتھ بابر نعیم کی انجام رہی۔ جس طرح مونک نے ایک تصویر کے ذریعے قاتل کا سراغ لگایا، اس نے بہت حیران کیا۔ زبردست کہانی تھی۔ موقع شناس، بے حس مغربی معاشرے کی مختصر جھلک تھی جہاں ہر میاں بیوی ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے ہی کوشاں رہتے ہیں۔ تنویر ریاض کی تحریر کارنامہ بھی جاسوسی کے معیار پر اترتی ایک بہترین تحریر تھی۔''

کراچی سے ادریس احمد خان کی تعریفیں ''جاسوسی ڈائجسٹ بروقت مل گیا جو مسلسل دو تین نشست میں پڑھ لیا۔ سرورق میں خوفناک منظر کے ساتھ خواب ناک چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنی محفل چینی، نکتہ چینی میں وارد ہوئے۔ پہلے نمبر پر پہلے ہی خط میں اختر صاحب براجمان تھے۔ سو مبارک باد۔ دیگر دوستوں کی بھی نرم گرم نگارشات پڑھ کر محظوظ ہوئے۔ مقبول ترین سلسلے للکار کی طرف بڑھے۔ پروفیسر جلالی والا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ تابش اور عمران

کی بھی کارگزاریاں منظرِعام پر آرہی ہیں اور نئے نئے کردار بھی سامنے آتے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہانی جاوید مغل کی لکھی ہوئی ہے جو کہانی میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے حقیقت میں واقعات پیش آرہے ہوں۔ دوسری کہانی گرداب شروع کی۔ اسما قادری کی یہ کہانی بھی لاجواب ہے۔ یہ بھی آخری قسط تک دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ مصنفین میں محی الدین نواب کا نام بھی نظر آرہا ہے جو اپنے طرزِتحریر سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ بے ثمر نے اچھا تاثر دیا۔ سلیم انور کی قطرہ خون بھی اچھا اضافہ تھا جس میں ایک چھوٹے سے ثبوت نے ایک گھاگ مجرم کو قیدِ سلاسل کر دیا۔ فیشن گزیدہ بھی اچھی لگی جہاں ایک ہوشیار جاسوس نے ممکنہ حد تک مجرم ثابت ہونے والی اسٹیسی کو قتل کے الزام سے بچالیا۔ نادیدہ قاتل بھی اچھی تحریر تھی۔ انجام بھی قاتل کے سامنے آتے ہی انجام بخیر ہوئی۔ موقع شناس نے موقع دیکھ کر اپنی بیوی کو باقاعدہ منصوبے کے ساتھ قتل کر دیا تاکہ الزام چور پر آئے۔ کارنامہ بہتر تھی۔ تحفہ میں زیادہ سیانی بننے کی وجہ سے قتل کے الزام میں پکڑی گئی۔ معاوضہ بھی بہتر تھی۔ مصنف جرم کی بھول بھلیوں میں کھو گیا آخری دونوں کہانیاں فریب کار اور اجل شناس بہترین کہانیاں تھیں۔''

اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کے خیالات ''میرے نزدیک جولائی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کی پہلی تاریخ میری سالگرہ کا دن ہے اور یہ میری پچیسویں سالگرہ ہے۔ (25 موم بتیوں کا ساتھ مبارک ہو...) اس دفعہ سرورق کافی اچھا لگا۔ سرورق سے ایک ہی جست میں محفل میں داخل ہوئے۔ ننکانہ سے اختر عباس صاحب کی پہلی کاوش اور ناپسندیدگی کو اوّل قرار دیا گیا، ہماری طرف سے خوش آمدید۔ ہمایوں سعید! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ایم اے ہاشمی صاحب! پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ۔ انجینئر عمیر شہزاد! مجھے نہیں معلوم میرے تبصرے میں آپ کے لیے خوشی کی کون سی بات تھی مگر مجھے بہت اچھا لگا کہ محفل میں کسی کو تو خوشی ہوئی میرے تبصرے سے۔ ماہا ایمان! نہایت نوازش کہ آپ نے میری خودشناسی کو پسند کیا۔ قمرتی صاحب آپ نے ای میل کا پوچھا ہے تو مزے کی بات بتاتا ہوں کہ میں نے آج تک سب ای میلو ہی کی ہیں کوئی خط نہیں بھیجا ڈاک کے ذریعے، کیونکہ محکمہ ڈاک سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایک اور بات کہ کوئی دوست سوشل میڈیا نیٹ ورک پر مجھے جوائن کرنا پسند کرے گا؟ کہانیوں کی ابتدا کی تو ہمیشہ کی طرح للکار کی باری آئی۔ کہانی میں جلالی صاحب کا کردار کسی طور بھی حقیقت پسند نہیں لگ رہا۔ باقی سب کے سب کردار اور کہانی بہت ہی بہترین ہیں۔ خیر یہ فاسٹنگ بدھا کا سلسلہ پھر سے چل نکلا۔ اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ گرداب میں پہلی بار دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔ اب دل کرتا ہے کہ کہانی طویل ہو......... محی الدین نواب کی اولین صفحات پر بے ثمر ایک بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ نواب صاحب ہمیشہ اچھوتے اور منفرد موضوع پر لکھتے ہیں۔ طالش تیموری جیسے کردار آج بھی موجود ہیں جو انسانیت کی تذلیل میں کوئی مضائقہ نہیں کرتے اپنی انا اور غرور کی خاطر۔ مگر قدرت ان کا غرور خاک میں ملانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتی۔ سرورق کے پہلے رنگ میں سلیم فاروقی کی جذبہ حب الوطنی سے بھرپور تحریر بہت پسند آئی۔ عمران کا کردار بہت خوب صورت اور جاندار تھا۔ دوسرا رنگ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا بھی خوب رہا۔ مائرہ کو عدنان اور شکیل شیرازی کے درمیان اسی طرح رکھا گیا جیسے دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے۔ باقی کہانی جاسوسی سے بھرپور تھی۔ مختصر کہانیوں میں قطرہ خون سلیم انور کی اچھی لگی مگر ایک جھول محسوس ہوا کہ جولیس کنگ سے پہلے کسی نے دوبارہ ڈی این اے ٹیسٹ کیوں نہیں کروایا۔ فیشن گزیدہ کوئی خاص نہیں لگی مگر پھر بھی بُری نہیں تھی۔ البتہ میمونہ عزیز کی نادیدہ قاتل بہت عمدہ کہانی تھی۔ کنزیٰ یونس کا نام میرے لیے بالکل نیا ہے مگر ان کی موقع شناس مختصر ہونے کے باوجود بہتر لگی۔ تنویر ریاض کی کارنامہ صحیح معنوں میں جاسوسی کے معیار کے مطابق تھی۔ اس میں نارمن نے نہ صرف ریمن کو بچالیا بلکہ روسی ایجنٹ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ اہم شواہد اور جزئیات کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہی کامیابی کے قریب کرتا ہے۔''

انجینئر عمیر شہزاد بنگش، ہنگو سے لکھتے ہیں ''اس دفعہ جاسوسی 4 جون کو ہی مل گئی۔ (کون مل گئی؟) ٹائٹل گرل پر نظر پڑی لیکن کچھ خاص نظر نہیں آئی۔ (دیر سے ملنے کی سزا میں خاص نہیں لگی...) اپنی محفل میں پہنچے تو وہاں اختر عباس کو دیکھا جو اٹھارہ سال سے خاموش بیٹھے سب کی سن رہے تھے لیکن اچانک ہی پھٹ پڑے اور سب پر حاوی ہو گئے۔ تبصرہ پڑھ کے مزہ آیا۔ قمرتی آپ کو ماہا ایمان اتنی بُری کیوں لگتی ہے اور آخرکار ماہا ایمان نے تسلیم ہی کر لیا کہ میں نے جو لکھا، وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں لکھا۔ مرزا انتظار اور نذیر مغل سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد۔ ماہ تاب گل! آپ کا پروگرام ایف ایم پر کس وقت چلتا ہے؟ اس دفعہ دوستوں میں کافی نئے دوستوں کا اضافہ ہوا، ان سب کو محفل میں خوش آمدید۔ جاسوسی ہاتھ میں لیے ہم سوچ رہے تھے کہ آج کل نواب صاحب کا پتا نہیں چلتا لیکن جیسے ہی پہلی کہانی دیکھی تو وہ نواب صاحب کی نکلی۔ تب سوچا کہ اچھے موقع پر اچھی چیز مانگ لی۔ نواب صاحب کی بے ثمر پڑھی لیکن اس کا بہت ثمر ملا۔ اس کے بعد قطرہ خون کا ٹیسٹ کرنا شروع کیا۔ نادیدہ قاتل میں مغربی لوگوں کا عکس دکھایا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو مارنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ اس کے بعد گرداب میں داخل ہوئے۔ گرداب سے زندہ نکلنے کے بعد میرا سر چکرا رہا تھا اس لیے اس پر کچھ نہیں کہوں گا۔ انجام میں مونک نے اپنی عقل اور تجربے سے قاتل کو اپنے انجام تک پہنچایا۔ موقع شناس میں شوہر کو اپنی بیوی کو قتل کرتے ہوئے دیکھ کر دلی سکون ملا۔ للکار میں مغل صاحب نے ایک بار پھر سے لوگوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ باقی ابھی زیرِمطالعہ ہیں۔''

لاہور سے کرن کا الٹی میٹم ''اپنے قلم کی خیال آفرینی اور بذلہ سنجی کے ساتھ ایک بار پھر سے حاضرِ بزم ہیں۔ (خوش آمدید) سرورق پر خوفناک صورت آدمی ایک آنکھ نہ بھایا البتہ نیچے ایک شخص کیپ پہنے اور رائفل سے کسی کا (کسی کا... پہچانا نہیں؟) نشانہ لیتے ہوئے کافی اسمارٹ لگ رہا تھا اور مس سرورق ہمیشہ کی طرح اس... مصرع پر مہر ثبت کر رہا تھا کہ وجودِزن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے محفل میں لیبرڈے کے حوالے سے اداریہ پڑھا تو اپنے ملک کی پسماندگی نے پریشان کر دیا۔ کرسیِ صدارت پر حق دار ماہا جی کو براجمان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ماہا جی اور تفسیر عباس جی! آپ دونوں کے تبصرے ہمیشہ ہی بھرپور اور لاجواب ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو ہمارے اندر بھی خط لکھنے کی امنگ آپ دونوں کو پڑھنے سے جاگی۔ باقی دوستوں میں ہمیں نعمان پیارے جی کا خط پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے۔ ایک دم فری اسٹائل ہے ان کا۔ اس بار ان کا تبصرہ شامل نہ تھا۔ ویسے باقی سب برادرز اور سسٹرز کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ سب کا ہمیں ویلکم کہنا اچھا لگا۔'' (اور آپ کا ہمیں خط لکھنا... مکمل تبصرہ آئندہ ماہ شائع کریں کیونکہ یہ تبصرہ مئی کی کہانیوں پر ہے... اب تو دل نہیں ٹوٹا نا؟)

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی پسندیدگی ''اس مرتبہ کا شمارہ دو جون کو ہی موصول ہو گیا جس پر ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سرورق پر بھونڈی شکل والی حسینہ اپنے صنفِ مخالف کو آپس میں لڑانے کے کارنامے پر پھولے نہیں سما رہی تھی جس پر ہمیں بہت غصہ آیا کہ بھائی یہ کون ہوتی ہے ہم پر ہنسنے والی۔ بہرحال، آگے بڑھے تو محفل میں اپنی نکتہ چینی دیکھ کر منہ میں چینی گھل گئی اور غصہ کم ہوا۔ اختر عباس صاحب! کرسیِ صدارت مبارک۔ آپ نے 18 سال میں پہلی بار جسارت کی مگر جو کچھ آپ نے تحریر کیا ہے، بھائی چھا گئے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ عمران اور جلالی کے ملنے سے کہانی کی وہ ہنگامہ خیزیاں جو گزشتہ ایک آدھ قسط میں نہیں ملیں، پھر اپنے عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ میرے خیال میں عمران کو فساد پلس چھوڑ کر اسٹار پلس جوائن کر لینا چاہیے۔ شاید کوئی انڈین ایکٹریس ہی ان کے دل کو بھا جائے۔ گرداب میں اے سی صاحب اب دشمنوں کی صفوں میں گھسنے اور ان کو جل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ محی الدین نواب صاحب کی تحریر کی کمی پوری کرنے کا شکریہ۔ واقعی طالش جیسے لوگ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں مگر کبھی کبھی انجانے میں وہ کچھ اپنے لیے سمیٹ لیتے ہیں جس سے بھاگ رہے ہوتے ہوں۔ سلیم فاروقی کی فریب کار میں عمران نے واقعی بے مثل کارنامہ انجام دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر بھی خاصی جاندار تھی۔ واقعی دولت کی خاطر انسان سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کنزیٰ یونس کی موقع شناس بھی اچھی کوشش تھی۔ باقی تحریریں بھی زبردست تھیں۔ مختصراً جون کا جاسوسی ہر لحاظ سے بیسٹ اور بہترین تھا۔''

دبئی سے مظفر شاہین نیازی کا مختصر پارہ ''کافی عرصے بعد دوبارہ شرکت کر رہا ہوں۔ ایک تو جاسوسی 6 جون سے پہلے نہیں ملتا دبئی میں، غصہ تو بہت آتا ہے لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔ ذاکر صاحب! کبھی دینا ملک کو بھی سرورق میں لگا دیں۔ بے چاری مشہور ہونا چاہتی ہے، دعا دے گی۔ اسما جی! میں تو سمجھا تھا کہ آفتاب اور کشور کو تو آپ بھول گئی ہیں اور اب اسلم اور ماہ بانو کو نہ بھول لیے گا۔ وہ ویسے بھی بے چارے پردیس میں ہیں ہماری طرح۔ اب آتے ہیں للکار کی طرف۔ عمران اور تابش کی جوڑی واقعی اچھی جا رہی ہے۔ ارے یہ کیا، ہماری بیگم نے جاسوسی کو سوکن کا خطاب دے دیا، مبارک ہو۔ نواب صاحب کی تو کیا ہی بات ہے۔ آخری رنگ میں اس دفعہ فریب کار بہت ہی اچھی رہی۔ اب اجازت کے ساتھ اسما صاحبہ، طاہر جاوید مغل، سلیم فاروقی، نواب صاحب اور سب رائٹرز اور تمام اسٹاف جاسوسی کو سلام دعا۔''

مصدق محمود دانش، گاؤں کنگ سہالی کا محبت نامہ ''چار جون کو پیپر دے کر واپسی پر جاسوسی خریدا۔ سرورق کو گھر آکر دھیان سے دیکھا تو حسبِ معمول دو مرد اور ایک عورت کی مثلث تھی۔ ان کے عقب میں پہاڑی کا پیچ نمایاں تھے۔ سرورق کی حسینہ کی مست نگاہیں رت جگے کا پیغام دے رہی تھیں۔ ایک شخص زخمی حالت میں اوندھے منہ گرا ہوا تھا جبکہ دوسرا شخص عینک لگائے خباثت سے دانت نکال رہا تھا جو اس کے ولن ہونے کی غمازی کر رہا تھا، ٹھاہ کر کے۔ سرورق کے مختصر پوسٹ مارٹم کے بعد ہم چینی کم مرچ مسالے زیادہ والی محفل یعنی چینی، نکتہ چینی میں پہنچے تو اختر عباس چٹھہ کی ناپسندیدگی ٹاپ نمبر 1 پر نمایاں تھی، مبارکباں۔ نمبر تین پر آصفہ صداقت کی ریل کار ہچکولے کھاتے نظر آئی۔ مزاح کا عنصر لیے یہ تبصرہ جان دار تھا۔ نمبر ایک اور دو کی نسبت۔ باقی تبصروں میں ہمایوں سعید کے جوابات پڑھ کر مزہ آیا جس میں جناب نے کچھ احباب کی خوب درگت بنائی مگر ہمایوں سعید صاحب! اس طرح کسی کو بھی منافق نہیں کہتے۔ اس کے دل کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ شہریار کی شخصیت میں تبدیلی ہمیں بہت پسند آئی۔ اسما قادری صاحبہ! چودھری کے تعاقب میں شہریار کو بھی امریکا بھیج دیں نا۔ وہاں پر ماہ بالو سے ملاقات بھی کرا دیں۔ للکار میں عمران کے ہنگامے زوروشور سے جاری ہیں، ٹھاہ کر کے۔ محی الدین نواب کی بے ثمر میں فرضی پن اور تخیل نمایاں تھا، سو بور ہی لگی۔ اب ہم نے سرورق کے رنگوں میں خود کو رنگنا چاہا تو سلیم فاروقی کا رنگ فریب کار بڑا گہرا رنگ تھا۔ یوں تو کہانی پسند آئی مگر اس میں کئی ایک جھول تھے اور میجر بابر کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے باوجود بھی عمران ایجنسی میں ان رہا؟ دوسرا رنگ پھیکا تھا، سو ہمیں پسند نہ آیا۔ مختصر کہانیوں میں بابر نعیم کی انجام، جمال دستی کی تحفہ اور سیر ینا راض کی فیشن گزیدہ پسند آئیں۔''

راجن پور سے ماہ تاب گل کی باتیں ''اپنا پیارا جاسوسی تین جون کو ملا۔ سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ وہی ایک چینی پھینی سی لڑکی، عینک والے انکل البتہ دیکھے دیکھے لگے، ذرا ذہن پر زور ڈالا... ارے، یہ تو اپنے تفسیر بابر ہیں جو کہ اپنے تازہ برش کیے گئے دانتوں کی نمائش کر رہے ہیں۔ خیر، بڑھاپا ایسا ہی ہوتا ہے۔ نیچے ایک صاحب چاروں شانے چت پڑے تھے اور کیوں پڑے تھے یہ جاننے کی ہم نے کوشش نہ کی اور شانِ بے نیازی سے محفل میں داخل ہوئے۔ اختر عباس کو مبارک باد! آصفہ صداقت! آپ محفل میں ایک خوش گوار اضافہ ہیں اور جہاں تک بات ہے گلاب جامن کے ڈبے کی تو جی جس نے لینا ہے راجن پور آجائے اور ڈبا لے جائے۔ یاد رہے صرف ڈبا۔ ہمایوں برادر! آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کے سننے کی کوشش نہ کریں کیونکہ آپ کو ماہ تاب نہیں ملنی۔ ہاں، البتہ نثار رضوی کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔ مسٹر مبشر حسن! اگر آپ کی طرف ہمارا چینل چلتا ہے تو نثار رضوی کو خود ڈھونڈیں۔ میں کیوں ٹائم بتاؤں بھئی۔ جعفر حسین! آپ کا تبصرہ پڑھ کے ہنسی آئی اور ساتھ ہی اپنا پہلا دن بھی یاد آگیا، اس دن تو بس رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ تفسیر برادر! ماہا نے آپ کو کیا زبردست پنچ مارا ہے، امید ہے ابھی تک اپنے زخموں کو سہلا رہے ہوں گے۔ خیر، مبارک باد کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ عمیر شہزاد! مبارک باد کا شکریہ اور آپ نے بھی سیکنڈ ایئر کے ایگزام دیے ہیں؟ حافظ آباد سے ماہا! کیا جواب دیے، مزہ آگیا۔ مبارک باد کا شکریہ۔ ڈاکٹر مرزا اینڈ نذیر مغل! اپنے تبصرہ نگار دوستوں کے ذکر سے بھی لسنرز کو مستفید کریں گے انشاء اللہ۔ گرداب اور للکار کی اقساط زبردست تھیں۔ ابتدائی صفحات پر کافی عرصے کے بعد محی الدین نواب آئے اور کیا خوب آئے، اپنی غیر حاضری کا ازالہ کر دیا۔ زبردست تحریر تھی۔ جیسے کو تیسا والی بات۔ طالش کا انجام اچھا ہوا۔ سرورق کی پہلی کہانی فریب کار سلیم فاروقی نے اچھا لکھا۔ اس مرتبہ تھوڑا سا چینج انداز تھا اس لیے مزہ آیا پڑھتے ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اجل شناس بھی اچھی رہی۔ ہیروں کے حصول کے لیے قتل سے شروع ہونے والی کہانی خون خرابے پر اینڈ ہو گئی۔ سیر ینا راض کی فیشن گزیدہ بھی اچھی کاوش تھی۔ قطرہ خون بھی اچھی تھی۔ جمال دستی کی تحفہ میں شیرائل کا تحفہ ہی اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ تراش خراش بھی اچھی تھیں۔''

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، چکوال سے لکھتی ہیں "4 جون گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لیے جاسوسی ٹھنڈی ہواؤں کو ساتھ لیتے ہوئے آیا اور ہم بھی خوش ہو گئے۔ محفل کے باغیچے کا ہر پھول اپنی اپنی مہک کے ساتھ موجود تھا۔ افسوس کے ساتھ اس دفعہ باغیچے میں خوب صورت پھول کا اعزاز اختر صاحب کو دیا گیا۔ رسمی طور پر مبارک باد۔ اعجاز احمد، زبردستی کی تعریف اچھی لگی۔ ڈاکٹر مرزا انتظار، دل چھوٹا نہ کریں۔ اقرا بانو، ادریس احمد، انضمام راجا آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لومی برادر اور دلنشین بلوچ! پلیز محفل میں جلدی انٹری ماریں نہیں تو داخلہ بند آپ کا۔ اس ماہ نواب انکل کو دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ نواب انکل! آپ عید کا چاند ہوتے جارہے ہیں۔ بے ثمر کا خلاصہ پاورفل تھا۔ طالش تیموری نے جائداد کے وارث کے لیے بہت ہی گھٹیا طریقہ اختیار کیا۔ مغل انکل! تھینک یو سوچ ایرانی بلیوں کو آپ نے خوف ناک کتوں کی خوراک سے بچالیا۔ اجل شناس میں ہمیں خضر حیات پر شک رہا لیکن ماسٹر پلان ایک عورت کا تھا یعنی کہ محترمہ نے پسِ پردہ رہ کر کہانی چلائی۔ سلیم فاروقی کی فریب کار کہانی ملکی سازشوں پر مبنی تھی۔ اچھی رہی۔ کہانی گرداب لوجی اسما قادری نے مسٹر آفتاب اور مسز آفتاب کی انٹری کرادی۔ باقی آگے کہانی میں اللہ ان کے لیے بہتر ہی کرے۔ فیشن گزیدہ کمزور کہانی لگی۔ نادیدہ قاتل ڈاکٹر صاحب کے ڈیڈی بچے ہی لگے جنھیں بچپن میں روزانہ نئے نئے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق ہوتا۔ موقع شناس عجیب سی لگی۔ کارنامہ کہانی ابھی ادھوری ہے۔ باقی رسالہ بھی ادھورا ہے، اچھاجی اجازت دیں۔"

مقصود الحسن طاہر، پتوکی ضلع قصور سے لکھتے ہیں "موسم گرما اپنے عروج پر ہے اور لوڈ شیڈنگ نے مت ماری ہوئی ہے۔ ایسے میں ماہِ جون کا شمارہ ہاتھوں میں آیا تو یقین کریں کچھ سکون ملا۔ ذاکر انکل نے ٹائٹل تو بہت اچھا بنایا خاص طور پر ٹائٹل حسینہ تو واقعی مس یونیورس کے خطاب پر پوری اتر رہی تھی۔ بہرحال حسینہ کی نگاہوں سے بچتے بچاتے اپنی پیاری محفل میں پہنچے تو گویا کالام کی کسی حسین وادی میں پہنچ گئے۔ اختر عباس چٹھہ صاحب کمال ہے 18 سال سے آپ چھپے بیٹھے ہیں اور ہمیں دیدار نہیں کروا رہے ہیں آپ؟ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ تفسیر عباس بابر! آپ کو پتا ہے کہ ماہا ایمان صدارت کی کرسی کے پیچھے کیوں بیٹھی تھیں۔ وہ اس لیے کہ ان کا میک اپ گرمی کی وجہ سے اتر گیا تھا اور اوپر سے بجلی کی لوڈ شیڈنگ، اصلی خوب صورتی دیکھ کر کوئی بھی بینائی کھو سکتا ہے لیکن انہوں نے ایسا کوئی موقع نہیں آنے دیا۔ سیانی ہو گئیں ہیں آج کل ماہا ایمان۔ آپ بھی کچھ سیکھ لیں۔ قمر تقی! راولپنڈی میں اتنی گرمی تو نہیں ہے کہ آپ کو کوئی بھی چیز برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ ماہا ایمان! کہیں آپ نے رسالے کی چٹنی بنا کے تو نہیں کھالی جو الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ سید محی الدین اشفاق صاحب! خوشی ہوئی کہ جہاں پر اچھے پڑھنے والے موجود ہوتے ہیں، وہاں پر یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ اقرا بانو جی! آپ کہاں چھپی رہی ہیں جو آج آپ کے درشن ہو رہے ہیں۔ بہرحال، سب کو مبارک ہو کہ ہماری محفل میں ایک اور چڑیل کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ میں نے خط کے شروع میں کالام کی حسین وادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ ہمارے پیارے راج دلارے رائٹر جناب محی الدین نواب جی بڑے عرصے کے بعد ہماری محفل میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔ طویل عرصے کے بعد اپنی ایک حسین کاوش بے ثمر لے کر حاضر ہوئے۔ دل کی آنکھوں سے پڑھی اور ان کی درازیِ عمر کی دعا کی۔ للکار اور گرداب نے حسبِ روایت قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا ہے۔ سرورق کے رنگ ابھی باقی ہیں۔ ان رنگوں کی بہار بعد میں دیکھوں گا۔" (چینی، نکتہ چینی میں اتنا وقت لگا دیا پھر خط لکھنے میں... کہانی پڑھنے کا وقت کہاں سے ملتا)

لکی مروت سے فرید اللہ کی گلابی اردو "مئی کے شمارے میں ماہا ایمان، علی رضا آتش، تصویر العین اور کبیر عباسی کے تبصرے اچھے لگے تھے۔ باقی کی بھی اچھے پر ان کے تبصروں میں توڑا جان تھی۔ اب آتے ہیں جون 2012ء کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی کیونکہ اب کافی اچھی ہو گئی ہے۔ جس میں مین کردار ذیشان آرہا ہے۔ ذیشان کافی سمجھ دار اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ شہزادی کی موت نے تھوڑا پریشان کیا پر یہ سب ہمارے اختیار سے باہر پھر جناب...؟ شہریار کا نیا روپ کیا رنگ لائے گی، یہ تو آنے والا وقت اچھی طرح جانتا ہے، پردیسے یہ ان کے لیے اچھا ہو گا کیونکہ اب اس سے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔ اسما صاحبہ نے بالکل غیر متوقع آفتاب اور کشور کو اسٹوری میں دوبارہ جگہ دی اور بالکل ہی غیر متوقع کشور کو بھائی سے بھی ملا دیا۔۔۔ ویسے مجموعی طور پر کافی اچھی کہانی ہے گرداب، للکار۔۔۔ واہ واہ۔ اس بار کافی اچھا قسط تھا پر گرداب کی طرح نہیں تھا۔ عمران اور تابش کا کڑا امتحان اب آنے والا ہے کہ اب وہ کس طرح جیلانی سے (سوری جلالی) سے وہ بکس حاصل کرتے ہیں پر عمران ڈاکٹر مہناز کو ہتھیار بنا کر جلالی صاحب سے وہ بکس لے سکتا ہے میرے خیال۔۔۔؟ سلیم فاروقی کا فریب کار ایک اچھی کاوش تھی۔ کافی معلوماتی اور کافی تجسس آمیز تھی اور یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک کے بہادر ہی ایسا کر سکتے ہیں جس طرح اس کہانی میں ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یقیناً اب بھی اس ملک میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ملک پر کسی کی میلی نظر برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ باقی باتیں پھر کبھی ہوں گی۔ ابھی تو میں کافی مصروف ہوں پر میں نے سوچا کہ جو وعدہ آپ نے پہلے خط میں کیا اس کو نبھاؤ اور خط لکھنے بیٹھ گیا۔" (یہ بات بہت اچھا کیا آپ نے)

کنڈان خورد سے راجہ امجد سعید ناز کی کوشش "ایک بار پھر خط لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اس امید پر کہ شاید کبھی ہمارا بھی خط شامل ہو گا۔ ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اس دفعہ ٹائٹل ذاکر صاحب کی فنِ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خطرناک حسینہ ہمیں ایسے دیکھ رہی ہے کہ ہم نے اس کی مسکراہٹ چرالی ہے یا ہم نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے۔ ٹائٹل دیکھنے کے بعد چینی، نکتہ چینی میں داخل ہوئے جہاں اختر عباس پہلے نمبر پر نظر آرہے تھے۔ بھائی بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے ماہا ایمان کے تبصرے اچھے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ بہت زبردست کہانی ہے۔ میں اس کہانی میں اس طرح کھو جاتا ہوں جیسے خود اس کا حصہ ہوں۔ پھر محی الدین نواب کی بے ثمر پڑھی۔ بہت ہی خوب صورت انداز سے لکھی گئی تحریر تھی۔ اس کے بعد سرورق کا پہلا رنگ فریب کار پڑھا۔ یہ میرے لیے بہت ہی خاص رنگ تھا کیونکہ مجھے فوج میں جانے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ٹیسٹ میں نے دیے ہیں، دعا کریں کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ (انشاء اللہ) اس کے بعد دوسرا رنگ پڑھا لیکن اس نے کچھ خاص اثر نہیں کیا۔ چھوٹی کہانیوں میں فیشن گزیدہ اچھی کہانی تھی۔ میمونہ عزیز کی نادیدہ قاتل کچھ خاص نہیں تھی۔ بابر نعیم کی انجام اچھی تھی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

علی پور سے محمد جاوید بلوچ کی غلط فہمیاں "ایک ماہ تک مسلسل 18 گھنٹے بدن توڑ محنت سے فراغت کے بعد 7 جون کو جاسوسی سے بغل گیر ہوئے۔ چاندی کے پیالے میں پگھلے ہوئے سونے جیسی رنگت والی سندرتا کو اپنی جانب دلکش انداز میں گھورتے ہوئے پایا۔ اس بار خط لکھنے کی وجہ اپنی صنف کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے ہمایوں سعید راج جو صنفِ نازک کی طرف سے فلرٹ فطرت کا درست خطاب ملنے کے بعد نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ بعد ازاں بزم طنز و مزاح کو اداس چھوڑ کر ایک زوردار زقند بھرنے کے بعد محی الدین نواب کی تخلیق بے ثمر کے پاس جا پہنچے۔ دولت اور طاقت کے بل بوتے پر مظلوموں کو روندنے والوں کا مقدر ہمیشہ ذلت کی تحت الثریٰ بنی ہے۔ گرداب میں سرفروش جاوید علی کی مختصر مگر جامع داستاں پڑھ کر حساس دل میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ گرداب نئے افق کی جانب گامزن ہے۔ اسی وجہ سے گزارش ہے کہ اسٹوری میں مزاح کا رنگ ضرور ہو۔ للکار میں جلالی صاحب بیک وقت کئی عورتوں سے تعلقات رکھنے کے باوجود خود کو غیر جذباتی ظاہر کرتے ہیں، یہ ایک نہ ماننے والی صورتِ حال ہے۔ بنا شغف کے تو کوئی بھی صنفِ مخالف کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ (اور کیا) عمران کا کردار جتنا زبردست ہے، تابی کا اتنا ہی کھوکھلا ہے۔ دوسری کہانیوں کی نسبت سراغ رسانی پر مشتمل اسٹوریز کو ہمہ تن گوش ہو کر پڑھنا پڑتا ہے۔ ایسی کہانیوں کا جوہر دو تین سطروں میں مخفی ہوتا ہے۔ مترجم بابر نعیم کی تلاش انجام کا انجام بخیر ہوا۔ عکس فاطمہ جیسا پیارا نام ویسی پیاری تحریر معاوضہ کے اختتام نے دل بے چارے پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا۔ ماضی سے جتنا پیچھا چھڑاؤ یہ اتنا ہی گلے پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو عیاں کرتی ہوئی مترجم جمال دستی کی تحفہ درست دریافت تھی۔ میمونہ عزیز کی نادیدہ قاتل میں وجودِ زن سے شروع ہونے والا دو بھائیوں میں بگاڑ اور انجام موت کی وجہ بنا۔ ہمایوں سعید کیا مرد بطور وطن کا محافظ اہلِ وطن کے لیے جان کا نذرانہ پیش نہیں کرتا؟ کیا بطور بھائی اپنی بہن کے آنچل پکڑنے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اترنے اور اتارنے میں کوئی کسر چھوڑتا ہے؟ ننکانہ سے صنفِ جلا پا کے بخیے ادھیڑنے والے اختر عباس چٹھہ کو جون کا ونر ہونے پر مبارک باد۔ اعجاز احمد راحیل کی چوٹ اور تبصرہ دونوں پسند آئے۔ صوابی سے مشائم کے خط کی پہلی چار سطور بہت پیاری لگیں۔ گرداب فوبیا کے شکار جعفر حسین کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ مگر یہ صاحب بھی گاہے بگاہے اپنی صنف پر جھپٹ کر دل کی تسکین کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ ایم اے ہاشمی، ماہا ایمان کا تفسیر عباس کو نازیبا جواب پڑھ کر لکھنے والے سے زیادہ غیر اخلاقی کمنٹ شائع کرنے والوں پر حیرت ہوتی ہے۔ شاید محترمہ کا کوئی شناسا ادارے سے وابستہ ہے جس کی وجہ سے ہر قسم کا مواد چھپ جاتا ہے۔" (قارئین اور تبصرہ نگاروں کے لیے قابلِ توجہ! پرچے کے تمام قارئین اور تبصرہ نگاروں سے ہماری بہت قریبی اور گہری رشتے داری ہے۔ ہر خط کی دلچسپ اور شائستہ سطور شاملِ اشاعت ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی سطور کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتی ہیں)

اسلام آباد سے سمیتہ سومی کی تحریک "جاسوسی کی محفل چینی، نکتہ چینی میں پہلی دفعہ انٹری دے رہی ہوں۔ امید ہے کہ شریک محفلان کو میری آمد گراں نہیں گزرے گی۔ میں نے بہت سے ڈائجسٹ بہت عرصے تک پڑھے لیکن معروفیت کی وجہ سے آہستہ آہستہ سب چھوٹ گئے۔ البتہ جاسوسی کا ساتھ نہیں چھوٹ سکا۔ آج بنوں سے ہمایوں سعید نے مجھے بھی قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ ان کے تبصرے میں شامل ایک جملے نے مجھے بے حد متاثر کیا جس کی بنا پر خط لکھ رہی ہوں۔ انہوں نے کہا مرد کی سرشت میں وفا کا عنصر نا پید ہوتا ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ دنیا کا کوئی مرد ایسا ہے جس نے یہ کہہ کر کسی خوب صورت لڑکی کو ٹھکرایا ہو کہ میری وفاؤں پر کسی اور کا حق ہے۔ ہمایوں سعید! میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں۔ اگرچہ آپ بھی مردوں کی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ نے سو فیصد تجزیہ کیا ہے۔ اب ذرا کہانیوں کی طرف آتے ہیں تو میں ہمیشہ سب سے پہلے للکار ہی پڑھتی ہوں۔ بے حد پسند آئی۔ عمران کا کردار بہت پسند ہے۔ محی الدین نواب صاحب کی بے ثمر بھی اچھی تھی۔ گرداب بہت لمبی ہوتی جارہی ہے۔ سرورق میں حسینہ کے پیچھے عینک والے انکل کی مسکراہٹ کچھ اچھی نہیں لگی۔ سرورق کے دونوں رنگ بہت اچھے تھے۔" (آپ بھی بہت اچھی ہیں... آئندہ ماہ کہانیوں کا بھی تجزیہ ضروری ہے)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی آمد بہار "پہلا خط گزشتہ ماہ لکھا تھا مگر ردی کی ٹوکری میں گیا اور بلیک لسٹ تک میں نہ آسکا۔ اب آیئے سب سے پہلے سرورق کی طرف! اچھا ہے اور سرورق کی کہانیوں کے مطابق ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ذاکر صاحب کچھ موسم کی مناسبت سے بھی سرورق بنایا کریں۔ محی الدین نواب صاحب کی کہانی بے ثمر بین ان کے انداز کی ہے جو کہ طویل بھی ہو سکتی تھی۔ گرداب اب ایک نیا رخ اختیار کر رہی ہے جو کہ مصنفہ کی ایک قابلِ ستائش کوشش ہے کیونکہ اب شہریار ایک دوسرے روپ میں سرگرم ہوا مگر اس کے دشمن بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ دوسری سلسلے وار کہانی للکار میں عمران کافی عرصے بعد اپنے اصل روپ میں آیا ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بس یونہی ہیں۔ اس ماہ کی بہترین کہانی مختار آزاد کی خونی کارٹون رہی۔ کاش آپ غیر ملکی کہانیوں کے اصل نام اور مصنف کا نام بھی دیا کریں۔ چینی، نکتہ چینی میں اس بار کافی نئے نام سامنے آئے سوائے میرے۔ (چلیں اس مہینے خوش ہو جائیں) اختر عباس چٹھہ صاحب کو صدارت مبارک ہو۔"

محمد کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار مری کی قلابیں "لوجی محفل کی شان، بھائیوں کی آن اور بہنوں کا مان شہزادہ کوہسار ایک دفعہ پھر محفل کی رونق بڑھانے اور مخالفوں کے چھکے چھڑانے حاضر ہے۔ ٹائٹل میں کوئی نئی بات نہ تھی، چاہے وہ ٹائٹل کے اجزا ہوں یا کلر اسکیم، ہاں حویلی والی محنت ذاکر انکل چار پانچ ماہ میں ایک بار کر دیتے ہیں۔ سو ٹائٹل اوسط درجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ فہرست کا ڈیزائن ہمیشہ کی طرح منفرد اور اچھوتا تھا۔ پسند آیا۔ اختر عباس! آپ نے ہماری خوب صورت سی محفل کو چڑیلوں کا محلہ اور ہماری خوب صورت سی ساتھی ماہا کو چڑیلوں کی سردار بنا دیا۔ کچھ تو ان کے نازک سے دل کا خیال کیا ہوتا۔ آصفہ صداقت! آپ کا تبصرہ اس دفعہ بھی بہت مزے کا تھا۔ سچ سچ بتائیں اتنے مزے مزے کے تبصرے آپ لکھواتی کس سے ہیں؟ اعجاز احمد! ہمیں تو سرورق گرل دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ

تیری چپ کے چرچے ہیں زمانے بھر میں
کس سے سیکھا ہے یوں نظروں سے وضاحت کرنا

ہمایوں ڈیئر! اس صنف کے تصور سے ہی تو کائنات میں رنگ ہے۔ اس میں انٹرسٹ نہیں ہوگا تو کس میں ہوگا؟ بس یہ ہے کہ ہم آپ کی طرح ان کے آگے بچھ

بچھ نہیں جاتے۔ کچھ اپنے وقار کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ جعفر حسین! میں نے تو یہ مقصود الحسن سے پوچھا تھا، آپ کو کیوں مرچی لگ گئی؟ ویسے اگر ہر لحاظ سے بہترین تبصرہ ری پرنٹ ہو تو وہ تو ہر دفعہ یا تو میرا ہو گا یا پھر میرا ہی۔ (اللہ رے خوش فہمی!) ہاں جی، اسے خود شناسی کہتے ہیں۔ کیوں انکل جی؟ (کیا آپ شناسی ہے!) ماہا ایمان یہ ہمارا اور ہمارے شہزادے بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے آپ کو اس فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ عمیر شہزاد میں نے تو انکل جی کا خیال رکھتے ہوئے تمام تحریروں کو پاس کر دیا تھا۔ (نہیں جی... آپ ہمارا خیال چھوڑیں اور اپنا خیال تحریر کیا کریں... اس سے ہمیں خوشی ہوگی) تفسیر عباس، ذرا ہتھ ہولا رکھو۔ محفل میں یہ دو چار دانے ہیں، یہ بھی بھاگ گئے تو پھر کس کی ٹانگیں کھینچو گے۔ (آپ تو مستقل مزاج ہیں نا؟) باقی جن لوگوں نے میرا تبصرہ پسند کیا وہ یقیناً بہت اچھے لوگ ہیں کیونکہ اچھی چیز کی پہچان تو اچھے لوگوں ہی کو ہوتی ہے۔ (واہ جناب) گرداب میں لگتا ہے اس دفعہ انٹرویل ہوا ہے۔ تقریباً تمام ہی کرداروں کے پرانے واقعات یک دم ہی سمیٹ کر انہیں نئے ٹریک پر ڈال دیا گیا ہے۔ کچھ کردار اب امریکا میں باہم برسرپیکار ہوں گے تو کچھ کی کچھاروں میں اپنے سابقہ اے سی صاحب ہاتھ ڈالیں گے۔ یعنی گرداب کا مستقبل محفوظ و مامون ہے۔ للکار میں طاہر جاوید نے جلالی کے روپ میں ایک اور لازوال کردار تخلیق کیا ہے۔ ہم کردار نگاری و مکالمہ نگاری کی وجہ سے اس تحریر سے ہر لمحہ لطف اندوز خوب ہوتے ہیں۔ سلیم فاروقی کی تحریر کی ابتدا کچھ مختلف تھی۔ یہ سوچ کر ہم نے مثبت امید کے ساتھ کہانی پڑھنا شروع کی مگر اگلے ہی صفحے سے یہ ٹپیکل فاروقی اسٹائل تحریر بن گئی۔ عکس فاطمہ کی معاوضہ کا پلاٹ تو بہتر تھا تاہم تحریر میں پختگی کی کمی محسوس ہوئی۔ کچھ باتیں وضاحت طلب بھی رہ گئیں۔ تنویر ریاض کی کارنامہ سراغ رسی کا شاہکار ثابت ہوئی۔ اوہو پرانی تحریر تھی' تنویر ریاض نہیں۔ ویسے جاسوسی میں جو مختصر تحریریں شائع ہوتی ہیں زیادہ تر وہ کافی پرانی ہوتی ہیں۔ (یہ آپ سے کس نے کہہ دیا... تمام چھوٹی کہانیاں نئے میگزین سے ہوتی ہیں) سیر یناراض کی فیشن گزیدہ موجودہ زمانے کی تحریر تھی۔ بہر حال کچھ ہلکے پھلکے جملوں کی وجہ سے تحریر کچھ بہتر لگی۔''

سردار اللہ دتہ اور ظفر اقبال وڑائچ کی خانیوال سے عجلت ''جون کا شمارہ 8 جون کو ملا۔ سرورق بہت اچھا لگا۔ کرسی صدارت پر اختر عباس چٹھہ صاحب براجمان تھے، مبارک ہو جناب! کشمیر کے انضمام راجا آپ کو ویلکم کہتے ہیں۔ ہمایوں سعید کا تبصرہ دلچسپ اور اچھا لگا۔ سعید بھائی! تفسیر صاحب کب سے منافق ہوئے مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ ویسے آج تک میں نے ان کی کوئی منافقت دیکھی تو نہیں ہے۔ ایم اے ہاشمی اور جعفر حسین کا تبصرہ بڑا اشارٹ لکھا ہوا تھا پر ٹھیک تھا۔ انجینئر عمیر شہزاد اور شمن سیال، قمر تی، ماہا ایمان، سید محی الدین اشفاق، اقرا بانو، مقصود الحسن، مرزا انتظار، عمران ہاشمی کے خطوط تقریباً ٹھیک ہی لگے۔ للکار بہت اچھی بلکہ بہت ہی اچھی جا رہی ہے۔ عمران آج کل فل ایکشن میں ہے۔ اب مورتی والا منحوس قصہ پھر شروع ہونے والا ہے۔ گرداب بھی ٹھیک جا رہی ہے۔ اجل شناس اچھی لگی۔ تنویر ریاض کا کارنامہ اچھا لگا۔ نادیدہ قاتل بھی اچھی تحریر تھی۔''

صبا گل مالاکنڈ ایجنسی سے لکھتی ہیں ''گزشتہ شمارہ جون کی تپتی ہوئی شب و روز میں کسی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے کم نہ تھا۔ سرورق کی خوب رو دوشیزہ روتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اسے کہتے ہیں، دھوپ میں بارش کا برسنا۔ فہرست کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد نکتہ چینیوں کو ملاحظہ کیا۔ اختر عباس صاحب ونر تھے۔ بھئی مکھن لگانے کے خوب ماہر ہیں۔ مبارک ہو۔ نئے آنے والوں کو ویلکم۔ آصفہ بہن! آپ کا خط بہت بھلا لگا۔ اگر خطوط شائع کرنے والی میں ہوتی تو آپ کو بادشاہت کی کرسی پر تو کیا، اس سے بھی اوپر بٹھا دیتی۔ (کیا سخاوت ہے) اعجاز احمد بھیا! میں پچھلے کئی ماہ سے دیکھ رہی ہوں آپ کے خط میں یاسیت بھرے الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ بھئی ایسی کیا بات ہے؟ ہم سے شیئر کر سکتے ہیں اور یہ بتا دیجیے کہ یہ شعر و شاعری کس کے لیے کرتے ہیں؟ کچھ تو ہے کالا دال میں۔ (جواب دیجیے، ہم بھی منتظر ہیں) بھئی ہمایوں! آپ نے جو فلسفہ بگھارا ہے یہ سب آپ کی کہنے اور لکھنے کی باتیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ انسان خود اپنے کہے پر عمل کرے۔ ایم اے ہاشمی صاحب! آپ سے ایسا لکھنے کی توقع نہیں تھی۔ بھلا میرے گھر والوں نے ایسی درخواستیں کب سے آپ کو بھیجنی شروع کر دیں؟ یا پھر آپ عینک والے جن ہیں کہ آپ کی نظر اپنے گھر سے ہمارے گھر تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ اپنے حالات بیان کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ تفسیر انکل! اگر غصہ بزرگوں کو زیادہ آتا ہے تو آپ کو تو سب سے زیادہ آنا چاہیے یا پھر اوکاڑہ کی شدید گرمی سہہ کر آپ سر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو غصہ نہیں آتا۔ قمرتی! بے تکی باتیں کرنا ہمیشہ آپ کی عادات میں شامل رہی ہیں۔ سب سے پہلے محی الدین نواب صاحب کی دلوں کو دھڑکانے والی تحریر پڑھی۔ ایک تحریر وہ جس نہج پر لکھتے ہیں، یہ ان کا ہی اعجازِ قلم ہے۔ کہانی کا ٹمپو تسلی بخش تیز تھا اور کہانی کا مرکزی خیال یعنی خیر و شر کی جنگ، واقعات کا تسلسل، موضوعات کا تنوع اور ایکشن و سسپنس کا بھرپور اظہار قاری کو ایک ہی نشست میں کہانی ختم کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ معاوضہ چھوٹی لیکن اچھی کہانی تھی۔ للکار بھی اچھی جا رہی ہے۔ عمران اور تابش کا پرائے بکھیڑوں میں پڑنا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ رنگوں میں اجل شناس ایک اچھی تحریر تھی، پسند آئی۔ گرداب کی یہ قسط گزارے لائق تھی۔ شہریار کا پس منظر میں جانا بالکل پسند نہ آیا۔ کنزئی یونس کی موقع شناس بھی اچھی تحریر تھی۔''

تونسہ شریف سے انعم رشید کے خدشات ''پہلی بار جاسوسی ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں جس جس نے خوش آمدید کہنا ہے کہہ دے، ورنہ ہم قدم تو رنجہ فرما ہی چکے ہیں۔ سرورق پر نظر پڑی تو بڑی حیرانی ہوئی۔ حسینہ بھی وہ جو اتنی گرمی میں زکام کی مریضہ لگ رہی تھی۔ مگر یہ کیا، اپنے روکھے بالوں اور مردانہ کلائی کی بدولت حسینہ کم اور گھریلو ملازمہ زیادہ دکھائی دیتی تھیں محترمہ۔ ذرا فاصلے پر نظر پڑی تو سید محی الدین اشفاق کو چشمہ لگائے مسکراتے ہوئے پایا۔ اشفاق انکل، آپ کی مسکان نے تو دل ہی لوٹ لیا۔ اشفاق صاحب دس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مجھے آپ کا نام اکثر ڈائجسٹ میں پڑھتے ہوئے۔ خود کو لڑکا کہہ کر سلمان خان بننے کی کوشش نہ کریں جو بڑھاپے میں بھی خود کو باڈی بلڈر ٹائپ ہیرو سمجھتا ہے۔ بالکل پسند نہیں ہیں مجھے اس طرح کے جھوٹ۔ (ہاں جی... کچھ شرم کریں اشفاق صاحب) چینی، نکتہ چینی میں کسی ایک کی بھی نکتہ چینی پسند نہیں آئی۔ صرف تفسیر عباس بابر کا خط پڑھ کر تھوڑی سی مسکان لبوں تک آئی اور بس۔ (جزاک اللہ) اعجاز احمد راحیل صاحب! پلیز یہاں اپنے دکھڑے نہ روئیں۔ ایک تو ویسے ہی اتنی گرمی ہے، ملک کے حالات الگ خراب اور اب یہ آپ کا رونا دھونا، آج کل ملنے بچھڑنے والے حالات ہر کسی کو درپیش ہیں۔ خود کو مسکین بنانے کی ناممکن کوشش نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ (بھئی اعجاز صاحب! اندازہ لگا لیں... کتنی گرمی ہے... پھر لوڈشیڈنگ... لگتا ہے دماغ پر چڑھ گئی ہے) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تو سب سے پہلے بابر نعیم کی انجام پڑھی۔ وہی پرانے موضوع پر سراغ رساں کے کارنامے۔ کچھ خاص رنگ نہ جم سکا۔ جمال دستی کی تحفہ میں شیرائل نے بے شک ثمینا کے ساتھ اچھا نہ کیا مگر اسے پولیس حراست میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ ایک اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ محی الدین نواب کی تحریر ایک منفرد تحریر تھی۔ طالش تیموری کا کردار بالکل پسند نہیں آیا مگر اس کا انجام اچھا لگا۔ سرورق کا آخری رنگ کچھ رنگ نہ جما سکا۔ یہ بھی پتا نہیں لگا کہ مائزہ کا شریکِ سفر عدنان ہوگا یا شکیل؟ گرداب اب بالکل نئے موڑ پر آگئی ہے۔ پتا نہیں لگ رہا کہ اب کس کروٹ بیٹھے گی۔ للکار ابھی زیر مطالعہ ہے اور مزید کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں جن کے لیے وقت درکار ہے لیکن اگر خط ٹائم پر پوسٹ نہ ہو سکا اور میں وقت پر نہ لکھ سکی تو چھپنے سے محروم ہو جائے گا۔''

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی گفتار ''ماہ جون کا شمارہ ایک تپتی ہوئی دوپہر کو ملا جس کی وجہ سے موسم کچھ کول کول لگا۔ سرورق پر موجود ڈاکٹر مرزا انتظار اور نذیر مغل کے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ بس جیسی کرنی ویسی بھرنی البتہ معصوم صورت حسینہ کی بھیگی بھیگی آنکھیں شاید یہ کچھ کہنے کی کوشش میں تھیں۔

چشمِ نم ڈھونڈ رہی ہے تم کو
کاش دنیا میں تم ہی تم ہوتے

کچھ بیتے ہوئے پل نہ جانے کیوں دل کی کسک بن کر رہ جاتے ہیں لیکن وہ لمحے کبھی واپس نہیں لوٹ سکتے... اپنی محفل میں حاضری دی۔ ننکانہ صاحب سے اختر عباس چٹھہ صاحب کی پہلی کوشش انہیں کامیاب کر گئی مبارک باد۔ محترمہ آصفہ صداقت بھی بہت ڈھیٹ ثابت ہو رہی ہیں۔ کیا تیرے کہنے، ایک تیری ہی کمی باقی تھی۔ ہمایوں سعید صاحب بھی شکر ہے صنفِ نازک کے چکر سے نکل آئے ہیں۔ بہر حال تفسیر بھائی کو منافق کہتے وقت شاید آپ آئینہ دیکھ رہے تھے۔ جعفر حسین کی آمد اچھی لگی، بھئی کدھر غائب تھے؟ ایم اے ہاشمی اپنے زبردست تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ بھائی یہ کسی اپنے کا دیا تخلص ہے جو راحیل لکھتا ہوں۔ اوکاڑہ سے اپنے محترم بھائی تفسیر عباس بابر کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کے تبصرے سے خاصا محظوظ ہوا۔ تفسیر بھائی اٹینشن ہم ہیں نا آپ کے ساتھ۔ ماہا ایمان صاحبہ لگتا ہے شادی کے بعد آپ کا دماغ اپنی جگہ سے کھسک گیا ہے۔ آپ کو ایک فری مشورہ، آپ کچھ دن ریسٹ کریں ایسا نہ ہو کہ...؟ ڈاکٹر انتظار مرزا کا تبصرہ اچھا تھا۔ محترم ہم ہمیشہ اچھی بات لکھتے ہیں بس سمجھنے کے لیے دماغ کی ضرورت ہے۔ ہمارے محترم بھائی آغا فرید احمد خاں بھی مسلسل غیر حاضر ہیں جناب کدھر ہو۔ ابتدائی صفحات پر موجود نواب صاحب کافی دنوں بعد آئے اور کیا خوب آئے۔ طالش تیموری کی تقدیر کے ہاتھوں شکست نے یہ ثابت کر دیا کہ تقدیر کے کام تدبیر سے نہیں نکلتے۔ یہ بالکل بجا ہے قانونِ قدرت کے فیصلے بالکل اٹل ہوتے ہیں، انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار اس دفعہ سپر ہٹ رہی۔ سنسنی و ایکشن سے بھرپور قسط مزہ دے گئی۔ سلیم فاروقی کی کہانی فریب کار پاک آرمی کے موضوع پر لکھی گئی تھی، پسند آئی۔ وقت گواہ ہے جب بھی ملک پاکستان پر کوئی کڑا وقت آیا، کوئی چال چلی گئی، پاک فوج نے منہ توڑ جواب دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اجل شناس زبردست رہی۔ یقیناً دولت کی حد سے زیادہ طلب انسان کے دماغ کو بالکل ماؤف کر دیتی ہے۔ جب تک کائنات باقی ہے دولت کی حرص و ہوس سے ایسی کہانیاں جنم لیتی رہیں گی۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کے حملے ''بات یہ ہے کہ مجھے جاسوسی پر شدید غصہ آرہا ہے۔ جب مجھے کوئی بھی چیز بے حد اچھی لگتی ہے اور بار بار اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بے حد غصہ آتا ہے کہ میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ٹائم کیوں ضائع کر رہا ہوں؟ آج بھی بذریعہ فون دن کے 12 بجے اطلاع موصول ہوئی کہ جاسوسی تشریف لا چکا ہے اور ہم اس شدید ترین دھوپ میں سر جھاڑ منہ پہاڑ بک اسٹال کی جانب دوڑتے چلے گئے اور ساتھ ساتھ سوچتے کہ اگر یہ محبت ہے تو بخدا بہت کمینی چیز ہے۔ (یہ تو سچ ہے) ہم اداریے سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ انضمام راجا صاحب! آپ کو آتا دیکھ کر ہم اندازہ لگا چکے تھے کہ آپ بے تحاشا پرانے ہیں۔ (آپ سے بھی زیادہ؟) آصفہ جی! میدان چھوڑ کر وہ بھاگتے ہیں جو اپنی ہار دیکھنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔ ہم تو اترتے ہی اس لیے ہیں کہ ہار کر کسی کو جیت کی خوشی دے سکیں۔ (یہ دل سے کہہ رہے ہیں؟) اپنے اعجاز برادر کو تو جب بھی پایا تو قیام پاکستان سے پہلے کے زمانے کی یادوں میں تڑپتا پایا، جب اپنے اعجاز میاں تھے، ''وہ'' تھے بادل تھے اور سارا جنگل محو رقص تھا۔ جعفر صاحب کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ادارہ ان کی تجاویز کو دیوانے کا خواب سمجھ کر مسترد کرتا ہے اور چونکہ رد کرنے کے جملہ حقوق محفوظ ہیں لہٰذا معذرت کی احمقانہ فارمیلٹی کی پابندی بھی نہیں ہے۔ ہاشمی برادر! صنفِ نازک نے تو وار چلا چلا کے ایک تاریخ رقم کر دی ہے اور آپ اب غور فرمانے پر غور کر رہے ہیں۔ عمیر شہزاد کی ڈھٹائی حیران کن ہے۔ موصوف نے چیٹنگ میٹریل سے غیر انسانی سلوک کر کے فرسٹ ایئر کے پیپر دیے اور دیکھو کس دھڑلے سے انجینئر کا دم چھلا لگائے پھرتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار قمرتی کے تبصرے پر بے پناہ پیار آیا، وہ بھی ابتدائی دو لائنوں پر۔ محی الدین نواب کی موجودگی میں تقریباً ناممکن ہے کہ پہلے کسی اور کو پڑھا جائے۔ بے ثمر منفرد موضوع اور عجیب و غریب انسانی رویوں کی ترجمان ایک شاندار کہانی ثابت ہوئی۔ مجموعی طور پر یہ کہانی عجیب کیفیات سے دوچار کرنے میں کامیاب رہی۔ (کتنی عجیب!) للکار میں حسبِ توقع تابی اور ثروت کی کہانی دوسری سنسنی خیز کہانیوں تلے دب کر رہ گئی ہے۔ جلالی کا منفرد خصوصیات کا حامل کردار ہمیں بے حد اچھا لگا۔ گرداب میں شہریار نے اسلم اور ماہ بانو کو بخیریت پردیس بھجوا کر جی خوش کر دیا۔ کافی عرصے سے غائب آفتاب اور کشور کی خیر خیریت بھی مل گئی۔ عکس فاطمہ کی معاوضہ انسانی جبلت کی عکاس کہانی تھی۔ تجسس اور ہوس کے امتزاج نے کہانی کو خوب صورت موڑ دیا۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ایم عزیر اسد، چکوال۔ تاج نواب بنگش، کوہاٹ۔ تنویر احمد، نوشہرہ۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل، جلال پور بھٹیاں۔ عالم خان' حیدر آباد۔ جعفر حسین، چنیوٹ۔ ماہا ایمان، حافظ آباد۔ رانا حبیب الرحمن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال۔ محمد شاہد اقبال، خانیوال۔ مشائم، صوابی۔

جال در جال

سلیم فاروقی

سنگلاخ پہاڑوں اور پُراسرار غاروں کی سرزمین جوصدیوں سے جارحیت اور حملہ آوروں کی رہ گزر کے طور پر تاریخ میں اپنی پہچان رکھتی ہے... انیسویں صدی کے اختتام سے اس علاقے میں تبدیلیوں کا ایک دور شروع ہوا... بیسویں صدی کے وسط تک اس بھونچال میں بڑی حد تک ٹھہراؤ آچکا تھا... مگر شوقِ جہانداری میں دنیا کی دو بڑی طاقتیں بدمست سانڈ بن چکی تھیں اوران سانڈوں نے مقابلے کے لیے افغانستان کی سرزمین کو چن لیا... اس کے بعد سے اب تک اس خطے میں وہی کچھ ہورہا ہے جو صدیوں سے اس کا خاصہ رہا ہے... مہمان ہو تو سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں... دشمن لپکے تو ان کی وہ جبلت جاگ اٹھتی ہے جس سے بڑے بڑے مہم جو کانپنے لگتے ہیں... سرحدوں کے آر پار یہی رشتے اور یہی معاشرت و ثقافت کارفرما چلی آرہی ہے... سرحدی لکیر کے باوجود خونی رشتے قائم ہیں اور پروان چڑھ رہے ہیں... جنگ کے طبل اور محبت کے شادیانوں میں لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی ایک سنسنی خیز و تیز رفتار داستاں...

عالمی طاقتوں کے بےرحم شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک دلیر اور جانفروش نوجوان کی جدوجہد مسلسل...

ماسکو کا درجۂ حرارت اس دن نقطۂ انجماد سے اٹھارہ ڈگری نیچے تھا۔ مجھے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا تصور کر کے ہی جھرجھری آرہی تھی لیکن کمرے سے باہر تو نکلنا ہی تھا۔ صبح ہمارا آخری پیپر تھا اور میرے انتہائی محنت سے تیار کیے ہوئے نوٹس عاقل خان کے پاس تھے۔ قصور اس میں میرا ہی تھا۔ میں خود ہی نوٹس اس سے لینا بھول گیا تھا۔

ہمارا انجینئرنگ کا آخری سال تھا۔ کل کا پرچہ دیتے ہی ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

میں نے اٹھ کر جیکٹ کے اوپر اوور کوٹ پہنا، سر پر سمور کی ٹوپی چڑھائی، کانوں اور چہرے کو دبیز اونی مفلر سے ڈھانپا۔

میں دستانے پہن رہا تھا کہ میرے روم میٹ بہادر خان نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ وہ بہت دیر سے میری حرکات دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے کچھ زیادہ ہی سردی لگ رہی ہے۔ حالانکہ کمرے میں ہیٹر آن تھا اور درجۂ حرارت بھی معقول تھا۔

جب میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو وہ حیرت سے بولا۔ ’’دلاور خان! کہاں جارہے ہو؟ کیا کل پرچہ نہیں دینا ہے؟‘‘

’’اسی وجہ سے تو جارہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم نے پرچے کی تیاری نہیں کی ہے اور اب بیمار ہو کر امتحان ہی سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔''

''او بھائی! مجھے مزید یہاں رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرے کچھ ضروری نوٹس عاقل خان کے پاس رہ گئے ہیں، وہی لینے جا رہا ہوں۔''

عاقل خان کا کمرا اس ہوسٹل کے دوسرے بلاک میں تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن خون جما دینے والی اس سردی میں تو یہ فاصلہ بھی مجھے بہت لگ رہا تھا۔

میں کوئی نازک اندام آدمی نہیں ہوں۔ میرے اپنے ملک افغانستان میں بھی سردی کم نہیں پڑتی۔ درجۂ حرارت عموماً وہاں بھی نقطۂ انجماد سے نیچے گر جاتا ہے۔ میرا بچپن اور لڑکپن انہی موسموں کا جبر سہتے اور ان سے نبرد آزما ہوتے گزرا تھا لیکن ماسکو کی سردی تو ہڈیوں میں پیوست ہو جاتی تھی۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سائبیریا کی یخ بستہ ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ وہ ایسی کاٹ دار ہوا تھی کہ چہرے کا جو حصہ کھلا رہ جاتا تھا، اسے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً کاٹ کر رکھ دیتی تھی۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا عاقل خان کے کمرے تک پہنچا تا کہ بھاگنے سے جسم اس شدید سردی سے کسی حد تک محفوظ رہے۔

میں عاقل خان کے پاس پہنچا تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے اس سے نوٹس لیے اور الٹے قدموں واپسی کے لیے دوڑ پڑا۔

اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے میری حالت غیر ہو چکی تھی۔

بہادر خان نے فوراً تھرماس سے گرما گرم کافی نکال کر مجھے پلائی۔ اس کے ساتھ ابلے ہوئے دو انڈے بھی دیے۔ اسے اندازہ تھا کہ واپسی میں میری کیا حالت ہوگی۔

میں سب کچھ بھلا کر پرچے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

میرے بابا قبیلے کے سردار تھے۔ اس دور میں سوویت یونین ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھا۔ وہ نہ صرف دیگر معاملات میں افغانستان کی مدد کرتا تھا بلکہ افغان طبقۂ اشرافیہ کے بچوں کے لیے ماسکو اور دوسرے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی مہیا کرتا تھا۔

مجھے ایک بات یہ بھی عجیب نظر آتی تھی کہ افغان سرداروں اور خوانین کے بیٹے عموماً انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ شاید اس لیے کہ سوویت یونین ٹیکنالوجی میں بہت آگے تھا۔ اسے مزید ہنر مندوں کی ضرورت تھی۔

میں اکثر سوچتا تھا کہ اس تعلیم سے فوری طور پر ہمارے ملک کو کیا فائدہ ہوگا۔ وہاں تو ابھی نہ کوئی ایسی قابلِ ذکر انڈسٹری تھی، نہ ہمارے پاس انڈسٹری قائم کرنے کے وسائل تھے۔ ہمیں ڈاکٹروں کی اور اساتذہ کی اشد ضرورت تھی جو اس وقت افغانستان میں برائے نام تھے اور ہماری ضرورت کے لیے ڈاکٹر اور اساتذہ پاکستان، بھارت، ایران اور ترکی سے آتے تھے۔

جب سے شاہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا تھا، افغانستان میں سوویت یونین کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔

وہ ہمیں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے ملک لے جاتے تھے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہنوں میں اشتراکیت کا فلسفہ بھی ٹھونستے تھے۔ کارل مارکس ان کے لیے انتہائی قابلِ احترام تھا۔ انہیں تو ہماری نمازیں بھی ناگوار گزرتی تھیں لیکن وہ لوگ شاید یہ بھلا بیٹھے تھے کہ جس بچے نے پیدا ہوتے ہی اذان کی آواز سنی ہو، وہ کارل مارکس یا لینن کو کیا خاطر میں لائے گا۔

میں انجینئرنگ کی ڈگری لے کر گھر پہنچا تو بابا کے حجرے میں دو تین دن تک مجھ سے ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

اب پھر سوال یہی تھا کہ میں اس ڈگری کا کیا کروں؟

میرے بہت سے ساتھی سوویت یونین ہی میں ملازمت کرنے لگے تھے، کچھ جرمنی چلے گئے تھے۔

اچانک ہی افغانستان پر جنگ کے بادل چھا گئے۔ مجھے ان دنوں سیاست کا اتنا شعور نہیں تھا۔ بس مجھے اتنا علم تھا کہ سوویت یونین ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

افغانستان کا حکمراں ٹولہ اس کے ساتھ تھا لیکن ملک کے بہت سے سرداروں اور بے شمار افغانیوں کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ ان قبیلوں نے نہ صرف سوویت یونین کی مخالفت کی بلکہ کچھ جنگجو قبائل نے تو ہتھیار بھی سنبھال لیے۔

میرے بابا اسفند خان شاہی خاندان کی نسبت سے روسیوں کی نظروں میں دوست تھے لیکن جب انہوں نے بھی کھل کر سوویت یونین کی مخالفت کی تو ہمارا قبیلہ بھی معتوب ٹھہرا۔

وہ صبح بہت پھیکی پھیکی سی تھی۔ سردی بھی اس دن بہت شدید تھی لیکن ہم لوگ پیدائشی طور پر موسم کی ان سختیوں کے عادی تھے۔

ہمارا گاؤں کابل سے تقریباً پچھتر کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں اور چکردار راستوں کے باعث یہ فاصلہ دگنے سے بھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

میں اس دن کچھ گھریلو سامان کی خریداری کے لیے کابل میں تھا۔ وہاں بھی ہمارے کچھ رشتے دار رہتے تھے۔ اچانک میں نے کابل کی شاہراہ پر فوجی ٹرکوں اور بکتر بند گاڑیوں کا ایک کارواں دیکھا۔ وہ کارواں خاصا طویل تھا اور گاڑیاں مسلسل کابل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ان سب میں روسی سپاہی سوار تھے۔ سرخ چہروں، چوڑے جبڑوں اور موٹی موٹی گردنوں والے ان سپاہیوں کو دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔

وہ کارواں جونہی کابل کے وسط میں پہنچا، اچانک اس پر کسی پہاڑی کی چوٹی سے فائرنگ ہونے لگی۔

میں حیرت زدہ ہو کر آگے بڑھا تا کہ صورتِ حال معلوم کر سکوں لیکن میرے ایک کزن نے مجھے پیچھے کی طرف کھینچ لیا اور بولا۔ ''کیا مرنے کا ارادہ ہے دلاور خان؟''

اس کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ روسی فوجیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ پھر تو گویا گھمسان کا رن پڑ گیا۔

میرا کزن واجد خان مجھے کھینچتا ہوا گھر کی طرف بھاگا۔ ہتھیاروں کی گھن گرج وہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

واجد خان کا مکان پختہ اور خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس کے ساتھ اس کے تین چچا، ان کے سات بیٹے، پانچ بیٹیاں اور اس کے دو بھائیوں اور تین بہنوں کے علاوہ دور کے کچھ رشتے دار بھی رہتے تھے۔

واجد خان گرتا پڑتا گھر میں داخل ہوا اور اپنے والد سے بولا۔ ''بابا! روسی فوج نے حملہ کر دیا ہے اور وہ لوگ کابل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

''تم خاموشی سے گھر میں بیٹھو۔ روسی فوجی ہمارے دشمن نہیں ہیں۔'' اس کے باپ سمندر خان نے کہا۔

''لیکن چاچا! وہ لوگ...''

''تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' سمندر خان نے میری بات کاٹ دی۔ ''ہمارے قبیلے کا روسیوں سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''معاہدہ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ان کافروں سے معاہدہ؟ آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے چاچا! یہ لوگ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور زنا کرتے ہیں۔

یہ ہمارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟''

''تم ابھی بچے ہو دلاور خان۔'' سمندر خان نے کہا۔ ''ان کے افعال سے ہمیں کیا لینا؟''

''لیکن وہ یہاں آ ہی کیوں رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''چاچا! ماسکو میں کئی برس رہ کر میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ لوگ...''

''بس کرو دلاور خان!'' چاچا سمندر خان نے مجھے جھڑک دیا۔ ''میں بھی انہیں بہت قریب سے جانتا ہوں۔ یہ سب سیاست کے کھیل ہیں۔...... ظاہر شاہ کے بعد یہاں عجیب سیاسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ سرداروں کے بعد یہاں کتنے حکمراں تبدیل ہو چکے ہیں اور وہ سب طبعی موت نہیں مرے ہیں بلکہ اپنوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اب اس ملک پر کسی کی حکومت ہی نہ ہو۔ سوویت یونین ہمارا پرانا دوست اور خیر خواہ ہے۔ وہ اس ملک کی تباہی کیسے برداشت کر سکتا ہے۔''

''لیکن اس کے لیے اتنی فوج، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی۔'' چاچا سمندر خان نے کہا۔ ''اب تم خود ہی دیکھو۔ ان عقل کے اندھوں نے ان لوگوں ہی پر حملہ کر دیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ مزاحمت کرنے والے لوگوں کی اکثریت میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتے لیکن کسی بھی آزاد اور خود مختار ملک میں اپنی فوجیں لے کر چڑھائی کرنے کا مطلب کیا ہے؟'' میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا۔ ''آپ ہی بتائیے چاچا! کوئی آپ کے گھر میں گھس آئے تو آپ کیا کریں گے؟ کیا اس کا استقبال کریں گے یا اسے گھر سے نکالیں گے؟''

''میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارا باپ بھی ایک قبیلے کا سردار ہے اور اس کا قبیلہ میرے قبیلے سے کہیں زیادہ بڑا اور طاقت ور ہے۔ وہ بھی روسیوں کے اس اقدام کی حمایت کر رہا ہے۔''

''ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا چاچا!'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا باپ ان کافروں کی حمایت کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو میرے ماسکو جانے کے بھی خلاف تھا۔ میں آج ہی اپنے گاؤں جاؤں گا۔''

''اس وقت دن کا اجالا پھیلا ہوا ہے۔'' چاچا سمندر خان نے کہا۔ ''ابھی تمہارا جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

اندھیرا پھیل جائے تو نکل جانا۔ روسی فوجی ابھی کابل سے آگے نہیں بڑھے ہیں لیکن گردونواح کی پہاڑیوں پر انہوں نے مورچے بنالیے ہیں۔ وہ دشمن سمجھ کر تمہیں نشانہ بھی بنا سکتے ہیں۔''

اس دن مجھے علم ہوا کہ چاچا سمندر خان انتہائی لالچی اور خودغرض انسان تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ غدار بھی تھا۔ اب اس گھر میں مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔

میرے پاس رائفل تو ہر وقت رہتی تھی۔ مجھے اس کے فاضل راؤنڈز اور ایک ریوالور کی بھی ضرورت تھی۔ منیر خان، چاچا سمندر خان کا سب سے چھوٹا بیٹا اور میرا ہم عمر تھا۔ اس کے ساتھ میری اچھی خاصی دوستی بھی تھی۔

مجھے پریشان دیکھ کر وہ میرے پاس آیا اور ہنس کر بولا۔ ''کیا بات ہے انجینئر! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' وہ ہمیشہ مجھے انجینئر ہی کہتا تھا۔

''تم ملک کے حالات دیکھ رہے ہو؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس کے باوجود تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں پریشان کیوں ہوں؟''

''یار! سچ پوچھو تو بابا کے فیصلے سے مجھے بھی اختلاف ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''منیر! تم مجھے کارتوسوں کا ایک ڈبا اور ریوالور لاکر دے سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں ان کے پیسے دے دوں گا۔''

''کیسی غیروں والی بات کررہے ہو انجینئر!'' اس نے بُرا مان کر کہا۔ ''ہمارے اسلحہ خانے میں بہترین جرمن رائفلیں اور پستول موجود ہیں۔ میں ابھی یہ چیزیں لے آؤں گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''لیکن انجینئر! میری ایک شرط ہے۔''

''چلو، وہ شرط بھی بتادو۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں بھی ان کافروں کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتا۔''

''لیکن تمہارے بابا...''

''بابا نے تو ان کافروں سے معاہدہ کررکھا ہے۔ مجھے ان کی کیا فکر ہے۔''

''اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

رات کی تاریکی پھیلتے ہی ہم نکل کھڑے ہوئے۔ میں وہاں کی ایک ایک پہاڑی اور غار کو اندھیرے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ میں عام رات میں جیپ میں سفر کرتا تھا لیکن اس وقت جیپ کا سفر مناسب نہیں تھا۔ کئی راستے ایسے تھے جو بالکل شاہراہ کے نزدیک سے گزرتے تھے اور اس وقت پوری شاہراہ پر ان موٹی گردنوں والے روسیوں کا قبضہ تھا۔

میں تو پیدل ہی سفر کرنا چاہتا تھا لیکن منیر خان نے کہا کہ ہم گھوڑوں پر بھی سفر کرسکتے ہیں۔ دو گھوڑے مہیا کرنا بھی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

ہم دونوں جدید اسلحے سے لیس ہوکر گھوڑوں پر سوار ہوکر نکل گئے۔ میری طرح منیر بھی اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور اندھیرے میں بھی خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کررہا تھا۔

ہم نے احتیاطاً اپنے ساتھ کھانے پینے کا کچھ سامان بھی رکھ لیا تھا۔ اس پورے سفر میں صرف ایک جگہ ایسی تھی جو شاہراہ کے بالکل نزدیک تھی۔ وہاں سے گزرے بغیر چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ درمیان میں بلند و بالا پہاڑ حائل تھے۔ ان پہاڑوں سے گھوم کر جانے میں ہمیں سات سے آٹھ گھنٹے لگ سکتے تھے ورنہ اس راستے سے گزرتے ہی صرف سترہ، اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر میرا گاؤں تھا۔

میں نے منیر سے کہا۔ ''ہم جب شاہراہ کے نزدیک پہنچیں گے تو احتیاطاً گھوڑوں سے اتر جائیں گے تاکہ وہاں اگر کوئی دشمن موجود بھی ہو تو اسے معلوم نہ ہو۔''

مزید چار کلومیٹر چلنے کے بعد منیر خان نے گھوڑا روک لیا۔ میں بھی اپنا گھوڑا روک چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب وہی خطرناک علاقہ شروع ہونے والا ہے جو شاہراہ کے بالکل نزدیک ہے۔ یہ راستہ تقریباً تین کلومیٹر تک شاہراہ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، پھر یہ بتدریج دور ہوتا جاتا تھا۔

وہاں اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ صرف ہمارے گھوڑوں کی خفیف سی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود ہم پیدل ہی چلتے رہے۔

ہم مزید ایک کلومیٹر آگے بڑھے تھے کہ منیر خان اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔

ایک پہاڑی کے عقب سے دھندلی دھندلی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم کچھ اور آگے بڑھے تو وہاں کا منظر مزید واضح ہو گیا۔

اس پہاڑی کے پیچھے فوجیوں نے مورچا بنا رکھا تھا۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر جدید قسم کا ایک ٹینٹ لگا ہوا تھا۔

ٹینٹ سے باہر دو تین سپاہی بیٹھے شراب نوشی میں مصروف تھے۔ انہوں نے سڑک کے ساتھ ہی ایک کارپٹ کا ٹکڑا بچھا رکھا تھا اور وہ اسی پر بیٹھے تھے۔

''یہ لوگ شراب پی کر ابھی سو جائیں گے۔'' منیر نے کہا۔ ''پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔''

''میں اتنا انتظار نہیں کرسکتا منیر خان!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے تو حیرت ہے کہ ان لوگوں کو اس جگہ لایا کون؟ یہ ہمارے ہی کسی ایسے آدمی کا کام ہے جو جانتا ہے کہ کابل سے جانے والے جیپ میں جائیں یا پیدل، وہ اس راستے سے گزرے بغیر نہیں جاسکتے۔'' میں نے گھوڑے کی لگام ایک ابھرے ہوئے پتھر میں اٹکاتے ہوئے کہا۔

''تم کرنا کیا چاہتے ہو انجینئر؟'' منیر خان نے مجھ سے پوچھا۔

''میں ان کافروں کو جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کے بڑوں کو یہ احساس ہو کہ ہم بھی ان کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔'' میں نے شانے پر لٹکی ہوئی جدید اور دور مار رائفل اتار لی۔

یہ رائفل، پستول اور ان کے بے شمار فاضل راؤنڈز منیر خان اپنے اسلحہ خانے سے لایا تھا۔ میں نے اپنی پرانی رائفل کابل کے ایک غریب اور غیور نوجوان کو تحفے کے طور پر دے دی تھی۔

''ایک منٹ!'' منیر خان نے کہا۔ ''میرے تھیلے میں دو دستی بم بھی ہیں۔''

''تم تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ذہین ہو منیر خان۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں بھی آخر افغان ہوں۔ میرے پردادا نے پانچ فرنگیوں کو...''

''اپنی تلوار سے تن تنہا جہنم رسید کیا تھا۔'' میں نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کردیا۔ ''اور یہ کہ تمہارے ایک اور جدِاعلیٰ نے فرنگیوں کی ایک پوری کمپنی کا نام و نشان مٹادیا تھا۔'' میں مسکرایا۔ ''منیر خان! اس وقت میں اپنے خاندان کی تاریخ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں کیونکہ تمہارے وہ پردادا اتفاق سے میرے پردادا بھی تھے۔'' پھر میں سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''ہم فوری طور پر دستی بم استعمال نہیں کریں گے۔ انہیں کسی بُرے وقت کے لیے بچاکر رکھیں گے۔ ممکن ہے یہاں صرف ان کے چند آدمی ہوں اور یہاں سے کچھ فاصلے پر ان کی پوری کمپنی موجود ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ہم دستی بم استعمال کرکے اپنے علاقے کی طرف نکل جائیں گے۔ فوری طور پر ہم دو طرف سے ان پر حملہ کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم گھوم کر بائیں طرف جاؤ، میں دائیں طرف سے حملہ کروں گا۔ ہاں، فائرنگ جگہ بدل بدل کر ایسے انداز میں کرنا کہ وہ سمجھیں، ہم پر بہت سے لوگوں نے بیک وقت ہلا بول دیا ہے۔''

''میں رائفل کے ساتھ ساتھ ریوالور سے بھی فائر کروں گا۔'' منیر خان نے کہا۔ ''تاکہ انہیں بالکل یقین آجائے کہ ہم پر حملہ کرنے والے کم سے کم دس بارہ آدمی ہیں۔''

''جاؤ، فی امان اللہ۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، جب تک میری طرف سے فائر نہ ہو، تم فائر مت کرنا۔''

منیر خان زمین کے ساتھ بالکل چپک کر آگے بڑھنے لگا۔

میں بھی مزید آگے بڑھ گیا۔ وہ لوگ بلندی پر تھے اس لیے وہ ہم سے بہتر پوزیشن میں تھے۔

اب مجھے ان کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ماسکو میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد میں روسی زبان سمجھ بھی لیتا تھا اور بول بھی سکتا تھا لیکن میرے لہجے میں اہلِ زبان کی سی روانی نہیں تھی۔

میرے کان ان منحوسوں کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خمار آلود آواز میں بولا۔ ''ان ذلیلوں نے ہمیں اس شدید سردی میں یہاں پھینک دیا۔'' اس نے کہا۔

''اور خود... آرام سے کمبلوں میں دبکے، ہیٹر جلائے سو رہے ہوں گے۔'' دوسرے نے غلیظ گالی استعمال کی۔

''یار، تو واڈکا پی اور یہ بھنا ہوا گوشت کھا۔'' تیسرے نے لقمہ دیا۔

''ٹائم کیا ہوگیا؟'' پہلی والی مکروہ آواز سنائی دی۔

''ٹائم کی فکر مت کرو۔'' دوسرا بولا۔ ''ابھی ہماری ڈیوٹی آف ہونے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک گھنٹے تک یہاں خوار ہوتے رہیں گے؟'' پہلے آدمی نے کہا، پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''آخر ان جاہل اور مفلوک الحال افغانوں سے اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ پاگل کے بچے اپنی توڑے دار رائفلوں سے کابل میں لڑ رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ اس ویرانے میں کون آئے گا کہ ہم چھ آدمی سزا بھگت رہے ہیں؟''

''کامریڈ! آرڈر تو آرڈر ہوتا ہے۔ یہاں کوئی آئے

یا نہ آئے، ہمیں دوسرے آرڈر تک یہاں رہنا ہے۔‘‘
’’ہمیں یہاں چھوڑ کر وہ... ٹرک بھی لے گئے۔‘‘ پہلے آدمی نے پھر ناقابلِ اشاعت گالی کا استعمال کیا۔
’’ان کی تو...‘‘ دوسرے آدمی نے بھی حسبِ توفیق زبان دانی کے جوہر دکھائے۔
ان کی گفتگو سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس پوسٹ پر صرف یہی چھ آدمی موجود ہیں۔
اب میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں سے ان پر بے خطا نشانہ لگایا جا سکے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہاں سے اتنی ہی بلندی پر ایک پہاڑی موجود تھی۔ منیر خان کی لائی ہوئی دور مار رائفل وہاں سے بھی انہیں نشانہ بنا سکتی تھی۔
میں جھکا جھکا اس پہاڑی کی طرف بڑھا اور دبے پاؤں اس پر چڑھنے لگا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ میرے اوپر چڑھنے سے کوئی پتھر نیچے نہ لڑھک جائے لیکن وہ بالکل ٹھوس چٹانیں تھیں۔ ان کی ڈھلان پر تو چھوٹے چھوٹے پتھر ہو سکتے تھے لیکن اوپر سے کوئی پتھر ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔
لیکن مجھ سے اندازے کی غلطی ہوئی۔ اس پہاڑی کے نیچے بہت سے چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے۔
میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ان پتھروں کو عبور کر گیا۔ ایک موقع پر میرا پاؤں پھسلا اور ایک پتھر لڑھکا لیکن اس کی آواز اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان لوگوں تک پہنچتی۔
وہ یوں بھی چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے پہلا منحوس کہہ رہا تھا۔ ’’یار! ہمیں ان پہاڑیوں میں پھینکا ہی تھا تو دو تین افغان لڑکیاں بھی اٹھانے کی اجازت دے دیتے۔ افغان حسن...‘‘
وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں بھی بُری طرح چونک اٹھا کیونکہ دوسری طرف سے پتھر گرنے کی خاصی پُرشور آواز آئی تھی۔
میں سمجھ گیا کہ منیر خان نے بھی میری طرح کسی پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کی ہے اور یہ پتھر اسی سے گرا ہے۔
اب کچھ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے پہاڑی کا آدھا راستہ طے کر لیا تھا۔ میں نے سرعت سے بقیہ فاصلہ طے کیا اور اوپر پہنچ گیا۔
’’یار! یہ آواز کیسی تھی؟‘‘ پہلے شخص نے کہا۔ واڈکا کا خمار اور افغانی دوشیزہ کے حسن کا تصور اس کے دماغ سے اتر گیا تھا۔
’’یہ پہاڑی علاقہ ہے۔‘‘ دوسرا شخص بولا۔ ’’یہاں اکثر پہاڑیوں سے پتھر لڑھکتے رہتے ہیں۔‘‘
’’بغیر کسی وجہ کے؟‘‘ پہلا والا شخص بولا۔ ’’اس وقت تو یہاں اتنی تیز ہوا بھی نہیں ہے۔‘‘
’’تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟‘‘ تیسرا آدمی مخمور لہجے میں بولا۔ ’’کوئی گیدڑ یا دوسرا جانور ہو گا۔‘‘
وہ تینوں اب میرے نشانے کی زد پر تھے۔ میں نے درمیان والے صورت حرام کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔
وہ الٹ کر گرا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ اوپر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ روشنی ٹینٹ میں سے نہیں بلکہ اس الاؤ کی تھی جو ان خبیثوں نے سردی سے بچنے کے لیے روشن کر رکھا تھا۔
پہلے آدمی کے گرتے ہی دوسرا فائر ہوا اور دوسرا آدمی زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے فوراً ہی تیسرے آدمی کو نشانہ بنایا۔ وہ بھی الٹ کر گرا۔
منیر خان نے اس کے باوجود جگہ بدل بدل کر دو تین فائر کیے، پھر ایک فائر اس نے پستول سے بھی کیا۔
میں جانتا تھا کہ ٹینٹ سے باہر آنے والے اندھا دھند باہر نہیں آئیں گے۔ وہ بہت محتاط انداز میں باہر نکلیں گے بلکہ یہ بھی ان کی فوجی تربیت کا نتیجہ تھا۔
انہوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ خیمے میں ہونے والی خفیف سی روشنی کو بھی بند کر دیا۔
اب اس پہاڑی پر اندھیرا تھا لیکن خیمے سے کچھ فاصلے پر ان کے ساتھیوں نے آگ کا جو الاؤ روشن کیا تھا، اس کی روشنی ابھی باقی تھی۔ اس الاؤ کو بجھانے کے لیے یا تو ان میں سے خود کوئی وہاں تک آتا یا پھر وہیں سے اس پر پانی پھینکتا۔
دونوں صورتوں میں وہ میری یا منیر خان کی نظر میں آ جاتا کیونکہ اب ہماری آنکھیں اندھیرے سے خاصی مانوس ہو گئی تھیں۔
میری نظریں ٹینٹ کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے آمد و رفت کا راستہ تھا۔ الاؤ کی بہت مدھم روشنی میں اب وہاں کی تقریباً ہر چیز نظر آ رہی تھی۔
مجھے اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تقریباً تین منٹ گزرے ہوں گے لیکن وہ تین منٹ مجھے تین گھنٹوں کے برابر لگ رہے تھے۔ ایک ہی جگہ نظریں جمائے جمائے میری آنکھیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ خوف سے باہر نہیں نکل رہے ہیں یا پھر اندر کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ اندر یقیناً کوئی تو موجود تھا جس نے خیمے کی روشنی گل کی تھی۔
اچانک خیمے کی مخالف سمت سے فائرنگ کی تڑتڑاہٹ

گونجی، اس کے ساتھ ہی کرب میں ڈوبی ہوئی انسانی چیخیں سنائی دیں۔
میں اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے خیمے کے اس عارضی دروازے کے پاس کسی کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ چھپکلی کی طرح تیزی سے پیٹ کے بل رینگتا ہوا اس سمت جا رہا تھا جہاں تاریکی تھی۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اسے تو چیخنے تک کی مہلت نہ ملی۔ شاید میری گولی اس کی کھوپڑی یا دل میں اتر گئی تھی۔
میں چند لمحے ساکت رہا اور اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔
پانچ منٹ بعد اسی اذیت ناک حالت میں گزر گئے۔
میرے بائیں جانب کوئی پتھر لڑھکا، میں بجلی کی سی سرعت سے پلٹا اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ منیر خان کی آواز آئی۔ ’’فائر مت کرنا انجینئر! یہ میں ہوں، منیر خان۔‘‘
میری رائفل جھک گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ’’کیا ہوا منیر خان! تم ٹھیک تو ہو؟‘‘
’’میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اب یہاں ان کا کوئی آدمی نہیں ہے ورنہ اب تک سامنے ضرور آ جاتا۔‘‘
’’تمہارا اندازہ درست ہے منیر خان۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ تعداد میں چھ تھے۔ تین باہر کھلے آسمان کے نیچے پہرا دے رہے تھے اور تین اس ٹینٹ میں سو رہے تھے۔‘‘
’’تم نے پہلا فائر کرنے میں کچھ جلدی کر دی تھی انجینئر!‘‘ منیر خان نے کہا۔ ’’پتھر گرنے کی آواز تم نے بھی سنی ہو گی۔ تم تو سمجھ بھی گئے ہو گے کہ پتھر میری ہی وجہ سے گرا ہے۔ وہ تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر اوپر چڑھ گیا کہ اب جو ہو سو ہو۔ اسی وقت تم نے فائر داغ دیا۔ دوسرا آدمی عین میرے سامنے تھا اس لیے میں نے اسے جہنم رسید کر دیا۔‘‘
’’لیکن کیا اس خیمے میں پیچھے سے نکلنے کا بھی راستہ ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’راستہ نہیں ہے لیکن انہوں نے راستہ بنانے کے لیے خیمے کو وہاں سے کاٹ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خطرہ صرف سامنے ہی سے ہے۔ اب انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ موت کا ایک فرشتہ دوسری طرف بھی موجود ہے۔ تیسرا بوکھلاہٹ میں پلٹ کر باہر بھاگا اور تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔‘‘
’’او بھائی موت کے فرشتے!‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’فائرنگ کی آواز دور دور تک گئی ہو گی۔ ان لوگوں کی مدد کے لیے مزید لوگ بھی آ سکتے ہیں۔‘‘
’’فائرنگ ہمارے ملک میں کوئی عجیب یا انوکھی بات نہیں ہے۔‘‘
’’تو کیا تمہارا یہیں قیام کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ’’ان کے سامان کی تلاشی لو اور فوراً یہاں سے نکلو۔‘‘
ہم بہت محتاط انداز میں تقریباً رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں میں ہمیں اپنی ہی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
خیمے سے ہمیں دو جدید روسی رائفلیں ملیں۔ یہ تو بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کلاشنکوف کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ تین انتہائی طاقتور دوربینیں تھیں۔ ایک بکس میں ان رائفلوں کے فالتو راؤنڈز بھرے ہوئے تھے۔ خاصی تعداد میں دستی بم بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔
وائرلیس سیٹ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً ان لوگوں نے وائرلیس سیٹ پر دوسری پوسٹ والوں کو آگاہ کر دیا ہو گا۔ میں نے وہ وائرلیس سیٹ بھی اٹھا کر انہی کے ایک بکس میں ڈال دیا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا سامان تھا۔ کافی، خشک دودھ اور چائے کی پتی کے ڈبے تھے۔ کیروسین اسٹوو بھی تھا۔ شراب کی بہت سی بوتلیں تھیں۔
میں نے وہ سب چیزیں وہیں چھوڑیں۔ مرنے والوں کے پاس سے ہمیں چھ عدد مزید کلاشنکوف رائفلیں اور جدید روسی پستول ملے۔ ان کے پاس روسی کرنسی بھی تھی۔ میں نے وہ بھی اپنے قبضے میں کی اور ہم تیزی کے ساتھ اس ڈھلان سے اترنے لگے۔
بھاری سامان اور رائفلوں کی وجہ سے ہم گھوڑوں تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگے۔
ہم نے وہ تمام سامان آدھا آدھا کر کے گھوڑوں پر لادا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گھوڑوں کی رفتار بھی وہ نہیں تھی جو عام حالات میں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لدا ہوا تھا۔
مجھے ہر دم یہی خطرہ تھا کہ ابھی دشمنوں کی گاڑیاں وہاں پہنچ جائیں گی۔ البتہ مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ گاڑیاں ان پہاڑی علاقوں پر نہیں چل سکیں گی۔ ہاں، وہ ہیلی کاپٹر استعمال کرتے تو اور بات تھی۔
ہم لوگ بہ عافیت اپنے گاؤں تک پہنچ گئے۔
ابھی ہم گاؤں کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اوپر سے

ایک گرج دار آواز آئی۔ ’’کون ہے؟ رک جاؤ۔‘‘
یہ جملہ پشتو میں ادا کیا گیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ میرے قبیلے والے بھی غافل نہیں ہیں۔
میں نے چیخ کر کہا۔ ’’دوست! میں دلاور خان ہوں۔‘‘
اچانک وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ گاؤں کے بہت سے مسلح نوجوان ہمارے سامنے آگئے اور مجھ سے اور منیر خان سے والہانہ انداز میں ملے۔
میں نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔ ’’صنوبر خان! گھوڑوں پر سے سارا سامان اتار کر کسی محفوظ جگہ رکھ دو اور گھوڑوں کو پانی وغیرہ پلاؤ۔ یہ بے چارے بھی تھک گئے ہیں۔‘‘
اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو یوں چوکس دیکھ کر مجھے مزید خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ میرے بابا اور میرا قبیلہ ان کافروں کی حمایت نہیں کر رہا تھا۔
میں بابا جان سے ملا تو انہوں نے مجھے یوں گلے لگایا جیسے میں برسوں بعد ان سے ملا ہوں۔ حالانکہ میں پچھلے ہی ہفتے تو کابل گیا تھا۔ وہ دیر تک مجھ سے کابل کے حالات کے بارے میں پوچھتے رہے۔
مجھے وہاں کے حالات کا اتنا ہی علم تھا جتنا چاچا سمندر خان سے معلوم ہوا تھا یا پھر میں نے روسی فوج کے کانوائے وہاں داخل ہوتے دیکھے تھے۔
بابا کے چہرے پر تشویش اور فکرمندی کے آثار تھے۔
’’آپ پریشان مت ہوں بابا!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہمارے باہمت اور جنگجو نوجوان ان کے خلاف شدید مزاحمت کر رہے ہیں اور وہ ہمارے ملک میں زیادہ دیر ٹھہرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔‘‘
’’دلاور بیٹا! تو نے تو ان ملعونوں کے ساتھ ایک عرصہ گزارا ہے۔ وہ بظاہر مہذب نظر آنے والے لوگ انتہائی وحشی ہیں۔ انہوں نے ہمارے ملک پر اس لیے چڑھائی نہیں کی ہے کہ وہ مزاحمت سے گھبرا کر واپس چلے جائیں گے۔ وہ ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ ان کے پاس بے انتہا وسائل ہیں، دولت ہے، طاقت ہے اور...‘‘
’’ان کے پاس ایک چیز کی کمی ہے بابا جان!‘‘ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’ان میں جذبۂ ایمانی کی کمی ہے۔ ہر جنگ کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ بلا مقصد لڑنے والے کرائے کے سپاہی زیادہ دیر جنگ کی صعوبتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کے مقابلے میں ہمارے پاس مقصد ہے۔ ہم اپنی سرزمین کا دفاع کر رہے ہیں۔‘‘
بابا نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بولے۔ ’’دلاور بیٹا! میں سمجھتا تھا کہ ماسکو کی جدید تعلیم اور طرزِ معاشرت نے تیرے خیالات بھی بدل دیے ہوں گے لیکن تو تو اب بھی ایک سچا اور کٹر مسلمان اور باغیرت افغان ہے۔ مجھے تجھ پر فخر ہے۔‘‘ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ’’سمندر خان نے ان کافروں سے معاہدہ کر کے اچھا نہیں کیا۔ ان لوگوں سے معاہدہ کرنا بھی ایسا ہے جیسے کسی سانپ سے یہ معاہدہ کرنا کہ وہ آئندہ ہمیں نہیں ڈسے گا۔‘‘ پھر وہ منیر خان سے مخاطب ہوئے۔ ’’منیر بیٹا! مجھے خوشی ہے کہ اس ضمیر فروشی میں تو اپنے باپ کے ساتھ نہیں ہے۔‘‘
’’میرے قبیلے کے بے شمار نوجوان ان کے خلاف ہیں تایا۔‘‘ منیر نے کہا۔ ’’اگر آپ کی اجازت ہو تو میں انہیں بھی یہاں بلا لوں؟‘‘
’’بیٹا! مجھے ان کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اپنے لوگوں کو ان کافروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا بھی تو عقل مندی نہیں ہے۔ وہ وہاں رہ کر ان کے خلاف زیادہ بہتر طور پر مزاحمت کر سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو تو ایسے ایسے غاروں کا علم ہے کہ روسی برسوں سر پٹخنے کے بعد بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔‘‘
’’بابا! میں روسیوں کا بہت سا اسلحہ تو لے آیا ہوں۔‘‘
’’یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ بھی نہیں ہے دلاور خان!‘‘ بابا نے کہا۔
’’میرا مطلب یہ نہیں تھا بابا!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں مکینیکل انجینئر ہوں اور اس اسلحے کو دیکھ کر ویسا ہی اسلحہ بنانے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔‘‘
’’دوسرے گاؤں میں گل خان کی فیکٹری ہے۔ وہ اس فیکٹری میں اسلحہ ہی بناتا ہے۔ تو اس سے مل لے۔ وہ انتہائی سچا اور کھرا مسلمان ہے۔ وہ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا۔‘‘ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ’’ان کافروں کو یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہمیں ہر طرح سے تیار رہنا ہوگا۔ تو آج ہی سے تیاری شروع کر دے۔‘‘
قبیلے کے نوجوانوں نے پہاڑوں میں گھرا ایک انتہائی محفوظ اور وسیع و عریض غار پہلے ہی دیکھ رکھا تھا۔
میں نے سب سے پہلے حکم دیا کہ اس غار میں کھانے پینے کا اتنا سامان بھر دو جو ہمارے لیے سال بھر کے لیے کافی ہو۔
’’میں کل ہی چاچا گل خان سے ملوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں روسی ساخت کی اس رائفل کی نقل بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔‘‘
پھر جنگ کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔
میں چاچا گل خان سے ملا تو اس نے رائفل دیکھ کر کہا۔ ’’ایسے رائفل بنانا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے دلاور بیٹا! لیکن ہمارے پاس وہ فولاد نہیں ہے جس سے یہ رائفلیں ڈھالی جاتی ہیں۔ ہماری بنائی ہوئی رائفل کسی بھی طور ہلاکت خیزی میں ان سے کم نہیں ہو گی لیکن اس میں ایک بنیادی خامی ہو گی۔ ایک دو برسٹ چلانے کے بعد ہی اس کی نال شدید گرم ہو جائے گی اور اسے پانی میں ڈبو کر ٹھنڈا کرنا پڑے گا۔‘‘
’’آپ اللہ کا نام لے کر کام تو شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کا بھی کوئی حل نکال دے گا۔‘‘

☆☆☆

جنگ پانچ سال سے جاری تھی۔ اس دوران میں افغانستان کے بے شمار باغیرت اور باضمیر نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں نے وطن کو اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ لاتعداد افغان اس جنگ میں معذور ہو گئے۔ لاکھوں کی تعداد میں افغان خاندانوں نے پناہ کی تلاش میں پاکستان کا رخ کیا۔
اس موقع پر پاکستان نے انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور ان لٹے پٹے مہاجرین کے لیے اپنی سرحدیں کھول دیں۔ پاکستان میں جگہ جگہ افغان پناہ گزینوں کے کیمپ قائم ہو گئے۔
ان پانچ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ میرے بابا، دو چچا اور ان کے چار بیٹے اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔
میری ایک ہی بہن تھی شاہ بانو۔ بابا نے اپنی زندگی ہی میں اس کی شادی قبیلے کے ایک نوجوان سے کر دی تھی۔ وہ نوجوان بھی میرے ساتھ شانہ بشانہ اس جنگ میں شریک تھا۔
ایک موقع پر روسیوں نے ہمارے ٹھکانے پر شدید حملہ کیا۔ وہ اب بمباری کے لیے جیٹ فائٹر اور ہیلی کاپٹر بھی استعمال کر رہے تھے۔ میرا بہنوئی منور خان اس حملے میں شدید زخمی ہو گیا اور اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اپنی بیوی اور بچوں کی حفاظت کے لیے تم پاکستان ہجرت کر جاؤ۔
وہ میری تجویز ماننے پر تیار نہیں تھا لیکن میرے مجبور کرنے پر وہ شاہ بانو اور اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گیا۔

میرے قبیلے کے بھی بہت سے نوجوان شہید ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ہم میں جوش و خروش کم نہیں ہوا تھا۔
میرے قبیلے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ہم نے صرف پانچ سو گوریلا جنگ کے ماہر نوجوانوں کے ذریعے روس کے تین بریگیڈ کا صفایا کر دیا تھا۔ اس حملے میں ان کے دو بریگیڈیئر اور لاتعداد فوجی افسر مارے گئے تھے۔
میں ایک دن اپنے مخصوص ٹھکانے پر بیٹھا نوجوانوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ قبیلے کے ایک نوجوان نے آکر اطلاع دی۔ ’’چھوٹے خان! ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔‘‘
’’اس آدمی کا کوئی نام بھی ہوگا؟‘‘ میں نے جھنجلا کر کہا۔
’’وہ اپنا نام انجینئر عاقل خان بتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک گورا بھی ہے۔‘‘
’’عاقل خان!‘‘ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا پھر اچانک مجھے یاد آگیا کہ عاقل خان تو میرے ساتھ ماسکو میں تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ وہ گورا کیوں تھا؟ کیا عاقل خان اسے میرا ٹھکانا دکھانے لایا تھا؟
’’اگر ایسا ہوا تو میں ان دونوں کو یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔‘‘ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور اطلاع لانے والے سے کہا۔ ’’مہمان کو میرے کمرے میں لے آؤ۔ صرف عاقل خان کو... اس گورے کو نہیں۔‘‘
وہ نوجوان سر جھکا کر چلا گیا۔
میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔
وہ کمرا کیا، اس وسیع و عریض غار کا ایک حصہ تھا جسے قبیلے کے نوجوانوں نے لکڑی اور پتھروں کی دیواریں بنا کر کمرا بنا دیا تھا۔ اس کمرے میں انتہائی دبیز قالین بچھا تھا۔ وہاں مہمانوں کے آرام کے لیے کشن اور گاؤ تکیے بھی تھے۔
تھوڑی دیر بعد عاقل خان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا جسم پہلے کی نسبت کچھ فربہ ہو گیا تھا لیکن وہ پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش اور ہنسنے ہنسانے والا عاقل خان لگ رہا تھا۔ وہ انتہائی والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔
’’کیسا ہے دلاور؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’جیسا بھی ہوں، تیرے سامنے ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’تو سنا، تیرے علاقے کا کیا حال ہے؟‘‘ اس کا تعلق قندھار سے تھا۔
’’ہم ہر ہر قدم پر ان کی مزاحمت کر رہے ہیں اور اب ان کے قدم اکھڑنے لگے ہیں۔‘‘
میں اسے لے کر بیٹھ گیا اور ایک بڑا تکیہ اسے پیش کر

دیا پھر ایک نوجوان سے کہا۔ ''مہمان کے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔''

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس کے ساتھ کوئی گورا بھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''عاقل خان! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی گورا بھی ہے؟''

''ہاں یار!'' اس نے چونک کر کہا۔ ''باتوں میں مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ وہ بے چارہ بھی کیا سوچ رہا ہوگا۔''

''یہ گورے بے چارے کب سے ہوگئے؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''ابھی تو تو کہہ رہا تھا کہ تیرے علاقے میں ان کافروں کی شدید مزاحمت ہو رہی ہے اور ایک گورے کو تو ساتھ لے کر گھوم رہا ہے؟''

میرے لہجے کی تلخی کو اس نے بھی محسوس کیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ''جناب انجینئر صاحب! ہر گورا آدمی روسی نہیں ہوتا اور یہ حرام زادے روسی گورے کب ہوتے ہیں، یہ تو چقندر کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ جو گورا ہے، وہ امریکی وزارتِ خارجہ کا ایک اعلیٰ عہدے دار ہے۔ تیرے قبیلے کے کارنامے امریکا تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ امریکن اسی لیے تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ تو یہ بھی جانتا ہے کہ امریکیوں اور روسیوں میں کئی عشروں سے سرد جنگ جاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتے ہیں۔ اسی لیے تو امریکا ہمیں دل کھول کر امداد دے رہا ہے، ہتھیار دے رہا ہے اور سیاسی طور پر ہمارے حق میں بیانات دے رہا ہے۔''

''تو پھر اسے بھی یہیں بلالے۔'' میں نے کہا پھر ایک نوجوان سے کہا کہ دوسرے مہمان کو بھی یہاں لے آؤ۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں دراز قد اور کسرتی جسم کا ایک آدمی افغانی حلیے میں داخل ہوا۔ اس کی داڑھی براؤن تھی اور سر کے بال پگڑی میں چھپے ہوئے تھے۔ اس نے بوسکی کے سوٹ پر بہت قیمتی گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔

اسے دیکھ کر عاقل خان کھڑا ہوا تو مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ''دلاور خان! یہ ہمارے دوست مسٹر الفرڈ کیمبل ہیں۔'' پھر وہ اس سے بولا۔ ''مسٹر الفرڈ! یہ میرا دوست ہے دلاور خان۔ گزشتہ پانچ برس سے اس نے روسیوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور صرف پانچ سو جوانوں کے ساتھ اس نے روسیوں کے تین بریگیڈ ختم کردیے۔''

میں نے مصافحہ کرنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ گیا۔

عاقل خان نے بتایا کہ مسٹر الفرڈ نے یہ حلیہ روسی فوجیوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا ہے۔ ان کی گھیردار شلوار موٹے تلے کے چپل، افغانوں کی مخصوص جیکٹ اور خوب صورت داڑھی سے ہر آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرے آدمی نے تو انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔''

''جی نہیں، اسے میں نے ہی بتایا تھا۔''

''مسٹر دلاور!'' الفرڈ نے کہا۔ ''کیا آپ لوگ انگریزی میں بات چیت نہیں کر سکتے؟ میری سمجھ میں تو آپ کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں آرہا ہے۔''

''ہم لوگوں کو انگلش بہت کم آتی ہے لیکن ہم سیکھ جائیں گے۔ خاص طور پر یہ دلاور تو دوسری زبانیں بہت جلدی سیکھ لیتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی کھانا لگا دیا گیا۔

پُرتکلف کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ میں نے الفرڈ کے لیے خاص طور پر کافی بنوائی تھی۔ وہ کافی پیتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر دلاور! ہماری حکومت آپ کے ملک اور اس کے جنگجو نوجوانوں سے بہت خوش ہے۔ خاص طور پر آپ تو وہاں ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔''

''اور روسی حکومت اس کی اتنی ہی دشمن ہے۔'' عاقل خان نے کہا۔

''اسے تو ہونا بھی چاہیے۔'' الفرڈ مسکرا کر بولا۔ ''سوویت یونین تو برسوں سے ہمارا بھی دشمن ہے لیکن وہ کھل کر ہم سے اپنی دشمنی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے۔ امریکی حکومت آپ کے ملک کو اور بالخصوص آپ کو اپنا بہترین دوست سمجھتی ہے۔ اسی دوستی کے ناتے میں آپ کے لیے امریکی حکومت کی طرف سے ایک تحفہ لے کر آیا ہوں۔ اسے قبول کرنے سے انکار مت کیجیے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔'' اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے مسٹر الفرڈ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے لفافہ کھولا تو اس میں امریکا کا ایک ریٹرن ٹکٹ تھا۔ امریکی محکمہ خارجہ کی طرف سے ایک تعریفی سند تھی جس میں میری اور میرے قبیلے کی خدمات کو سراہا گیا تھا اور ایک کراس چیک تھا جس پر دو لاکھ ڈالرز کی رقم درج تھی۔

''مسٹر الفرڈ! یہ میں...''

''دیکھیے مسٹر دلاور! پلیز انکار مت کیجیے گا۔ میں اپنی

حکومت کے حکم پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر محض آپ سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ مسٹر عاقل میرے دوست ہیں۔ یہ گزشتہ سال امریکا کا چکر لگا چکے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ایک اور اہم چیز تو میں آپ کو دینا ہی بھول گیا۔'' اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور لفافہ نکالا لیکن وہ امریکی حکومت کے استعمال کا مخصوص لفافہ تھا۔ اس پر امریکی وزارتِ خارجہ کا مونوگرام بھی تھا۔ لفافے میں ایک خط تھا جس میں امریکا کے سیکریٹری خارجہ اور وزیر خارجہ کی طرف سے مجھے امریکا آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

''آپ کا ٹکٹ اوپن ہے مسٹر دلاور! آپ کا پاسپورٹ تو موجود ہی ہے۔ اس پر ویزا آپ کو میں لگوا دوں گا اور آپ ہی کا کوئی آدمی وہ پاسپورٹ آپ تک پہنچا دے گا۔''

پھر عاقل خان کے اصرار پر میں نے اسے اپنا پاسپورٹ دے دیا۔ الفرڈ دوسرے دن رخصت ہوگیا۔ میرے قبیلے کے چار نوجوان اسے محفوظ علاقے تک چھوڑ آئے۔ عاقل خان بھی اسی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

عاقل خان وہ چیک بھی لے گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد عاقل خان کا ایک آدمی میرا پاسپورٹ اور چیک بک لے کر آگیا۔ وہ رقم میرے نام سے ایک سوئس بینک میں جمع ہوچکی تھی۔

مجھے الفرڈ کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا لیکن اس نے کچھ اس انداز سے بات کی تھی کہ میں انکار نہیں کرسکا پھر عاقل خان بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس رقم سے اپنے لوگوں کے لیے دوائیں، کمبل، خیمے اور استعمال کی دوسری چیزیں خریدوں گا۔

میں نے الفرڈ سے وعدہ کرلیا تھا اس لیے اپنی ہزار مصروفیات کے باوجود مجھے امریکا جانا پڑا۔ میں واشنگٹن ڈی سی میں امریکی حکومت کا خاص مہمان تھا۔ وہاں میری بہت پذیرائی ہوئی۔ سیکریٹری خارجہ اور کئی سینیٹرز نے میرے اعزاز میں ڈنر دیے۔ مجھے اور میرے ملک کی خدمات کو سراہا گیا۔ امریکی صدر کے پرسنل سیکریٹری نے مجھے ایک ٹائپ شدہ خط بھی دیا جس میں تحریر تھا کہ میں اور میری فیملی جب چاہے امریکا کی شہریت اختیار کرسکتی ہے۔

اپنے ملک کی اس پذیرائی پر میرا سر فخر سے بلند ہوگیا اور مجھے لگا کہ امریکا میں ابھی انسانیت باقی ہے ورنہ اس مادّی دور میں کون کسی کی اتنی مدد کرتا ہے۔

امریکا سے واپسی پر میں تحفوں سے لدا پھندا پشاور پہنچا کیونکہ اس وقت افغانستان براہِ راست پہنچنے کے راستے روسیوں کے قبضے میں تھے۔

امریکی تحفوں میں زیادہ تر الیکٹرانک اشیا تھیں۔ ان میں ایئر کنڈیشنر، روم ہیٹرز، گھریلو استعمال کی اشیا وغیرہ شامل تھیں۔

میں فوری طور پر یہ اشیا افغانستان نہیں لے جاسکتا تھا اس لیے میں نے پشاور کے ایک پوش علاقے میں ایک بنگلا خرید کر تمام سامان اس میں رکھا اور اپنی بہن شاہ بانو اور منور کو وہاں منتقل کردیا۔

پاکستان آنے کے بعد منور نے ایک ٹرک خرید لیا تھا۔ وہی اس کی روزی کا ذریعہ تھا۔ ٹرک ڈرائیور بھی ہمارے ہی قبیلے کا ایک آدمی تھا۔

میں نے شاہ بانو کو مزید رقم دی اور کہا۔ ''یہ منور خان کو دے دینا۔ وہ خوددار شخص مجھ سے تو یہ پیسے لے گا نہیں۔ اس سے کہنا کہ اس رقم سے وہ مزید ٹرک اور بسیں خرید لے۔''

منور اس پر بہت جزبز ہوا لیکن میں نے کہا کہ یہ قرضِ حسنہ ہے۔ تم ایک ہی سال میں اتنا کمالو گے کہ میرا تمام قرض لوٹانے کے قابل ہوجاؤ گے۔

میں اکثر پناہ گزیں کیمپوں میں بھی چلا جاتا تھا۔ وہاں لوگوں کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ روس نے اپنے جنگی جنون میں بے شمار ماؤں سے ان کے لختِ جگر چھین لیے تھے، لاتعداد بچوں کو یتیم اور لڑکیوں کو بیوہ کردیا تھا۔

انہی کیمپوں کے دوروں کے موقع پر میں ایک کیمپ میں پہنچا۔ وہاں کا بھی عالم دوسرے پناہ گزین کیمپوں سے مختلف نہیں تھا۔

اچانک میری نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ سب سے الگ تھلگ گم صم سی ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی صعوبتیں برداشت کرنے اور سختیاں جھیلنے کے بعد اس کیمپ تک پہنچی ہوگی لیکن اس کے حسن میں اب بھی ایک انوکھا نکھار تھا۔ رنگت اب بھی تروتازہ سیب کی طرح تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے سبزی مائل بھورے بال گو کہ کیمپ کی سخت اور تکلیف دہ زندگی میں اپنی چمک کسی حد تک کھو چکے تھے لیکن ان میں اب بھی ایک خوب صورتی تھی۔ اس کا سانچے میں ڈھلا جسم موسم کی شدت اور حالات کا جبر سہنے کے باوجود اب بھی قیامت خیز تھا۔

وہ لڑکی پہلی ہی نظر میں میرے دل میں اتر گئی۔ وہ نہ جانے کون تھی اور افغانستان کے کس شہر سے اس کا تعلق تھا۔ اس پر نہ جانے کیا بیتی تھی جو وہ یوں گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے کیمپ کے ایک والنٹیئر سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے اور یوں الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہے؟“

”خان صاحب! یہ افغانستان کے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ جنگ میں اس کے باپ کے علاوہ چھ بھائی، ماں اور دو بہنیں بھی شہید ہو گئی ہیں۔ یہ جب سے یہاں آئی ہے، یونہی خاموش اور گم صم رہتی ہے۔ کوئی کچھ کھانے کو دیتا ہے تو کھا لیتی ہے ورنہ بھوکی ہی پڑی رہتی ہے۔“

میں اس افغان دوشیزہ کی طرف بڑھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرائیں پھر وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ ”آگ لگی ہوئی ہے... بچو... ہر طرف آگ، دھواں اور بارود کی بُو ہے... بھاگو ورنہ تم بھی ان شعلوں میں بھسم ہو جاؤ گے۔“

”ہم نے وہ آگ بجھا دی ہے اور روسی سپاہیوں کو چن چن کر جہنم رسید کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“ اس نے غیر یقینی سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس جنگ نے مجھے بھی یتیم کر دیا ہے۔ مجھ سے میرے اپنے چھین لیے ہیں لیکن میں نے بھی ان کا انتقام لے لیا ہے۔“

اب اس لڑکی کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا بلکہ وہ پُرستائش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”میرا نام... میرا نام گل زرین ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں نے سنا ہے کہ تم کسی قبیلے کے سردار کی بیٹی ہو؟“

”اب کہاں قبیلہ اور کون سردار؟“ وہ آب دیدہ ہو گئی۔ ”جب یہ حرام زادے واپس جائیں گے تو میں ایک دفعہ پھر اپنے ملک جاؤں گی۔“

”ہاں، زرین! صرف تم ہی نہیں، ہم سب اپنے ملک واپس جائیں گے اور اسے نئے سرے سے سجائیں گے، سنواریں گے، آباد کریں گے۔“

میری بات سے اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ روشن ہو گئے۔ ”مجھے لگتا ہے، آپ بھی اپنے قبیلے کے سردار ہیں؟“ وہ اب خاصی نارمل ہو گئی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”زرین! اپنے بابا کے بعد میں ہی اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور دشمنوں کو جہنم واصل کرنے میں معروف ہوں۔ میرے قبیلے نے سب سے زیادہ روسی کتوں کو ہلاک کیا ہے۔“

”آ... آپ... دلاور خان ہیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، میں ہی دلاور خان ہوں۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کیا میری بدنامی کی داستان آپ کے قبیلے تک بھی پہنچ گئی ہے؟“

”بدنامی؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”آپ اسے بدنامی کہہ رہے ہیں۔ آپ پر تو ہر افغان ماں، بہن اور بیٹی کو فخر ہے۔ آپ نے دشمن کے دانت کھٹے نہیں کیے ہیں بلکہ توڑ دیے ہیں۔“

”زرین! اس جنگ میں صرف میری ایک بہن شاہ بانو بچی ہے۔ اس کا شوہر جنگ میں معذور ہو گیا ہے۔ میں نے زبردستی اسے یہاں بھیج دیا تھا۔ کل وہ تم سے ملنے آئے گی۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا لیکن میں اس کی بات سنے بغیر کیمپ سے باہر آ گیا۔

کھانے کی میز پر میں شاہ بانو سے زرین کے بارے میں بات کرنے ہی والا تھا کہ اس نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔

”لالہ! ایک بات کہوں، مانو گے؟“ اس نے کہا۔

”اب ایک تُو ہی تو میرے خاندان کی واحد نشانی ہے بانو!“ میں نے کہا۔ ”تیری بات ٹالنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ میری جان مانگ کر دیکھ لے، انکار نہیں کروں گا۔“ شدتِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آپ کہاں اس پاگل کی باتوں کو اتنا سیریس لے رہے ہیں۔“ میرے بہنوئی منور خان نے کہا۔ ”یہ تو کچھ بھی کہتی رہتی ہے۔“

”نہیں منور! یہ بات نہیں ہے۔ مجھے بانو کے اس انداز پر بابا یاد آ گئے۔ وہ بھی اس کی باتیں سن کر یہی کہا کرتے تھے کہ دلاور نے اسے بگاڑ دیا ہے۔“

شاہ بانو بھی رونے لگی اور بولی۔ ”لالہ! آپ بھی بات کہاں سے کہاں لے گئے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ اب میں اس گھر میں ایک چاند سی بھابی لانا چاہتی ہوں۔“

”جنگ ابھی جاری ہے بانو!“ منور نے کہا۔ ”لالہ بھائی کے پاس ابھی اتنا وقت کہاں ہے؟“

”اس میں بھلا کون سا وقت لگے گا؟“ بانو نے مسکرا کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تُو نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ابھی پسند تو نہیں کی۔“ بانو نے کہا۔ ”لیکن آپ اگر راضی ہوں تو لڑکیاں تو میری نظر میں کئی ہیں۔“

”مثلاً؟“ منور خان نے پوچھا۔

”مثلاً ہمارے پڑوس میں جو آغا صاحب رہتے ہیں، ان کی دو لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ خوب صورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ!“

”دیکھو بانو! اگر تجھے بھابی لانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی پناہ گزین کیمپ سے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ لے۔ میں تو اکثر کیمپوں میں جاتا رہتا ہوں۔ وہاں بہت سی بے یارومددگار لڑکیاں ہیں۔“

”لالہ بھائی!“ بانو نے مسکرا کر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے وہاں کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟“ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”یہی بات ہے؟“

”ہاں بانو!“ میں نے کہا۔ ”میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ جنگ میں اس کا پورا خاندان وطن پر قربان ہو گیا ہے۔“

”تو یوں کہیں کہ آپ مجھ سے بھی پہلے لڑکی پسند کر چکے ہیں؟“ بانو کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں نے ایک عرصے بعد اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

”کس کیمپ میں ہے وہ؟“ بانو نے پوچھا۔ ”آپ مجھے کل وہاں لے چلیں۔“

دوسرے دن بانو کے اصرار پر میں اسے کیمپ لے گیا۔ زرین آج بھی سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھی تھی لیکن آج اس کی آنکھوں میں وہ ویرانی نہیں تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا۔ میں نے بانو اور زرین کا تعارف کرایا اور خود کیمپ کے دوسرے حصے کی طرف نکل گیا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ان لوگوں کے پاس پہنچا تو وہ یوں گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتی ہوں۔

مجھے دیکھ کر زرین کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا اور وہ

سمت کر رہ گئی۔

''بانو! اگر تمہاری باتیں ختم ہو گئی ہوں تو اب ہم چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں لالہ! واقعی بہت دیر ہو گئی ہے۔ بچے اسکول سے آنے والے ہوں گے۔'' پھر وہ زرین سے بولی۔ ''انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہو گی۔''

ہم وہاں سے واپس آئے تو شاہ بانو نے کہا۔ ''لالہ! آپ کی پسند تو لاجواب ہے۔ میں نے زرین بھابی کو بھی بتا دیا ہے کہ آپ ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''پھر... زرین نے کیا کہا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''انہوں نے کہا کہ وہ آپ جیسے بہادر، غیور اور... خوبرو شخص سے شادی کر کے خود کو خوش قسمت سمجھیں گی۔''

☆☆☆

پھر ایک ہفتے کے اندر اندر زرین دلہن بن کر میرے گھر آ گئی۔

مجھے اپنے قبیلے کی بھی فکر تھی اور جنگ کی بھی۔ میں شادی کے تیسرے ہی روز افغانستان واپس چلا گیا۔

یہ وہ دور تھا جب سوویت یونین کو ہر محاذ پر شکست ہو رہی تھی اور یہ خبریں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ سوویت یونین ہمارے ملک سے اپنا بوریا بستر گول کرنے والا ہے۔ ان کے لاتعداد فوجی اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ انہیں گزشتہ برسوں میں بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ ان کی معیشت ڈانواں ڈول ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک دن ہمیں یہ خوش خبری سننے کو ملی کہ سفید ریچھ، سوویت یونین نے افغانستان سے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

پھر وہ روزِ سعید بھی آ پہنچا جب ان ملعونوں کی واپسی شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں ہم نے بھی بہت کچھ کھویا تھا لیکن اپنی قومی حمیت برقرار رکھی تھی۔ ہمارے قبضے میں سوویت یونین کے فوجیوں سے چھینا ہوا اسلحہ ڈھیروں کے حساب سے موجود تھا۔ اس میں رائفل اور پستول سے لے کر راکٹ لانچرز اور ٹینک شکن میزائل بھی تھے۔

☆☆☆

روسی افواج کے رخصت ہونے کے بعد ہم اپنے علاقوں میں لوٹ گئے۔ زرین گل، شاہ بانو اور اس کے خاندان کے علاوہ میرے قبیلے کے بے شمار جنگجو نوجوان بھی میرے ساتھ تھے۔

میں اس دوران میں دو بچوں بابر خان اور مہوش کا باپ بن چکا تھا۔

ہم سب کئی روز تک اپنی فتح کا جشن مناتے رہے لیکن یہ جشن عارضی ثابت ہوا۔ سوویت یونین کے رخصت ہوتے ہی مقامی جنگجو سرداروں میں اقتدار کے لیے رسّاکشی شروع ہو گئی۔

ہم نے غیر ملکی دشمن کو تو مار بھگایا تھا لیکن اب اس نئی صورتِ حال نے مجھے واقعی پریشان کر دیا۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ دوست کون ہے اور دشمن کون؟

ایسے میں گل زرین نے مشورہ دیا کہ ہم پاکستان لوٹ چلتے ہیں۔ جب یہاں کے حالات سازگار ہوں گے تو ہم بھی اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ میرے بہنوئی منور خان کا مشورہ بھی یہی تھا۔

میں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر اپنا وطن عارضی طور پر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا اور ہم دوبارہ پشاور لوٹ آئے۔

میں نے منور خان کے ساتھ مل کر کاروبار کو وسعت دی اور ہمارا کاروبار تیزی سے پھیلنے لگا۔

میں بنیادی طور پر مکینیکل انجینئر تھا اس لیے میں نے گجرات میں الیکٹرانک کے آلات بنانے کی ایک فیکٹری قائم کر لی۔ ابتدا میں میری فیکٹری میں واشنگ مشین اور پنکھے بنتے تھے، پھر رفتہ رفتہ میں نے ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر اور جوسر بلینڈر بھی تیار کرنا شروع کر دیے۔

بابر خان اس وقت چار سال کا تھا اور مہوش دو سال کی۔ مجھے ان کی تعلیم کی بھی فکر تھی۔

میں نے بابر خان کو پشاور کے بہترین کانوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں تو اسے پہلے قرآن پاک حفظ کرانا چاہتا تھا لیکن زرین کی ضد پر میں نے اسے کانوینٹ میں داخل کرایا۔

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کاروبار میں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔

اب میرا شمار پشاور کے معززین میں ہوتا تھا۔

بابر خان اب ماشاء اللہ پرائمری پاس کر چکا تھا اور میں نے اسے لارنس کالج گھوڑا گلی بھیج دیا تھا۔ مہوش البتہ پشاور ہی کے ایک اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔

افغانستان کا حال اب بھی وہی تھا، وہاں اقتدار کے لیے اب بھی رسّاکشی جاری تھی اور افغان آپس ہی میں ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔

میں نے افغانستان واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وقت مزید گزرا تو میرے بالوں میں چاندی اتر آئی۔ البتہ زرین اب تک اسی طرح تروتازہ تھی جیسے کل ہی اس کی شادی ہوئی ہو۔

مہوش بھی اب کالج میں پڑھ رہی تھی اور وہ ہو بہو اپنی ماں کا عکس تھی۔ اسی کی طرح نازک اندام اور خوب صورت۔ شاہ بانو کے بالوں میں بھی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ میرا بھانجا یاور خان اور بختاور خان دونوں اپنے باپ کے ساتھ ٹرانسپورٹ کے بزنس میں تھے۔

میں نے بابر خان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا کی ایک ریاست ٹیکساس بھیج دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹیکساس میں عاقل خان مستقل طور پر مقیم تھا۔ بابر خان ایم بی اے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ بھی ماشاء اللہ اب بھرپور نوجوان تھا اور بقول زرین گل اور شاہ بانو، بابر خان میری جوانی کی تصویر تھا۔

☆☆☆

میں نے بچپن سے لے کر اپنے بابا دلاور خان سے یہ واقعات اتنی مرتبہ سنے تھے کہ مجھے حفظ ہو گئے تھے۔ مجھے صرف اس بات پر فخر تھا کہ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے اور میں ایک کروڑپتی صنعت کار کا اکلوتا بیٹا ہوں۔

اماں اور بابا کی نسبت مجھے نماز، روزے وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بابا اکثر مجھے نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کی بات پر کان نہیں دھرا۔ میری تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس میں نماز اور روزے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ میں دوسرے دولت مند گھرانوں کے نوجوانوں کی طرح ہلے گلے کا شوقین تھا اور مخلوط پارٹیوں میں شرکت کر کے خوش ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ بابا نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھجوا دیا تھا۔

میں ابتدائی چند ماہ ٹیکساس میں رہا لیکن وہاں چاچا عاقل خان نے قدم قدم پر مجھ پر اتنی بندشیں لگائیں کہ میں چند ماہ بعد ہی وہاں سے کیلی فورنیا شفٹ ہو گیا۔

بابا جان نے ٹیلی فون پر مجھ سے اس کا سبب پوچھا تو میں نے یہ بہانہ بنا دیا کہ ڈلاس (ٹیکساس) کی اس یونیورسٹی کی وہ ویلیو نہیں ہے جو کیلی فورنیا یونیورسٹی کی ہے۔

میں وہاں محض تفریح ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ واقعی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ ہاں، فوری طور پر پاکستان واپسی کا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ ایم بی اے کرنے کے بعد میں وہاں کسی دوسرے مضمون کی تعلیم حاصل کروں گا بلکہ سچ پوچھیے تو میں پاکستان جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

بس مجھے ایک فکر تھی کہ اگر میں پاکستان واپس نہ گیا تو میرے باپ کی تینوں فیکٹریاں جن کی مالیت اب کروڑوں میں تھی، ان پر میرے پھوپی زاد قبضہ کر لیں گے۔

میں سال میں ایک دو دفعہ پاکستان ضرور جاتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس مادر پدر آزاد امریکن معاشرے میں رہنے کے باوجود مجھے اپنے بابا اور اماں سے بہت محبت تھی اور مہوش تو میری جان تھی۔ وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔

میں جب بھی آتا تھا اس کے لیے ڈھیروں شاپنگ کرتا تھا۔ اعلیٰ ترین پرفیومز، جیولری، ہینڈ بیگس اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے اس کی الماریاں بھر گئی تھیں۔

مجھے اس سے صرف ایک ہی شکایت تھی کہ وہ میرے لائے ہوئے جدید فیشن کے انتہائی قیمتی کپڑے استعمال نہیں کرتی تھی۔ اسے کانوینٹ میں تعلیم دلانے کے باوجود اماں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے شلوار قمیص ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ جب نماز پڑھ کے فارغ ہوتی تھی تو اس کے سر اور چہرے کے گرد لپٹا ہوا دوپٹا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک مرتبہ میں پاکستان آیا تو رمضان شریف کا مہینا تھا۔

رات کے کسی پہر مہوش نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تو میں بُری طرح جھنجلا گیا۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''سحری میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ بابا جان اور اماں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' مہوش نے کہا۔

میں اس وقت اتنی میٹھی نیند میں تھا کہ اگر مہوش کی جگہ کوئی ملازم ہوتا تو شاید میں اسے تھپڑ مار دیتا۔

''جلدی اٹھیں لالہ! دیر ہو رہی ہے۔'' مہوش نے کہا۔

''اچھا تو چل، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے دل پر جبر کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

اللہ مجھے معاف کرے، میں رمضان شریف میں پاکستان آ کر پچھتا رہا تھا۔ روزہ تو خیر میں کیا رکھتا لیکن دن بھر ...کھانے پینے کی پابندی میری برداشت سے باہر تھی۔ پشاور میں یوں بھی دوسرے شہروں کے مقابلے میں بہت سختی ہے۔ وہاں رمضان کے دنوں میں اگر کوئی کھاتے پیتے دیکھ لے تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اس روز بابا جان کے ساتھ سحری ضرور کی لیکن روزہ نہیں رکھا۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ مجھے وہاں صرف دس روزے گزارنا پڑے۔

بابا جان اور اماں بے چاری تو یہی سمجھتی تھیں کہ ان کا بیٹا روزہ رکھتا ہے۔ اس راز سے تو صرف مہوش واقف تھی کہ میں دوپہر کو بھی پابندی سے لنچ کرتا ہوں اور دن بھر چائے، کافی اور سگریٹ بھی پیتا رہتا ہوں۔ سگریٹ اور سگار کی لت مجھے امریکا میں پڑی تھی۔

عید کے بعد میں ایک مرتبہ پھر امریکا لوٹ گیا۔

وہاں ایک پارٹی میں میری ملاقات کلارا سے ہوئی۔ وہ دراز قد، متناسب جسم والی پُرکشش حسینہ پہلی ہی ملاقات میں میرے دل میں گھر کر گئی۔

میں اپنی سرخ و سفید رنگت، براؤن آنکھوں اور گولڈن بالوں کی وجہ سے امریکن ہی لگتا تھا۔ میں امریکنوں ہی کی طرح کپڑے پہنتا تھا اور انہی کی طرح روانی سے انگلش بولتا تھا۔

جب کلارا سے میرا تعارف ہوا تو وہ میرا نام سن کر چونکی اور بولی۔ ''تم... مسلمان ہو؟''

''ہاں، اتفاق سے میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہو گیا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

کلارا نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں یہودی اور باپ کرسچین ہے۔

''اور تم خود کیا ہو؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''میں... میں کلارا اسٹیفرڈ ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے ماں یا باپ کے مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہی حال میرا بھی ہے۔ میرا بھی صرف نام بابر خان ہے اور بس!''

اسی وقت ایک ویٹر مشروبات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا وہاں سے گزرا۔

کلارا نے اسے روک لیا اور اپنے لیے شیری بنانے کو کہا، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''ایک پیک شیمپئن کا بھی بنا دینا۔''

اس نے خود شیری کا جام سنبھالا اور میری طرف شیمپئن کا گلاس بڑھا دیا۔

وہاں کئی برس گزارنے کے بعد بھی میں اس لعنت سے بچا ہوا تھا لیکن کلارا جیسی خوب صورت، ماڈرن، دولت مند اور قاتل ادا حسینہ جب اپنے خوب صورت ہاتھوں سے جام پیش کرے تو مجھ جیسا آدمی تو ہرگز انکار نہیں کر سکتا۔

میں ایک لمحے کو ہچکچایا پھر گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں نے پہلی دفعہ شراب کا ذائقہ چکھا تو مجھے تلخی تو محسوس ہوئی، پھر کچھ ہی دیر بعد ایک انوکھے سرور نے گھیر لیا۔ میرے چاروں طرف تو رنگ اور روشنیاں تھیں ہی، مجھے اپنے اندر سے بھی روشنیاں اور رنگ بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

اس کے بعد کلارا سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ملاقات میں وہ مجھے پہلے سے حسین اور پُرکشش محسوس ہوئی۔ ہر ملاقات میں شراب نوشی بھی ضروری تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اب باقاعدہ پینے لگا۔

شراب پیتے ہوئے کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا کہ حاجی اسفند خان کا پوتا، سردار دلاور خان کا بیٹا شراب جیسی حرام چیز سے شوق فرما رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے کلارا کی سحر انگیز اور پُرکشش شخصیت مجھے سب کچھ بھول جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

کلارا ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ میں بھی کوئی کنگال نہیں تھا۔ میرا باپ بھی پاکستان کا کروڑ پتی صنعت کار تھا اس لیے ہم آزادی سے ملتے رہے۔

میں نے کیلی فورنیا کے پوش علاقے میں خوب صورت سا ایک اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔

وہاں اکثر میرے دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا لیکن جب سے کلارا میری زندگی میں آئی تھی، دوستوں کی آمد و رفت برائے نام رہ گئی تھی۔

پھر وہ اکثر راتیں بھی میرے ساتھ گزارنے لگی۔

وہاں کے معاشرے میں والدین کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ ان کے بچے کہاں اور کس حال میں ہیں۔

ایک دن شراب کی ترنگ میں کلارا سے میں نے کہا۔ ''کلارا! مجھ سے شادی کرو گی؟''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولی۔ ''ہمیں بھلا شادی کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میرے علاوہ تمہارا کوئی اور بوائے فرینڈ بھی ہو۔''

''آخر تم ہو تو ایشیائی۔!'' کلارا نے ہنس کر کہا۔ ''عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہو۔''

''ملکیت نہیں، عورت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں ہم لوگ! ہم ایشیائی جس سے محبت کرتے ہیں، اس سے دل کی تمام تر گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں اور اس محبت کو کسی کے بھی

ساتھ بانٹ نہیں سکتے۔''

میری بات پر کلارا مسکرائی اور بولی۔ ''بابر! اگر یہی پابندی میں تم پر بھی لگاؤں کہ شادی کے بعد تم کسی بھی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے تو کیا تم مان لو گے؟''

''آف کورس کلارا!'' میں نے کہا۔ ''ہم ایشیائی ایک دفعہ جسے اپنے دل میں اتار لیں پھر کوئی اور اس کی جگہ نہیں لے سکتا، چاہے وہ حسینۂ عالم ہی کیوں نہ ہو۔''

''اوکے!'' کلارا خلافِ توقع مسکرا کر بولی۔ ''یہی حال میرا بھی ہے ڈارلنگ! میں بھی زندگی بھر صرف اور صرف تمہاری ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ابھی تمہیں چند ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔''

''انتظار کیوں جان؟'' میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ابھی میں اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی۔ سترہ سال، پانچ مہینے کی ہوں۔''

''اوکے جان!'' میں مسکرایا۔ ''میں اس وقت تک انتظار کر لوں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اردگرد کوئی بھی لڑکا نظر آئے۔''

''یہی بات تو میں تم سے کہنے والی تھی۔'' وہ مسکرائی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''بابر! اب تم یہ کہو گے کہ میں مسلمان ہو جاؤں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہنی!'' میں نے کہا۔ ''ابھی تم کون سی مذہبی ہو۔ مسلمان ہونے کے بعد تمہیں صرف اپنا نام ہی تو بدلنا ہوگا۔''

''کیا میرا مسلمان ہونا ضروری ہے؟'' کلارا نے پوچھا۔

''صرف نام کی حد تک جان۔'' میں نے کہا۔ ''میرا باپ تمہیں کلارا کی صورت میں قبول نہیں کرے گا۔''

''تو نہ کرے۔'' کلارا نے کہا۔ ''میرا باپ بھی تو مجھ سے لاتعلق ہو جائے گا۔''

''تم میں اور مجھ میں فرق ہے کلارا ڈارلنگ!'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے ارب پتی باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔'' میں نے اسے متاثر کرنے کو بابا جان کو کروڑ پتی سے ارب پتی بنا دیا۔ ''ان کی ناراضی کی صورت میں ان سے مجھے ایک پینی بھی نہیں ملے گی۔ پھر یہ عیاشیاں اور شاہ خرچیاں کہاں سے پوری ہوں گی؟ کیا ہم دونوں معمولی جاب کر کے اپنی زندگیاں گزاریں گے؟ تمہارے والدین تو ممکن ہے بعد میں راضی ہو جائیں لیکن میرے والدین کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔ وہ کسی بھی صورت میں قبول نہیں کریں گے کہ ان کی بہو کرسچین یا یہودی ہو؟''

''اوکے ڈارلنگ! میں اس پر غور کروں گی۔'' کلارا نے کہا اور اٹھ کے باتھ روم میں چلی گئی۔

میں سوچتا رہ گیا کہ اس میں بھلا غور کرنے کی کیا بات ہے؟ پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ بابر خان! کیا تم بغیر سوچے سمجھے اپنا مذہب چھوڑ سکتے ہو؟ تم نام ہی کے مسلمان سہی لیکن کیا تم اپنا نام ڈیوڈ یا ہنری رکھ سکتے ہو؟

☆☆☆

پھر کئی دن تک کلارا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کا سیل فون بھی بند تھا اور اس کے لینڈ لائن نمبر سے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل رہا تھا۔

میں دو تین مرتبہ اس کے گھر بھی گیا لیکن وہ گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ حیرت تو مجھے یہ تھی کہ اس کے والدین کو بیٹی کے غائب ہونے کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔

پانچ دن تک میں اس کے لیے پاگلوں کی طرح گلیوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس دوران میں نہ مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا، نہ لباس کی پروا تھی۔ میں جو اپنے لباس پر ہلکی سی ایک شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا گزشتہ پانچ دن سے انہی کپڑوں میں ملبوس تھا جن میں کلارا مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔

میں نے ضرورت سے زیادہ شراب نوشی شروع کر دی اور پانچواں دن تو میں نے گویا عالمِ بے ہوشی میں گزارا۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کلارا اگر مجھے نہیں ملی تو شاید میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

کلارا میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی بہت سی خوب صورت اور پُرکشش لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں لیکن کلارا میں کوئی ایسی خاص بات تھی کہ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی محال لگ رہی تھی۔

چھٹے دن میری یہ حالت تھی کہ میں بیڈ سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی ہو۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔

لیکن جب گھنٹی تواتر سے کئی مرتبہ بجی تو میں اپنے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھا اور کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اپنے بیڈ روم سے دروازے تک کا مختصر فاصلہ طے کرنے ہی میں میرا سانس بُری طرح پھول گیا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔

میں نے بہ مشکل ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لاک کھول دیا اور دیوار کے سہارے ٹک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میری ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گزشتہ چار دن سے میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا، صرف اپنے معدے میں شراب انڈیلتا رہا تھا۔ اب تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں شاید مر رہا ہوں۔

اچانک دروازہ کھلا اور کلارا اندر آگئی۔ میں اسے بھی اپنا وہم سمجھا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ میرے خیالوں میں آچکی تھی۔ مجھ سے باتیں کر چکی تھی۔

''بابر!'' کلارا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''مجھے مزید دھوکا مت دو کلارا!'' میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے بھی تم کئی مرتبہ آچکی ہو۔ مجھے مزید پریشان مت کرو اور سکون سے مرجانے دو۔''

''ہوش میں آؤ بابر!'' کلارا نے کہا۔ ''تمہاری حالت تو واقعی بہت خراب ہے۔ چلو، بیڈ روم میں چلو۔ میں ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرتی ہوں۔''

اس کی باتیں سن کر مجھے یقین آگیا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کلارا حقیقت میں میرے سامنے ہے۔

مجھ سے کھڑا رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں دیوار کے سہارے پھسلتا ہوا فرش پر گر گیا۔

''بابر!'' کلارا نے چیخ کر کہا اور مجھے اٹھانے کی کوشش کی لیکن کلارا جیسی نازک اندام لڑکی مجھ جیسے قدآور نوجوان کو بھلا کیسے اٹھا سکتی تھی۔

میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل گھستا ہوا بیڈ تک پہنچا۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ کلارا نے کسی نہ کسی طرح مجھے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میری آنکھ دوبارہ کھلی تو میں ایک صاف ستھرے کمرے میں تھا۔ میری دائیں جانب کلارا بیٹھی تھی اور بائیں جانب اسٹینڈ پر ایک ڈرپ لٹک رہی تھی جس کا سیال قطرہ قطرہ میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔

میں اس وقت کیلی فورنیا کے ایک اسپتال میں تھا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر کلارا نے میری طرف دیکھا، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بٹن دبا کر نرس کو بلا لیا۔ نرس نے سب سے پہلے میرے خون کا دباؤ چیک کیا، پھر نبض کی رفتار دیکھی اور مسکرا کر بولی۔ ''مس کلارا! مریض اب خطرے سے باہر ہے۔ میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتی ہوں۔''

''تھینک گاڈ!'' کلارا نے کہا۔ ''یہ چوبیس گھنٹے تو مجھ پر چوبیس صدیاں بن کر گزرے ہیں بابر! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں ڈارلنگ! مجھے کیا ہو سکتا ہے؟'' مجھے ایسا لگا جیسے میری آواز کنوئیں سے آرہی ہو۔

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نرس کے بنائے ہوئے چارٹ پر نظر ڈالی پھر مسکرا کر مجھ سے بولا۔ ''آپ بہت خوش قسمت ہیں مسٹر بابر کہ آپ کو بروقت طبی امداد مل گئی۔ اگر مزید آدھے گھنٹے کی دیر ہو جاتی تو...'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر وہ کلارا سے مخاطب ہوا۔ ''میڈم! آپ مریض کو زیادہ بولنے پر مجبور نہ کریں۔'' پھر اس نے ڈرپ میں انجکشن کے ذریعے کوئی دوا ملائی اور مسکرا کر چلا گیا۔

مجھ پر ایک مرتبہ پھر غنودگی طاری ہوئی اور میں گردوپیش سے بے خبر ہو گیا۔

میں دوبارہ ہوش میں آیا تو وہی کمرا تھا لیکن وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ دیوار گیر گھڑی میں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے اس لیے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس وقت دن ہے۔

مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کا جگ اور گلاس مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آسانی سے اٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پانی سے گویا میرے جسم میں ایک نئی توانائی آگئی۔

''لیکن کلارا کہاں گئی؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔ ''کہیں وہ پھر سے تو مجھے چھوڑ کر نہیں چلی گئی؟'' میں نے ہول کر سوچا اور سسٹر کو بلانے کے لیے سرخ بٹن پر انگلی رکھ دی۔

سسٹر تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''مسٹر بابر! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پھر پلیز، اس بٹن سے اپنی انگلی ہٹائیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ نے کچھ ایسے انداز میں بیل بجائی کہ میں گھبرا گئی۔''

''اوہ سوری۔'' میں نے کہا۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں سسٹر!'' میں نے کہا۔ ''ہاں، وہ مس کلارا...''

''وہ ڈاکٹر صاحب سے بات کر رہی ہیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''لیجیے وہ آگئیں۔'' یہ کہہ کر نرس نے ایک مرتبہ پھر میرا بلڈ پریشر چیک کیا، اسٹیتھو اسکوپ سے میرے دل کی دھڑکن سنی اور بولی۔ ''ویری گڈ! اب تو آپ بالکل ٹھیک ہیں۔'' وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں کلارا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ڈاکٹر صاحب کے پاس تھی اور تمہیں ڈسچارج کرنے کے لیے فارم پُر کر رہی تھی۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''لیکن... یہ کیا حرکت تھی... تم نے... بھوک ہڑتال کس سلسلے میں کی تھی؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟'' میں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ میں نے تمہیں ہر اس جگہ تلاش کیا جہاں تمہارے ملنے کا امکان تھا۔ تین دفعہ تمہارے گھر بھی گیا۔ تمہارا سیل فون بھی بند تھا۔ تم آخر تھیں کہاں؟''

''لیکن یہ کیا حرکت تھی بابر! تم نے اپنی جان ہی داؤ پر لگا دی؟ اگر... اگر... تمہیں... کچھ ہو جاتا... تو...'' وہ بُری طرح سسکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ ''تو میں کیا کرتی بابر؟'' وہ اب ہچکیاں لے رہی تھی۔

''کلارا پلیز!'' میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ''تم جانتی ہو، میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔'' میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک ٹشو نکال کر اس کے آنسو خشک کیے لیکن اس کی سسکیاں جاری رہیں۔

''تم آخر غائب کہاں ہو گئی تھیں کلارا؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا تو میں پاگل ہو جاتا یا پھر...''

''سوری بابر!'' کلارا سسکتے ہوئے بولی۔ ''غلطی میری ہی ہے۔ میں خود کو تم سے دور رکھ کر آزمانا چاہتی تھی کہ مجھے واقعی تم سے محبت ہے یا یہ محض وقتی جذبہ ہے اور میں تمہاری مردانہ وجاہت سے متاثر ہوں؟''

''یہ جاننے کے لیے تم غائب ہو گئیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''چلو غائب ہی ہوئی تھیں تو مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ تو رکھ سکتی تھیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میری محبت کا مذاق مت اڑاؤ بابر۔'' کلارا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں ایک ہفتے کے لیے اپنی ایک فرینڈ کے پاس ورجینیا چلی گئی تھی، مما اور پاپا سے صرف میں نے یہ کہا تھا کہ میں کچھ دن کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس جا رہی ہوں۔ وہاں تو دوسرے ہی دن مجھے تمہاری یاد ستانے لگی، تیسرے دن میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ اپنی دوست نینسی کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب تم خود کو آزمانا ہی چاہتی ہو تو ایک ہفتہ پورا کرو۔ میرے ساتھ گھومو پھرو، نائٹ کلبس میں چلو، ہلا گلا کرو۔ اس کے باوجود بھی اگر تمہیں بابر کی کمی محسوس ہو تو میں سمجھوں گی کہ تمہیں واقعی اس سے محبت ہے۔''

''گویا تم ایک ہفتے تک عیش کرتی رہیں اور میں مر مر کے جیتا رہا؟'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''میں عیش کرتی رہی؟'' کلارا نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''نینسی کے مجبور کرنے پر میں صرف ایک بار اس کے ساتھ ایک پارٹی میں گئی تھی۔ وہاں ایک نوجوان نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ وہ خاصا خوب رو اور خوش لباس نوجوان تھا۔ پارٹی میں شریک ہر لڑکی اس کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔ نینسی خود بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھی۔ میں نے پہلے تو اس نوجوان کو بری طرح نظر انداز کیا لیکن جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس بات پر نینسی بھی مجھ سے خفا ہو گئی۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے منایا۔ اس نے کہا، ایک بات تو طے ہو گئی کہ بابر اس لڑکے سے زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ ہو گا۔ چوتھے دن میں نے کمرے سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اگر نینسی نہ ہوتی تو شاید میرا بھی وہی حشر ہوتا جو تمہارا ہوا۔ میرا دماغ بالکل آؤٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ میرے دل سے بس ایک ہی آواز آرہی تھی۔ بابر... بابر... بابر...!''

''اور میں یہاں کلارا... کلارا... کہتے ہوئے مرنے کی تیاری کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''بابر! مجھے شدت سے احساس ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی... آ... لو یو... بابر!'' وہ میری بانہوں میں سما گئی۔

عین اسی وقت ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں اس حالت میں دیکھ کر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

''بابر!'' کلارا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''میں تم سے شادی کروں گی... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی بابر!''

''لیکن ابھی تمہیں سات مہینے تک انتظار کرنا ہے

ڈارلنگ۔'' میں نے کہا۔

''ان سات مہینوں میں سے یہ دس دن کم کر دو۔'' کلارا نے کہا۔ ''ہاں، میں تمہارا مذہب بھی قبول کرلوں گی۔''

''یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا کلارا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس میں بھلا سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟'' کلارا بولی۔ ''مجھے صرف نام ہی تو بدلنا ہوگا۔ ابھی تو میں نہ کرسچین ہوں نہ یہودی۔''

☆☆☆

مجھے اسپتال سے واپس آئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ کلارا اب مجھ سے روزانہ ہی ملتی تھی اور گھنٹوں میرے ساتھ رہتی تھی۔

اسی دوران میں میری تعلیم مکمل ہوگئی۔ میں قانونی طور پر امریکا میں رہ سکتا تھا لیکن اب وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ بابا جان دو دفعہ ٹیلی فون کر چکے تھے کہ اب تمہاری تعلیم مکمل ہوگئی ہے تو تم واپس کیوں نہیں آجاتے۔

وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اس لیے میں کوئی بہانہ بھی نہیں بنا سکتا تھا۔

آخر مجھے امریکا میں مزید قیام کرنے کا ایک حل سوجھ ہی گیا۔ مجھے فاسٹ ڈرائیونگ کا تو جنون تھا ہی، میں ہوائی جہاز بھی اڑانا چاہتا تھا۔

میں نے وہاں کے ایک معروف فلائنگ کلب میں داخلہ لے لیا۔ وہ امریکا کا انتہائی معروف اور مہنگا ترین فلائنگ کلب تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کا تربیت یافتہ کوئی بھی پائلٹ بے کار نہیں رہتا بلکہ اسے ٹریننگ کے دوران ہی میں دنیا کی بڑی بڑی ائرلائنز سے ملازمت کی آفرز آنے لگتی ہیں۔

میرا مقصد کوئی ائرلائن کمپنی جوائن کرنا نہیں بلکہ وقت گزارنا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی فطری ذہانت کے سبب میں اس ٹریننگ کلب کے بہترین اسٹوڈنٹس میں شمار ہونے لگا۔

اس ادارے سے میں نے ائربس سے لے کر بوئنگ اور ہیلی کاپٹر تک اڑانے کی تربیت حاصل کی۔

وہاں داخلہ لینے والے عموماً صرف فلائنگ کے وہ گھنٹے پورے کرتے تھے جو کسی کمپنی میں ملازمت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے جنونی تو دو چار ہی تھے جو فلائنگ کا ہر کورس کر رہے تھے۔ میری طرح ان کے پاس بھی پیسے کی فراوانی تھی۔

ان میں عرب کا ایک شہزادہ اور مصر کے ایک بہت بڑے صنعت کار کا بیٹا بھی شامل تھا لیکن مہارت میں وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چھوٹے موٹے سیسنا ٹائپ جہاز تو گویا میرے لیے کھلونے تھے۔

میں نے جب اپنی تربیت مکمل کرلی تو کئی ائرلائنز سے مجھے ملازمت کی پیش کش کی گئی۔ میرا ریکارڈ دیکھتے ہوئے پین ایم کی ائرلائن نے تو مجھے دگنی تنخواہ کی آفر کی لیکن مجھے ملازمت تو کرنا ہی نہیں تھی اس لیے میں نے تمام کمپنیز سے معذرت کرلی اور کہا کہ فی الحال تو میں دنیا کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی آپ کی آفرز پر غور کروں گا۔

کلارا کے اٹھارہ سال پورے ہونے میں ابھی مزید دو مہینے باقی تھے۔

میں نے وقت گزاری کے لیے کیلی فورنیا کے ایک معروف آئی ٹی سینٹر میں ایڈمیشن لے لیا۔

وہاں بھی میں نے اپنی ذہانت اور مہارت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ کورس چھ مہینے کا تھا لیکن میں تو صرف دو مہینے گزارنا چاہتا تھا اس لیے میں نے آئی ٹی کا وہ کورس ادھورا چھوڑ دیا۔ اس مختصر عرصے میں بھی میں کمپیوٹر سے اتنا واقف ہوگیا تھا کہ وہاں کے انسٹرکٹرز کو حیرانی ہوتی تھی۔

میں گھر واپس آکر کلارا کا انتظار کرنے لگا۔ دو دن پہلے وہ قانونی طور پر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ لائسنس کے لیے پہلے ہی درخواست دے رکھی تھی۔ افسر مجاز کے اعتراض پر اس نے یہ دلیل دی تھی کہ جب تک میرا ڈرائیونگ لائسنس بنے گا، میں اٹھارہ سال کی ہو جاؤں گی۔

امریکا میں پاسپورٹ کی اور خاص طور پر ڈرائیونگ لائسنس کی وہی اہمیت ہے جو آج کل پاکستان میں قومی شناختی کارڈ کی ہے۔ اس کے بغیر آپ کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

کلارا آئی تو بہت تھکی تھکی اور کچھ پریشان سی نظر آرہی تھی۔

''کیا ہوا کلارا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا ڈرائیونگ لائسنس نہیں بنا یا کوئی اور بات ہے؟''

''ڈرائیونگ لائسنس تو مجھے مل گیا ہے۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور ڈرائیونگ لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ ''میں نے نئے پاسپورٹ کے لیے بھی اپلائی کر دیا ہے۔ وہ بھی دو چار دن میں مل جائے گا۔''

''پھر پریشانی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''ڈیڈی کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں نہ صرف تم سے شادی کرنے والی ہوں بلکہ مسلمان بھی ہو رہی ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے ڈارلنگ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آج نہیں تو کل انہیں یہ بات معلوم ہونی تھی۔ اب تم قانونی طور پر خود مختار ہو۔ وہ تمہیں روک تو نہیں سکتے نا...''

''مجھے تو نہیں، وہ تمہیں روک سکتے ہیں۔ میں ان کی ذہنیت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کسی کرائے کے قاتل کو تمہارے پیچھے لگا سکتے ہیں، کسی بھی الزام میں تمہیں امریکا سے ڈی پورٹ کرا سکتے ہیں۔ کئی بہت بااثر سینیٹرز سے ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔''

''صرف اتنی سی بات۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''جہاں تک کرائے کے کسی قاتل کا تعلق ہے تو میں کوئی ایسا تر نوالہ نہیں ہوں۔ ہم لوگ بندوقوں کی گھن گرج میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ میرے بابا سردار دلاور خان نے افغان، سوویت یونین جنگ میں روسیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ روسی مائیں آج بھی اپنے بچوں کو دلاور خان کے نام سے ڈراتی ہوں گی۔''

''میں جانتی ہوں، تم بہت بہادر ہو بابر!'' کلارا نے کہا۔ ''لیکن اندھیرے کے تیر اور پشت سے آنے والی گولی سے تو بڑے بڑے بہادر چت ہو جاتے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو کلارا ڈارلنگ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میرے پیچھے بھی آنکھیں ہیں۔''

''تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟'' کلارا جھنجلا گئی۔ ''میرے ڈیڈی کو تم نہیں، میں جانتی ہوں۔''

''تو پھر تم بھی سمجھ لو کہ میں بھی ایسا ہی ہوں۔ میں نے باقاعدہ تو کوئی جنگ نہیں لڑی ہے لیکن لڑنا جانتا ہوں۔ میں جب بھی دو تین مہینے کے لیے گھر جاتا ہوں تو بابا مجھے نشانے بازی سکھاتے ہیں، گھڑ سواری سکھاتے ہیں اور اپنے ساتھ شکار پر لے جاتے ہیں۔ پھر میں یہاں جم میں دو دو گھنٹے ایکسرسائز کرتا ہوں، وہ کس دن کام آئے گی؟''

''اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟'' کلارا نے بے بسی سے کہا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' میں بھی سیریس ہوگیا۔ ''کیا میں گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں یا تمہارے باپ سے جا کر معافی مانگ لوں کہ جناب عالی مجھ سے بہت بڑی خطا سرزد ہوگئی ہے جو میں آپ کی بیٹی سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے معاف فرما دیں۔ آئندہ میں اس کا نام بھی نہیں لوں گا یا پھر میں تمہارا ملک چھوڑ کر چلا جاؤں؟'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔ ''ان تین صورتوں کے علاوہ تمہارے خیال میں اگر کوئی چوتھی صورت ہے تو مجھے بھی بتاؤ۔''

''تم کچھ دن کے لیے اپنے ملک پاکستان چلے جاؤ۔'' کلارا نے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے کہا۔ ''میں واپس جانے کو تیار ہوں لیکن ایک شرط پر، تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔''

''اوکے، ڈن!'' اس نے ہنس کر کہا۔

''لیکن پہلے ہم یہاں نکاح کریں گے، پھر...''

''نو!'' اس نے کہا۔ ''پہلے تم مجھے مسلمان کرو گے... اسلامی طریقے سے ہمارا نکاح ہوگا پھر...''

''پھر تم ایسا کرو کہ ڈھنگ کے کپڑے پہن لو۔ ہم ابھی اسلامی سینٹر چلتے ہیں۔''

''ڈھنگ کے کپڑے!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ہم کسی پارٹی میں جا رہے ہیں اور اگر پارٹی میں بھی جا رہے ہیں تو ان کپڑوں میں کیا بُرائی ہے؟ میں بس شاور لے کر فریش ہو جاتی ہوں۔''

''نہیں کلارا!'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے کپڑے کہیں جانے کے قابل نہیں ہیں لیکن اسلامی سینٹر میں یہ اسکن ٹائٹ جینز اور لونیک (Low neck) ٹی شرٹ نہیں چلے گی۔ تم شاور لو، میں تمہارے لیے کپڑے لے کر آتا ہوں۔''

''اوکے بابا۔'' کلارا نے بیزاری سے کہا۔ ''لیکن ذرا جلدی آنا۔''

میں نے اپنے طور پر اسے غسل کا طریقہ سکھانے کی کوشش کی اور اپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔

مارکیٹ میرے اپارٹمنٹ سے صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کلارا کے لیے قمیص شلوار اور دوپٹا خرید لوں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ وہ اس اچانک تبدیلی سے بھڑک ہی نہ جائے۔ میں بہ تدریج اسے اس لباس پر آمادہ کر سکتا تھا۔ مجھے خود تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن بابا جان اور اماں اسے اس حلیے میں دیکھتے تو صدمے سے گنگ ہو کر رہ جاتے۔

میں نے اس کے لیے بند گلے کی ایک جرسی، ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزرز اور سر پر باندھنے کے لیے اسکارف بھی لے لیا۔

میں واپس پہنچا تو کلارا باتھ گاؤن میں آئینے کے سامنے بیٹھی ہیئر ڈرائر سے اپنے بال خشک کر رہی تھی۔

میں نے اسے وہ کپڑے دیے تو اس نے حیرت اور

نا گواری سے مجھے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں اور کپڑے لے کر بیڈ روم میں چلی گئی۔

وہ اس لباس میں بھی قیامت لگ رہی تھی۔ جرسی اس کے جسم پر کچھ ٹائٹ تھی جس سے اس کا جسم مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

اس نے اسکارف مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے بابر؟''

''یہ اسکارف ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم فی الحال تو اسے مفلر کی طرح اپنے گلے میں ڈال لو۔ کلمہ پڑھتے وقت تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

''کلمہ؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''وہ جو تم لوگ عربی میں پڑھتے ہو؟ لیکن مجھے تو عربی نہیں آتی۔''

''عربی مجھے بھی نہیں آتی۔'' میں نے کہا۔ ''صرف پڑھ لیتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ تم فکر مت کرو، مولانا صاحب تمہیں سب کچھ سکھا دیں گے، چلو ورنہ سینٹر بند ہو جائے گا۔''

میں نے احتیاطاً ایک شال بھی خرید لی تھی لیکن میں نے وہ کلارا کو دی نہیں تھی بلکہ اس کا شاپر گاڑی ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

ہم اسلامک سینٹر پہنچے تو اس وقت نمازِ مغرب ختم ہوئی تھی اور لوگ مسجد سے باہر آ رہے تھے۔

میں ایک طرف گاڑی روک کر ان لوگوں کے نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔

جب تمام نمازی نکل گئے تو میں سینٹر کے مرکزی دروازے پر پہنچا۔ اس کا چھوٹا ذیلی دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے نزدیک ہی ایک گارڈ بھی موجود تھا۔ وہ اپنے حلیے ہی سے مجھے پختون لگ رہا تھا۔

میں نے پشتو میں اس سے کہا۔ ''خان! مجھے اس سینٹر کے بڑے مولانا صاحب سے ملنا ہے۔''

اس نے حیرت سے پہلے مجھے دیکھا، پھر سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر اس کی نظر کلارا پر پڑی۔ وہ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آپ یہاں سے سیدھے برآمدے میں جائیں۔ وہاں جو بڑا دروازہ نظر آ رہا ہے'' وہ مسجد کا ہال ہے۔ آپ اس سے آگے بڑھیں گے تو دونوں طرف کمروں کی قطاریں ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ آپ اس سے مولانا طلحہ ابن ہشام صاحب کے بارے میں پوچھ لیجیے گا۔ وہ آپ کو مولانا صاحب کے پاس لے جائے گا۔''

میں اپنے جوتے اتارنے لگا تو وہ بولا۔ ''صاحب! آپ اپنے جوتے برآمدے کی سیڑھیوں پر اتاریں۔ ہاں ایک بات بتائیں، آپ نے اتنی اچھی پشتو کہاں سے سیکھی؟''

''پشتو میری مادری زبان ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور کلارا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

لکڑی کا خوب صورت اور وسیع و عریض دروازہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے اور گارڈ کی ہدایات کے مطابق سیدھے چلتے رہے۔

وہاں ایک باریش شخص موجود تھا۔ میں نے اس سے مولانا صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے ان کے کمرے تک میری راہنمائی کر دی۔

مولانا صاحب فرشی نشست پر بیٹھے تھے۔ ان کے اردگرد کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کمرا بہت صاف ستھرا تھا اور فرش سے لے کر چھت تک دائیں بائیں الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں میں سلائڈنگ ڈور تھے۔ ان میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ مولانا صاحب کے نزدیک بھی اردگرد بہت سی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

مولانا صاحب کی عمر پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان ہوگی۔ ان کا رنگ سرخ و سفید تھا، سر اور داڑھی کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے جو ان کے نورانی چہرے پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ لمحے بھر کو تو میں بھی گھبرا گیا۔ وہ گونج دار آواز میں بولے۔ ''جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' یہ جملہ انہوں نے نہایت رواں انگلش میں ادا کیا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ان کا تعلق مصر یا کسی عرب ملک سے ہے۔ ان کی پُراثر شخصیت کے سحر میں کھو کر میں ایسا بوکھلایا کہ انہیں سلام کرنا بھی بھول گیا۔

''سر! یہ خاتون اسلام قبول کرنا چاہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سبحان اللہ... سبحان اللہ۔'' مولانا صاحب کے اردگرد بیٹھے ہوئے افراد نے یک زبان ہو کر کہا۔

''میڈم! آپ ادھر میرے پاس آ جائیں۔'' مولانا صاحب نے کچھ فاصلے پر کلارا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

''آپ کا نام؟'' مولانا نے پوچھا۔

''کلارا البرٹو انتھونی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مذہب؟'' مولانا نے پوچھا۔

''میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔ والدین میں سے ایک کرسچین ہے اور دوسرا یہودی۔ مجھے ان دونوں مذاہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' کلارا نے کہا۔

''آپ مسلمان کیوں ہونا چاہتی ہیں؟'' مولانا صاحب نے پوچھا۔

''میں نے اسلام کا بہت زیادہ مطالعہ تو نہیں کیا ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اسلام نے عورت کو بہت عزت اور عظمت سے نوازا ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے میں بھی اسی عزت کی حق دار ہوں جو میرا مذہب تو مجھے ہرگز نہیں دے گا۔''

کلارا نے میرا رٹایا ہوا سبق دہرا دیا۔

ایک مرتبہ پھر سبحان اللہ اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔

''بی بی! آپ کسی جبر یا زور زبردستی سے تو اسلام قبول نہیں کر رہی ہیں؟''

''نو سر! میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کر رہی ہوں۔ قانون کی رو سے میں بالغ ہوں اور اب اپنے قول و فعل کی بھی خود ذمے دار ہوں۔ آپ چاہیں تو میرا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ سکتے ہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' مولانا صاحب نے کہا اور وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو کوئی فارم لانے کا حکم دیا۔

اس فارم میں بھی وہی کچھ لکھا تھا کہ میں اپنی مرضی سے بہ قائمی ہوش و حواس اسلام قبول کر رہی ہوں۔ اس میں کسی زور، زبردستی، ظلم، جبر، دھمکی یا بلیک میلنگ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

کلارا نے وہ فارم پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کر دیے۔

پھر مولانا صاحب نے وہاں موجود دو گواہوں سے بھی اس فارم پر دستخط کرائے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ دونوں امریکن تھے۔

''باضابطہ اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ کو غسل اور وضو کرنا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا پھر وہاں موجود ایک امریکن سے مخاطب ہوئے۔ ''مولانا عبدالسلام! آپ انہیں اپنی بیگم کے پاس لے جائیں، وہ انہیں غسل اور وضو کا طریقہ سکھا دیں گی۔'' وہ کلارا سے مخاطب ہوئے۔ ''مولانا عبدالسلام اس اسلامک سینٹر کے نائب امام ہیں۔ اب سے بیس برس پہلے انہوں نے بھی آپ ہی کی طرح اسلام قبول کیا تھا۔''

نائب امام صاحب کلارا کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اس کے جانے کے بعد مولانا صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''جناب! یہ آپ نے بہت نیکی کا کام کیا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ اس بی بی کو تو اسلام قبول کروانے لے آئے، آپ خود بھی دائرۂ اسلام میں کیوں نہیں آ جاتے؟''

ان کے اس جملے سے میں نادم ہو کر رہ گیا۔

''میں کوئی جبر نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اتمامِ حجت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے گا تو ایک دن آپ بھی اسلام قبول کریں گے انشاء اللہ۔'' پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی... میرا نام بابر خان... ہے۔'' میرے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔

مولانا صاحب اور ان کے ساتھی بُری طرح چونک اٹھے۔ ''بابر خان؟'' مولانا صاحب نے کہا۔ ''آپ مسلمان ہیں؟'' انہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔

''کیا آپ امریکن نیشنل ہیں؟'' انہوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جی نہیں، میں یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔ میرا تعلق افغانستان سے ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کیسے مسلمان ہیں؟'' مولانا صاحب نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا آپ کے والدین نے آپ کو یہ نہیں سکھایا کہ کہیں جاتے ہیں تو سب سے پہلے حاضرین مجلس کو سلام کرتے ہیں؟''

''میں آپ کی سحر انگیز اور روحانی شخصیت دیکھ کر کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس بعد میں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''آپ افغان ہیں؟ نماز کس اسلامک سینٹر میں ادا کرتے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''میں نے آپ کو کبھی یہاں نہیں دیکھا۔''

''میں یہاں نماز نہیں پڑھتا۔'' میں نے کہا۔ اس میں آدھا سچ اور آدھا جھوٹ شامل تھا۔ میں وہاں کیا کہیں بھی نماز نہیں پڑھتا تھا۔

''آپ کہاں نماز ادا کرتے ہیں بابر خان صاحب!'' وہاں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے نہایت شفیق لہجے میں پوچھا۔

''وہ... سر... ایسا ہے کہ... تعلیمی مصروفیات... کی وجہ سے... مجھے اتنا وقت ہی نہیں... ملتا کہ... میں نماز کے لیے... وقت نکال سکوں۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو پنج وقتہ نماز باجماعت کی توفیق عنایت فرمائے۔'' مولانا صاحب نے کہا۔

اس پر وہاں موجود لوگوں نے آمین کہا۔
''بابر صاحب! آپ میری باتوں کا بُرا مت مانیے گا۔'' مولانا صاحب نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ ماشاء اللہ ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے والدین اور دوسرے بزرگ پنج وقتہ نمازی ہوں گے۔ یہی تو ہم مسلمانوں میں خامی ہے کہ اپنے مذہب سے دور ہو گئے ہیں اور اللہ کی رسّی کے بجائے غیر اللہ پر توکل کرنے لگے ہیں اور یہ شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا بڑے سے بڑا گناہ معاف فرما دے گا لیکن وہ شرک کو بھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اللہ کو چھوڑ کر نعوذ باللہ دوسرے ملکوں پر تکیہ کرنا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھنا کفر تو ہے ہی، شرک بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور ہر مسلمان کو اس قبیح فعل سے ہمیشہ بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ دنیا تو ایک سرائے ہے بابر بیٹا! یہاں تو ہم لوگ عارضی طور پر مقیم ہیں۔ اصل آزمائش تو موت کے بعد شروع ہو گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے اجداد کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔'' ایک مرتبہ پھر وہاں موجود افراد نے یک زبان ہو کر ''آمین'' کہا۔
''آپ کا تعلق افغانستان کے کس علاقے سے ہے؟''
''مولانا صاحب! یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے آج تک افغانستان دیکھا ہی نہیں ہے۔ میرے بابا دلاور خان میری پیدائش سے پہلے پشاور منتقل ہوئے تھے۔''
''بیٹا! کیا نام بتایا آپ نے اپنے والد کا؟'' مولانا صاحب نے چونک کر پوچھا۔
''سردار دلاور خان!'' میں نے کہا۔
''آپ کے دادا کا نام سردار اسفند خان تھا؟'' مولانا صاحب پُرجوش لہجے میں بولے۔
''جی ہاں، لیکن...''
میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے والہانہ انداز میں مجھے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
''میں تمہارے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مولانا صاحب نے کہا۔ ''تم اس مجاہد کے بیٹے ہو جس نے برسوں روسیوں کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ میرا تعلق پاکستان ہی سے ہے۔ میری ملاقات تمہارے والد سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ امریکی حکومت کی دعوت پر یہاں آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس بیس بائیس سال کے نوجوان نے اپنے مٹھی بھر مجاہدوں کے ذریعے سوویت یونین کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تمہیں کہاں دیکھا ہے۔ تم دلاور خان کی جوانی کی تصویر ہو بیٹا! پاکستان جاؤ تو ان سے میرا اسلام ضرور کہنا۔''
کلارا کمرے میں داخل ہوئی تو میں تو اسے پہچان بھی نہ سکا۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کے جسم پر بڑی سی ایک چادر تھی جس نے اس کا سر بھی ڈھک دیا تھا۔ سیاہ چادر میں اس کا خوب صورت چہرہ چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔
مولانا صاحب نے اسے کلمہ پڑھایا اور اعلان کیا کہ آج سے کلارا بیٹی کا نام مریم ہے۔
وہاں موجود تمام افراد نے اس کے لیے دعا کی۔
''مریم بیٹا!'' مولانا صاحب نے پہلی دفعہ اسے اس کے اسلامی نام سے مخاطب کیا۔ ''جب بھی تمہیں وقت ملے، مولانا عبدالسلام کی بیگم کے پاس آجایا کرو۔ وہ تمہیں اسلام کے بارے میں بہت کچھ بتا دیں گی۔ وہ بھی تمہاری طرح امریکن ہیں۔ ہر نمازِ جمعہ کے بعد میں بھی یہاں درس دیتا ہوں۔ یہاں خواتین کے لیے علیحدہ انتظام ہے۔ تم وہ درس سنو گی تو اس سے بھی بہت زیادہ فائدہ ہو گا۔ ہاں، تمہیں نماز کی ادائیگی کا طریقہ بھی بتا دیا گیا ہو گا۔ کوشش کرنا کہ اب کوئی نماز قضا نہ ہونے پائے۔''
''جی مولانا صاحب!'' مریم نے سر جھکا کر کہا۔
''عبدالسلام صاحب! اس موقع پر شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔''
''مولانا صاحب! میں نے شیرینی کے لیے ایک آدمی کو روانہ کر دیا ہے۔'' عبدالسلام صاحب نے کہا۔
''مولانا صاحب... اسلام قبول کرنے کے بعد مریم کے لیے یہاں بہت دشواریاں پیدا ہو جائیں گی... میں... چاہتا ہوں کہ...''
''ہاں ہاں بولو بیٹا، رک کیوں گئے؟''
''میں چاہتا ہوں کہ آپ مریم سے میرا نکاح پڑھا دیں۔ میں اگلے ہفتے اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔''
''بیٹا! اگر یہ کام تم اپنے والد کی موجودگی میں کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ انہیں بھی خوشی ہوتی کہ ان کے بیٹے نے نہ صرف ایک لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا ہے بلکہ اس سے شادی بھی کر رہا ہے۔''
''چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن مریم کا باپ یہاں کا بہت دولت مند آدمی ہے۔ کئی سینیٹرز اور وزیروں سے اس کے تعلقات ہیں۔ ان لوگوں کو یہ علم بھی ہو گیا ہے کہ مریم مسلمان ہونے کے بعد مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ان

لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ وہ اسلام دشمنی میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''
مولانا صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولے۔ ''بات تو تمہاری درست ہے۔ چلو پھر یہ نیک کام بھی کر لیں۔ یہاں گواہ بھی موجود ہیں۔'' انہوں نے عبدالسلام صاحب سے نکاح نامے کے فارم لانے کو کہا۔
تھوڑی دیر بعد وہ فارم لے آئے۔ مولانا صاحب نے خطبۂ نکاح پڑھا، نکاح نامے پر میرے اور مریم کے دستخط لیے اور وہاں موجود افراد نے مجھے مبارک باد دی۔
''بیٹا بابر!'' مولانا صاحب نے کہا۔ ''مریم اب تمہاری شرعی بیوی ہے۔ اس کے تمام حقوق ادا کرنا تمہارا فرض ہے۔ اس کی عزت کی حفاظت بھی اب تمہاری ذمے داری ہے۔''
انہوں نے مریم کو بھی شوہر کے حقوق سے آگاہ کیا پھر مجھ سے بولے۔ ''بابر بیٹا! آج تم دونوں میرے مہمان ہو۔ اب عشا کی نماز کے بعد کھانا کھا کر ہی جانا۔ ہاں، تم احتیاطاً مجھے اپنے والد کے ٹیلی فون نمبرز لکھوا دو، اپنا اور مریم کا سیل نمبر بھی دے دو۔''
میں نے انہیں بابا جان کے تمام لینڈ لائن نمبرز، ان کے سیل نمبرز، اپنا اور مریم کا سیل نمبر بتایا جنہیں مولانا عبدالسلام صاحب نے نہ صرف ایک رجسٹر میں لکھ لیا بلکہ اپنے سیل فون میں محفوظ بھی کر لیا۔
رخصت ہوتے وقت بھی مولانا صاحب نے ہمیں بہت سی ہدایات اور دعائیں دیں۔ پھر انہوں نے مریم کو قرآن پاک کا ایک خوب صورت نسخہ دیا اور بولے۔ ''دنیا میں اس سے بڑا کوئی تحفہ نہیں ہے جو ایک باپ اپنی بیٹی کو دے سکتا ہے۔''
مریم نے انتہائی احترام سے وہ نسخہ ان سے لیا اور اسے چوم لیا۔
میں حیران تھا کہ مریم یہ سب کچھ دل سے کر رہی ہے یا یہ بھی اس کی اداکاری ہے۔ اس کے بعد مولانا صاحب نے اپنی الماری سے چیک بک نکالی اور اس میں سے دس ہزار ڈالرز کا ایک چیک کاٹ کر مریم کو دیتے ہوئے بولے۔ ''مریم بیٹا! میں فی الوقت اتنا ہی دے سکتا ہوں۔''
مریم نے انکار کرنا چاہا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔
''بابر بیٹا! بہتر ہے کہ تم فوری طور پر اپنی قیام گاہ تبدیل کر لو یا پھر جب تک تم امریکا میں ہو، کسی اچھی سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کر لو۔ میرے خیال میں تم یہ اخراجات برداشت کر سکتے ہو۔''
''مولانا صاحب! فوری طور پر قیام گاہ تبدیل کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ ہاں، میں یہاں کی کسی بہترین سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کر لیتا ہوں۔''
وہاں سے واپسی میں ہمیں خاصی دیر ہو گئی تھی لیکن مولانا صاحب کی بات میرے دل کو لگی تھی۔
میں اسی وقت ٹیلی فون ڈائریکٹری لے کر بیٹھ گیا اور امریکا کی ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی کا ٹیلی فون نمبر نکال کر اسے ٹیلی فون کر دیا۔
دوسری طرف سے فوراً ہی کسی خاتون کی مترنم آواز سنائی دی۔
''ایس بی سی ایجنسی۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر؟''
''اپنے آپریشنل منیجر یا جی ایم سے میری بات کرائیے۔'' میں نے کہا۔
''سر! جی ایم صاحب تو اس وقت نہیں ہیں، میں منیجر آپریشن سے آپ کی بات کرا دیتی ہوں۔''
میں نے منیجر سے کہا کہ مجھے فوری طور پر آپ کی ایجنسی کی سیکیورٹی درکار ہے۔
''سر! آپ کو کتنے گارڈز کی ضرورت ہو گی؟''
''فی الحال دو گارڈز بھی کافی ہیں۔''
''میں گارڈز تو فوری طور پر بھیج دیتا ہوں لیکن سیکیورٹی الارم کے لیے آپ کو کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' منیجر نے کہا۔
میں نے اسے اپنا ایڈریس سمجھایا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں ایجنسی کے سیکیورٹی گارڈز وہاں پہنچ گئے اور پوزیشن سنبھال لی۔
''یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو بابر!'' مریم نے کہا۔ ''آج ہماری سہاگ رات ہے۔''
''بس ایجنسی کے گارڈز پہنچ گئے ہیں، اب ہم بغیر کسی مداخلت کے سہاگ رات منا سکیں گے۔''
مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ ستمبر کی سات تاریخ تھی۔
دوسرے دن میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو مریم بستر میں موجود نہیں تھی۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی اور اس کے پُرکشش چہرے پر گویا نور برس رہا تھا۔ وہ میرے لیے بیڈ ٹی لے کر

آئی تھی، چائے کا کپ مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”تم کیسے مسلمان ہو بابر! فجر کی نماز پڑھنے میں جو لطف آیا، اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”تم نے نماز پڑھی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تمہیں عربی آتی ہے؟“

”مجھے باجی کلثوم نے نماز پڑھنے کے لیے چند آیتیں یاد کرادی تھیں۔ پھر میں نے انہیں رومن انگلش میں لکھ بھی لیا تھا۔ تھوڑی بہت غلطی تو ہوئی ہو گی لیکن اللہ معاف کرنے والا ہے۔“

میں حیرت سے اس یہودی نژاد کرسچین لڑکی کو دیکھ رہا تھا جسے کل تک کسی بھی مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو صرف مجھ سے شادی کی خاطر اسلام قبول کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی باتوں سے انتہائی شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ میں جو پشتوں سے مسلمان تھا جس کے اجداد گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی نماز قضا نہیں کرتے تھے اور جس کے قبیلے کے لوگ آج بھی اسلام کے نام پر مر مٹتے ہیں، اسے ایک نومسلم لڑکی اسلام کا درس دے رہی تھی۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں بیٹھا ہی تھا کہ سیکیورٹی ایجنسی کے لوگ آگئے۔ انہوں نے گھر میں جدید قسم کے الیکٹرانک آلات نصب کیے اور مجھے بتایا کہ کسی بھی خطرے کی صورت میں آپ یہ سرخ بٹن دبا دیں۔ ہماری ایجنسی کے لوگ فوری طور پر آپ سے رابطہ کریں گے اور چار سے پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک ہمارے یہ دونوں گارڈز آپ کی حفاظت کریں گے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کی سیفٹی کے لیے ہم باڈی گارڈز بھی مہیا کر سکتے ہیں جو چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ رہیں گے۔

”فی الحال مجھے باڈی گارڈز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

میں نے پاکستان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے تو میں نے ایک ٹریول کمپنی سے اپنے لیے پاکستان کی دو سیٹیں بک کرائیں۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن میری لاکھ کوششوں کے بعد بھی مجھے کسی ائرلائن کے جہاز میں سولہ تاریخ سے پہلے کی سیٹیں نہیں ملیں۔

اس دن سات تاریخ تھی۔ یعنی نو دن مجھے مزید اس جگہ گزارنا تھے۔ میں نے سیکیورٹی ایجنسی سے دو باڈی گارڈز کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔

مریم شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔ وہ پاکستان میں رہنے والے ہر رشتے دار کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور خریدنا چاہتی تھی۔

اس نے پہلے ہی دن اتنی شاپنگ کر لی کہ میں بگڑ گیا اور اس سے کہا۔ ”مریم! یہ سامان ہمارے ساتھ نہیں جا سکے گا۔ اسے کارگو سے بھیجنا پڑے گا۔“

”تم اسے کارگو سے بھیجو یا کسی شپ سے، سامان تو میں لے جاؤں گی۔“

اس نے بابا جان، اماں، پھپو، ان کے دونوں بیٹوں، پھوپا اور مہوش کے لیے نہ جانے کیا کچھ خرید لیا۔

وہ وقت نکال کر دن میں ایک دفعہ اسلامک سینٹر ضرور جاتی تھی۔ مجھے اس کی تبدیلی پر حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔ بس مجھے اس وقت شدید کوفت ہوتی تھی جب وہ مجھے بھی اسلام کی تعلیم دینے لگتی تھی۔

شاپنگ وہ ہمیشہ تنہا ہی کرتی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ جا کر بہت بور ہونا پڑتا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کے لیے کئی دکانوں کے چکر لگاتی تھی اس لیے میں نے اس کے ساتھ جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ کمپنی کا ایک چاق و چوبند باڈی گارڈ اس کی حفاظت کے لیے موجود ہوتا ہے۔

ایک دن مریم کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اپنے لیے کچھ شاپنگ میں بھی کر لوں۔ گاڑی تو مریم لے جا چکی تھی۔ میں نے ٹیلی فون کر کے ٹیکسی منگوائی اور اس میں روانہ ہو گیا۔ میرا باڈی گارڈ ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر تھا لیکن اس کی نظریں بہت تیزی سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

کیلی فورنیا کے ایک معروف ڈپارٹمنٹل اسٹور کے پاس میں ٹیکسی سے اتر گیا۔

اسٹور کے داخلی دروازے پر مجھے مریم دکھائی دی۔ گارڈ سامان کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کے عقب میں چل رہا تھا۔

اچانک ایک سمت سے دو نوجوان برآمد ہوئے اور مریم سے بولے۔ ”ارے کلارا! تم کہاں غائب ہو، تمہارے ڈیڈی اور مما بہت پریشان ہیں۔ وہ تو پولیس میں رپورٹ لکھوا رہے تھے لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اتنی جلد بازی مت کریں۔ اس سے پہلے بھی تو کلارا کئی کئی دن گھر سے غائب رہی ہے۔ اچھا ہوا تم مل گئیں۔ چلو، ہمارے ساتھ چلو۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی۔ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو۔“ مریم نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے دیکھا، اس کا باڈی گارڈ ٹرالی ایک طرف

روک کر کھڑا ہو گیا تھا اور وہ چیتے کی طرح چوکنا نظر آ رہا تھا۔

”کلارا! خاموشی سے گھر چلو۔“ ایک نوجوان غرا کر بولا۔ وہ خاصا دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا اور شاید اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔

”میں اپنے کام سے کام ہی رکھ رہا ہوں کلارا! انکل نے کہا ہے کہ کلارا جہاں بھی نظر آئے، اسے زبردستی اٹھا لاؤ۔“

”پہلی بات تو یہ کان کھول کر سن لو کہ اب میں کلارا نہیں بلکہ مریم خان ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں بابر سے شادی کر چکی ہوں۔“

”وہاٹ؟“ وہ دہاڑ کر بولا۔ ”تم اس کم ذات سے شادی بھی کر چکی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔“ اس نے اچانک مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پھر جیسے بجلی سی کوندی۔ مریم کے باڈی گارڈ نے اس نوجوان پر چھلانگ لگا دی تھی اور اس کے جبڑے پر اتنا زوردار گھونسا مارا تھا کہ وہ الٹ کر گر گیا۔ دوسرے نوجوان نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن گارڈ نے ٹانگ اڑا کر اسے بھی گرا دیا اور اس کا کالر پکڑ کے سر اتنے زوردار انداز میں فرش سے ٹکرایا کہ وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔

مریم پر ہاتھ ڈالنے والا گالیاں بکتا ہوا گارڈ کی طرف بڑھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور جبڑے کی تکلیف کے باعث الفاظ بھی درست نہیں نکل رہے تھے۔

اس نے چیخ کر گارڈ سے پوچھا۔ ”تو مجھے جانتا ہے، میں کون ہوں؟“

”میں صرف میڈم کو جانتا ہوں۔“ گارڈ نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر اب تم نے ان پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش بھی کی تو میں تمہارے دونوں ہاتھ توڑ دوں گا۔“

”تو... تو میرے ہاتھ توڑے گا؟“ نوجوان نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

”کوشش کر کے دیکھ لو۔“ گارڈ نے سرد لہجے میں کہا۔

نوجوان نے اچانک پستول نکال لیا اور جھپٹ کر مریم کی کنپٹی ... پر رکھ دیا۔ ”چل اب میرے ہاتھ توڑ کر دکھا۔ میں تیری میڈم کی کھوپڑی توڑ دوں گا۔“

گارڈ نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پستول نکالا اور فرش پر گر گیا۔

میں سمجھا شاید وہ پھسل کر گرا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر گرا تھا۔ نوجوان کی توجہ لمحے بھر کو مریم سے ہٹ گئی۔ وہ اس انداز میں کھڑا تھا کہ مریم کو اس نے ڈھال بنا رکھا تھا۔ گارڈ پھسلتا ہوا مریم تک پہنچا، پھر نہ جانے کیسے اس نے پستول بردار نوجوان کی پنڈلی پر بھرپور ٹانگ رسید کر دی۔ یہ انتہائی خطرناک حرکت تھی۔ پستول بردار سے اچانک فائر بھی ہو سکتا تھا اور اس کی وہ بھرپور ٹانگ مریم کے پیر میں بھی لگ سکتی تھی۔

پستول بردار لات کھانے کے بعد پھسلتا ہوا دور جا گرا تھا۔ اس کا پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

گارڈ نے پھر اسے اٹھنے کا موقع نہ دیا۔ پہلے اس کی دائیں کہنی کے جوڑ پر ٹانگ ماری، پھر بائیں کہنی کا جوڑ بھی ناکارہ کر دیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ میں دونوں ہاتھ توڑ دوں گا۔ اب بھی اگر ہمت ہے تو میڈم پر ہاتھ اٹھا کر دکھا، میں تیری دونوں ٹانگیں بھی توڑ دوں گا۔“

پولیس والے اس کی طرف جھپٹے اور پلک جھپکتے میں اس کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔

”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ مریم چیخ کر بولی ”یہ میرا باڈی گارڈ ہے۔ یہاں آپ کو بے شمار ایسے لوگ مل جائیں گے جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ مسٹر ٹونی نے مجھے کڈنیپ کرنے کی کوشش کی، پھر میرے باڈی گارڈ کی مداخلت پر گن نکال لی۔“

پولیس آفیسر نے ٹونی کو بھی گرفتار کر لیا اور مریم سے کہا۔ ”میڈم! آپ کو پولیس اسٹیشن تک چلنے کی زحمت کرنا ہو گی۔ یہ صرف فارملٹی ہے اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔“

”اوکے آفیسر۔“ مریم نے کہا۔ ”میں اپنا سامان گھر چھوڑ کر پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤں گی۔ آپ میرا سیل نمبر اور ایڈریس نوٹ کر لیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میڈم! وہ تو ہمیں ٹونی سے بھی مل جائے گا اور آپ کے باڈی گارڈ سے بھی۔“

وہ ٹونی اور مریم کے باڈی گارڈ کو لے کر روانہ ہو گیا۔

میں مریم کے پاس پہنچا تو وہ روتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ ”بابر! یہ زمین اب مجھ پر تنگ ہو گئی ہے۔ فوراً یہاں سے نکلو، ہم فوری طور پر کینیڈا یا کسی اور ملک کی طرف نکل سکتے ہیں۔“

”اچھا تم گھر تو چلو۔“ میں نے کہا۔

ٹیکسی ابھی تک موجود تھی۔ میں نے سوچا، ٹیکسی والے کو فارغ کر دوں۔ اب تو میری گاڑی موجود تھی۔

اچانک ایک لمبا تڑنگا، وحشی قسم کا نیگرو میرے سامنے آگیا اور بولا۔ ”مسٹر بابر!“

”جی ہاں، فرمائیے؟“ میں نے حیرت سے اسے

دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ابو محمد ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی ورنہ یہ واقعہ پیش نہ آتا۔''

''مسٹر ابو محمد!'' میں نے کہا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھ کر کہا۔ ''میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں۔''

''میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر بابر!'' اس نے کہا۔ ''میں مسلم رائٹ کمیشن کا رکن ہوں اور ہر مسلمان کی حفاظت کرنا ہماری تنظیم کا فرض ہے۔''

''آپ کا بہت شکریہ مسٹر ابو محمد! میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں۔''

''لیکن آپ اپنی مسز کی حفاظت تو نہیں کرسکتے۔ اب تو اس کے باڈی گارڈ کو بھی پولیس لے گئی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔''

''لیکن اب یہ میری ذمے داری ہے کہ میں اپنی حفاظت میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں' خاص طور پر آپ کی مسز کو۔ انہوں نے ابھی حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ اس لیے خطرہ بھی ان کے لیے زیادہ ہے۔'' پھر وہ مریم سے بولا۔ ''آیئے مسز بابر! میری گاڑی میں آجایئے۔''

''تھینکس مسٹر! میرے پاس گاڑی ہے۔'' مریم نے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ یہ میری ذمے داری ہے۔'' ابو محمد درشت لہجے میں بولا۔ ''چلیے، میری گاڑی میں بیٹھیں۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟'' مجھے اس کے لہجے پر اچانک غصہ آگیا۔ ''مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ اپنا کام کرو۔ ہاں، آئندہ خیال رکھنا، تمہارے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے ہیں اور کسی ایسی تنظیم کا آدمی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔''

ابو محمد نے اچانک لمبی نال کا ایک پستول نکالا اور مجھے دکھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ''تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی نال پر سائیلنسر لوڈ ہے اور یہ بے آواز چلتا ہے' اس لیے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرنا۔ میں جیب میں سے بالکل صحیح نشانہ لے سکتا ہوں۔ اپنی مسز سے کہو کہ وہ میری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔''

میں نے اچانک اس کے دائیں شانے پر زوردار گھونسا رسید کردیا کہ پستول بھی اس کی دائیں جیب میں تھا۔

بقیہ کام میرے باڈی گارڈ نے کیا۔ اس نے ذرا سی دیر میں اس کیم تیم نیگرو کو دھول چٹادی، پھر اس سے پہلے کہ پولیس وہاں پہنچتی' ہم وہاں سے نکل آئے۔

مریم کے ساتھ میں بھی پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں میری سیکیورٹی ایجنسی کا آپریشنل ہیڈ کیپٹن رالف پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ریٹائر ہونے کے بعد اس ایجنسی میں ملازمت کرلی تھی لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پولیس کا بہت دبنگ آفیسر رہا ہوگا۔ پولیس اسٹیشن کا سارجنٹ چیف اس کے سامنے بچھا جارہا تھا۔

کیپٹن رالف نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے آدمی کو بغیر کسی ثبوت کے گرفتار کرنے کی جرأت کیسے کی؟ تم اسے پولیس اسٹیشن بلاکر پوچھ گچھ کرسکتے تھے۔''

''حالات اور واقعات آپ کے آدمی...''

''بس کرو سارجنٹ!'' کیپٹن رالف غرایا۔ ''جب میری معزز کلائنٹ کہہ رہی ہے کہ اس پر حملہ ہوا تو تمہیں اس کی بات کا یقین کرنا چاہیے تھا۔ میں اس معاملے کو بہت اوپر تک لے کر جاؤں گا۔ میری سیکیورٹی ایجنسی ایسی نہیں ہے کہ جس کا دل چاہے، وہ میرے سیکیورٹی گارڈ کو چوروں اچکوں کی طرح گرفتار کرلے۔'' پھر وہ مریم سے مخاطب ہوا۔ ''میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں میم! آپ کو زحمت برداشت کرنا پڑی۔''

''اٹس آل رائٹ کیپٹن!'' مریم نے کہا۔ ''میں بھی اپنے وقت کے زیاں اور ذہنی کوفت کے لیے پولیس کے خلاف کارروائی ضرور کروں گی۔''

سارجنٹ چیف اتنا نروس ہوگیا تھا کہ اس نے جلدی جلدی مریم کا بیان لیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ سیکیورٹی گارڈ کا بیان پہلے ہی ہوچکا تھا۔ البتہ ٹونی نے اپنے وکیل کے پہنچنے سے پہلے زبان کھولنے سے انکار کردیا تھا۔ پولیس نے اسے اسپتال بھجوادیا تھا کیونکہ وہ بری طرح زخمی تھا۔

''سارجنٹ!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی ایک رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔''

پھر میں نے ابو محمد کے آنے اور اس کے حملہ کرنے تک کے تمام واقعات بیان کردیے۔

سارجنٹ کچھ متفکر سا ہوگیا۔ اس نے ابو محمد کا حلیہ تفصیل سے لکھا، رپورٹ پر میرے اور میرے باڈی گارڈ کے دستخط لیے اور ہم پولیس اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

مریم مسلسل یہ کہہ رہی تھی۔ ''بابر! یہاں سے نکلو۔ میری چھٹی حس کسی بڑے خطرے کی نشاندہی کررہی ہے۔ ہمیں فوری طور پر فرانس، برطانیہ، سویڈن یا کسی بھی ملک کی فلائٹ

مل جائے گی۔ فلائٹ نہ بھی ملے تو تم کوئی پلین چارٹر کرلو لیکن یہاں سے نکلو۔''

''ٹیک اٹ ایزی بے بی!'' میں نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔ ''ایسی کون سی آفت آگئی ہے کہ ہم یوں چوروں کی طرح یہاں سے فرار ہو جائیں۔ جہاں تک جہاز چارٹر کرنے کا سوال ہے تو ہم کسی دوسرے ملک کے لیے کیوں، پاکستان ہی کے لیے جہاز چارٹر کیوں نہ کریں۔''

''کچھ بھی کرو لیکن جلدی کرو۔'' مریم نے کہا۔ ''میں اپنے باپ کی فطرت اور سوچ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اسے اپنے مذہب سے تو ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔''

''او کے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

میں نے اسے تسلی تو دے دی تھی لیکن میں سولہ تاریخ کی سیٹیں کنفرم کرا چکا تھا اور اسی فلائٹ سے پاکستان جانا چاہتا تھا۔ ایسی بھی کیا بزدلی کہ میں اس کے باپ سے خوف زدہ ہو کر چوروں کی طرح وہاں سے نکل جاتا۔

ایک دن مزید گزر گیا۔ میں نے اپنے لیے شاپنگ کی جو اس روز نہیں کر سکا تھا پھر الیکٹرانک کا کچھ سامان خریدا۔

صبح مریم نے مجھے زبردستی فجر کے وقت بیدار کر دیا اور بولی۔ ''جانے سے پہلے کم سے کم ایک دفعہ تو مولانا صاحب کے اسلامک سینٹر میں نماز ادا کرلو اور انہیں اپنی شکل دکھا دو۔''

اس کے کہنے پر میں نمازِ فجر کے لیے اسلامک سینٹر چلا گیا۔

مولانا صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''ہاں، ٹیلی فون پر میری دلاور خان سے بھی بات ہو چکی ہے۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ''لیکن میں نے انہیں ابھی تمہاری شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ بس ہم گزرے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔''

مولانا صاحب سے رخصت ہو کر میں نے گھر پہنچ کر ناشتا کیا اور غیر ارادی طور پر ٹی وی کھول لیا۔

اچانک میری آنکھوں نے ٹی وی پر ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ اس وقت مریم بھی میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ایک طیارہ اچانک ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند و بالا عمارت سے ٹکرا گیا۔ مریم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہاں ہر طرف گرد اور دھواں پھیل گیا۔ ابھی ہم اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک دوسرا طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دوسری بلڈنگ سے ٹکرایا اور دونوں عمارتیں لمحوں میں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔

اس واقعے سے امریکا سمیت پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ جی ہاں، وہ نو ستمبر کا دن تھا جو نائن الیون کے نام سے معروف ہے۔

پورے امریکا میں کہرام مچا ہوا تھا۔ حکومت نے تمام فلائٹس کینسل کر دی تھیں اور امریکا کی بدنامِ زمانہ خفیہ ایجنسیاں سی آئی اے اور ایف بی آئی حرکت میں آگئی تھیں۔

امریکی صدر جارج بش نے اسے دہشت گردی قرار دیا تھا اور اس کا ذمے دار مسلمانوں کو ٹھہرایا تھا۔

انہیں اس سازش کے ماسٹر مائنڈ کی تلاش تھی۔ ایف بی آئی نے سیکڑوں مسلمانوں کو محض شبہے کی بنا پر حراست میں لے لیا تھا۔ پورے امریکا میں سوگواری طاری تھی۔

امریکا کے سابق صدر بل کلنٹن تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے ٹریڈ سینٹر کے ملبے پر کھڑے ہو کر ایک پُرجوش تقریر کی اور کھل کر اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس دہشت گردی میں سو فیصد مسلمان دہشت گردوں کا ہاتھ ہے۔

''بابر!'' مریم نے تشویش سے کہا۔ ''اب تو ہم کوئی پلین بھی چارٹر نہیں کر سکتے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ہم سولہ تاریخ والی عام فلائٹ سے روانہ نہیں ہو سکیں گے۔''

''تو کیا بائی روڈ چلیں؟'' میں نے اسے چڑانے کو کہا۔

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ میری جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔'' مریم نے جھنجلا کر کہا۔

''تو اپنی اس جان کو سولی سے اتار لو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی دو چار دن میں حالات انشاء اللہ نارمل ہو جائیں گے تو ہم پاکستان کے لیے کوئی فلائٹ چارٹر کر لیں گے۔'' میں نے اسے پھر بچوں کی طرح بہلایا۔

دو دن تک امریکا میں سوگ کا عالم رہا۔ ہر شخص سہما سہما سا نظر آرہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ امریکی قوم اتنی بزدل ہے۔

یہی واقعہ اگر پاکستان یا افغانستان میں ہوتا تو وہاں کے لوگ سہمنے کے بجائے جوش و خروش میں مبتلا ہو جاتے۔ بس ان میں اور ہم میں یہی فرق تھا۔

وہ پندرہ ستمبر کی منحوس صبح تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے اخبار پر سرسری سی نظر ڈالی اور ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔

مریم قریبی مارکیٹ سے کھانے پینے کی اشیا کی خریداری کے لیے گئی ہوئی تھی۔

اچانک مجھے دروازے کی طرف سے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ بولنے والے انتہائی درشت لہجے میں گارڈ سے بات کر رہے تھے۔

میں نے ٹی وی کی آواز کم کی اور خود دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اب مجھے ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''ہمارا راستہ چھوڑ دو مسٹر! ہمارا تعلق ایف بی آئی سے ہے۔''

''ایف بی آئی سے ہے تو اپنی شناخت کراؤ۔'' گارڈ نے بھی درشت لہجے میں کہا... پھر آہستہ سے بولا۔ ''سوری سر! اصل میں یہاں مسٹر اور مسز بابر کے اتنے دشمن پیدا ہو گئے ہیں کہ ہمیں سختی کرنا پڑتی ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔

کرخت چہروں والے دو دراز قد امریکن بہت ہی غیر مہذب انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔

ان میں سے ایک درشت لہجے میں بولا۔ ''میرا تعلق ایف بی آئی سے ہے۔'' اس نے اپنے کوٹ کا کالر اٹھا کر اپنا شناختی بیج دکھایا، دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔

جس نے پہلے مجھ سے گفتگو کی تھی، اس کا جسم کسرتی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور سانپ کی طرح چمک دار تھیں۔ سر پر چھوٹے چھوٹے سفید بال تھے جو کھڑے ہوئے تھے کیونکہ وہ کنگھے کی زد میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ دوسرا آدمی اس کے مقابلے میں خاصا مہذب تھا۔ اس کے چہرے پر جو کرختگی تھی، وہ بھی غالباً مصنوعی تھی۔ وہ پہلے آدمی کے مقابلے میں کم عمر بھی تھا اور خوش لباس بھی۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں مسٹر...'' میں نے سفید بالوں والے سے پوچھا۔

''وکٹر!'' اس نے کہا۔ ''میرا نام وکٹر ہے اور آپ کو فوری طور پر میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''کیا آپ مجھے اریسٹ کر رہے ہیں؟'' میں نے تحمل سے پوچھا۔

''سوال جواب میں وقت ضائع مت کرو مسٹر بابر!'' سفید بالوں والا سخت لہجے میں بولا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ...''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ سفید بالوں والے نے اچانک میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بغلی ہولسٹر سے گن بھی نکال لی۔ ''خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔'' وہ غرایا۔

''میں کپڑے تو بدل لوں۔'' میں نے کہا۔

''تم وہاں کسی پارٹی میں نہیں جا رہے ہو۔'' اس نے مجھے دروازے کی طرف کھینچا۔

''او کے، میرا گریبان چھوڑو، میں چل رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔

میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ باہر ان کی بیوک موجود تھی۔ اس میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔

سیکیورٹی ایجنسی کے گارڈ نے سب کچھ بے بسی سے دیکھا لیکن ایف بی آئی کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

انہوں نے مجھے عقبی نشست پر اپنے بیچ میں بٹھایا، پھر سفید بالوں والے نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک بلائنڈ فولڈ میری آنکھوں پر چڑھا دیا۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟

میں گاڑی کے دائیں بائیں مڑنے سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کس جگہ سے گزر رہے ہیں لیکن پھر میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔

وہ لوگ یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھے لے جا رہے تھے۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہاں پہنچ کر میں ان کی غلط فہمی رفع کر دوں گا۔

گاڑی تقریباً آدھ..... یا پون گھنٹے تک چلتی رہی، پھر ایک جگہ رک گئی۔ وہاں ٹریفک کا شور بھی قدرے کم تھا۔ سفید بالوں والا میری بائیں جانب بیٹھا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا، پھر اچانک انتہائی بے رحمی سے مجھے بھی باہر گھسیٹ لیا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس لیے پختہ فرش پر گر گیا۔ گرنے سے میرے گھٹنوں اور ہتھیلیوں کی جلد ادھڑ گئی۔

پھر کسی نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان لوگوں کی ہڈی پسلی ایک کر دوں۔ معاملہ اگر ایف بی آئی کا نہ ہوتا تو شاید اب تک میں ان میں سے کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا۔

اچانک میری آنکھوں سے بلائنڈ فولڈ ہٹا دیا گیا۔ وقتی طور پر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

وہ کوئی ہال نما کمرا تھا۔ اس کی دیواریں بالکل سپاٹ

تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بیضوی میز اور اس کے اردگرد کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر پانچ مکروہ صورت امریکن بیٹھے تھے۔ پانچواں میز کے ایک سرے پر تھا اور دو دو آدمی اس کے دائیں بائیں تھے۔

سرے پر بیٹھا ہوا آدمی مجھے ان سب سے زیادہ سینئر لگ رہا تھا۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف تھا، رنگ تانبے کی طرح سرخی مائل تھا اور اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں ان سے دگنا موٹا سگار دبا ہوا تھا۔

''مسٹر بابر خان!'' دائیں سرے پر ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں ہی بابر خان ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' ان کے افسر نے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

میں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''بابر خان سن آف دلاور خان!'' گنجے نے پوچھا۔

''یس!'' میں نے مختصر جواب دیا' مبادا میرے منہ سے کوئی سخت بات نکل جائے۔

''تعلق پاکستان سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

گنجا اچانک بپھر گیا۔ ''میرے سوالوں کا درست جواب دو، اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ کہہ سکتے ہیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اصل میں میرا تعلق افغانستان سے ہے لیکن ہمارا خاندان برسوں سے پاکستان میں مقیم ہے۔ ویسے پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس کے حوالے سے میں پاکستانی ہوں۔''

''تم یہاں کیوں آئے تھے؟'' بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔ اس کی آواز بلغم زدہ تھی۔

''میں یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں کیلی فورنیا یونیورسٹی...''

گنجے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کر دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس تمہارا مکمل ڈیٹا موجود ہے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''تم یو ایس اے میں گزشتہ سات سال سے مقیم ہو۔ اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں رہتے ہو اور تمہارے اخراجات بھی شاہانہ ہیں۔'' گنجے نے ایک فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اتنی رقم کہاں سے ملتی ہے؟''

''میں کوئی غریب یا نادار نہیں ہوں سر!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میرا باپ ایک کروڑ پتی صنعت کار ہے۔''

''تم یہاں ایم بی اے کی تعلیم کے لیے آئے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے کے باوجود تم یہاں سے نہیں گئے؟''

''میرے پاس یو ایس اے کا ملٹی پل ویزا ہے اور...''

''میں جانتا ہوں۔'' گنجے نے میری بات کاٹ دی۔ ''اس کے بعد تم نے کیلی فورنیا کے ایک بہت مہنگے فلائنگ کلب میں داخلہ لیا اور فلائنگ میں مہارت حاصل کی؟''

''فلائنگ میرا شوق ہے سر!'' میں نے جواب دیا۔

''پھر تم نے آئی ٹی کے ایک بہترین انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا لیکن وہاں چند ماہ کمپیوٹر کی مخصوص ٹریننگ لینے کے بعد وہ کورس ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہو؟''

''بس میں اب یہاں سے اکتا گیا تھا اور وطن واپس جانا چاہتا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم نے یہاں کی ایک لڑکی کلارا کو مسلمان کرنے کے بعد اس سے شادی کر لی؟''

''کیا میں قانونی طور پر ایسا نہیں کر سکتا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''القاعدہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''القاعدہ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''مسٹر بابر! ہمیں سختی پر مجبور مت کرو۔ القاعدہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کیا یہ کسی شہر کا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم شرافت سے کچھ نہیں بتاؤ گے۔'' گنجے نے کہا۔ ''میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا جسے تم نے گنوا دیا۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''وکٹر! اب تم اس سے اپنے طریقے سے پوچھو۔'' گنجے نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بقیہ چار افراد بھی اٹھ گئے۔

وکٹر وہی سفید بالوں والا شخص تھا جو مجھے یہاں لایا تھا۔

اس نے اچانک پشت سے میری گردن دبوچ لی اور گردن پکڑے پکڑے مجھے اٹھا لیا۔ پھر وہ اسی انداز میں مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔

باہر خاصا طویل کوریڈور تھا۔ اس کوریڈور میں آمنے سامنے بہت سے کمرے تھے۔

وہ مجھے ایک کوریڈور کے بائیں طرف والے پانچویں کمرے میں لے گیا۔

اس کمرے کے اندر کچھ فاصلے پر مضبوط سا ایک دروازہ بھی موجود تھا۔

وکٹر نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور دروازے کے الیکٹرانک سسٹم سے دروازہ کھول لیا۔

کمرے میں صرف بوسیدہ سا ایک کارپیٹ پڑا تھا یا پھر اسٹیل کی دو کرسیاں رکھی تھیں۔ وہاں بہت سے عجیب و غریب آلات بھی تھے لیکن فوری طور پر مجھے ان کا مصرف سمجھ میں نہیں آیا۔

وکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کرسی فرش میں فکس ہے۔ کرسی کے ہتھوں کے ساتھ چمڑے کی بیلٹس لٹک رہی تھیں۔

''ہاں تو مسٹر دہشت گرد!'' اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''القاعدہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ یہ نام میں پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

وکٹر نے اچانک میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کم بخت کا ہاتھ اتنا سخت تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ شاید میرا ہونٹ پھٹ گیا تھا کیونکہ مجھے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔

''تم لوگ اس طرح مجھے ہراساں نہیں کر سکتے۔'' میں نے کلائی کی پشت سے بہنے والا خون صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اب اپنے وکیل کی موجودگی ہی میں تمہارے کسی سوال کا جواب دوں گا۔''

''وکیل؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''دہشت گردوں کا کوئی وکیل نہیں ہوتا۔ تم نے ہماری دو عظیم عمارتوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا، سیکڑوں آدمی ہلاک کر دیے، کھربوں ڈالرز کا نقصان کر دیا۔ اب تم وکیل کی بات کر رہے ہو؟'' وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''طلحہ ابن جعفر کون ہے؟''

میں خاموش رہا۔

''احمد الحسام، ابوبکر محمد اور سعد ابن الصلاح الدین کو تو جانتے ہو گے؟''

میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

اچانک اس نے مجھ پر گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ میں کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔

''دیکھو وکٹر! تم بلاجواز مجھ پر تھرڈ ڈگری کا استعمال نہیں کر سکتے۔''

''تھرڈ ڈگری!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''یہ تو فرسٹ ڈگری بھی نہیں ہے مسٹر دہشت گرد! میں تو تمہارا وہ حشر کر دوں گا کہ ہر شخص عبرت پکڑے گا۔''

''تم لوگ انصاف اور قانون کے علمبردار بنتے ہو، جمہوریت کے چیمپئن کہلاتے ہو، یہی ہے تمہارا قانون؟''

جواب میں اس نے میرے پیٹ میں لات مارنے کی کوشش کی لیکن میں عین وقت پر کروٹ لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اپنی اس ناکامی پر اس نے مجھے انتہائی غلیظ گالیاں دیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بیل جیسی گردن توڑ دوں۔

پھر اس نے مجھے ایسی غلیظ گالی دی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا مجرم اگر ہوں تو میں ہوں، میری ماں کا نام اب اپنی زبان پر مت لانا ورنہ...''

''ورنہ کیا کرے گا تو؟'' وہ بپھر کر بولا۔ ''تو نہ جانے کس روسی کی ناجائز اولاد ہے، تیری ماں تو...''

میری آنکھوں کے سامنے اچانک میری ماں کا چہرہ آ گیا پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ میں ایف بی آئی کے ٹارچر سیل میں ہوں۔ میں جھپٹ کر اٹھا اور وکٹر کے منہ پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ اس کے سامنے کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ میرے دوسرے گھونسے نے اس کا جبڑا اہلا دیا۔

وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا، اپنے سر کو جھٹک کر اوسان بحال کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔ ''تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ مجھ پر... تیری تو ماں...''

میں نے پھر اس کے پیٹ میں زوردار لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور چیخا۔ ''ہیلپ... ہیلپ!''

کسی کے آنے سے پہلے ہی میں نے اس کے پیٹ، پسلیوں اور چہرے پر لاتیں مار کے اسے ادھ موا کر دیا۔

اچانک باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور کرخت چہروں والے دو امریکن اندر آ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے اور ان کا رخ میری طرف تھا۔

ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ ''بابر خان! تم نے ایف بی آئی کے ایک ذمے دار افسر پر ہاتھ اٹھا کر اپنی فردِ جرم میں مزید اضافہ کر لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں، تم کتنے بڑے سورما ہو۔ چلو اس کرسی پر بیٹھو۔'' اس نے اسٹیل کی اس کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر میں اس سے پہلے بیٹھا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھا تو اس نے میرے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر رکھے اور کوئی بٹن دبایا۔ ہتھوں کے ساتھ چمڑے کی لٹکی ہوئی بیلٹ سانپ کی طرح میرے دونوں

ہاتھوں پر مضبوطی سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے میرے دونوں پاؤں بھی کرسی کے پایوں کے ساتھ ملائے اور انہیں بھی مضبوطی سے باندھ دیا۔

اس کرسی کی پشت عام کرسیوں سے خاصی اونچی تھی۔ اس نے میرا سر کرسی کی پشت سے لگایا اور اسے بھی پشت کے ساتھ جکڑ دیا۔ میرے ماتھے سے بیلٹ اتنی مضبوطی سے باندھی گئی کہ میں اپنا سر دائیں بائیں ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر اس نے آواز دے کر کسی کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”ڈکٹر کو فوراً اسپتال شفٹ کرو۔“

ڈکٹر اس وقت بے ہوش تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

”اب دعا کرنا کہ یہ مرنے نہ پائے ورنہ چیف تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کر دے گا۔“

”میں تو چاہتا ہوں کہ یہ ابھی اور اسی وقت مر جائے۔ اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔“

”اگر اب میں تمہیں ماں کی گالی دوں تو تم کیا کرو گے؟“ اس نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

”اگر میرے ہاتھ کھلے ہوں تو تیرا بھی یہی حشر کروں گا۔ وہ تو سور کی طرح سخت جان ہے۔ میری مار برداشت کر گیا لیکن تو تو یہیں دم توڑ دے گا۔“

اس نے بھنا کر میرے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ”بتا، یہاں القاعدہ کا ٹھکانا کہاں ہے؟“

”القاعدہ کا ٹھکانا نیویارک میں ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ایک عمارت میں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن وہ تو تباہ ہو گیا۔“

ان میں سے ایک آدمی نے وہاں رکھی ہوئی بڑی سی بالٹی اٹھائی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، انہوں نے وہ بالٹی میرے سر پر اوندھا دی۔

کرسی کی پشت اور میرے سر کا حصہ اس کے نیچے آ گیا۔

”بتا القاعدہ سے تیرا کیا تعلق ہے؟“

اس کے ساتھ ہی ایسا لگا جیسے میرے کان کے پاس انتہائی طاقتور بم پھٹا ہو۔ ان میں سے کسی نے بالٹی پر ڈنڈے سے ضرب لگائی تھی۔

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دوسری ضرب اس سے بھی زیادہ زوردار تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ دماغ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا۔

پھر بالٹی پر مسلسل چوٹیں پڑتی رہیں۔ میں بالکل بے حس ہو کر رہ گیا تھا، سوچنے سمجھنے کی ساری قوت مفلوج ہو کر رہ گئی اور اب مجھے کچھ احساس نہیں تھا۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو وہ بالٹی میرے سر پر نہیں تھی لیکن میری آنکھوں کے عین سامنے شاید ہزار واٹ کا بلب روشن تھا۔ میری آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن بلب کی وہ منحوس روشنی مجھے بند آنکھوں سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہاں تمہارا گینگ لیڈر کون ہے؟“

”میرا کوئی گینگ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میری قوتِ سماعت کام کر رہی ہے۔

”تم القاعدہ کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ القاعدہ کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے بلکہ بندھے ہوئے میرا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔ صبح میں نے صرف ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا اور اب نہ جانے کتنے گھنٹے گزر چکے تھے۔ بھوک اور پیاس کے باعث میں نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان چوٹوں کی تکلیف الگ تھی جو ان لوگوں کے لاتوں اور گھونسوں سے پہنچی تھیں۔

وہ لوگ مجھ سے اسی قسم کے اوٹ پٹانگ سوال کرتے رہے، پھر مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

بلب کی تیز روشنی میری آنکھوں کے ذریعے پورے جسم کو تہ و بالا کیے دے رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا دماغ ابلتے ہوئے پانی کی طرح کھول رہا ہے۔

اسی حالت میں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شاید ایک گھنٹا یا دو گھنٹے۔

میں نے کرسی پر ہلنے کی کوشش کی تو مجھ سے جنبش بھی نہ کی گئی۔ ان حرام زادوں نے مجھے اس بیدردی سے باندھا تھا کہ مجھے اپنے ہاتھوں اور پیروں کا دورانِ خون رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے مریم کا خیال آیا۔ نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا؟ سیکیورٹی گارڈ نے اسے بتا تو دیا ہوگا کہ ایف بی آئی والے مجھے لے گئے ہیں لیکن وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔ اگر باپ سے اس کے تعلقات اچھے ہوتے تو شاید وہ میرے لیے کچھ کر سکتی۔

بلب کی روشنی اتنی تیز تھی کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا اگر مزید کچھ دیر یہی صورتِ حال رہی تو میں بصارت سے محروم ہو جاؤں گا۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود وہ روشنی میری

آنکھوں میں بُری طرح چبھ رہی تھی۔

میں نے سوچا، یہ القاعدہ کیا ہے؟ کیا یہ کوئی تنظیم ہے؟ انڈر ورلڈ مافیا کا کوئی گینگ ہے یا کسی سیاسی پارٹی کا نام ہے؟ عربی کا یہ نام کسی سیاسی پارٹی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ انڈر ورلڈ مافیا کے نام بھی ایسے نہیں ہوتے۔ مجھے اس کا نام سن کر بچپن میں پڑھا ہوا قاعدہ یاد آتا تھا جس کے ذریعے میں نے الف، ب پڑھنا سیکھی تھی۔

روشنی کی حدت اور مسلسل چکا چوند سے میں ایک بار پھر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں اس منحوس کرسی پر نہیں تھا بلکہ فرش پر پڑا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، میرے پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔

ایف بی آئی کا وہی کرخت اور مکروہ صورت افسر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

”ہاں مسٹر بابر خان! کچھ یاد آیا؟“

”مجھے جو کچھ... یاد... تھا... میں نے... بتا دیا ہے۔“ میں نے بہ مشکل تمام کہا کیونکہ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

”مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔“ میں نے کہا تو مجھے اپنے انداز اور آواز پر خود بھی شرمندگی ہوئی۔

”تمہیں کھانا بھی ملے گا اور پانی بھی۔“ وہ منحوس مکروہ انداز میں مسکرایا۔ ”تم صرف اپنے گینگ لیڈر کا نام بتا دو؟“

”تم... ایک... ہی... سوال... کتنی دفعہ... پوچھو گے؟“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے ساتھ آنے والے کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً پانی کی بوتل لے آیا۔

اس منحوس نے بوتل میرے منہ سے لگائی اور میں نے ابھی ایک ہی گھونٹ لیا تھا کہ ہٹا لی۔ ”ہاں، اب بتاؤ۔ القاعدہ کا ٹھکانا کیلی فورنیا میں کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا؟“ میں جھنجلا کر چیخا۔

اس منحوس نے افسردگی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”میں تو چاہتا تھا کہ تم صحیح سلامت اس سیل سے باہر نکلو لیکن تم خود ہی ایسا نہیں چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس نے اپنے آدمی کو مخاطب کیا۔ ”سائمن! اسے الٹا لٹکا دو۔“

سائمن نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چھت پر پنکھے کا کنڈا لگا تھا۔ اس میں ایک چرخی لگی تھی۔ چرخی سے ایک زنجیر منسلک تھی جس کے دونوں کنارے دیوار کے ساتھ ایک ہک میں لگے ہوئے تھے۔ پہلے مجھے بالٹی، زنجیر اور چرخی کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اب میں سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ یہ سب ایذا رسانی اور تشدد کے آلات تھے۔ پاکستانی پولیس تو فضول میں بدنام ہے۔ یہ حرام زادے تو اس سے کئی ہاتھ آگے تھے۔

سائمن نے زنجیر کے ذریعے مجھے لمحوں میں سر کے بل لٹکا دیا۔

اچانک دروازہ کھلا اور وہی گنجا اندر داخل ہوا جو کانفرنس روم میں مجھ سے سوال جواب کرتا رہا تھا۔

”سائمن! اسے کھانے کو کچھ دیا؟“

”نو سر!“ سائمن نے جلدی سے کہا۔

گنجا، اس مکروہ صورت افسر کی طرف مڑا جس کا نام بھی ابھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ ”احمق ہو تم لوگ، یہ مرنا نہیں چاہیے۔ اسے کھانا کھلاؤ، پانی پلاؤ۔ اگر یہ مر گیا تو ہم میں سے کئی لوگ اپنی موت آپ مر جائیں گے۔“

گنجا انگلش کے بجائے فرانسیسی میں بات کر رہا تھا، بس اس منحوس کو یہ علم نہیں تھا کہ میں فرنچ بھی جانتا ہوں اور جرمن بھی۔ زبان دانی کی خداداد صلاحیت مجھے بابا سے ورثے میں ملی تھی۔ روسی زبان تو بابا نے اسی وقت مجھے سکھا دی تھی جب میں پرائمری اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ فی الحال یہ لوگ مجھے ہلاک نہیں کریں گے۔

گنجے کے حکم پر سائمن نے مجھے نیچے اتار لیا اور خود باہر نکل گیا۔

گنجا اس کرخت صورت تفتیشی افسر سے مخاطب ہوا۔ ”بیکر! اس نے کچھ بتایا؟“

”نہیں سر!“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ میں القاعدہ کا نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔“

گنجے کی زبانی مجھے اس منحوس کا نام معلوم ہوا، بیکر! اس کی شکل بھی کسی بیکری کی طرح تھی۔

”مسٹر بابر!“ گنجا مجھ سے بولا۔ ”میں آپ کے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں۔ لیکن آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے کہ ہمیں دوبارہ آپ کو باندھنا پڑے۔“

”اگر تمہارے آدمیوں نے اپنی زبانیں قابو میں رکھیں اور مجھے ماں اور بہن کی گالیاں نہ دیں تو میں بھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔“

”سر اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“ بیکر نے کہا۔

”تمہارے دماغ کو زنگ لگ گیا ہے بیکر!“ گنجے نے درشت لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہے کہ تم اب ریٹائرمنٹ لے لو۔

احمق! اس کی گرفتاری کی خبر میڈیا پر آچکی ہے۔ ہم لاکھ انکار کریں لیکن سیکیورٹی ایجنسی کا وہ گارڈ اس بات کا گواہ ہے۔ اس بے وقوف وکٹر نے اپنی شناخت ظاہر کر کے بہت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی بیوی نے پریس کے ذریعے ہمارا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ وکٹر کو اپنی شناخت ظاہر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس پر تو پہلے بھی حملے ہو رہے تھے۔ اس کی گمشدگی کو بھی اسی قسم کی کارروائی سمجھا جاتا۔''

''لیکن سر! اس صورت میں سیکیورٹی ایجنسی کا وہ گارڈ مارا جاتا یا پھر وکٹر اور اس کا ساتھی کام میں آجاتے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ کوئی معمولی سیکیورٹی ایجنسی نہیں ہے۔ گارڈ چند منٹ میں ایجنسی سے مزید گارڈز کو بلا سکتا تھا۔''

''اس پر تھرڈ ڈگری کا استعمال اس انداز میں کرو کہ اس کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہ ہو۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میڈیا کے پریشر سے تنگ آکر کسی بھی وقت اسے طلب کر سکتا ہے۔''

یہ تمام گفتگو ان لوگوں نے فرنچ میں کی تھی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اطمینان ہوا کہ مریم پریس کے ذریعے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ پر دباؤ ڈال رہی ہے۔

سائمن نے میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔

کافی دیر تک میں یونہی بے سدھ مُردوں کی طرح پڑا رہا۔ میرے ہاتھ اس بُری طرح اکڑ گئے تھے کہ فوری طور پر میں اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

''دیکھو بابر! اب کوئی حماقت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر گنجا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''بابر خان! دعا کرو کہ وکٹر کی صحت یابی سے پہلے تم یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ انتہائی ظالم اور کینہ پرور آدمی ہے۔ وہ اتنا سرکش ہے کہ نہ وہ مسٹر آرنلڈ کی پروا کرے گا، نہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور میڈیا کی۔ وہ تمہیں بہت اذیت ناک انداز میں ہلاک کرے گا۔''

میرے ہاتھوں اور پیروں میں خون کی روانی کسی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''مسٹر بیکر!'' میں نے کہا۔ ''اگر وکٹر اتنا ہی خوف ناک ہے تو اسے پھر ایک مرتبہ یہاں بھیج دینا لیکن میرے ہاتھ مت باندھنا۔ میں بھی دیکھوں گا کہ وہ کتنا سخت جان ہے۔''

سائمن ایک ٹرے میں کھانے پینے کا سامان لے کر آگیا۔ وہ کھانا میری توقع کے خلاف تھا۔ اس میں بیف برگر تھا، انڈوں کا آملیٹ تھا، مکھن تھا اور بھاپ اڑتی کافی کا ایک مگ تھا۔ ٹرے میں پانی کی ایک بوتل بھی تھی۔

میں نے سب سے پہلے پانی کی بوتل اٹھائی اور اسے منہ سے لگا لیا۔ مجھے ہر دم یہی دھڑکا تھا کہ بیکر اب میرے ہاتھ سے بوتل چھین لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پانی پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں بھرپور توانائی آگئی ہو۔

پھر میں نے کھانے پر ہاتھ صاف کیا اور منٹوں میں بھری ٹرے کا صفایا کر دیا۔

اس کے بعد گرما گرم اور لائٹ کافی کا ہر گھونٹ میرے جسم میں ایک نئی تازگی کا باعث بنا۔

کھانے کے بعد بیکر نے مجھ سے کہا۔ ''بابر خان! اب میں تمہیں سوچنے کے لیے صرف آدھا گھنٹا دے رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی تم نے کچھ نہ بتایا تو تمہیں یہاں سے ایسے سیل میں منتقل کر دیا جائے گا کہ یہ سیل تمہیں فائیو اسٹار ہوٹل کا کوئی کمرا محسوس ہو گا۔''

وہ انتہائی نخوت سے پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ میں ان لوگوں کو اپنی بے گناہی کا یقین کیسے دلاؤں؟ کیا میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں مسلمان تھا؟ اور میں مسلمان بھی کب تھا؟ میرا نام ہی صرف مسلمانوں والا تھا اور نہ مجھ میں بھی ہر وہ بُرائی تھی جو امریکن معاشرے کا خاصہ ہے۔ نماز شاید میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ روزہ تو میں نے آج تک نہیں رکھا تھا۔ میں اپنے فعل سے کسی بھی طرح سے مسلمان نہیں تھا۔ مجھے تو قرآن پاک کی چند ایک آیات کے سوا کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ آیات بھی بچپن میں مجھے اماں نے یاد کرائی تھیں۔ ہاں، انہوں نے مجھ پر ایک احسان ضرور کیا تھا کہ ایک قاری صاحب سے قرآن پاک کی ناظرہ تعلیم دلوا دی تھی لیکن میں نے تو برسوں سے اس مقدس کتاب کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ مجھے ایک لمحے کو خود پر شرم آئی اور میں نے سوچا کہ شاید یہ میری اسی غفلت کا نتیجہ ہے جس کی سزا میں آج بھگت رہا ہوں اور سزا کی تو ابھی ابتدا تھی۔ میں نے ایف بی آئی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد بیکر کا منحوس چہرہ مجھے پھر دکھائی دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''بابر خان! مجھے امید ہے کہ تم نے اب تک سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا؟''

''میں تو شروع سے سچ ہی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''گویا القاعدہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں نے اس سے پہلے القاعدہ کا نام بھی نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔

''تم نے ایم بی اے کے بعد فلائنگ کورس کیوں کیا؟''

''مجھے فلائنگ کا شوق ہے مسٹر بیکر!''

''اگر تمہیں فلائنگ ہی کا شوق تھا تو تم نے ایم بی اے کیوں کیا؟''

''ایم بی اے میرا پروفیشن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور کیا قانونی طور پر فلائنگ کا کورس کرنا کوئی جرم ہے؟''

اس نے اچانک میرے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''مجھے قانون مت سکھاؤ۔ تم یہاں کے اسلامک سینٹر بھی جاتے رہے ہو، کیوں؟ بہ قول تمہارے تم نماز وغیرہ کے پابند بھی نہیں ہو؟''

''میں اپنے نکاح کے سلسلے میں اسلامک سینٹر گیا تھا۔ میں نے کلارا کو مسلمان کرنے کے بعد ہی اس سے شادی کی ہے۔''

''تو تمہیں اس بات سے انکار ہے کہ القاعدہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں پھر وہی سوال دہرایا۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ہم نے ان تمام مسلمان نوجوانوں کو گرفتار کر لیا ہے جو فلائنگ کلب میں تمہارے ساتھ تھے۔''

''تو پھر انہی سے پوچھ لو کہ القاعدہ سے میرا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟''

''دیکھو بابر خان!'' بیکر نے کہا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ جتنی رعایت کرنا تھی، وہ کر چکا۔ اب میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ...''

''میں بھی آخری دفعہ جواب دے رہا ہوں کہ القاعدہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے پھر میرے چہرے پر تھپڑ مارا اور سائمن کو کوئی اشارہ کیا۔

سائمن فوراً کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز کمرے کے درمیان گھسیٹ لایا۔ اس میز کی بناوٹ عجیب تھی۔

بیکر نے اچانک میرے پیٹ میں گھونسا مارا اور ان دونوں نے گھسیٹ کر مجھے میز پر لٹا دیا۔

بیکر کے ہاتھ میں پھر ایک دفعہ مجھے ریوالور نظر آیا۔ ''کوئی بھی حماقت کرنے کی کوشش مت کرنا۔'' اس نے کہا۔ پھر سائمن سے بولا۔ ''اس کے کپڑے اتارو۔''

سائمن نے فوراً ہی مجھے بے لباس کر دیا۔ اس نے میرے جسم پر کپڑے کی دھجی تک نہیں چھوڑی۔

زندگی میں پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ بے لباس آدمی کتنا بے بس، مجبور اور شرمندہ ہوتا ہے۔

پھر سائمن نے میز کے ساتھ لگے ہوئے چمڑے کے تسموں سے میرے ہاتھ باندھ دیے۔

اس کے بعد انہوں نے میرے پیر باندھے اور سائمن نے میز کے نیچے لگا ہوا کوئی ہینڈل گھمانا شروع کیا۔ اس قسم کے ہینڈل یا لیور اسپتالوں کے بیڈ میں ہوتے ہیں جن کی مدد سے بیڈ کے سرہانے کو اوپر یا نیچے کیا جا سکتا ہے لیکن اس ہینڈل سے تو میز میرے پیروں کی طرف سے چوڑائی میں کھلتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے دونوں پاؤں بھی کھل رہے تھے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے لگا، میرے دونوں پیر اتنے کھنچ جائیں گے کہ میرا وجود درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

سائمن نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ میری دونوں ٹانگیں مخالف سمت میں چری ہوئی تھیں اور میں شدید کرب میں مبتلا تھا۔

''کچھ یاد آیا بابر خان!'' بیکر کی آواز بھی مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

میں نے شدت کرب سے تڑپتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا... اللہ کے واسطے میری بات کا یقین کرو... مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔''

بیکر نے سائمن کو پھر اشارہ کیا اور میری ٹانگیں مزید کھلنے لگیں۔ میرے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی، پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کمرے کا منظر وہی تھا لیکن میری دونوں ٹانگیں اب اس حالت میں نہیں تھیں لیکن تکلیف کا شدید احساس اب بھی موجود تھا۔

''بابر خان!'' بیکر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہاری زبان کھلوانے میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا لیکن میں مسٹر آرنلڈ کی وجہ سے مجبور ہوں۔ اگر میں تمہارا ایک کان کاٹ دوں تو کیسا رہے؟''

''میں اس وقت... تمہارے... قبضے... میں ہوں... تم... میرے دونوں کان... بھی کاٹ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے جھنجلا کر مجھ پر گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میرے جسم کا رواں رواں اس وقت شدید کرب میں

مبتلا تھا۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”بیکر... مجھے... زندہ... مت چھوڑنا... مجھے... ابھی... اور... اسی وقت مار دو..... ورنہ.... تم لوگ.... بہت پچھتاؤ گے۔“

”ہاں، اب آئے نا لائن پر۔“ بیکر مکروہ انداز میں مسکرایا۔ ”تمہارے کہنے کا مقصد یہی ہے نا کہ بعد میں تم القاعدہ کی مدد سے ہم سے انتقام لوگے؟“ اس نے کہا۔

”مجھے... کسی... کی مدد... کی ضرورت نہیں ہے... میں... تم لوگوں... کے لیے اکیلا ہی... کافی ہوں۔“

جواب میں اس نے مجھ پر پھر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ اس نے مجھے اتنی بے رحمی سے مارا تھا کہ میں ایک مرتبہ پھر ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کمرے میں صرف سائمن موجود تھا۔ میں اسی طرح میز پر بندھا ہوا تھا۔

وہ شخص بیکر کے مقابلے میں مجھے کچھ نرم دل محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”مسٹر سائمن! مجھے تھوڑا پانی پلا دو۔“

وہ فوراً پانی کی بوتل لے آیا اور بولا۔ ”مسٹر بابر! آپ جلدی سے پانی پی لیں۔ بیکر آگیا تو میری بھی کم بختی آجائے گی۔ ان یہودیوں میں تو ذرہ برابر بھی انسانیت نہیں ہوتی۔“

میں نے ایک ہی سانس میں پانی کی بوتل خالی کردی۔

سائمن بوتل دوبارہ باہر رکھ آیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بیکر کیا یہودی ہے؟“

”اپنے یہودی باپ کی ناجائز اولاد ہے۔“ سائمن نے کہا۔ ”اور بہت فخر سے لوگوں کو بتاتا ہے کہ میں اپنے والدین کی ناجائز اولاد ہوں اس لیے مجھ سے کسی نیکی کی توقع مت رکھنا۔ اسی کی طرح وکٹر بھی یہودی ہے۔ آپ نے اسے اس بُری طرح مارا ہے کہ وہ زندگی بھر اسے یاد رکھے گا۔ اس کے سامنے کے پانچ دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ بائیں شانے اور دائیں ٹخنے میں فریکچر ہے اور اس کی کالر بون بھی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ تین چار مہینے سے پہلے اسپتال سے نہیں آئے گا۔ اس مردود نے تو ہماری زندگی بھی حرام کردی ہے۔ اس کی پٹائی کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”آپ نے تو کئی گھنٹے سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے سینڈوچز لے کر آتا ہوں۔“

”رہنے دو سائمن!“ میں نے کہا۔ ”اگر بیکر آگیا تو تم بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

”آپ فکر مت کریں۔ میں بھول گیا تھا۔ مجھ سے مسٹر آرنلڈ نے کہا تھا کہ آپ کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھوں۔ بیکر آبھی گیا تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ یہ مسٹر آرنلڈ کا حکم ہے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں حیرت سے سوچتا رہا کہ اس بدنامِ زمانہ ادارے میں ملازمت کرنے کے باوجود سائمن کے اندر ابھی انسانیت باقی ہے۔

وہ فوراً ہی لوٹ آیا۔ وہ چکن برگر، کولڈ ڈرنکس کے دو ٹن اور کچھ سینڈوچز لایا تھا۔

اس نے ہاتھ کھولے بغیر مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے مجھے برگر کھلانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ”مسٹر سائمن! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ اگر یہاں سے زندہ نکل گیا تو تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ گو کہ میں تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا لیکن کوشش تو کرسکتا ہوں۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور مجھے گنجے آرنلڈ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے بیکر بھی چلا آرہا تھا۔

”کل ایک سمری کورٹ میں تمہارے خلاف دہشت گردی کا مقدمہ چلے گا۔“ آرنلڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تو پھر مجھے وکیل سے بات کرنے کی اجازت دیں۔“ میں نے کہا۔

”وکیل بھی تمہیں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ہی کی طرف سے مہیا کیا جائے گا۔“ اس نے کہا پھر سائمن سے مخاطب ہوا۔ ”اس کے ہاتھ پاؤں کھول دو اور اس کے کپڑے اسے دے دو۔“

☆☆☆

دوسرے دن میں پھر اسی ہال نما کمرے میں موجود تھا جس میں مجھے پہلی بار لایا گیا تھا۔ کرسیوں کی ترتیب وہی تھی۔ البتہ وہاں مجھے دو تبدیلیاں نظر آئیں۔ گنجے آرنلڈ کی جگہ گھنی سفید مونچھوں اور اس سے بھی زیادہ گھنی سفید بھوؤں والا ایک امریکن موجود تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مکروہ انداز میں مسکرایا۔

اس بار مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا گیا بلکہ گھنی مونچھوں والے کی انتہائی دائیں ایک گوشے میں کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ میری پشت پر دو مسلح افراد مسلط تھے اور ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے خلافِ معمول سانس لینے کی کوشش بھی کی تو وہ مجھے گولی ماردیں گے۔

سفید مونچھوں والے نے بے دلی سے میرا بیان لیا۔ وہ سارا وقت اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف رہا۔

آرنلڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ اسٹیٹ کی طرف سے مجھے وکیل مہیا کیا جائے گا لیکن وہاں وکیلِ صفائی تو ایک طرف رہا، وکیلِ استغاثہ بھی موجود نہیں تھا۔ نہ وہاں کسی قسم کی کوئی جیوری تھی۔ مجھے تو یہ عدالتی کارروائی بھی ان لوگوں کا ایک ڈھونگ ہی لگ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”یور آنر! مجھ سے کہا گیا تھا کہ اسٹیٹ کی طرف سے مجھے وکیل مہیا کیا جائے گا۔ میں اپنے وکیل سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وکیل؟“ سفید مونچھوں والے نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیسا وکیل مسٹر بابر خان! یہاں تم اپنے وکیل خود ہی ہو۔“ پھر اس نے لیپ ٹاپ پر نظریں جمائیں اور اسے بند کر کے گونج دار آواز میں بولا۔ ”بابر خان ولد دلاور خان! تم پر ریاست کے خلاف دہشت گردی کے اس منصوبے میں شریک ہونے کا الزام ثابت ہوگیا ہے۔ تم امریکا دشمنی میں دشمنوں کے آلۂ کار بنے، ایک دہشت گرد تنظیم کا ساتھ دینے کے لیے فلائنگ کی اعلیٰ تربیت حاصل کی اور کمپیوٹر میں مہارت حاصل کی۔ ایف بی آئی کے ایک ذمے دار افسر پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس لیے تمہیں سزا کے طور پر اس وقت تک گوانتاناموبے میں رہنا ہوگا، جب تک تم القاعدہ کے تمام ارکان اور ان کے آپریشنل ہیڈ کی نشان دہی نہیں کردیتے۔“ پھر اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”مسٹر بابر خان! تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟“

”مجھے جو کچھ کہنا تھا، اپنے بیان میں کہہ چکا ہوں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ عدالت برخاست کی جاتی ہے۔“

”یہ تم کسے دھوکا دے رہے ہو؟“ میں نے سفید مونچھوں والے کو مخاطب کیا۔ وہ اس وقت تک اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیگر لوگ بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ ”مجھے، اسٹیٹ کو، اپنے آپ کو یا اس نام نہاد قانون کو جس کے گن گاتے تم لوگ نہیں تھکتے؟“

میرے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں گارڈز نے آرنلڈ کے اشارے پر مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر کی طرف لے چلے۔

آرنلڈ مجھے پھر اسی سیل میں لے آیا۔ اس نے استہزائیہ انداز میں مجھ سے کہا۔ ”اگر تم میرے سوالوں کا درست جواب دے دیتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ اب میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ تم نے شاید گوانتاناموبے کا صرف نام سنا ہوگا۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں تم چیخ چیخ کر سچ بولو گے اور کوئی نہیں سنے گا، تم موت کی خواہش کرو گے لیکن تمہیں موت بھی نصیب نہیں ہوگی۔ تمہاری سزا کی مدت غیر معینہ ہے۔ جب تک تم تمام نیٹ ورک کی نشان دہی نہیں کردیتے، وہاں سے تمہاری گلوخلاصی نہیں ہوگی۔ تمہیں پرسوں صبح کی فلائٹ سے گوانتاناموبے روانہ کردیا جائے گا۔ اس دوران میں جتنا آرام کرسکتے ہو کرلو کیونکہ اس کے بعد تو آرام اور سکون کا کوئی لمحہ تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا۔“ پھر وہ سائمن سے مخاطب ہوا۔ ”سائمن! تم اس وقت تک مسٹر بابر خان کا ہر طرح خیال رکھنا جب تک یہ یہاں موجود ہے۔“ یہ کہہ کر وہ سیل سے باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”گوانتاناموبے!“

☆☆☆

آرنلڈ کے جانے کے بعد سائمن نے مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”مسٹر سائمن! اب تو مجھے یہاں ساری سہولتیں میسر ہیں، آپ مجھے ایک کپ گرما گرم اور بہترین کافی پلادیں۔“

سائمن نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کا مگ لے کر آگیا اور بولا۔ ”آرنلڈ صاحب نے بیکر اور دوسرے لوگوں کو اس طرف آنے سے منع کردیا ہے۔ انہیں آپ کی طرف سے خطرہ ہے کہ کہیں آپ مایوس ہوکر ان میں سے کسی کا قتل نہ کردیں۔“

”میں کیوں مایوس ہونے لگا؟“ میں نے کہا۔ ”تم میرے لیے ایک ٹوتھ پیسٹ، سیفٹی ریزر، صابن، تولیا وغیرہ کا بندوبست کردو۔ میں نے تین دن سے غسل نہیں کیا۔ ہاں، اگر ممکن ہو تو مجھے کپڑوں اور جوتوں کا ایک جوڑا بھی مہیا کردو۔ ان لوگوں نے تو مجھے معقول لباس تک پہننے کی مہلت نہیں دی۔“

”میں آپ کو کاغذ اور قلم لادیتا ہوں۔ آپ ان چیزوں کی ایک لسٹ بنادیں۔ آرنلڈ صاحب کی منظوری کے بعد ہی وہ چیزیں آپ کو دی جائیں گی۔“

وہ کمرے سے باہر گیا اور ایک قلم اور رائٹنگ پیڈ لے کر واپس آگیا۔

اپنی ضرورت کی اشیا لکھتے وقت مجھے خیال آیا کہ میں اسے مریم کا نمبر بھی تو دے سکتا ہوں۔ ممکن ہے، یہ اس سے رابطہ کرہی لے۔ میں نے ان تمام اشیا کی ایک لسٹ بنائی اور پیڈ کا نچلا حصہ پھاڑ کر اس پر مریم کا سیل نمبر بھی لکھ دیا۔ اس کا

نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ ایک اسی کا کیا، مجھے تو اپنے بیشتر دوستوں اور جاننے والوں کے سیل نمبرز یاد تھے۔

میں نے وہ لسٹ سائمن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سائمن! میرا ایک ذاتی کام کرو گے؟''

''اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا بابر صاحب!'' سائمن نے کہا۔

''میں تمہیں ایک سیل نمبر دے رہا ہوں۔ یہ میری بیوی مریم کا سیل نمبر ہے۔ تم اس سے رابطہ کر کے صرف اتنا بتا دو کہ میں یہاں قید میں ہوں اور اب یہ لوگ مجھے گوانتانا موبے بھیجنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کام تو خطرناک ہے بابر صاحب!'' سائمن نے کہا۔ ''لیکن آپ چونکہ گوانتانا موبے جا رہے ہیں اس لیے میں اسے اپنی جان پر کھیل کر بھی کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''یہ گوانتانا موبے ہے کیا؟ کوئی جیل ہے، ساحل ہے، جزیرہ ہے یا جزائر انڈیمان میں اب بھی کوئی ایسی جگہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ اس بدنامِ زمانہ جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''سچی بات تو یہ ہے سائمن کہ میں نے اب تک رئیس زادوں کی طرح پلے بوائز والی زندگی گزاری ہے۔ میں نے تو کبھی اس جگہ کا نام بھی نہیں سنا۔ میرے اپنے ملک افغانستان میں کیا ہو رہا ہے؟ پاکستان کی تھوڑی بہت صورت حال تو بابا سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یقین جانو میں تو امریکا کے سیکریٹری خارجہ اور سیکریٹری داخلہ کا نام تک نہیں جانتا۔ میں نے گوانتانا موبے کا نام بھی پہلی مرتبہ ان ہی لوگوں سے سنا ہے۔''

''میں آپ کی ضرورت کی چیزیں لے آؤں، پھر تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ وہاں کیا ہوتا ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔''

سائمن مجھے گومگو کی کیفیت میں چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

میں نے بابا جان سے ''کالا پانی'' کے بارے میں سنا تھا۔ جزائر انڈیمان میں وہ خوف ناک جزیرہ تھا جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں آتا تھا۔ بابا جان نے بتایا تھا کہ ان کے دو اجداد کو بھی انگریزوں نے ''کالا پانی'' کی سزا سنائی تھی۔ انہوں نے ایک انگریز کرنل اور اس کے بیٹے کو ذبح کر دیا تھا۔

تو کیا وہ گوانتانا موبے بھی اسی طرح کا کوئی خوف ناک جزیرہ ہوگا جہاں امریکا اپنے دشمنوں اور غداروں کو قید رکھتا ہے؟

سائمن تمام اشیا لے کر آ گیا۔ اسے مریم کو ٹیلی فون کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ایف بی آئی کا ایک شخص اور بھی تھا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر پہلی دفعہ آئینے میں اپنی شکل غور سے دیکھی تو میں چونک اٹھا۔ تین ہی دن میں میرا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ میرے وہ خوب صورت براؤن بال جن پر لڑکیاں مرتی تھیں، اس وقت بے رونق، بدرنگ اور الجھے ہوئے تھے۔ چار دن میں شیو بھی خوب بڑھ گیا تھا۔

میں نے سب سے پہلے شیو کیا، پھر نیم گرم پانی سے غسل کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں دوبارہ زندگی آ گئی ہو۔ میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ نیم گرم پانی سے میری ان چوٹوں کو بہت آرام پہنچ رہا تھا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔

میں نہا دھو کر، نئے کپڑے پہن کر باہر نکلا تو میری شخصیت میں ایک مرتبہ پھر وہی اعتماد پیدا ہو چکا تھا جو یہاں آنے سے پہلے تھا۔

کمرے کا نقشہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہاں مجھے ایک بیڈ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر صاف ستھرا بستر تھا اور ایک کمبل بھی تھا۔

میں نے بیڈ پر نیم دراز ہونے کے بعد سائمن کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''تم نے مریم کو ٹیلی فون کیا؟''

''میں ابھی آرنلڈ صاحب کے ایک کام سے باہر جاؤں گا تو انہیں کال کر لوں گا۔ میں فون تو انہیں یہاں سے بھی کر سکتا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرا نمبر ان تک پہنچے اور ایف بی آئی اس کے سہارے مجھ تک پہنچ کر میری گردن ناپ لے۔''

وہ ایک مرتبہ پھر چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹا رہا، پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ یوں بھی میں کئی دن اور راتوں سے بے آرام تھا۔ میرے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے اور ان میں ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ میں نے سوچا، سائمن سے اس دفعہ کوئی پین کلر اور سکون آور گولیاں بھی منگواؤں گا۔

سائمن کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''بابر صاحب! میں نے کئی دفعہ کوشش کی لیکن آپ کی مسز سے میری بات نہ ہو سکی۔''

''کیوں؟'' میں مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھا۔

''ان کے سیل فون سے ہر دفعہ ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔ میں نے کہا مجھے مسز مریم سے بات کرنا ہے۔ اس

نے کہا، شٹ اَپ! یہاں کوئی مسز مریم نہیں ہوتی۔“
”تم نے مریم ہی کا نمبر ملایا تھا نا؟“
”جی ہاں بابر صاحب!“ سائمن نے کہا۔ ”میں نے دوسری مرتبہ ایک دوسرے نمبر سے آپ کی مسز کا نمبر ملایا اور آواز بدل کر بولا... کیا میں مس کلارا سے بات کرسکتا ہوں؟ دوسری طرف سے پوچھا گیا کہ آپ کون بول رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں مس کلارا کا ایک دوست ہوں۔ اس نے کہا کہ مس کلارا اس وقت موجود نہیں ہیں، واپس آئیں گی تو آپ کو رنگ بیک کرادوں گا۔“

”مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی ہے سائمن! مریم کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔“ میں اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ مریم نہ جانے کس حال میں ہوگی؟“

”میں رات کو ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا۔ ابھی تو آپ کے پاس کل کا دن بھی ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔“

وہ میرے لیے درد رفع کرنے والی گولیاں لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سکون آور گولیاں بھی لے آیا تھا۔

میں نے الٹا سیدھا کھانا زہر مار کیا اور گولیاں کھا کر لیٹ گیا۔

سکون آور دوائیں کھانے کے باوجود بھی مجھے سکون نصیب نہیں ہورہا تھا۔ میرے دماغ میں خیالات کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ مریم کے باپ نے اسے اغوا کرالیا ہے یا پھر قتل کرادیا ہے۔ مجھے ایک امید تھی کہ جس سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات میں نے حاصل کی تھیں، وہ اتنی آسانی سے مریم کو نقصان نہیں پہنچنے دے گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے رات کے نہ جانے کس پہر نیند آگئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میری طبیعت خاصی گڑبڑ تھی۔ گرم پانی سے نہانے کے بعد میں نے ناشتا زہر مار کیا کیونکہ بہ قول سائمن گوانتانامو بے میں تو میں ان اشیا کو دیکھنے تک کو ترس جاتا۔ پھر میں نے پین کلرز لیں اور بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ میں نے سائمن سے کہا۔ ”سائمن، پلیز! آج پھر کوشش کرلو۔ ممکن ہے مریم سے رابطہ ہوجائے۔“

”آپ فکر مت کریں بابر صاحب!“ سائمن نے کہا۔ ”میں ابھی اسی مقصد کے لیے جارہا تھا۔“

میں دوپہر تک سائمن کا بہت بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سائمن کہاں ہے؟“

”سائمن کی ڈیوٹی تبدیل ہوگئی ہے۔ اب میں اس کی جگہ آیا ہوں۔ میرا نام جیکب ہے اور...“

”لیکن سائمن سے میں نے کچھ دوائیں منگوائی تھیں۔“ میں نے مضطرب ہوکر کہا۔

”اگر وہ دوائیں لایا ہوگا تو وہ آرنلڈ صاحب کے پاس ہوں گی۔ وہ ابھی آپ کو بھجوادیں گے۔“

میں نے واقعی سائمن سے پین کلر، چوٹ پر لگانے کا مرہم اور آنکھوں میں ڈالنے کی دوا بھی منگوائی تھی۔ رات سے میری آنکھوں میں جلن ہورہی تھی۔

”اگر تم کہو تو میں آرنلڈ صاحب سے معلوم کرلوں؟“ جیکب نے کہا۔ اس کا لہجہ دوسرے ایف بی آئی والوں کی طرح اکھڑ تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ دوائیں لایا ہوگا تو وہ خود ہی مجھے بھجوادیں گے۔“ میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ ”ہوسکے تو مجھے ایک کپ بلیک کافی لادو۔“ میں نے کہا۔

”یہ لنچ ٹائم ہے۔“ جیکب نے اکھڑ انداز میں کہا۔ ”کافی صرف صبح اور شام کو ملتی ہے۔“

”یہ آرنلڈ کا حکم ہے یا تم خود کہہ رہے ہو؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”یہاں کا تو یہی اصول ہے مسٹر بابر!“ جیکب کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”آرنلڈ کو بلاؤ۔“ میں چیخ کر بولا۔ ”مجھے ابھی اس سے بات کرنا ہے۔“

”آرنلڈ صاحب کوئی فالتو آدمی نہیں ہیں کہ تمہارے بلانے پر دوڑے چلے آئیں گے۔ ویسے بھی کل تمہیں یہاں سے گوانتانامو بے جانا ہے۔ اپنی عادت کیوں خراب کررہے ہو مسٹر بابر؟“

”شٹ اَپ۔“ میں دہاڑ کر بولا۔ ”آرنلڈ کو بلا اور یہاں سے دفع ہوجا ورنہ وہاں جانے سے پہلے تُو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“

لمحے بھر کو جیکب سہم کر رہ گیا۔ اسے مجھ سے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ بہ قول سائمن... گوانتانامو بے جانے والے تو اپنی زندگی سے مایوس ہوجاتے ہیں۔ ان میں ایسا غصہ اور طنطنہ نہیں ہوتا۔

”تُو جاتا ہے یا میں تیری گردن توڑ دوں؟ جب میں نے وکٹر جیسے سانڈ کو ادھ موا کردیا تو تُو کیا چیز ہے؟“

میری چیخ پکار سن کر بیکر کا منحوس چہرہ ایک مرتبہ پھر مجھے دکھائی دیا۔ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے بابر خان؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟“

”یہ تم اپنے اس ذمے دار افسر سے پوچھو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وکٹر کی طرح یہ بھی ذمے داری دکھانے کی کوشش کررہا ہے۔“

”یہ اس وقت کافی کی فرمائش کررہا تھا۔ میں نے انکار کردیا تو آرنلڈ صاحب کو بلانے کی ضد کرنے لگا۔“ جیکب نے کہا۔

”یہ بے چارہ یہاں چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ آرنلڈ صاحب کا خصوصی حکم ہے کہ اس کی کسی بھی بات کو رد نہ کیا جائے۔“

بیکر کے جانے کے بعد جیکب بھی وہاں سے نکل گیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور سائمن کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”سائمن! تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے...“

اسی وقت آرنلڈ کمرے میں داخل ہوا۔ سائمن اسے دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے سائمن پر توجہ دیے بغیر مجھ سے کہا۔ ”مسٹر بابر! آپ کی روانگی میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ رائٹنگ پیڈ اور پین یہاں موجود ہے۔ آپ اپنے کسی دوست، رشتے دار یا بیوی کے نام کوئی پیغام لکھ سکتے ہیں، وہ پیغام انہیں پہنچا دیا جائے گا۔“ پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ جیکب نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی۔ میں نے اسے تنبیہ کردی ہے۔ وہ کل صبح تک ہر طرح سے آپ کا خیال رکھے گا۔“ اس نے ایک نظر سائمن کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم نے بابر خان کو ان کی دوائیں پہنچادیں؟“

”سر! میں وہی دینے آیا تھا۔“ اس نے کہا اور ایک شاپر میری طرف بڑھا کر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

گویا آج بھی مریم سے اس کا رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔

جیکب مسلسل میرے سر پر سوار تھا۔ مجھے اس کی موجودگی سے الجھن ہورہی تھی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”مسٹر جیکب! جب مجھے ضرورت ہوگی تو آپ کو زحمت دے دوں گا۔ اس وقت میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ وکٹر اور بیکر کی طرح مجھے وہ آدمی بھی پسند نہیں آیا تھا۔

جیکب نے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ ”بابر خان! تمہاری روانگی میں اب چند ہی گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میں تو اس خیال سے یہاں رک گیا تھا کہ ممکن ہے وہاں تم کسی سے بات کرنے کو بھی ترس جاؤ۔“

”کیا تم نے گوانتانامو بے دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا تو نہیں ہے لیکن وہاں کے بارے میں ایسی ایسی لرزہ خیز داستانیں سنی ہیں کہ مجھے تمہاری جوانی اور مردانہ وجاہت پر رحم آرہا ہے۔ تم سے تو اس سیل کا ماحول برداشت نہیں ہورہا ہے۔ وہ تو سمجھو جہنم ہے جہنم۔“

”ویسے بھی کون سا مجھے جنت میں جانا ہے۔“ میں نے جبراً مسکرا کر کہا۔ ”چلو مرنے سے پہلے ہی جہنم دیکھ لیں گے۔“

”میں اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے لیے کچھ خطوط لکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں اس کی باتوں سے کچھ پریشان ہوگیا تھا۔

میں نے رائٹنگ پیڈ سنبھالا اور سب سے پہلے مریم کے نام خط لکھا۔ اسے بتایا کہ میں اس وقت ایف بی آئی کی تحویل میں ہوں لیکن کہاں ہوں اس کا مجھے علم نہیں۔ تم حوصلہ رکھنا، میں جلد ہی ان لوگوں کی قید سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔ انہیں کبھی تو میری بے گناہی کا یقین آئے گا۔

دوسرا خط میں نے بابا جان اور اماں کے نام لکھا۔ ”بابا جان! مجھے افسوس ہے کہ میں حسبِ وعدہ پاکستان نہ آسکا۔ اصل میں نہ جانے کیوں ایف بی آئی والوں کو مجھ پر شبہ ہوگیا ہے اور انہوں نے دہشت گردی کے الزام میں مجھے گرفتار کرلیا ہے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا تعلق ”القاعدہ“ سے ہے۔ اب یہ لوگ سزا کے طور پر مجھے گوانتانامو بے بھیج رہے ہیں لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ امریکی قانون اتنا بے بس نہیں ہے کہ ان کا کوئی ادارہ کسی بے گناہ کو ناکردہ گناہ میں ملوث کرے اور وہ آنکھیں بند کیے رکھے۔ بابا جان! آخر میں بہ صد معذرت میں آپ کو ایک اطلاع اور دینا چاہتا ہوں۔ نہ جانے یہ آپ کے لیے خوش خبری ہوگی یا بُری خبر؟ میں نے یہاں کی ایک لڑکی کو مسلمان کرنے کے بعد اس سے شادی کرلی ہے۔ میں اس جسارت پر آپ سے اور خاص طور پر اماں اور اپنی گڑیا بہن سے معافی چاہوں گا۔ ہوسکے تو آپ لوگ اپنے اس بدنصیب بیٹے کو معاف کردیجیے گا اور میری آخری خواہش کے طور پر مریم کو اپنی بہو تسلیم کرلیجیے گا۔ میں نہیں جانتا کہ اس خط کا کتنا حصہ سنسر ہوگا اور کتنا آپ تک پہنچے گا۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اور اماں میری باتوں پر یقین کرلیں۔ میرا کبھی کسی بھی تنظیم یا اس کے رکن سے کوئی تعلق

نہیں رہا۔ القاعدہ کا نام بھی میں نے پہلی دفعہ ان ہی لوگوں کی زبان سے سنا ہے۔ شاید میرا قصور یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن بابا جان! مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی ندامت اور شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں محض نام کا مسلمان ہوں۔ آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ میری تمام غلطیوں کو معاف کر دیجیے گا۔ ممکن ہے، اب آپ سے کبھی ملاقات نہ ہو۔ میں نے گوانتاناموبے کے بارے میں بہت ہولناک داستانیں سنی ہیں۔ میں پھر التجا کروں گا کہ پلیز میری نشانی سمجھ کر ہی مریم کو اپنی بہو تسلیم کر لیجیے گا۔ آپ کا بدنصیب بیٹا بابر!''

خط لکھنے کے بعد میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری نظروں کے سامنے اماں، بابا جان اور اپنی معصوم بہن کا چہرہ آ گیا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رووں۔ شاید مجھے پھر رونے کا موقع بھی نہ ملے۔

میں اپنے بیڈ پر پڑا دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ اگر میں قصوروار ہوتا تو مجھے بالکل افسوس نہ ہوتا لیکن میں تو محض ایف بی آئی کے شبہے کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔

رونے کے بعد دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے باتھ روم میں جا کر اپنا منہ دھویا۔

میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ یہ اس بابر خان کا عکس نہیں تھا جو محفلوں اور پارٹیوں کی جان ہوا کرتا تھا۔ یہ تو ایک بے بس، مجبور انسان کا عکس تھا جس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور جو شکل ہی سے برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

منہ دھو کر ایک مرتبہ پھر میں بیڈ پر لیٹ گیا۔

اچانک وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ دو آدمی برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے میرے بیڈ کی چادر تبدیل کی، دوسرے نے فرش کو گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا پھر وہ جس برق رفتاری سے آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔ میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ ایسا کیا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ اتنی ایمرجنسی میں میرے کمرے کی صفائی ستھرائی کر رہے ہیں؟ انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

باہر سے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں سن کر مجھے یہی لگا کہ شاید ان کا کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے۔

فوراً ہی جیکب میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کور تھا اور دوسرے ہاتھ میں چمکتے ہوئے نئے جوتے۔

''مسٹر بابر! اس سوٹ کور میں آپ کے لیے سوٹ، شرٹ، ٹائی اور کف لنکس ہیں۔ آپ سوٹ پہن کر جلدی سے تیار ہو جائیں۔ آپ کو فوری طور پر یہاں سے کہیں اور شفٹ کیا جا رہا ہے۔''

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی کہ مجھے یہاں سے شفٹ کرنے کے لیے کپڑوں کی تبدیلی کیوں ضروری تھی؟

میں نے وہ چیزیں بے دلی سے ایک طرف ڈال دیں۔

دو ہی منٹ بعد آرنلڈ آ گیا اور حیرت سے بولا۔ ''مسٹر بابر خان! آپ نے لباس تبدیل نہیں کیا؟''

''مجھے ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی کل مجھے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی!'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد کمرے میں جیکب اور بیکر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہروں سے اس وقت کچھ زیادہ ہی نحوست ٹپک رہی تھی۔

''مسٹر بابر کو کانفرنس ہال میں لے آؤ۔'' آرنلڈ نے کہا۔

''سر! میں نے اپنی بیوی اور والدین کے نام خطوط لکھ دیے ہیں۔ انہیں میں نے رائٹنگ پیڈ سے علیحدہ بھی نہیں کیا ہے، یوں بھی آپ لوگ بغیر پڑھے اور سنسر کیے تو انہیں پہنچاتے نہیں۔ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ آپ واقعی وہ خطوط متعلقہ لوگوں تک پہنچا بھی دیں گے۔''

آرنلڈ میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔

بیکر اور جیکب نے مجھے ایک کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ایک مرتبہ پھر کانفرنس روم میں لے جا رہے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔

وہ دونوں ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

اس کے دروازے پر دو باوردی اور مسلح پہرے دار موجود تھے۔

''مسٹر بابر خان!'' بیکر نے ان دونوں سے میرا تعارف کرایا۔

''او کے، آئیے مسٹر بابر!'' ان میں سے ایک نے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ چند لمحوں کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ مجھے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں...

اس سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

پہلا شوہر

مختار آزاد

میاں بیوی کے درمیان پہلے اور دوسرے شوہر کی چپقلش کا دلچسپ احوال...

ازدواجی زندگی کی خوشیاں سکون و اطمینان اور اندھے اعتماد میں چھپی ہوتی ہیں... ان دونوں کی زندگی بھی جذبوں... چاہتوں اور عنایتوں کا حسین امتزاج تھی... مگر اچانک ہی ان کی منشا اور مرضی کے بغیر ان کی زندگی میں کوئی تیسرا در آیا جس کی مداخلت انہیں کسی طور گوارا نہ تھی...

جینی شوہر کی عادت اچھی طرح جان چکی تھی۔ اب اس بات سے وہ چڑنے لگی تھی۔ شادی کی تقریب ہو یا تعزیت کا موقع، اسپتال میں کسی کی عیادت کو جائیں یا بزنس ڈنر پر یا پھر راہ چلتے کوئی شناسا مل جائے۔ شوہر ساتھ ہو تو پھر اُس کے تعارفی کلمات سن کر وہ بُری طرح شرمندہ ہو جاتی تھی۔ کئی بار اس نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر 'ڈھاک کے تین پات' والی مثل ہی رہی۔ جہاں کہیں کوئی شناسا ملا، وہ شروع ہو گیا۔ ''ان سے ملیے، یہ ہیں جینی ہینور، میں ان کا پہلا شوہر ہوں۔'' اتفاق سے اگر کوئی جینی کی جان پہچان کا مل جائے تب بھی وہ انتظار کیے بغیر ہاتھ آگے بڑھاتا۔ ''مجھ سے ملیے۔ میں ہوں ایڈورڈ ہینور... جینی کا پہلا شوہر۔''

اکثر لوگ اس کے عجیب وغریب تعارفی کلمات سن کر حیران رہ جاتے اور چند لمحوں تک خاموشی سے اس کا منہ تکتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ اگر کوئی شامت کا مارا اس تعارف کی وجہ تسمیہ پوچھ بیٹھتا تو وہ شروع ہوجاتا۔ ''میں حقیقت پسند انسان ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ میں اب تک جینی کا پہلا شوہر ہی ہوں۔''

ایڈورڈ ٹھیک ٹھاک مال دار شخص تھا۔ اس کی قانونی فرم بہت اچھی چل رہی تھا۔ خوش لباس تھا۔ شکل وصورت کے حوالے سے عمدہ شخصیت کا مالک تھا۔ جینی سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ تقریبات میں شرکت کا شوقین تھا۔ ویسے بھی شہر کے سیاسی وسماجی حلقوں میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جینی کو اس سے ویسے تو کوئی شکایت نہیں تھی مگر جب عجیب و غریب تعارفی کلمات سن کر لوگوں کے چہروں پر حیرانی اُمڈ آتی یا پھر کوئی مرد یا عورت اس پر طنزیہ جملہ کستا تو جینی شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتی۔

جینی بہت شائستہ عورت تھی لیکن شوہر کی اس عادت سے بڑی نالاں تھی۔ وہ سیکڑوں بار کہہ چکی تھی کہ اسے اس طرح متعارف کرائے جانا پسند نہیں مگر وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اس کی بات سے جینی کا دل دکھ سکتا ہے یا وہ شرمندگی بھی محسوس کرسکتی ہے۔ کئی بار جینی نے اس سے کہا تھا کہ کیا اس طرح کے تعارف سے تم یہ باور کروانا چاہتے ہو کہ میں نے دولت کے باعث تم سے شادی کی مگر وہ ہمیشہ انکار میں سر ہلا دیتا۔ وہ اپنی بات پر شرمندہ ہونے کے بجائے صرف ایک ہی جملہ کہتا۔ ''جانِ من! یہ تو صرف مذاق ہے۔'' یہ بات تو جینی ہی جانتی تھی کہ اُس کا مذاق اس کے مزاج پر کتنا گراں گزرنے لگا ہے۔

اُس روز ایڈورڈ کی قانونی فرم کی کلائنٹ ڈائریکٹر ریٹا کی شادی تھی۔ وہاں بھی ایڈورڈ نے اس کا تعارف حسب سابق کرایا تو جینی جل بھن کر رہ گئی۔ واپسی پر اس نے دل کھول کر اسے سنائیں مگر وہ ہنستا رہا۔

جینی تھک ہار کر خاموش ہوئی تو کہنے لگا۔ ''یہ تو بہت معمولی سی بات ہے اور تم اسے دل پر لے گئیں۔''

''تمہارے لیے ہوگی معمولی مگر میرے لیے یہ شرمندگی کی بات ہے۔'' وہ جھنّا کر بولی۔ ''کیا سوچتے ہوں گے وہ اجنبی لوگ کہ میں لالچی ہوں جو تم سے شادی کرکے سونے کی کان پر قبضہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔'' وہ بھری بیٹھی تھی۔

''لوگ جو سوچتے ہیں، انہیں سوچنے دو۔'' ایڈورڈ نے بے پروائی سے کہا۔ ''میری عمر دیکھو اور خود کو دیکھو۔ ایک ایک دن تو میں تمہارا پہلا شوہر ہی کہلاؤں گا۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتا کہ دنیا سے جانے کے بعد تم میری یاد میں سیاہ میکسی پہن کر غمگین زندگی گزارو۔ تمہیں کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنا ہوگی۔ تب تم بھی یہی کہو گی ان سے ملو یہ ہیں میرے دوسرے شوہر مسٹر...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر جینی کی طرف دیکھا۔ ''بھرپور امید ہے کہ مجھ سے پہلے تم دنیا چھوڑ کر جانے والی نہیں ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ اسی دوران ایک تیز رفتار کار نے انہیں اوورٹیک کیا۔ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ دوسری طرف گھمایا، کار لہرا کر رہ گئی۔

''سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔'' جینی نے ڈانٹ پلائی۔ ''ورنہ ہم دونوں اکٹھے ہی اوپر پہنچ جائیں گے اور پھر نہ پہلے کا مسئلہ رہے گا نہ دوسرے کی توقع۔''

''اوکے...'' وہ پھر بے پروائی سے ہنسا۔ ''جینی میری پیاری بیوی۔'' اس نے ترنم سے گا کر کہا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔

ایڈورڈ اچھا خاصا مال دار تھا مگر سچ یہ ہے کہ جینی نے اس سے دولت کے لالچ میں شادی نہیں کی تھی۔ دونوں کی عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا مگر کیا کہیے جینی کو اس سے محبت ہوگئی تھی جس کا انجام چرچ میں پادری کے سامنے ایجاب و قبول کی صورت ہوا۔

شادی کا پہلا سال تو ٹھیک ٹھاک گزرا۔ ایڈورڈ نے شادی کے بعد کلیولینڈ میں نیا مکان خریدا، جس کی تزئین و آرائش میں کئی ماہ گزر گئے۔ ایڈورڈ ہمیشہ اس سے پیار کرنے والے سنجیدہ شخصیت کے مالک شوہر کی طرح پیش آتا تھا۔ وہ بھی اس سے بہت مطمئن تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے تحائف لاتا۔ اس نے شاپنگ کے دوران میں کبھی اس کا ہاتھ نہ روکا بلکہ آگے بڑھ کر اس پر زور دیتا کہ یہ بھی خریدلو، وہ بھی خریدلو۔ روپے پیسے کی طرف سے ایڈورڈ نے بیوی کا ہاتھ تنگ نہ کیا۔ ہر ماہ اسے جیب خرچ کے طور پر بھاری رقم دیتا۔ شادی کا پہلا سال وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی رہی۔ شادی کے دوسرے سال وہ کچھ اور کھلا۔ دونوں کی ایک سالہ رفاقت نے درمیان میں پڑے کئی پردے اٹھادیے تھے۔ وہ اب زیادہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ اکثر اسے لطیفے سنا کر ہنساتا رہتا۔ جینی اب خود کو واقعی بہت ہی خوش قسمت سمجھنے لگی تھی مگر اس سال کے اختتام تک ایک اور بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ ایڈورڈ اکثر و بیشتر نوجوان مرد مہمانوں کو ڈنر پر مدعو کرنے لگا تھا۔ جینی نے اس بات کا بُرا نہ مانا۔ وہ ایک

بہت بڑی قانونی فرم چلاتا تھا۔ وہ مہمانوں کی گھر آمد کو تعلقاتِ عامہ کا سلسلہ ہی سمجھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ نئے کلائنٹ ڈھونڈنے کے لیے اس طرح لوگوں کی دعوتیں تو کرنا پڑتی ہی ہیں۔ اسکاٹ کرافورڈ بھی ایڈورڈ کے گھر آنے والے نوجوان مرد مہمانوں میں سے ایک تھا۔ اسکاٹ اجنبی نہیں تھا۔ وہ بھی ایڈورڈ کی فرم میں جونیئر پارٹنر تھا۔

جینی بہت اچھا کھانا پکاتی تھی۔ اس کے والدین کا بفیلو میں بہت معروف ریستوران تھا جہاں اس نے طرح طرح کی ڈشز بنانے میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ ایڈورڈ بھی اس کے کھانے کی بہت تعریف کرتا تھا مگر جس رات اس نے اسکاٹ کو گھر پر مدعو کیا، اس نے نہ تو مہمان کے لیے کھانا بنانے کو کہا اور نہ ہی ڈنر میں اپنی پسند کی کوئی چیز تیار کرنے کی ہدایت کی۔ جینی سمجھی کہ شاید وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ اس کی چہیتی بیوی مہمان کے سامنے طرح طرح کے پکوان بنا کر میز پر سجانے میں لگی رہے۔

جس شام اسکاٹ کو ڈنر پر آنا تھا، اس روز صبح دفتر جاتے ہوئے ایڈورڈ بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔ ''سنو...'' اس نے ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے جینی کو مخاطب کیا۔ ''ذرا اچھی طرح تیار ہوجانا اور سِلک کا وہ عمدہ سا سوٹ پہننا جو میں نے ہانگ کانگ سے منگوایا تھا۔''

''کیوں...'' جینی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ''کوئی خاص مہمان ہے جو بیوی کو خاص طور پر تیار ہونے کا کہہ رہے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ بھی مسکرایا۔ ''میری چہیتی بیوی سب کو خاص نظر آنی چاہیے۔''

شام کو جب ایڈورڈ کے دفتر سے آنے کا وقت ہوا تو وہ ہر طرح سے تیار ہوچکی تھی۔ ایڈورڈ نے فون پر بتادیا تھا کہ اسکاٹ اس کے ساتھ ہی آرہا ہے۔ وہ شوہر اور مہمان کی منتظر تھی۔ شوہر کی عادتِ بد کے باعث وہ اجنبیوں سے ملنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی مگر اسکاٹ سے پہلے بھی دو بار مل چکی تھی۔ خوش بھی تھی کہ کم از کم اس بار اسے ایڈورڈ کی ناقابلِ برداشت تعریف سننے کو نہیں ملے گی۔ ویسے بھی وہ اسکاٹ کو سنجیدہ اور باذوق شخص سمجھتی تھی۔ اسے بھی اس طرح کے مہذب لوگوں سے ملنے میں لطف آتا تھا۔

جینی بالائی منزل پر تھی، جب اس نے کار پورچ میں داخل ہوتے دیکھی۔ وہ سمجھ گئی کہ مہمان پہنچ گیا ہے۔ جب وہ اپنے کمرے سے نچلی منزل پر واقع لیونگ روم کی طرف آرہی تھی، اُس وقت وہ دونوں آتش دان کے پاس بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ایڈورڈ دیوار پر ٹنگی پکاسو کی ایک پینٹنگ کے بارے میں بتارہا تھا جو اس نے کچھ روز پہلے ہی نیلامی میں بھاری قیمت دے کر خریدی تھی۔ اسکاٹ بھی ستائشی نظروں سے پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔

جینی زینے پر تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر ایڈورڈ نے نظریں گھمائیں اور اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ نیچے اتری تو ایڈورڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اسکاٹ...'' اس نے اسے متوجہ کیا۔ ''یہ ہے میری پیاری اور محبت کرنے والی بیوی جینی، جس سے تم دو بار پہلے بھی مل چکے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور جینی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔ ''اور یقیناً میں اپنی اس محبت کرنے والی بیوی کا پہلا شوہر ہوں۔'' جینی جل بھن کر کوئلہ ہوگئی مگر چہرے پر بدستور متانت طاری رکھی۔

''گڈ ایوننگ۔'' اسکاٹ آگے بڑھا اور مسکرا کر کہا۔ جواب میں جینی نے صرف مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

اسکاٹ کھانے پر آیا تھا مگر جینی نے کچھ تیار نہیں کیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا ایڈورڈ اسے اور مہمان کو باہر لے کر جائے گا یا پھر تینوں کے لیے کھانا آرڈر کرچکا ہے۔ وہ تینوں آگے بڑھے اور آتش دان کے پاس بیٹھ گئے۔

''سنو...'' ایڈورڈ نے جینی کو متوجہ کیا۔ ''ان کی والدہ ایک موسیقی اسکول چلاتی ہیں جہاں نوجوان بچے بچیوں کو بنا فیس کے تعلیم دی جاتی ہے۔'' اس نے بیوی کو مہمان کی سماجی خدمات گنوانا شروع کیں۔ ''ہفتے کو ان نوجوان فنکاروں کا شو ہوتا ہے۔ اس کے انتظامات اسکاٹ کے ذمے ہوتے ہیں۔''

''واہ... بہت عمدہ۔'' جینی نے اس کی طرف دیکھا۔

اسی دوران میں ڈور بیل بجی۔ جینی اٹھنے لگی مگر ایڈورڈ نے روک دیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تو جینی نے اسکاٹ کی طرف نظر ڈالی۔ وہ اس کا ہم عمر تھا۔ اگرچہ اس کی شخصیت جاذبِ نظر تھی مگر اس سے صرفِ نظر کبھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ''تم واقعی بہت اچھا کام کررہے ہو۔ اس طرح روح کو سکون ملتا ہے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' اسکاٹ نے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا۔

اسی دوران میں وہ بھی واپس آگیا۔ ''کھانا لگ رہا ہے، کچھ دیر بعد ہم ڈائننگ ٹیبل پر ہوں گے، باقی باتیں وہیں پر۔''

''اوہ... تم کتنے اچھے ہو ایڈورڈ۔'' یہ سنتے ہی جینی نے

کہا تو وہ جھک کر کورنش بجالایا، وہ مسکرادی۔

کھانے پر بھی جینی اور اسکاٹ کے درمیان موسیقی اسکول کے موضوع پر ہی باتیں ہوتی رہیں۔ ''مجھے تو ان بچوں کی صلاحیتوں نے حیران کردیا ہے۔'' اسکاٹ نے جینی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے جینی...'' ایڈورڈ نے بیوی کو مخاطب کیا۔ ''میرا تو خیال ہے تم بھی وہ اسکول جوائن کرلو۔ تمہیں یقیناً بہت اچھا لگے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''ویسے بھی تمہیں فارغ بیٹھنا پسند نہیں۔ یوں تمہاری یہ شکایت بھی دور ہوجائے گی کہ میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتا۔''

''یہ تو سچ ہے۔'' جینی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں تو اسکاٹ، کیا خیال ہے تمہارا؟'' ایڈورڈ نے اس سے کہا۔ ''ہفتے کا پروگرام منعقد کرنے میں جینی رضاکارانہ طور پر تمہارے اسکول کی مدد کرسکتی ہے؟ ویسے بھی اسکول کیا، کام تو تمہیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمہاری مدد کیا کرے گی۔ بس! اسے مصروف رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔''

''اگر تم یہی چاہتے ہو تو پھر ہم جینی کو پیشگی خوش آمدید کہتے ہیں۔'' اسکاٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔

اگلے سنیچر سے ہی جینی نے موسیقی اسکول کے ہفتہ وار پروگراموں کے انتظامات میں ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ اسے اسکاٹ کی ماں اور اسکول کے شوقیہ فنکاروں سے مل کر اچھا لگا۔ سب کے سب بہت دلچسپ نوجوان لڑکے لڑکیاں تھے۔ وہ مختلف موضوعات کی تعلیم حاصل کررہے تھے لیکن موسیقی کا یہ اسکول ان میں قدرِ مشترک تھا۔ اسے پہلا پروگرام ہی بہت دلچسپ لگا۔ اس کے بعد جینی نے مزید تین پروگراموں میں اسکاٹ کا ہاتھ بٹایا۔ اب تو گروپ کے تقریباً سب ہی لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہوچکے تھے۔

وہ موسیقی اسکول کا پانچواں پروگرام تھا۔ جینی صبح سے ہی انتظامات میں مصروف تھی۔ وہ اپنے ذمے کے کام ختم کرکے لوٹی تو اسکاٹ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''کام ختم۔'' جینی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، وہ مسکرادیا۔

کچھ دیر تک وہ کمپیوٹر پر ہی مصروف رہا اور پھر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیسے ہیں صاحب؟'' اس نے ایڈورڈ کی خیریت دریافت کی۔

''ہمیشہ کی طرح خوش باش۔'' جینی نے رسمی جواب دیا۔

کچھ دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ''ایک بات پوچھوں اگر بُرا نہ مانیں تو۔'' وہ کافی پی رہے تھے، جب اسکاٹ نے استفساریہ نگاہوں سے جینی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ضرور پوچھو۔''

''وہ اور تم کس طرح ملے تھے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا ہچکچایا۔

جب سے جینی اسے جانتی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے نہایت ذاتی نوعیت کا سوال کیا۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ ''پہلی نظر کی محبت نہیں تھی۔''

''مگر پھر بھی...'' اس کی ہنسی سے اسکاٹ کی ہچکچاہٹ بھی دور ہوگئی۔

''وہ روزانہ ریستوران آتے تھے اور بس!'' جینی نے کہنا شروع کیا۔ ''اُن دنوں وہ کچھ عرصے کے لیے بفیلو میں آکر رہنے لگے تھے۔ روز ڈنر کے لیے ہمارے ریستوران آتے، پہلے کھانا، پھر سلام دعا۔ جان پہچان بڑھی تو ہم ریستوران سے باہر بھی ملنے لگے۔ مجھے ان کی باتیں اچھی لگتی تھیں، وہ کہتے ہیں انہیں میری عادت اچھی لگی، پھر ہم نے شادی کرلی۔''

''تم سے شادی سے پہلے کیا وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا؟'' اسکاٹ نے پوچھا۔

''ہاں... جب ہم ملے تب وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ چکا تھا۔'' جینی نے فوراً کہا۔ ''یہ تو میری شادی سے بھی کئی برس پہلے کی بات تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہیں معلوم ہے، اس نے اپنی پہلی بیوی کو بھی شادی پر بلایا تھا۔''

''اور وہ آئی بھی تھی؟''

''ہاں... اپنے نئے شوہر کے ساتھ۔'' جینی نے کہا۔ ''ویسے وہ اتنا نیا شوہر بھی نہیں تھا۔ ان کی شادی بھی کئی سال پہلے ہوئی تھی۔ تقریب کے بعد میں نے اس سے کچھ دیر بات چیت کی تھی۔ وہ مجھے اسمارٹ اور دلچسپ عورت لگی۔'' اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب...'' اسکاٹ نے کہا اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ ''میرا خیال ہے جینی کہ تم ہفتے کے بجائے جمعرات کو یہاں آنا چاہو تو زیادہ مناسب رہے گا۔'' اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہفتے کو یہاں تمہارے کرنے کے لیے کچھ خاص کام تو ہوتا نہیں، بیٹھی بور ہی ہوتی ہوگی۔'' جینی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''ویسے ہفتے کو تو میں بھی یہاں ہوتا ہوں مگر جمعرات کو نہیں۔ بہتر ہے کہ اس دن تم مسز شیرون کا ہاتھ بٹادیا کرو۔ وہ انتظامی امور دیکھتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''بڑی مصیبتوں کی ماری عورت ہے وہ۔ تمہیں اس کے ساتھ کام کرکے اچھا لگے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ خاموش ہوا تو جینی نے کہا۔ ''میں جمعرات کو آجایا کروں گی۔''

''بہت شکریہ۔'' اسکاٹ مسکرادیا۔

سینٹر میں جینی کا پانچواں سنیچر آخری ثابت ہوا۔ اس کے بعد وہ اگلی جمعرات کو پہلی بار سینٹر پہنچی لیکن نہ جانے کیوں یہ بات ایڈورڈ کو پسند نہیں آئی۔ دو ہفتوں بعد ہی ایڈورڈ نے یہ کہہ کر اس کا جانا بند کرادیا کہ علاقہ اچھا نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جینی یونہی تنہا باہر جاتی رہی تو کوئی لٹیرا اس کا پرس چھین سکتا ہے، مزاحمت پر اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بس! اس کے بعد سے جینی کا وہاں جانا بند ہوگیا۔ ویسے بھی وہ موسیقی کی کلاس کے آخری دن تھے۔ اس کے بعد نئے داخلے ہوتے، تب ہی نئی سرگرمیاں شروع ہوتیں۔

اگلے چند ماہ کے دوران میں ایڈورڈ نے اپنے کئی نوجوان دوستوں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ اسکاٹ سمیت ان سب میں ایک قدرِ مشترک تھی۔ سب کے سب فلاحی کاموں سے منسلک تھے۔ ایڈورڈ ہر مہمان کے سامنے جینی کو اجازت دیتا کہ وہ اُس کے ادارے سے بطور رضاکار وابستہ ہوجائے لیکن جینی ہر بار مسکرا کر معذرت کرلیتی۔ اب اسے ان مہمانوں سے الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک دن صبح وہ ناشتا کررہے تھے۔ ایڈورڈ ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ ''سنو...'' اس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے جینی کو متوجہ کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم کسی فزیکل ٹرینر کی خدمات لے لو۔'' اس نے بیوی کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے تجویز دی۔

''مگر کیوں؟'' جینی نے تڑپ کر کہا۔ ''میں باقاعدگی سے یوگا کرتی ہوں، جاگنگ کرتی ہوں، سوئمنگ کرتی ہوں اور پھر موٹی بھی نہیں ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''شادی کے بعد سے میں نے اپنا وزن آٹھ پاؤنڈ کم کیا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کسی فزیکل ٹرینر کی۔'' یہ کہہ کر اس نے شوہر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم محسوس نہ کرو مگر میں اپنی عمر کی عورتوں کے مقابلے میں اب بھی خوبصورت اور پتلی دُبلی ہوں ورنہ تو کئی ایسی ہیں جو پھول کر بھینس بن چکی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تو پھر...''

''میرے سب دوستوں کی بیویوں نے فزیکل ٹرینر رکھے ہیں، اسی لیے تم سے کہہ دیا۔''

''وہ بھینس سے بکری بننا چاہ رہی ہوں گی مگر میں...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''میں تو اب بھی نازک اندام حسینہ ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھ ماری، وہ ہنس دیا۔

''بات یہ ہے جینی۔'' اس نے ایک بار پھر اخبار اٹھایا۔ ''مجھے بھینس نما عورتوں سے چڑ ہے۔ مجھے پسند نہیں کہ تم بھی کبھی ان جیسی لگو۔'' یہ کہہ کر اس نے جینی کی طرف دیکھا۔ ''میں نے جم کلب میں تمہارا اپائنٹمنٹ طے کردیا ہے، آج سے ہی جانا ہوگا۔''

جینی مسکرادی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا فیصلہ بدلنا ممکن نہیں۔ ''اوکے۔'' اس نے انگور کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

سہ پہر کے تین بج رہے تھے، جب جینی جم میں داخل ہوئی۔ ایڈورڈ نے بتایا تھا کہ اس کا سیشن ٹونی کے ساتھ طے ہے۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ ایتھلیٹ کی طرح مضبوط ہاتھ پاؤں والا ٹونی اس کا ہم عمر تھا۔ جینی اس وقت بتیس سال کی تھی۔ ٹونی نے اپنی شخصیت کو پُرکشش بنانے کے لیے سنہری بال رنگے ہوئے تھے، وہ عجیب انداز میں تراشے گئے تھے مگر اس کے باوجود اس میں کشش نام کو نہ تھی یا کم از کم جینی کے لیے تو بالکل نہیں تھی۔ ہفتے میں پانچ بار اسے ہر سہ پہر ایک گھنٹے کی کلاس لینے اسی کے پاس آنا تھا۔ ٹونی نے جم کی مرکزی عمارت کے باہر بنے چھوٹے سے کمرے میں اس کی ٹریننگ کا انتظام کر رکھا تھا۔

اس روز پیر تھا۔ یہ جم میں جینی کی آمد کا تیسرا ہفتہ تھا۔ وقت سے کافی پہلے وہ تیار ہوئی۔ تربیتی لباس پہنا، بال بنائے، ہلکا میک اپ کیا اور جانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اس دن جینی کے جذبات کچھ کچھ منتشر تھے۔

تربیت شروع ہوچکی تھی۔ وہ ٹونی کے سامنے پنجوں کے بل سیدھی کھڑی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بنا آستین کی ٹی شرٹ پہنے جینی کے بازو اوپر کو اٹھے تھے۔ ٹونی اس کے بالکل سامنے اتنا قریب کھڑا تھا کہ وہ اس کی سانسوں کی آواز تک سن رہی تھی۔ ''اب آہستہ آہستہ اپنے بازو نیچے لاؤ۔'' ٹونی نے کہا۔

جینی نے بازو نیچے کرنا شروع کیے مگر اچانک اس نے ٹونی کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اپنی کمر کے گرد حمائل کرلیے۔ اس نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ڈال دیے تھے۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

اس پر عجیب سی بے خودی طاری تھی۔ ٹونی کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ جینی کی آنکھیں بند تھیں۔ اسی دوران جھٹکے سے دروازہ کھلا، وہ حقیقت کی دنیا میں پلٹ آئے۔

''ایکسکیوز می۔'' دروازہ کھلتے ہی ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ''اوہ سوری...'' کمرے کے نیم تاریک ماحول میں ان دونوں پر نظر پڑتے ہی نووارد نے بوکھلا کر کہا۔ ''مجھے پتا نہیں تھا...''

''یہاں ٹریننگ سیشن چل رہا تھا۔'' ٹونی نے اس کی بات مکمل کر دی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے خود کو ایک دوسرے سے الگ کر لیا۔

''تم جینی بینور ہو؟'' نووارد نے اسے غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں۔'' جینی نے آہستہ سے کہا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کے شوہر مسٹر بینور میرے واقف کار ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں پال اڈیسن ہوں۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' جینی نے قدم اٹھائے اور اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''کچھ لینا پسند کریں گی؟'' پال نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیمن جوس، سبز قہوہ یا کچھ اور...''

''جی نہیں، بہت شکریہ۔'' جینی نے مسکرا کر جواب دیا۔

جس طرح پال نے اسے پہچانا، اس سے جینی کو یقین ہو گیا کہ وہ اس سے ملی ہوگی مگر کہاں... یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچتی رہی مگر پھر بھی یاد نہیں آیا۔ ویسے بھی شادی کے ڈھائی سالوں میں وہ سیکڑوں لوگوں سے مل چکی تھی۔ ایڈورڈ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

''اب میں چلتی ہوں۔'' چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد اس نے ٹونی سے کہا اور جیکٹ پہن کر باہر نکلنے لگی۔ پال بھی کمرے میں تھا، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آیا۔

''سامنے کیفے ہے، مجھے امید ہے کہ تم میرے ساتھ بیٹھ کر ایک گلاس جوس پینا پسند کرو گی۔'' پال نے باہر نکل کر ہاتھ سے کیفے کی طرف اشارہ کیا۔

جینی نے چند لمحے سوچا۔ ''چلیے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ کیفے میں بیٹھے جوس پی رہے تھے۔

''مزیدار جوس تھا۔'' جینی نے گلاس میز پر رکھا۔ ''میں ایڈورڈ سے تمہارا ذکر کروں گی۔''

''یہ غلطی ہرگز نہ کرنا۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ جینی کچھ نہ سمجھی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

''ٹونی گلیسن...'' پال نے کہا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''وہ ہے مضبوط مرد، اس کی بانہوں میں اچھی بھلی شریف عورتیں پگھل سکتی ہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جینی پر بھرپور نظر ڈالی۔

''وہ ایک کمزور لمحہ تھا ورنہ کم از کم میری حد تک کوئی ایسی بات نہیں۔'' وہ شرمندہ لہجے میں بولی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر گڑبڑا گئی۔

''تم جتنی ذہین ہو اتنی ہی عقل مند۔'' پال کا لہجہ بدستور معنی خیز تھا۔ ''تم ٹونی جیسے شخص کو آسانی سے ہینڈل کر سکتی ہو۔ ویسے ہی جیسے تم اسکاٹ سے نمٹی تھیں۔''

اسکاٹ کا نام سن کر جینی بوکھلا گئی۔ ''تم کون ہو اور اسکاٹ کو کیسے جانتے ہو؟'' جینی کا دوستانہ لہجہ خوف میں بدل چکا تھا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''تم ہو کون؟'' اس نے اٹکتے ہوئے پھر کہا۔

''بتایا تو تھا پال اڈیسن۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارے ہاں...'' اس نے اپنی کنپٹی دبائی۔ ''حیران مت ہو۔ میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور پچھلے چھ ماہ سے ایڈورڈ نے مجھے تمہاری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور جینی پر گہری نظر ڈالی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ ''اسکاٹ اور اب ٹونی کے سوا بھی، میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو پچھلے چھ ماہ کے دوران تم کرتی رہی ہو...'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''غلط مت سمجھنا، مجھے بیڈ روم میں تاکا جھانکی کی عادت نہیں۔ بس! اس کے سوا تمہاری ہر خبر رکھتا رہا ہوں۔''

اس کی بات سن کر چند لمحوں تک وہ سکتے میں رہی۔ ''گھٹیا ذلیل انسان۔'' یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی مگر پال نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''میں نے ٹونی کے ساتھ تمہاری تصاویر نہیں بنائی ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''ایسا ہوتا تو میں تم سے نہیں ملتا۔ میری بات کا یقین کرو۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔'' اس نے جینی کو واپس کرسی پر بٹھا دیا۔ جینی نے اسے نفرت آمیز نگاہوں سے گھورا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''مرد دوستوں کو گھر لانا، تمہاری موجودگی میں ڈنر، اسکاٹ سے ملوانا، اس کے ساتھ کام کرنے پر تمہیں مجبور کرنا،

اب یہ جم کلب اور ٹونی...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کا جائزہ لیا۔ ''یہ سب کچھ تم نے ایڈورڈ کے کہنے پر کیا مگر سوچا کہ وہ ایسا کرنے پر تمہیں کیوں مجبور کرتا رہا ہے؟''

جینی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔ اس کی پریشانی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔

''تم ٹونی کو نہیں جانتیں۔'' اسے خاموش دیکھ کر پال نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ بلیک میلر ہے۔ مال دار عورتیں پھانس کر مال بٹورنا اس کا اصل پیشہ ہے۔ جس عورت نے اسے رقم دینا بند کی، اس نے فوراً اُس کے شوہر کو حقیقت بتا دی۔ یوں وہ اگلے ہی روز طلاق یافتہ ہو جاتی۔ ایڈورڈ کی قانونی فرم کی خاصیت طلاق کے مقدمات ہیں۔ وہ ٹونی کو بہت قریب سے جانتا ہے۔'' پال نے گہری سانس لے کر بات مکمل کی۔

جینی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس نے بے چینی اور افسوس سے دونوں ہاتھ رگڑے۔ اسے اب سمجھ میں آنے لگا تھا کہ ایڈورڈ نوجوان دوستوں کو گھر پر کیوں لے کر آتا تھا۔ ''مگر کیوں؟'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کیا وہ مجھے آزما رہا تھا؟ مگر میں نے تو پچھلے ڈھائی سال کی ازدواجی زندگی میں ایک بار بھی یہ موقع نہ دیا کہ اُسے ایسا کرنے کی ضرورت پڑے۔'' وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ شوہر کی اس گھٹیا حرکت پر جی بھر کر روئے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کچھ دیر پہلے تم اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کرنے جا رہی تھیں۔'' اسے خاموش دیکھ کر پال نے کہنا شروع کیا۔ ''تم ٹونی کا اگلا شکار تھیں۔ اپنے ہاتھوں اپنی ہی زندگی برباد کرنے والی تھیں۔ اسی لیے مجھے یوں بیچ میں آنا پڑا۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ ہے۔

''تم نے مجھ سے یہ ہمدردی کیوں دکھائی؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد جینی نے بولنا شروع کیا۔ ''میری نگرانی کی فیس ایڈورڈ نے دی اور شاید وہ یہی چاہتا ہوگا مگر تم نے مجھے کیوں روکا؟'' یہ کہہ کر اس نے غصیلی نظروں سے پال کو گھورا۔ ''تم چاہتے ہو کہ ٹونی کا کچا چٹھا کھول کر میرے سامنے رکھ دو گے اور مدد کے عوض مجھ سے فیس وصول کر لو گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' پال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم اس وقت غصے میں ہو اور بالکل غلط سوچ رہی ہو۔ مجھے ایڈورڈ بھاری رقم دے چکا ہے۔ تم سے مجھے ایک پائی بھی نہیں چاہیے۔''

''تو پھر کیوں کیا یہ سب کچھ؟'' جینی نے غصے سے دانت کچکچا کر پوچھا۔

''میں نہیں کرنا چاہتا تھا مگر تمہارا شوہر...'' ایڈورڈ نے بات ادھوری چھوڑی اور نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ ''بڑا ہی کمینہ ہے وہ، اس سے بڑا گھٹیا شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔''

''تم بکواس کرتے ہو۔'' اس نے رومال کے کونے سے نم پلکوں کو صاف کیا۔ ''وہ اچھا انسان ہے، کم از کم وہ تو یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے نہیں پتا کہ اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ کیا غلطی ہو گئی تھی مجھ سے جو وہ یہ کرنے پر مجبور ہوا۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ پال اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اب جینی کو بھی اس کی باتوں پر یقین آ چکا تھا۔

''تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد پال نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''سب قصور اس کا اپنا ہے۔ اس کی ماں ہمیشہ اس سے دور رہی، امیر بننے کے لیے اس نے بہت پاپڑ بیلے، بہت انتظار کیا۔''

''کیا مطلب...'' جینی چونکی۔ ''وہ تو ہمیشہ سے ہی مال دار رہا ہے۔''

''تمہارے مطابق یہ سچ ہے مگر میرے مطابق یہ حقیقت نہیں۔'' پال نے فوراً جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کہ وہ کامیاب وکیل ہے مگر وہ صرف اسی سے دولت مند نہیں بنا۔ اس کی پہلی بیوی بہت مال دار تھی۔ جب وہ اسے چھوڑ کر گئی تو جانے سے پہلے اسے بہت کچھ دے چکی تھی۔ ویسے صحیح معنوں میں تو وہ تب دولت مند بنا جب چار سال پہلے اس کی ماں فوت ہوئی اور ترکے میں اس کے لیے بہت دولت چھوڑ گئی۔''

''مگر میری نگرانی سے ان سب باتوں کا کیا تعلق...''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' پال نے سکون سے جواب دیا۔ ''اس کی پہلی بیوی اسے دھوکا دے چکی تھی۔''

''یہ میں جانتی ہوں، خود اس نے مجھے ساری حقیقت بتائی تھی۔'' جینی نے قطع کلامی کی۔ ''میرا سوال وہی ہے۔ آخر اس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کس لیے کیا؟'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بڑبڑائی۔ ''ایڈورڈ... تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

''اب اگر تم بھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں تو کم از کم اس کے لیے میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھوں گا۔'' پال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں...'' جینی تڑپ کر بولی۔ ''میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

”جانتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اس سے طلاق چاہو گی تو پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی، البتہ اس کے ساتھ چمٹی رہو گی تو ہر لحاظ سے فائدے میں ہی رہو گی۔“ پال کے لہجے میں پوشیدہ طنز صاف جھلک رہا تھا۔

”یہ بکواس ہے۔“ وہ چلّائی۔ ”میں اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں، اسے ٹوٹ کر چاہتی ہوں۔ وہ میری پہلی محبت ہے۔ میں چاہوں گی کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے توقف کیا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے پال کو گھورا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ پچھلے چھ ماہ سے میری نگرانی کر رہے ہو مگر آج سے پہلے میں نے تمہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا۔“ لگ رہا تھا کہ اب اسے پال پر شک ہو رہا ہے۔

”تمہارا سوال میرے لیے اعزاز ہے۔“ پال نے گول گول دیدے گھمائے۔ ”ایک سراغ رساں کے لیے اس سے بڑی بات کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ وہ چھ مہینوں سے جس کی نگرانی کر رہا ہو، وہ اس سے لاعلم رہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ ”اب ٹونی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔“ جینی نے فوراً کہا۔ ”ایڈورڈ سے کہہ دوں گی وہ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔“

”یوں تو میں بھی ایڈورڈ کو یہ رپورٹ دے سکتا ہوں کہ تمہارے اور ٹونی کے بیچ کوئی چکر نہیں مگر ایک بار پھر سوچ لو۔“ پال نے مشورہ دیا۔ ”ویسے تم چاہو تو ہم بھی مل کر اس سے بھی ایک کھیل کھیل سکتے ہیں۔“ اس نے شاطرانہ انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

”میں کچھ سمجھی نہیں۔“ جینی نے الجھی الجھی نظروں سے دیکھا۔

”تم کل بھی جم آؤ گی۔“ پال نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”تم اسے قریب آنے کا موقع دو گی اور جب ٹونی اس موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا تب تم اس کے گال پر زوردار تھپڑ مارنا اور پھر پاؤں پٹختی ہوئی، غصے سے باہر نکل کر سیدھی گھر چلی جانا۔ جب تمہاری ایڈورڈ سے ملاقات ہو تو کہنا تم دوسرا جم جوائن کرنا چاہتی ہو مگر یہ ہرگز نہ بتانا کہ کیوں۔ وہ زور دے کر پوچھنا چاہے گا مگر تم وجہ بتائے بغیر کہنا کہ اب تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔“

”جب میں اسے تھپڑ ماروں گی، تب تم فوٹو کھینچو گے؟“ جینی نے پوچھا۔

”ہاں...“ پال نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”مگر جب میں اور ٹونی کمرے میں ہوتے ہیں تو دروازہ تقریباً بند ہوتا ہے۔“

”میں خفیہ کیمرے سے تصویر لوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے جینی کو غور سے دیکھا۔ ”تم پریشان مت ہو، میں اپنا کام کرنا بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بس تمہیں اپنا کردار بہت عمدگی سے ادا کرنا ہوگا۔“

”بے فکر رہو، میں اسکول کے زمانے میں ڈراما کلب کی صدر تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”یہ کردار اتنا مشکل بھی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور پھر رازدارانہ انداز میں کہنے لگی۔ ”مگر تم تصویر کا کیا کرو گے؟“

”میں ایڈورڈ سے ملوں گا۔ تصویر اسے دکھاؤں گا اور یہ بتاؤں گا کہ جب ٹونی نے یہ حرکت کی تو تم ششدر رہ گئیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”تو پھر کل ملتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے پال اٹھ کھڑا ہوا۔

”مگر میں تم سے نہیں مل پاؤں گی۔“ جینی بھی کھڑی ہو گئی۔

”جانتا ہوں...“ وہ مسکرایا۔ ”کسی اور وقت تو ضرور مل سکیں گے۔“

یہ سن کر جینی مسکرا دی، وہ دونوں باہر جانے والے راستے پر بڑھنے لگے۔

دوسرے دن جینی مقررہ وقت پر جم پہنچ گئی اور پھر سب طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوا۔

رات ڈنر پر جب جینی نے شوہر سے کہا کہ وہ کسی اور جم کو جوائن کرنا چاہتی ہے تو یہ سن کر وہ بہت پریشان ہوا۔ کئی بار اس نے وجہ جاننے کی کوشش کی مگر جینی نے لب نہ کھولے۔ دوسرے دن جب شام کو ایڈورڈ واپس آیا تو اس کے لیے ایمرالڈ جڑے ٹاپس لے کر آیا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ جینی سمجھ گئی کہ پال نے اپنا کام بہت عمدگی سے کیا ہے۔ ایڈورڈ سے شادی کے بعد اس کے سارے دوست چھوٹ چکے تھے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی مگر اب اسے لگ رہا تھا پال کی صورت میں ایک بہت اچھا دوست مل گیا ہے۔ ان کی پہلی ملاقات، اب تک کی آخری ملاقات تھی مگر نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے قریب ہی موجود ہے۔

ٹونی کا قصہ ختم ہونے کے چند روز بعد کا ذکر ہے۔ کنٹری کلب میں ایڈورڈ کی قانونی فرم کے سب سے پرانے رکن تھامسن کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر اس نے پارٹی دی۔ بہت سارے لوگ مدعو تھے۔ یہاں بھی اس نے جینی کا

تعارف حسبِ سابق کرایا۔ جس پر کئی مہمانوں نے اس پر جملے کسے۔ وہ دلبرداشتہ ہو گئی اور نظر بچا کر، مشروب کا گلاس تھامے ہال کے کونے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایڈورڈ اس سے کچھ فاصلے پر بار کے قریب لوگوں میں گھرا باتیں کر رہا تھا۔ وہ تنہا کھڑی کھڑکی سے باہر تک رہی تھی کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ چونک کر پلٹی، سامنے اسکاٹ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”تم...“ جینی نے حیرت سے کہا۔

”کچھ روز سے میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ اس نے کہا۔

”مگر کیوں؟“

”تمہیں وہ چھوٹی سی، پتلی دُبلی ٹینا تو یاد ہے نا؟“ اسکاٹ نے کہنا شروع کیا۔

جینی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کچھ روز پہلے وہ میرے پاس آئی تھی۔ اس نے کنسرٹ میں سولو پرفارمنس دی اور انعام جیتا۔ بہت یاد کر رہی تھی تمہیں۔ کہہ رہی تھی کہ مس جینی کی وجہ سے ہی اس کا حوصلہ اتنا بڑھا ورنہ وہ آج اس مقام پر نہ ہوتی۔“

”اوہ... یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔“ جینی نے چہک کر کہا۔

”خیر... تم سناؤ، کیسی ہو؟ سب کچھ کیسا چل رہا ہے؟“ اسکاٹ نے گفتگو کا رخ اس کی ذات کی طرف موڑ دیا۔

”بہت مصروف... اگلے تین ہفتوں بعد میری چھوٹی بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ تیاریوں میں وقت گزر رہا ہے۔ تم سناؤ، کچھ نئے بڑے کیسز ملے یا نہیں؟“ جینی نے گول مول رسمی باتیں کیں۔

”کوئی خاص نہیں، بس وہی لگی بندھی معمول پہ زندگی گزر رہی ہے۔“ اسکاٹ نے بھی رسمی جواب دیا۔

اسی دوران میں ایڈورڈ بھی پہنچ گیا۔ ”بہت خوب! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ اس نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔ وہ دونوں مسکرا دیے۔ ”اور بھئی اسکاٹ، موسیقی اسکول کی کیا خبریں ہیں؟“

”بہت اچھی خبریں ہیں۔“ اسکاٹ نے جواب دیا۔ ”ابھی میں جینی سے یہ کہنے ہی والا تھا کہ اگر مزید کچھ رقم کا انتظام ہو جائے تو ہم مزید میوزک ٹیچر بھرتی کر لیں گے۔ ویسے کام کافی بہتر جا رہا ہے۔“

”اگر یہ بتا کر تم عطیے کی درخواست کر رہے ہو تو چیک دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔“ ایڈورڈ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر رضاکارانہ مدد چاہیے تو پہلے کی طرح ہر سنیچر کو تم جینی کی خدمات لے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے جینی کی طرف دیکھا۔ ”کیوں... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”نہیں...“ جینی نے فوراً انکار کر دیا۔ ”سنیچر کو میرے کرنے کے لیے وہاں کچھ خاص کام نہیں ہوتا، البتہ جمعرات کو جا سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انتظامی معاملات میں زیادہ مدد کر سکوں گی۔“

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ علاقہ زیادہ محفوظ نہیں۔“ ایڈورڈ نے جینی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جمعرات مناسب نہیں، سنیچر اس لیے بہتر ہے کہ کم از کم اسکاٹ وہاں ہوتا ہے۔ اگر کسی غنڈے نے تم پر حملہ کیا تو یہ مدد کر سکتا ہے ورنہ...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، وہ علاقہ محفوظ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اسکاٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مسز شیرون سے کہنا کہ اگر انہیں میری مدد کی ضرورت ہے تو اسی جمعرات سے وہاں آ سکتی ہوں۔“

ایڈورڈ کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے جینی کی یہ بات قطعاً پسند نہیں آئی لیکن موقع محل کی مناسبت سے اس نے بیوی سے بحث نہ کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ ویسے بھی یہ اس کے لیے غیر متوقع تھا کہ جینی نے اس کی بات سے کھلم کھلا اختلاف کیا تھا۔

اس پارٹی کے بعد دونوں میں غیر اعلانیہ ناراضی ہو گئی۔ کھانے کی میز پر ہوں یا بیڈ روم میں... کئی روز تک ان کے درمیان چند نہایت ضروری باتوں کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوئی۔ اس ناراضی کی ابتدا ایڈورڈ نے کی تھی اور شادی کے بعد ان کی یہ پہلی ناراضی تھی۔ اب دونوں ہی ایک دوسرے سے سرد مہری برت رہے تھے۔ جینی ہر وقت اسے دل ہی دل میں بُرا بھلا کہتی رہتی۔ وہ شدت سے خواہش کر رہی تھی کہ اس کا شوہر مر جائے۔ وہ دل ہی دل میں دن میں اتنی بار ایڈورڈ کو بُرا بھلا کہتی کہ اسے خود لگنے لگا کہ جیسے یہ منتر ہے اور وہ اس کے جاپ میں مصروف ہے۔ دوسری طرف ایڈورڈ بھی سوچ رہا تھا کہ آخر کون سی ایسی بات ہوئی ہے جو وہ سرکشی پر اتر آئی۔ جینی کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اب تک تو وہ اپنا کھیل کھیلتا رہا تھا مگر جینی کا بدلا ہوا رویہ اسے چونکا گیا۔ وہ شوہر کی طرف سے خاصی بے پروائی برت رہی تھی۔ وہ بھی یہ بات سمجھ چکا تھا۔

چند روز سے جاری اس سرد جنگ کے دوران میں جمعرات آ گئی اور وہ شیرون کی مدد کے لیے کمیونٹی سینٹر پہنچ گئی۔ اس نے بہت مصروف دن گزارا۔ وہ جان بوجھ کر کام

میں مصروف رہی۔ پہلے تو وہ سہ پہر ڈھلنے پر اٹھ جاتی تھی مگر اس بار وہ سورج ڈھلنے تک کام میں لگی رہی۔ جب وہ اٹھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ اس نے کمیونٹی سینٹر کے اندر واقع اسکول سے دو بلاک کی دوری پر کار کھڑی کی تھی۔ اس نے باہر نظر ڈالی۔ تیز سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ ٹھنڈ کی وجہ سے سڑک پر بھی بہت کم لوگ نظر آرہے تھے۔

جینی دل ہی دل میں ڈرتی ہوئی باہر نکلی اور فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ اُس وقت دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی جارہی تھی کہ اسی دوران عقب سے ایک شخص آیا۔ اس نے سیاہ اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جیکٹ کے کالر کھڑے تھے، جس کی وجہ سے اس کا چہرہ دیکھنا ممکن نہ تھا۔ آتے ہی اس نے جینی کی گردن کو عقب سے ہاتھ ڈال کر دبوچا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ اچانک پڑنے والی اس افتاد سے تو جینی کا دم ہی نکل گیا تھا۔ حملہ آور نے اس کے شانوں سے لٹکتا پرس چھینا اور اس کی گردن ۔ ہاتھ بڑھا کر سونے کا لاکٹ کھینچنا چاہا۔ جینی نے چلّانا چاہا مگر اس نے منہ سختی سے دبا رکھا تھا۔ جینی سوچ رہی تھی کہ لاکٹ چھن جانے پر ایڈورڈ اسے مار ڈالے گا۔ کرسمس پر اس نے بڑے پیار سے ہیرا جڑا سونے کا لاکٹ بطور تحفہ اسے دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لٹیرا لاکٹ کھینچ پاتا، کسی نے اس پر حملہ کردیا۔ وہ لڑکھڑا گئی، پلٹ کر دیکھا تو اس پر حملہ کرنے والا کسی اور سے گتھم گتھا تھا۔ مکوں اور لاتوں کے تبادلوں کے دوران میں ہی مدد کو پہنچنے والے نے اس کا پرس لٹیرے سے واپس حاصل کرلیا تھا۔ چند لمحوں کے اندر ہی اندر جب وہ لٹیرا مقابلہ نہ کرسکا تو جان بچانے میں عافیت سمجھی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ جینی کے اوسان خطا تھے مگر اسے بھاگتا دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ جب اس نے مدد کرنے والے کو دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے سراغ رساں پال کھڑا تھا۔

''لو...'' اس نے جینی کی طرف پرس بڑھایا۔ ''تم ٹھیک تو ہو، کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟'' اس کا لہجہ پُرتشویش تھا۔

وہ چند لمحوں تک خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے پرس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا اور پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم پہنچ گئے۔'' اس نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تو پرس اور لاکٹ لُٹ جانے کا سن کر تو وہ پاگل ہی ہوجاتا، جان سے مار ڈالتا مجھے۔'' یہ کہتی ہوئی وہ دو قدم آگے بڑھی اور عین اس کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ''شکر ہے تم آگئے ورنہ آج نہ جانے کیا ہوجاتا۔'' یہ کہہ کر اس نے پرس اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ ''میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''پلیز... ایڈورڈ سے اس بات کا ذکر مت کرنا ورنہ تو وہ میرا اکیلے گھر سے نکلنا بند کردے گا۔'' جینی نے اس سے درخواست کی۔ ''وہ تو پہلے ہی مجھے منع کررہا تھا۔ یہ سن لیا تو نہ جانے کتنی باتیں سنا ڈالے گا۔''

''جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔'' پال نے مسکرا کر کہا۔ ''ویسے کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہاں قریب میں ایک اچھا کافی ہاؤس ہے۔''

''فوراً چلو۔'' جینی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ خوف کی شدت کے باعث اب تک لرز رہی تھی۔ ''اس وقت کافی کی سخت طلب ہورہی ہے۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے، اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہوکر کافی ہاؤس پہنچے۔ اندر پہنچتے ہی پال نے کافی آرڈر کی۔ دونوں شیشے کی دیوار کے ساتھ لگی میز پر ہاتھ رکھے، ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے کافی کے منتظر تھے۔

''اور سناؤ، معاملات کیسے چل رہے ہیں؟'' پال نے پوچھا۔

یہی سوال چند روز پہلے اُس سے اسکاٹ نے بھی کیا تھا مگر وہ بات بنا گئی تھی لیکن اب وہ پال کی دل سے معترف تھی۔ اس نے سب کچھ سچ سچ کہہ دینے کا فیصلہ کیا۔

''معاملات بہت خراب ہیں۔'' جینی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''جب تم نے اسے ٹونی کو تھپڑ مارنے والی تصویر دکھائی، اس شام اس نے مجھے ایمرالڈ کے نہایت قیمتی ٹاپس دیے مگر اس کے چند روز بعد اس کا رویّہ پھر بدلنے لگا۔ اس نے مجھ پر اسکاٹ کے ساتھ کام کرنے کے لیے دباؤ ڈالا اور انکار پر اس کا مزاج بالکل ہی بدل گیا ہے۔ اب تو ہماری بول چال بھی کئی روز سے بند ہی ہے۔'' جینی نے اسے پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک پیش آنے والے واقعات کا احوال سنایا۔

وہ خاموش ہوئی تو پال نے غور سے چند لمحوں تک اسے دیکھا۔ ''تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور پھر استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں... کرتی ہو محبت اس سے؟''

''میرا خیال ہے کہ شاید...'' اس نے کافی کا بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد بے یقین لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اسے پسند کرتی تھی، شادی سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور کچھ سوچتی رہی۔ ''میں گھر میں تنہائی کی بور زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ اب وہ بھی شادی سے پہلے والا ایڈورڈ نہیں رہا۔ ہم دونوں اچھی زندگی گزار سکتے ہیں مگر گزار نہیں رہے۔ اگر وہ چاہے تو اب بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوسکتا ہے۔''

''میرا خیال نہیں کہ اب سب کچھ پہلے جیسا ہوسکے گا۔'' اس کے خاموش ہونے پر پال نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ تم اسے چھوڑ دو اور کوئی ایسا ساتھی ڈھونڈ لو جو تمہیں سمجھ سکتا ہو، تم پر بھروسا کرے اور تمہاری قدر بھی کرسکے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ یہ اچھا فیصلہ ہوگا۔'' جینی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' پال نے فوراً اس کی تائید کی۔ ''ویسے میں خوش ہوں کہ آج بروقت پہنچ گیا ورنہ تو...''

''واقعی... تم نہ پہنچتے تو نہ جانے کیا ہوجاتا۔'' جینی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ بتاؤ...'' جینی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''جب میں کمیونٹی سینٹر میں تھی تو کیا تم سارا وقت باہر بیٹھ کر میری راہ تک رہے تھے؟''

''سارا وقت تو نہیں...'' وہ مسکرایا۔ ''زیادہ تر وقت میں نے کمیونٹی سینٹر کے اندر گزارا۔''

''اندر...'' جینی نے حیرت سے کہا۔ ''میں نے تو تمہیں وہاں نہیں دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب گروپ کے بچے بچیاں پہنچ گئے تو شیرون نے سینٹر کا دروازہ لاک کردیا تھا تو پھر تم کیسے اندر پہنچے؟'' اس کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔

''کمیونٹی سینٹر کی خفیہ کیمروں سے نگرانی نہیں کی جاتی اور اس کا لاک بہت اعلیٰ درجے کا نہیں۔'' یہ کہہ کر پال مسکرایا۔ ''ویسے بھی کسی سراغ رساں کے لیے تالے کھولنا بڑی بات نہیں ہے۔''

کافی کب کی ختم ہوچکی تھی لیکن ان کی باتیں جاری تھیں۔ جینی کو بھی اس کی باتوں میں مزہ آرہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو شدید اعصابی تناؤ تھا، وہ ختم ہوچکا تھا۔ اب وہ خود کو ہشاش بشاش محسوس کررہی تھی۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلنا چاہیے، کافی دیر ہوگئی۔ وہ گھر پر منتظر ہوگا، کافی کے لیے شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''سنو... کل تم بہن کی شادی کی تیاریوں کے لیے گھر سے شاپنگ کو نکلوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے جینی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تو پھر کل لنچ ساتھ کریں گے؟''

''سن کر اچھا لگا۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''مگر یہ سوچو کہ اگر کسی نے ہمیں اکٹھے لنچ کرتا دیکھ لیا تو...''

''اسے... تم پر صرف میری نظریں ہیں اور میں یہ بات ایڈورڈ کو بتانے والا نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''کل کا لنچ ساتھ کریں گے۔''

''اوکے۔'' جینی نے کار کا دروازہ کھولا۔ پال کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ''بائے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر بیٹھی اور گھر کی جانب چل دی۔

پال سے یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔ وہ بھی پہلی ملاقات کے کئی ہفتوں بعد مگر تیسری ملاقات پندرہ سولہ گھنٹوں کے اندر اندر ہوئی اور پھر ملنے ملانے کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ وہ اوپری دل سے تو انکار کرتی مگر پال کے زور دینے پر آمادہ ہوجاتی اور یوں وہ روز ملنے لگے۔ کبھی لنچ پر کسی ریستوران میں تو کبھی کافی کے بہانے سہ پہر کو کسی کافی ہاؤس میں۔ ہر ملاقات میں پال جینی کو ایڈورڈ سے علیحدگی کا مشورہ دیتا۔ بظاہر وہ یہ تاثر دیتا کہ یہ دوست کا مشورہ ہے مگر وہ ہنس کر اسے ٹال جاتی تھی۔ ہر بار جینی کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اب بھی حالات پہلے جیسے ہوسکتے ہیں مگر پال ہمیشہ اس سے پہلے اختلاف کرتا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا۔

''تم سے وہ عمر میں کافی بڑا ہے، اپنی جسمانی صحت کی فکر ہے اسے۔'' ایک دن کافی پیتے ہوئے اس نے جینی سے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے ورزش وغیرہ کرتا ہے وہ؟''

''کیوں نہیں۔ اس نے گھر پر ورزش کرنے والی کئی مشینیں رکھی ہوئی ہیں۔ اکثر رات کو وہ تہ خانے میں جاکر ورزش کرتا ہے۔''

''کس قسم کی مشینیں ہیں؟'' پال نے پوچھا۔

''ٹریڈمل، فری ویٹ، اسٹیشنری بائیک...'' جینی نے بتایا۔

''فری ویٹ...'' یہ سنتے ہی وہ چونکا۔ ''یہ مشین تو خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔'' اس کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

''نہیں...'' جینی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''اس کا ایک فرنچ دوست آندرے فزیکل ٹرینر ہے، وہ اس کی ہدایت کے مطابق ان ورزشی مشینوں کا استعمال کرتا ہے۔''

''اس کی شخصیت میں شکی پن ہے۔'' پال نے کہنا شروع کیا۔ ''اب یہ عنصر زیادہ ہے یا کم، میں اس بارے میں

کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ شاید تمہارا اندازہ درست ہے۔" جینی نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں میرے پیچھے کیوں لگاتا۔"

"تمہارے گھر کا جدید سیکیورٹی سسٹم جو اس نے شاید اپنی نایاب پینٹنگز کی حفاظت کے لیے لگا رکھا...."

"صرف یہی نہیں۔" جینی نے قطع کلامی کی۔ "ایسی کئی اور چیزیں بھی ہیں جن سے تمہاری رائے کو تقویت ملتی ہے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں گفتگو کررہی تھی۔

"میں تم سے شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اس نے گھر کے سیکیورٹی سسٹم کا کوڈ اپنی تاریخ پیدائش رکھا ہوگا۔" اچانک پال نے گفتگو کو نیا رخ دے دیا۔ "ایسا ہی ہے نا؟" اس نے جینی کو غور سے دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"مجھے نہیں معلوم، اس نے کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ "ویسے وہ شادی کی تاریخ کو بھی بطور کوڈ استعمال کرسکتا ہے۔ تاریخ پیدائش کے مقابلے میں یہ زیادہ رومینٹک ہے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے۔"

"اچھا سنو!" جینی نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "ہم کل نہیں مل سکیں گے، میں اپنے والدین کے گھر جارہی ہوں، شادی کے سلسلے میں۔"

"جانتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ صرف تم ہی بفیلو نہیں جارہی ہو، میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے وہیں جارہا ہوں۔"

"کیا..." جینی نے یہ سن کر خوشگوار حیرت کے انداز میں کہا۔

"ایڈورڈ چاہتا ہے کہ میں وہاں بھی تم پر نظر رکھوں کہ کہیں تم اپنے کسی پرانے ہائی اسکول فیلو سے تو پینگیں نہیں بڑھارہی ہو۔"

"ذلیل انسان..." یہ سنتے ہی اس نے ایڈورڈ کی شان میں کہا۔ وہ یہ سن کر جل بھن گئی تھی۔ اسے شوہر کی کمینگی اور گندی ذہنیت پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں، مجھے یہ بات تم سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

"تمہارا کوئی قصور نہیں۔" جینی نے سر جھٹک کر کہا۔ "وہ ہے ہی ایسا۔"

"کیا اب بھی تم توقع کروگی کہ حالات پہلے جیسے ہوسکتے ہیں؟" پال نے کہا مگر جینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"اگر ایسا ہو کہ تم جب بفیلو سے لوٹو تو ایڈورڈ تمہیں گھر پر نہ ملے، وہ کہیں جاچکا ہو، پورا گھر تمہارا ہو اور تم اس کے خوف سے بالکل آزاد ہو۔" پال نے چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "اگر ایسا ہو تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

اس کی بات سننے کے بعد کچھ دیر تک جینی خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہی اور پھر سر جھٹک کر کہنے لگی۔ "ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔"

"یقیناً... ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔" پال نے فوراً اس کی تائید کی۔ "مگر وہ سیکیورٹی کوڈ... ممکن ہے کہ یہ کوڈ وہ ہو جس تاریخ کو اس نے گریجویشن کیا ہو یا پھر اس کا سوشل سیکیورٹی نمبر..."

"چھوڑو ان فضول باتوں کو۔" اس نے کہا۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ کہہ دے کہ یہ کوڈ وہ تاریخ بھی ہوسکتی ہے جس دن اس نے اپنی فرم کا پہلا سینئر پارٹنر بنایا ہو مگر وہ کہہ نہ سکی۔ ویسے بھی وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس روز کیا تاریخ تھی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے اور پھر اچانک جینی کھڑی ہوگئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔" یہ دیکھ کر پال بھی کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اپنی اپنی راہ جارہے تھے۔

اگرچہ ایڈورڈ پہلے ہی کئی بار اسے بتاچکا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی میں شرکت نہیں کرسکے گا مگر روانگی سے ایک رات پہلے جینی نے آخری بار اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "اگر تم بھی ساتھ چلتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔" وہ سونے کے لیے لیٹا تو جینی نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ پروگرام پہلے ہی طے ہوچکا ہے۔"

"مگر..."

"بہتر ہے کہ تم سوجاؤ، کل صبح تمہیں بفیلو کے لیے نکلنا ہے۔" ایڈورڈ نے کمبل اوپر لیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا اور لیمپ آف کردیا۔ وہ سمجھ گئی کہ مزید کچھ کہنا فضول ہوگا۔

دوسرے دن وہ صبح سویرے اٹھی، ناشتا کیا اور تیار ہونے لگی۔ ایڈورڈ کل رات ہی اسے کہہ چکا تھا کہ وہ اسے ائرپورٹ چھوڑنے نہیں جاسکے گا۔ اس نے فون کرکے ٹیکسی منگوائی۔ راستے میں وہ کافی اداس تھی مگر اسے علم تھا کہ پال بھی جارہا ہے۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر ائرپورٹ پر پال مل جائے تو سفر زیادہ خوشگوار کٹے گا مگر وہ اسے نہیں ملا۔

سفر اس نے تنہا طے کیا۔

ائرپورٹ پر اسے لینے کے لیے چھوٹی بہن گینی، اس کا منگیتر اور دو کزن آئے تھے۔ گینی کا منگیتر آرتھر مکینک تھا۔ پیسے جوڑ جوڑ کر اب اس نے ایک علیحدہ دکان لے کر ورکشاپ بنالی تھی۔ گینی اس ورکشاپ کے برابر میں چائے، کافی کی ایک چھوٹی سی دکان چلارہی تھی۔ اگرچہ وہ بہت خوبصورت نہیں تھا مگر کچھ ہی دیر میں اس نے بھانپ لیا کہ وہ گینی کا بے دام غلام ہے۔ ویسے بھی دونوں ہم عمر ہی تھے۔ دوسرے روز ان کی شادی ہونے والی تھی۔ جینی ان کے لیے بہت قیمتی تحائف لے کر آئی تھی۔ اس کے سب ملنے جلنے والے جانتے تھے کہ اس کا شوہر بہت مال دار ہے۔ اسے نیک نامی کی لاج رکھنی تھی۔ جینی کے والدین قدامت پسند تھے۔ انہوں نے شادی میں شرکت کے لیے تمام رشتے داروں کو مدعو کیا تھا۔ وہ گھر پہنچی تو سب نے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا۔

اُس شام جینی بہت خوش تھی۔ اس روز جمعہ تھا۔ شادی سے ایک رات پہلے دولہا کے اعزاز میں لڑکی والے روایتی ڈنر دیتے ہیں، اس ڈنر میں جینی کی کئی پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ شادی کا ہنگامہ خوشیوں سے بھرا تھا۔ جینی بھی خود کو کئی برس پہلے والی بے فکر لڑکی محسوس کررہی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا سِلک کا مہنگا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایمرالڈ کے ٹاپس پہننا چاہتی تھی مگر بھول گئی۔ کئی پرانی سہیلیوں نے اس کے لباس کی بہت تعریف کی جس پر وہ پھولے نہیں سمارہی تھی۔ ڈنر کا ہنگامہ ختم ہوا تو وہ کمرے میں لوٹی اور بیڈ پر بیٹھ کر اونچی ایڑی کی جوتی اتار کر پاؤں سہلانے لگی۔ مستقل کئی گھنٹوں تک اسے پہنے پہنے پاؤں تھک گئے تھے، اوپر سے وہ مستقل تتلی کی طرح اِدھر اُدھر پھرتی رہی تھی۔ فرصت ملی تو تھکن کا احساس جاگ اٹھا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسے ٹاپس کا خیال آیا۔ اٹھ کر دیکھا تو وہ غائب تھے۔ اس نے پورا کمرا چھان مارا مگر وہ نہ ملنا تھے نہ ملے۔ وہ ٹاپس نہ پاکر ڈر گئی۔ یہ ایڈورڈ کا تحفہ تھا۔ اُسے پتا چلتا تو سخت بگڑتا۔ بیٹھے بیٹھے وہ کچھ سوچتی رہی اور پھر موبائل اٹھا کر ایڈورڈ کا نمبر ملانے لگی۔

"ہاں جینی، سب خیریت تو ہے؟" فون اٹینڈ کرتے ہی اس نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔"

"تو پھر رات کے اس پہر فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

لیکن

ایک ٹریولنگ سیلز مین کرکٹ کا بہت شوقین تھا۔ وہ ایک دور دراز کے قصبے میں گیا تو مقامی دکان دار سے پوچھا۔ "یہاں کوئی ٹیم بھی ہے؟"

"بالکل ہے۔ کل میچ بھی کھیلے گی۔" دکان دار نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"مجھے کھلائیں گے وہ لوگ؟"

"ضرور کھلائیں گے، کل میدان میں پہنچ جانا۔"

سیلز مین نے دکان دار سے مکمل کٹ خریدی۔ اگلے روز صبح کے وقت وہ نئی کٹ پہن کر بیٹ بغل میں دبائے میدان میں پہنچا۔ دکان دار وہاں موجود تھا۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟" سیلز مین نے دکان دار سے پوچھا۔

"جچ رہے ہو۔" دکان دار نے کہا۔ "لیکن میچ تو فٹ بال کا ہے۔"

(کراچی سے عرفان احمد کی معصومیت)

فیصلہ

نوجوان پادری: "وہ شخص اعتراف کررہا ہے کہ اس نے شراب کی بوتلوں کا پورا ایک کریٹ چرایا ہے۔ بتایئے میں اس سے کیا کہوں؟"

بوڑھا پادری: "کہہ دو کہ ہم ایک شلنگ فی بوتل سے زیادہ نہیں دے سکتے۔"

(البرٹ جارج کی فیاضی)

"ضرورت تھی۔" جینی نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔

"کیسی ضرورت؟"

"کل شادی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم شریک ہو۔ کل صبح کی پرواز مل سکتی ہے۔ چاہو تو تم اب بھی کار لے کر نکل سکتے ہو۔"

"ممکن نہیں۔" ایڈورڈ نے اس کی بات کاٹی۔ "میں پہلے ہی تمہیں کہہ چکا تھا تو پھر اب یہ سب کچھ کہنے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آئی ہے۔"

"بہت سخت ضرورت پیش آئی ہے مسٹر ایڈورڈ۔" جینی نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تم نے میرے پیچھے جو سراغ رساں لگا رکھا ہے، وہ یہاں مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کررہا ہے اور یہ سب کچھ مجھے پسند نہیں۔ اس لیے

تمہارا یہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔" اس نے غصے میں راز فاش کردیا۔ "اب تو سمجھ گئے نا کہ تمہاری یہاں کس لیے ضرورت ہے اور وہ بھی صرف مجھے۔"

"لگتا ہے تم نے پارٹی کے ہنگامے میں بہت زیادہ پی لی ہے، اسی لیے بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔" ایڈورڈ نے کہا۔ "فون بند کرو اور سوجاؤ۔ میں کل بہت مصروف ہوں۔ اتوار کو فون کروں گا... بائے۔" یہ کہہ کر اس نے لائن منقطع کردی۔

فون جینی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے ٹاپس کی گمشدگی سمیت کسی اور کے بارے میں بھی بتانا چاہتی تھی لیکن بتا نہ سکی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اسی عالم میں بستر پر لیٹ گئی۔ رات کا آخری پہر تھا جب اسے نیند آئی۔ جب تک جاگتی رہی، تب تک وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہونے جارہا ہے۔

سنیچر کی شام طے شدہ وقت پر جب وہ اپنی بہن اور والدین کے ساتھ چرچ پہنچی تو مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ اگرچہ جینی کو پہننے اوڑھنے اور میک اپ کا بہت شوق تھا لیکن اس سے چند سال چھوٹی گینی اس معاملے میں اُس کے برعکس تھی۔ اسے تو ٹاپس پہننا بھی پسند نہ تھا مگر اُس شام شادی کے لباس میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اسے ایڈورڈ کے ساتھ گزری زندگی پر رونا آنے لگا مگر اس نے آنسو ضبط کرلیے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ شادی سے فراغت کے بعد وہ کلیولینڈ واپس جائے گی اور اپنا سامان لے کر واپس یہیں آجائے گی۔ اس کے والدین کا فارم ہاؤس بہت بڑا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ یہیں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے زندگی بسر کرلے گی۔

مذہبی رسومات ختم ہوئیں تو مہمانوں کے لیے پُرتکلف چائے کا اہتمام تھا۔ وہ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی پارکنگ کی طرف گئی۔ پال بذریعہ کار کلیولینڈ سے یہاں پہنچا تھا۔ وہ کل رات اس سے مل چکا تھا۔ جینی کو یقین تھا کہ پال پارکنگ میں ہوگا مگر وہاں نہ تو وہ نظر آیا اور نہ ہی اس کی کار موجود تھی۔ وہ کچھ دیر تک اسے تلاش کرتی رہی اور پھر ناکام ہوکر چرچ کے لان میں لوٹ آئی، جہاں مہمان چائے اور خوش گپیوں سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

شادی ڈنر کے بعد ڈانس نائٹ تھی۔ دولھا دلہن اور نوجوان دوست احباب رات دیر گئے تک ڈانس کرتے رہے۔ اس دوران میں جینی کئی بار پارکنگ کی طرف گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی مگر پال نظر نہ آیا۔ اسے نہ پاکر جینی کا دل انجانے وسوسوں سے بیٹھا جارہا تھا۔ اُس رات پال کرید کرید کر اس کے گھر کے الیکٹرانک حفاظتی سسٹم کا کوڈ جاننے کی کوشش کررہا تھا، اب وہی بات اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ اُس رات وہ ایڈورڈ کو یہی بتانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں پال گھر میں گھس کر اسے قتل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے مگر نہ جانے کیوں وہ یہ نہ کہہ سکی۔ اب اسے نہ پاکر اس کا دل ڈوبے جارہا تھا۔

رات ایک بجے کا وقت ہوگا، جب پارٹی ختم ہوئی۔ گینی اور آرتھر تین دن کے ہنی مون پر لیک ٹاؤن چلے گئے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد مہمانوں نے بھی جانا شروع کردیا۔ جب وہ گھر والوں کے ساتھ لوٹی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سیدھی بیڈروم میں گئی اور موبائل اٹھا کر کئی بار ایڈورڈ کا نمبر ملایا لیکن کال ملنے سے پہلے ہی لائن کاٹ دیتی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ایڈورڈ برس نہ پڑے، اسی کشمکش میں وہ سوگئی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ وہ سب سے پہلے اٹھی۔ ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ فون کر کے اگلی پرواز کے لیے اپنی نشست کنفرم کرائی اور صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے، جب اس نے گھر والوں کو الوداع کہا اور ائرپورٹ چل دی۔ کلیولینڈ پہنچ کر اس نے ایڈورڈ کو فون کرنے کا سوچا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ ٹیکسی منگوائی۔ گھر پہنچی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ وہ کانپتے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر بیڈروم میں پہنچی۔ وہاں ایڈورڈ نہیں تھا۔ اس نے سوٹ کیس فرش پر رکھا اور سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اٹھی۔ اب وہ تہ خانے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں اکثر رات کو ایڈورڈ مشینوں کے ذریعے ورزش کرتا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور پھر اس کے قدم جہاں تھے، وہیں تھم گئے۔ فری ویٹ مشین کے قریب فرش پر ایڈورڈ مردہ حالت میں چت پڑا تھا۔ اس کا جسم بے ترتیب حالت میں تھا۔ اوپر چڑھی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور فرش پر ہر طرف خون تھا جو خشک ہوکر جم چکا تھا۔

جینی کے لیے یہ سب کچھ دل دہلا دینے والا تھا۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور پھر کئی منٹ بعد اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور موبائل فون نکال کر ریسکیو نائن ون ون ڈائل کرنے لگی۔

یہ اس قصے کا اختتام نہ تھا۔

ایڈورڈ کی تدفین کے کئی ہفتوں بعد بھی پولیس والے گھر آکر اس سے مختلف سوالات کرتے رہے۔ پولیس کی روز روز کی آمد سے تنگ آکر اس نے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ بطور وکیل وہ صرف اسکاٹ کو ہی جانتی تھی۔ اسے فون کیا۔ اسکاٹ نے کہا کہ عام طور پر وہ جرائم کے مقدمات نہیں لیتا تاہم اس کی خاطر وہ ایسا کرنے کو تیار تھا۔ اکثر دو سراغ رساں تفتیش کے لیے اس کے پاس آتے تھے لیکن جب سے اس نے اسکاٹ کی مدد لی، تب سے وہ ایک بار بھی تنہا ان لوگوں سے نہیں ملی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ایڈورڈ کا قتل ہفتے اتوار کی درمیانی شب بارہ سے ایک بجے کے درمیان ہوا تھا۔ جینی اس وقت کئی سو میل دور واقع بفیلو شہر میں تھی اور جس وقت قتل ہوا وہ ڈانس پارٹی میں تھی۔ پولیس کو پتا چل چکا تھا کہ وہ جم جاتی تھی اور ٹونی اس کا ٹرینر تھا۔ اس سے بھی پوچھ گچھ ہوئی مگر اس رات وہ گیارہ سے دو بجے تک بار میں تھا۔ پولیس نے اس کے ایمرالڈ کے ان قیمتی ٹاپس کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی جو شادی کے ہنگامے میں کھو گئے تھے۔ پولیس نے جب دس ہزار ڈالر مالیت کے ٹاپس کھو جانے پر رپورٹ نہ درج کرانے کی وجہ جاننی چاہی تو جینی کا جواب تھا کہ وہ شادی کے گھر میں بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر گھر کی خفیہ نگرانی کرنے والے کیمروں کی ریکارڈنگ بھی غائب تھی۔

پولیس نے دو ماہ تک ایڈورڈ کے قتل کی تحقیقات جاری رکھیں مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس دوران میں وہ اَن گنت بار جینی کے پاس بھی آئے مگر اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کرسکے۔ ان دو مہینوں میں اسکاٹ اور جینی کے درمیان بے تکلفی بڑھتی رہی۔ البتہ پال کی کوئی خبر نہیں تھی۔

ایک مہینا اور گزر گیا۔ اس دوران میں پولیس نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ البتہ اسکاٹ اس سے ملنے آتا رہا۔ اب وہ اکثر شام کو باہر کھانے پر جانے لگے تھے۔ یہ دوستی صرف گھومنے پھرنے تک ہی محدود تھی البتہ جینی سمجھ رہی کہ اسکاٹ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ وہ خود بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔

ایڈورڈ کی موت کو پانچواں مہینا تھا۔ ایک روز اسکاٹ نے اسے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ گھر جھیل کنارے بہت پُرفضا مقام پر تھا۔ غروب آفتاب کے وقت وہ ٹیرس پر بیٹھے تھے اور سورج ڈوب رہا تھا۔ آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس جینی کے دل میں بھی گدگدیاں ہورہی تھیں۔ رات ڈنر کے بعد وہ کافی دیر تک اس کے ساتھ رہی اور جب بادل ناخواستہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اسکاٹ نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بھی خود سپردگی کے عالم میں اس کی بانہوں کے گھیرے میں جھول گئی۔ پہلی بار وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے تھے۔ وہ اکثر شامیں ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے تھے مگر یہ پہلا موقع تھا جب ان کی رات بھی ایک ساتھ گزری۔ اس کے بعد سے اکثر وہ شام سے صبح تک ساتھ رہنے لگے۔ جینی کو اس کی قربت بہت پسند تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایڈورڈ نے شادی کے تیسرے سال اسے جو شدید ذہنی تناؤ بخشا تھا، اسکاٹ اس کا ازالہ ثابت ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ اسے شادی کا پیغام دینے والا ہے۔ اسکاٹ سے شادی کی خوشی میں وہ پال کو بھلا چکی تھی۔ ویسے بھی مہینوں ہوگئے تھے، اس نے ایک بار بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ جینی صوفے پر بیٹھی ناخن تراش رہی تھی۔ بیڈ پر اس کا نیا سوٹ پڑا تھا۔ شام کو اسے اسکاٹ کے ساتھ ڈنر پر جانا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر موبائل فون رکھا تھا۔ وہ ناخن تراشنے میں مگن تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جینی نے فون اٹھایا۔ اجنبی نمبر تھا۔ "ہیلو!" کال اٹینڈ کر کے اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پال بول رہا ہوں، امید ہے پہچان گئی ہوگی۔"

جینی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آواز سن کر اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر اٹھی۔ "کیسے ہو؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے رسمی لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک..." پال نے لہک کر کہا۔ "آج رات تم میرے ساتھ ڈنر کررہی ہو، اسی جگہ جہاں ہم نے پہلی بار جوس پیا تھا۔"

"نہیں..." جینی نے انکار کیا۔ "میں ڈنر پر جارہی ہوں مگر اسکاٹ کے ساتھ۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔"

"جانتا ہوں یہ سب کچھ۔" پال نے بے فکرے انداز میں کہا۔ "یہی میں تم سے کہنے والا ہوں کہ مجھ سے شادی کرو، مزے میں رہوگی۔"

"کیا مطلب..." جینی نے چونک کر کہا۔ "میں اُسے پسند کرتی ہوں۔"

"مجھے بھی کرسکتی ہو اگر پوری بات سن لو تو..." اس نے

جینی کی بات کاٹی۔

''ستاؤ...'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

''تمہارے قیمتی ایمرالڈ ٹاپس، جن کی گمشدگی پولیس ریکارڈ پر ہے۔'' پال نے کہنا شروع کیا۔ یہ سن کر وہ دم بخود رہ گئی کہ اسے کیسے پتا چلا۔ ''پریشان مت ہو، بس یہ سوچو کہ اگر پولیس کو وہ ٹاپس اور ٹونی کی بانہوں میں تمہاری خود سپردگی والی یادگار تصویر اُسی کے فلیٹ سے مل جائے تو...''

''او کے۔'' جینی نے اس کی بات کاٹی۔

''بہت جلد معاملہ سمجھ گئیں۔ تم خوبصورت ہی نہیں، بہت ذہین بھی ہو۔'' پال نے اس کی رضامندی سنتے ہی کہا۔

''شام سات بجے میں کیفے پہنچ رہی ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' اس نے کہا۔ ''میں انتظار کروں گا۔''

جینی نے کچھ دیر بعد فون کر کے اسکاٹ سے معذرت چاہی اور جب وہ کیفے میں داخل ہوئی تو شام کے سات بجنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ پال نے فون پر اس سے جو کچھ کہا تھا، وہ سب سن کر جینی بہت ڈر گئی تھی مگر دو گھنٹے بعد جب وہ دونوں کیفے سے باہر نکلے، تب تک جینی خود کو یقین دلا چکی تھی کہ پال بھی کوئی برا شخص نہیں۔

کچھ ہی دن میں وہ اسکاٹ سے قطع تعلق کر کے مکمل طور پر پال کی ہو کر رہ گئی۔ چند ہفتے انہوں نے نہایت ہنسی خوشی گزارے۔ اس کے بعد پال نے اس سے ایک لاکھ ڈالرز لیے تاکہ وہ اپنی سراغ رساں ایجنسی کھول سکے۔ جینی نے رقم ہنسی خوشی دے دی۔ جس روز اس نے پال کو رقم دی، اسی شام وہ اپنے سامان سمیت مستقل طور پر اس کے گھر منتقل ہو گیا۔ وہ گھر جس کا مالک مقتول ایڈورڈ بھی پال کو فیس ادا کرتا تھا مگر اب وہ خود اس کے گھر کا مالک بننے والا تھا۔

کچھ ہی دن میں دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا۔ جینی کا خیال تھا کہ وہ بفیلو جا کر اپنے خاندان والوں کے درمیان شادی کرے مگر پال راضی نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کلیولینڈ کے سٹی ہال میں سادگی سے شادی کریں گے اور اسی رات کروز پر سوار ہو کر ...... ہنی مون منانے چل دیں گے۔ کافی ردوکد کے بعد آخر جینی نے اس کی رائے کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی، سورج غروب ہو رہا تھا اور وہ دونوں کروز پر سوار ہو کر ہنی مون شروع کر چکے تھے۔ وہ ان کی کروز کے آٹھ روزہ سفر کی پہلی شام تھی۔ اس شام کروز کی انتظامیہ نے ڈائننگ ہال میں پُرتکلف ڈنر اور اس کے بعد موسیقی کا اہتمام کیا تھا۔ جینی نے گہرے نیلے رنگ کی میکسی، کانوں میں ہیرے جڑے ٹاپس اور گلے میں بہت نازک لاکٹ پہن رکھا تھا۔ یہ سب کچھ ایڈورڈ کا دیا ہوا تھا، جسے وہ اپنی دوسری شادی کے موقع پر زیب تن کیے ہوئے تھی۔ ڈنر سوٹ میں ملبوس پال اس کا ہاتھ تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔

''پال...'' اچانک کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز دینے والا پال کا کوئی شناسا تھا، وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ بھی کر رہا تھا۔ جینی نے دیکھا۔ پانچ چھ مرد اور عورتیں ایک بڑی سی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ پال کو پکارنے والا انہی میں سے ایک تھا۔

''آؤ... تمہیں اپنے پرانے دوست سے ملاتا ہوں۔'' پال نے جینی کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ میز کے قریب پہنچے تو سب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ ''ارے یہ کون ہیں؟'' اس کے دوست نے جینی کو دیکھتے ہوئے پال سے سوال کیا۔

''خواتین و حضرات... میں ہوں پال اڈیسن اور یہ ہیں میری نہایت پیاری اور چہیتی مسز جینی اڈیسن۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر ان سب پر طائرانہ نظر ڈالی اور جینی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے مزید قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''جینی، میری پہلی بیوی۔''

وہ مسکرا رہی تھی لیکن یہ سنتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے مگر کسی نے اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ وہ اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی۔ اسی لمحے، کھڑے کھڑے جینی نے فیصلہ کر لیا۔ وہ ایڈورڈ کے خلاف پال کا پورا کھیل اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ ہفتہ بھر بعد جب وہ گھر لوٹے گی تو سب سے پہلے دوسرے شوہر کے لیے کسی شاطر سراغ رساں کا انتظام کرے گی۔ وہ پہلی بیوی کہلانے سے بہتر بیوہ کہلوانا پسند کرتی، یہ سوچتے ہوئے اس کی نگاہوں میں اسکاٹ کا چہرہ گھوم گیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے مسکرا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ''جی ہاں... میں ہوں ان کی پہلی بیوی اور یہ ہیں میرے دوسرے شوہر۔''

یہ سنتے ہی لمحہ بھر کے لیے پال کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ جینی بھی ہنس دی۔ وہ سوچ رہی تھی آئندہ پانچ چھ ماہ میں پال کا قصہ نمٹنے تک اسکاٹ ضرور غیر شادی شدہ ہی رہے گا۔

منصوبہ ساز

آصف ملک

ایک تجربہ کار، کہنہ مشق شخص کے مقابل آجانے والے ایک ناتجربہ کار کا عبرت آموز انجام

جرم کرنا سہل کام نہیں... اس کے لیے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے... معمولی جرم کرنے کے بعد اس دفعہ وہ خطرناک کام انجام دے رہا تھا... اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی کامیابی کے احساس نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ منصوبہ سازی کرنے والے ایک تیسرے شخص کا کردار جس نے کہانی کا رخ بدل دیا...

جیف ڈین جیل کی چار دیواری میں داخل ہوا تو اسے وہ تمام مراحل طے کرنے پڑے جو نئے آنے والے قیدیوں کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ اس میں پریشر والے پانی سے صفائی بھی شامل تھی۔ جیف کو سب سے زیادہ نفرت اسی مرحلے سے تھی۔ جیل اس کے لیے نئی جگہ نہیں تھی، یہ اس کا تیسرا دورہ تھا۔ پہلی بار اسے چوری کے جرم میں چار مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ دوسری بار اس نے ایک گیس اسٹیشن لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس بار اسے ایک سال کے لیے جیل بھیجا گیا تھا۔ دونوں بار اسے کم عمری کا فائدہ دیا گیا تھا۔ دوسری بار وہ جیل سے نکلا تو اس کی

عمر صرف بیس سال تھی، اس کے بعد وہ محتاط ہوگیا۔ تیسری بار وہ بدقسمتی سے پکڑ میں آیا تھا۔ اس نے ایک کمسن لڑکی سے زیادتی کی تھی اور وہ اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ شناختی پریڈ میں اس نے بہ آسانی اسے شناخت کرلیا اور جیف کو پھر سات مہینے کی سزا ہوئی۔ دراصل جیف کا وکیل شک پیدا کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ لڑکی کی رضامندی سے سب ہوا تھا اور بعد میں اس نے جیف پر الزام لگا دیا۔ اسی وجہ سے اسے صرف سات مہینے کی سزا ہوئی تھی۔

جیف کا پس منظر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا اس قسم کے تھرڈ کلاس مجرموں کا ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی مجرم تھا اور اس کا زیادہ وقت جیل میں گزرتا تھا۔ جب وہ رہا ہوکر آتا تو نشے میں دھت ہوکر اس کی ماں اور جیف کے بہن بھائیوں سمیت سب کی مرمت کرتا تھا۔ بیوی کو ایک نئے بچے کا تحفہ دے کر وہ پھر جیل چلا جاتا۔ اسے سات بار جیل ہوئی اور اس کے چھ بچے تھے۔ آخری بار جیل میں ہی ایک جھگڑے میں کسی قیدی نے ریزر سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ جیف کی ماں نے دونوں طرح سے جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ جیف اس وقت بارہ سال کا تھا اور اسے اسکول چھوڑے ہوئے بھی کئی سال ہوچکے تھے۔ باپ کے مرنے سے پہلے جیف جرم کی راہ اپنا چکا تھا۔

جیف بدمعاش تھا لیکن اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ جیل سے باہر بھی وہ اکیلا تھا۔ اس کے چند ایک نام نہاد دوست تھے جو صرف عیاشی میں اس کا ساتھ دیتے آئے تھے، وہ اس کے ساتھ کسی واردات یا مشکل کام میں شریک ہونے کا سن کر ہی کھسک جاتے تھے۔ جیف کی حیثیت جنگل میں اس اکیلے چیتے کی سی تھی جسے اپنی دیکھ بھال خود کرنی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کسی چیتے کی طرح محتاط رہتا تھا۔ اس نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں تعلیم ضروری نہیں تھی اور کم سے کم اس کے شعبے میں بالکل بھی ضروری نہیں تھی۔

تیسری بار جیل جانے پر اس کا استقبال ذرا مختلف انداز میں ہوا تھا۔ جو نئے آئے تھے انہوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا لیکن پاس آنے سے گریز کیا اور جو اسے پہلے دیکھ چکے تھے، انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنا سامان اٹھائے گارڈ کے ساتھ اپنی کوٹھری تک آیا۔ وہاں پہلے ہی ایک بوڑھا قیدی تھا۔ گارڈ نے خودکار طریقے سے کھلنے والے دروازے کو اس وقت مینول انداز میں کھولا کیونکہ صبح جب سارے قیدیوں کو باہر نکالنا ہوتا تھا تو سارے دروازے ایک ساتھ خودکار طریقے سے کھولے جاتے تھے۔ اس کے بعد جب شام کو ان قیدیوں کو واپس بند کیا جاتا، تب بھی دروازے خودکار انداز میں بند ہوتے تھے۔

جب گارڈ چلا گیا تو جیف نے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ وہ بہت بوڑھا نہیں تھا، اس کی عمر پچپن سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہا تھا۔ وہ جیف کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”ہیلو... میرا نام مائیکل کین ہے۔“

جیف نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اپنے بستر کے نیچے موجود خانے میں سامان رکھنے لگا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا ..... کیونکہ اس وقت اسے شدت سے نیند آرہی تھی۔ غسل وغیرہ کرنے کے بعد وہ تھک گیا تھا اس لیے چند منٹ میں خراٹے لینے لگا۔ پھر کسی نے اسے جھنجوڑا۔ دوسری بار ہلانے پر وہ بھناتا ہوا اٹھا اور اس نے بوڑھے مائیکل کی گردن پکڑلی۔ وہ اسے جگا رہا تھا۔

”کیا بات ہے... تم مرنا چاہتے ہو میرے ہاتھ سے...؟“

مائیکل میں دم کہاں تھا، اس کی سانس رکنے لگی۔ جیف کی جھنجلاہٹ اب لطف میں بدل گئی تھی۔ اسے ایسے لوگوں پر جبر کرکے مزہ آتا تھا جو اس کے خلاف جوابی کارروائی نہیں کرسکتے ہوں۔ مائیکل میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اس کے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑا سکتا۔ اس کی سانس رک رہی تھی اور آنکھیں ابل کر باہر آرہی تھیں پھر اچانک ہی اس نے جیف کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا۔ جیف اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور پاؤں کھول کر کھڑا تھا اس لیے وار بھرپور لگا۔ خود اس کی سانس رک گئی۔ اس نے مائیکل کی گردن چھوڑی اور اپنا پیٹ دباتا ہوا بستر پر ڈھیر ہوگیا، وہ سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔ دوسری طرف مائیکل اپنا سانس بحال کررہا تھا۔

”بوڑھے خبیث، یہ کیا حرکت تھی؟“

”تم خراٹے لے رہے تھے۔“ وہ خفگی سے بولا۔ ”بار بار میری نیند خراب ہورہی تھی۔“

”میں خراٹے لیتا ہوں۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”تمہیں اسی طرح سونا پڑے گا۔“

کچھ دیر میں دونوں کی حالت سدھر گئی۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ مائیکل نے کہیں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ برآمد کیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس نے جلدی جلدی دو کش لیے اور پھر اسے بجھانے جارہا تھا کہ جیف نے اس سے سگریٹ چھین لیا اور دو کش لگا کر اسے ختم کردیا۔

مائیکل نے بدمزگی سے اسے دیکھا اور جلدی سے سگریٹ اور ماچس چھپا دی، اس کے بعد اس نے اخبار سے کوٹھری میں جمع ہونے والے دھوئیں کو باہر نکالا۔ گارڈ کو بو آجاتی تو وہ کوٹھری کی تلاشی لینے آجاتے اور کسی قیدی کے پاس سے ماچس یا آتشیں اسلحہ برآمد ہونا برابر تھا اس لیے جو قیدی تمباکو کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، وہ اسے بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھتے تھے۔ جیف نے فلٹر کا بچ جانے والا حصہ کموڈ میں ڈال کر بہا دیا۔ مائیکل کا موڈ اب بہتر ہوگیا تھا۔

”تم کس جرم میں آئے ہو، میرا خیال ہے کہ تم پہلے بھی دو بار جیل کاٹ چکے ہو؟“

”آبروریزی کے جرم میں۔“ جیف نے جواب دیا۔ ”تم پرانے قیدی ہو؟“

”نہیں، مجھے پانچ سال پہلے سزا ہوئی تھی... بینک لوٹنے کے الزام میں۔“

جیف نے پہلی بار اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ”تم ڈاکو ہو؟“

”ہاں، میں نے جوانی میں کئی بینک اور گیس اسٹیشن لوٹے تھے لیکن آخر میں پکڑا گیا۔“

”یعنی تم پہلی بار گرفتار ہوئے ہو؟“

”ہاں، اس سے پہلے پولیس کے پاس میرا کوئی ریکارڈ تک نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پوری پلاننگ سے کام کرتا تھا جب تک مطمئن نہیں ہوجاتا، اس وقت تک بینک لوٹنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میں اکیلا کام کرتا تھا، یہاں آنے والے اکثر لوگ صرف اس وجہ سے آتے ہیں کہ ان کے کسی ساتھی نے دغا یا حماقت کی ہوتی ہے اور وہ مارے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں ایک الو کے پٹھے کے کہنے میں آگیا جو فلموں سے متاثر تھا اور ان کے انداز میں کوئی بڑا بینک لوٹنا چاہتا تھا۔“

”بینک ڈکیتی ناکام رہی تھی؟“

”منصوبہ ہی احمقانہ تھا اس لیے سب پکڑے گئے، سوائے اس الو کے پٹھے کے... میری وجہ سے وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔“

”تمہیں کتنی سزا ہوئی؟“

”سزا تو مجھے دس سال کی ہوئی تھی اور ابھی پانچ سال ہوئے ہیں لیکن میں اس سال کے آخر تک کسی وقت رہا ہو جاؤں گا۔“

جیف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ کیسے... کیا تمہاری سزا معاف ہوگئی ہے؟“

”نہیں، سزا تو معاف نہیں ہوئی ہے۔“ بوڑھے مائیکل نے کہا اور اٹھ کر باہر جھانکا اور دوبارہ سگریٹ نکال کر سلگایا اور جلدی جلدی چند کش لے کر باقی جیف کو تھما دی۔ دونوں میں کچھ دیر پہلے ہونے والی کشیدگی کا نام و نشان نہیں تھا۔ جیف نے بھی جلدی جلدی باقی سگریٹ ختم کی۔ اس کے پھیپھڑے مہینے سے نکوٹین کو ترسے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اب مائیکل کا شکر گزار تھا لیکن منہ سے اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کے خیال میں الفاظ سے کسی کا شکریہ ادا کرنا شریف لوگوں کا کام تھا۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ ”پھر تم کیسے رہا ہو جاؤ گے؟“

”مجھے پھیپھڑوں کا کینسر ہے اور ناقابلِ علاج ہوچکا ہے۔ ڈاکٹروں نے مجھے اس سال کے آخر تک کا وقت دیا ہے۔“

جیف کو جھٹکا لگا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اسے افسوس کرنا نہیں آتا تھا اور نہ ہی اسے افسوس ہوا تھا۔ اس کے خیال میں جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے مرنا بھی پڑتا ہے، چاہے موت کیسی ہی کیوں نہ ہو اس لیے اس پر افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے نزدیک تو یہ سوال بھی غیر ضروری تھا کہ جب مائیکل کو پھیپھڑوں کا کینسر تھا اور آخری اسٹیج پر تھا تو وہ سگریٹ نوشی کیوں کررہا تھا۔ اسے ایک طرح سے سزائے موت ہوگئی تھی اس لیے اس کی مرضی تھی کہ وہ جو چاہے کرے۔ البتہ جیف کو اس شخص میں دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔ خود جیف نے جو سب سے بڑی واردات کی تھی، وہ گیس اسٹیشن میں ڈکیتی تھی۔ گیس اسٹیشن میں ڈکیتی آسان کام تھا خاص طور سے جو ہائی وے پر واقع ہوتے ہیں۔ وہاں کیش اچھا خاصا مل جاتا ہے، آدمی آرام سے فرار بھی ہوجاتا ہے اور کسی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔

کسی بینک میں ڈکیتی اس کے خیال میں اونچا کام تھا اور خود اسے آج تک یہ کام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کے سامنے ایک پیشہ ور ڈاکو موجود تھا جس نے کئی بینک کامیابی سے لوٹے تھے اور کبھی پکڑا نہیں گیا، جب پکڑا گیا تو وہ بھی اپنی حماقت سے۔ جیف کو خیال آیا کہ وہ اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ وہ بے چارہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا اور اسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکے۔ اگر جیف ذرا چالاکی سے کام لیتا تو اس سے بینک لوٹنے کے گُر سیکھ سکتا تھا۔

چند دن میں جیف کوشش کرکے مائیکل سے خاصا

قریب ہو گیا۔ اپنی فطرت کے خلاف وہ اس سے شرافت سے پیش آتا تھا اور اس کی بہت ساری فضول باتیں بھی سن لیتا تھا۔ انہی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ مائیکل نے اپنی زندگی بڑی کامیابی سے دو حصوں میں بانٹ رکھی تھی۔ ایک طرف وہ شریف آدمی تھا جس کا گھر اور بیوی بچے تھے۔ وہ بہ ظاہر گاؤں دیہاتوں میں پھر کر جانوروں کی دوائیں بیچنے والا سیلز مین تھا جو مہینے کے بیس دن گھر سے باہر رہتا تھا اور اسے دس دن کی چھٹی ملتی تھی۔ یہ دس دن وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کے پڑوسی اور جاننے والے اسے نہایت شریف آدمی سمجھتے تھے جو کسی کو تھپڑ بھی نہیں مار سکتا تھا اور شاید کسی سے ایک ڈالر بھی ناجائز نہیں لے سکتا تھا۔ وہ سب کے کام آتا تھا اور سب سے اچھی طرح ملتا تھا۔

اس کا دوسرا روپ ایک ڈاکو کا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے شہر سے دور واردات کرتا تھا اور واردات کرنے سے پہلے اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لیتا تھا۔ منصوبہ بناتا اور اسے بار بار چیک کرتا۔ کبھی کبھار تو وہ اس کام میں مہینوں لگا دیتا تھا۔ جزئیات کے ساتھ وہ اتفاقات کو بھی مدِنظر رکھتا تھا اور اگر اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا تو وہ فرار کے لیے بھی متبادل منصوبہ پہلے سے بنا کر رکھتا تھا۔ پھر وہ واردات کے لیے بالکل الگ حلیہ بناتا تھا۔ ویسے تو وہ واردات کے وقت کسی طریقے سے اپنے نقوش چھپا لیتا تھا لیکن اگر وہ پکڑا جاتا تو پولیس کے ہاتھ ایک ایسا شخص آتا جسے وہ کسی صورت مائیکل کین ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس جعلی نام سے ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر دستاویزات موجود تھیں۔ پولیس ڈریڈ آئزنامی شخص کو گرفتار کرتی۔

مائیکل اتنا تردد اس لیے کرتا تھا کہ اس کے بیوی بچے اس کی گرفتاری سے ہونے والی ذلت سے محفوظ رہیں۔ وہ ان کے لیے غائب ہو جاتا۔ اپنے دوسرے حلیے میں مائیکل عینک استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ سن گلاسز لگاتا تھا، یہ سن گلاسز رات کو بھی اس کے چہرے پر موجود ہوتے تھے۔ اس کے لیے وہ روشنی سے حساسیت کا بہانہ کرتا تھا۔ وہ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے بالوں پر موٹی مشین پھیر لیتا تھا۔ مشین اس کے پاس تھی اور یہ کام وہ خود کرتا تھا۔ دوسرے وہ مونچھیں میکسیکن انداز میں نیچے تک چھوڑ دیتا تھا۔ پندرہ بیس دن میں اس کی مونچھوں کا یہ انداز نمایاں ہو کر اس کا حلیہ بالکل بدل دیتا تھا۔ جب گھر واپسی کا وقت آتا تو وہ مونچھیں صاف کر دیتا اور سر کے بال بھی بڑھ چکے ہوتے تھے۔

مائیکل کی کوشش ہوتی تھی کہ ایک واردات سے اسے کم سے کم لاکھوں ڈالرز مل جائیں تاکہ اگر اسے مزید ایک سال تک کوئی واردات کرنے کا موقع نہ ملے، تب بھی فرق نہ پڑے۔ ویسے اس نے سال میں ایک واردات کا ٹارگٹ رکھا تھا۔ ویسے تو مائیکل نے درجنوں کے حساب سے وارداتیں کی تھیں لیکن بڑے کام اس نے دس کیے تھے اور ان میں سے ہر واردات میں اسے کم سے کم بھی ایک لاکھ ڈالرز ملے تھے۔ حاصل ہونے والی رقم کے وہ تین حصے کرتا تھا۔ ایک حصہ وہ گھر کے لیے رکھتا تھا۔ اس کی بیوی مشل کو معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی آمدنی کیا ہے، وہ اسی حساب سے رقم رکھتا تھا اور ایک دوسرے اکاؤنٹ سے یہ ہر مہینے اس کے شہر والے بینک اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ یہ اکاؤنٹ مشترک تھا۔ رقم کا دوسرا حصہ وہ اپنی دوسری زندگی کے لیے نکالتا تھا کیونکہ اس میں وہ ہوٹلوں میں ٹھہرتا تھا اور عیاشی کرتا تھا۔ تیسرا حصہ وہ مستقبل کے لیے محفوظ کرتا تھا۔ اس رقم سے وہ شیئرز میں سرمایہ کاری کرتا تھا تاکہ اسے کچھ ہو جائے یا وہ گرفتار ہو جائے تب بھی اس کے بیوی بچوں کا گزارہ چلتا رہے۔

جیف کو اس سے غرض نہیں تھی کہ مائیکل حاصل ہونے والی رقم کا کیا کرتا ہے لیکن وہ اس کی ذہانت اور منصوبہ بندیوں سے بہت متاثر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خود اس طرح سے منصوبے نہیں بنا سکتا، اس کے پاس اس قسم کا ذہن ہی نہیں تھا۔ مگر مائیکل کی باتیں سن کر رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں بھی خیال آنے لگا کہ اسے کوئی بینک لوٹنا چاہیے۔ اس میں خطرہ تھا لیکن کامیابی کی صورت میں ایک ساتھ ہی بڑی رقم مل جاتی اور وہ مہینوں تک کھل کر عیاشی کر سکتا تھا۔ مائیکل کی چند وارداتوں کا احوال سن کر تو وہ بُری طرح للچانے لگا۔ ایک دن اس نے سرسری انداز میں مائیکل سے پوچھا۔

"کیا میں بینک لوٹ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" مائیکل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر تم ایک اچھا منصوبہ بنا سکتے ہو تو تم دنیا کا کوئی بھی بینک لوٹ سکتے ہو۔"

"میں اچھا منصوبہ ساز نہیں ہوں اور دوسرے میں ہر بینک کی نہیں بلکہ کسی عام بینک کی بات کر رہا ہوں جہاں سیکیورٹی کے انتظامات زیادہ نہ ہوں اور اسے آسانی سے لوٹ کر فرار ہوا جا سکے۔"

"میں بھی عام بینک کو ہی ترجیح دیتا ہوں جہاں آدمی کو دو تین لاکھ ڈالرز کیش مل جائے۔ ملین کیش رکھنے والے

بینکوں کی سیکیورٹی بھی اسی حساب سے کی جاتی ہے۔ عام برانچوں میں ایک آدھ سیکیورٹی گارڈ ہوتا ہے اور جیسے ہی ڈاکو کسٹمرز پر گن تانتا ہے سب سے پہلے سیکیورٹی گارڈ ہتھیار ڈال دیتا ہے کیونکہ اسے سختی سے منع ہوتا ہے کہ وہ کسی کی زندگی کے رسک پر بینک کی حفاظت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر اس کی حماقت سے بینک میں کوئی خوں ریزی ہوتی ہے، اس کا خمیازہ بھی اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کی نوکری جاتی ہے اور آئندہ اسے کہیں بھی نوکری نہیں ملتی۔"

جیف کے لیے دو تین لاکھ ڈالرز کی رقم خاصی بڑی تھی۔ اس سے تو وہ سال بھر سے بھی زیادہ وقت عیاشی سے گزار سکتا تھا۔ اسے صرف شراب اور عورت سے دلچسپی تھی۔ اسے جوئے یا کسی ایسے کام سے دلچسپی نہیں تھی جس میں آدمی کچھ دیر میں کنگال ہو جائے۔ اس نے منہ میں آنے والا پانی نگلا اور بولا۔ "بعض عام بینکوں میں اس سے زیادہ رقم بھی تو ہوتی ہوگی؟"

"بالکل ہوتی ہے، پر ہر روز نہیں ہوتی لیکن ویک اینڈ پر ہوتی ہے جب آس پاس کسی بڑی کمپنی کے ملازمین کو کیش تنخواہ دی جاتی ہے۔"

"کتنی رقم ہوتی ہے... ملین ڈالرز تک چلی جاتی ہے؟"

"ہاں، بعض اوقات اس سے بھی اوپر جاتی ہے۔" مائیکل نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "بلکہ میری نظر میں ایسا ایک بینک بھی ہے۔ جیل آنے سے پہلے میں نے اسے ہی لوٹنے کا سوچا تھا لیکن پھر اس الو کے پٹھے کی باتوں میں آ گیا۔"

"بینک کہاں ہے؟" جیف نے بہ مشکل اپنے جوش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

مائیکل نے اس کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "یہ میں کسی کو نہیں بتا سکتا۔ میں نے بہت محنت کی تھی اور سارا منصوبہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اب بھی کوئی اس پر عمل کرے تو آدھے گھنٹے سے کم وقت میں کم سے کم ایک ملین ڈالرز کا مالک بن سکتا ہے۔"

"تم مرنے والے ہو اس لیے تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مجھے نہیں ہوگا لیکن کسی اور کو بھی نہیں ہوگا۔" مائیکل نے سکون سے کہا۔ "آج کل کا دور ہی ایسا ہے۔ آدمی کسی کے لیے مفت میں کچھ نہیں کرتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو، میں تم سے یہ منصوبہ خرید لوں؟"

جیف نے برہمی سے کہا۔ اسے اس خبیث بوڑھے پر غصہ آ رہا تھا جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور کسی دوسرے کا بھلا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔" مائیکل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ "میں مرنے والا ہوں لیکن میرے بیوی بچوں کو اسی دنیا میں رہنا ہے اور اس کے لیے انہیں رقم کی ضرورت ہے۔"

"انہیں نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو؟"

"معلوم ہے، اسی الو کے پٹھے نے میری مشل تک اطلاع پہنچا دی تھی لیکن میرے پڑوسی اور دوست احباب اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

جیف نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم کیا چاہتے ہو، میں حاصل ہونے والی رقم میں سے کچھ تمہارے بیوی بچوں تک پہنچا دوں؟"

"کچھ نہیں، نصف۔" مائیکل نے تصحیح کی۔

"نصف؟" جیف نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے دماغی توازن پر شک کر رہا ہو۔ "سارا کام میں کروں، خطرہ مول لوں اور حاصل ہونے والی رقم میں سے آدھی تمہارے بیوی بچوں کے سپرد کر دوں۔"

"تمہیں صرف عمل کرنا ہے، ٹھیک ہے تم خطرہ مول لو گے لیکن خطرہ تو تم لیتے رہتے ہو۔ تمہاری زندگی ہی خطرہ ہے۔ ظاہر ہے یہاں سے جا کر تم کوئی شریفانہ کام تو کرو گے نہیں۔" مائیکل نے طنز کیا۔ "تمہارے لیے نصف بھی بہت ہوں گے۔ پانچ لاکھ ڈالرز تم سو برس میں بھی اپنے بل بوتے پر نہیں کما سکتے۔"

جیف سوچ میں پڑ گیا پھر اسے خیال آیا کہ مائیکل ہوگا کہاں جو اسے نصف حصہ دینے پر مجبور کرے اور ہوگا بھی تو وہ اس سے ایک منٹ میں نمٹ سکتا تھا۔ ایک بار وہ اس کا منصوبہ جان لیتا تو وہ اس کے رحم و کرم پر ہوتا اور وہ اس پر قطعی رحم نہیں کھاتا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ "مجھے منظور ہے۔"

مائیکل اسے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ "اگر تمہارے ذہن میں کوئی اس قسم کا خیال آ رہا ہے کہ تم مجھے دھوکا دے جاؤ گے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ اگر میں مر بھی گیا تو میں اپنی بیوی کو سب بتا جاؤں گا اور جب اسے حصہ نہیں ملے گا تو وہ پولیس کو ایک گمنام کال کرے گی اور بتا دے گی کہ یہ واردات تم نے کی ہے۔ اس کے بعد پولیس خود تمہیں تلاش کر لے گی۔"

جیف نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ ڈر گیا ہو حالانکہ اسے

پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ ایک بار اس کے پاس ایک ملین ڈالرز آجاتے تو وہ ملک کے کسی دور دراز حصے میں چلا جاتا۔

''میں دھوکا نہیں کروں گا۔'' اس نے حلف اٹھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نصف حصہ مشل تک پہنچا دوں گا لیکن پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ منصوبہ اس قابل بھی ہے کہ اس پر عمل کیا جاسکے۔''

''یہ سو فیصد قابلِ عمل ہے۔'' مائیکل نے یقین سے کہا۔ ''یہ ایک چھوٹے شہر کا بینک ہے۔ اس شہر میں ایک ہی کنسٹرکشن کمپنی ہے چونکہ کمپنی کا مالک میئر کا بھائی ہے اس لیے تمام سرکاری ٹھیکے اسے ملتے ہیں۔ کمپنی میں ہزار سے بھی زیادہ لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی ہفتہ وار تنخواہ اسی بینک میں آتی ہے۔ یہ تقریباً دو ملین ڈالرز کی موٹی رقم ہے۔ ممکن ہے اب اس میں اضافہ ہوگیا ہو۔''

جیف کے ہوش تو دو ملین ڈالرز کا سن کر ہی اڑ گئے تھے۔ اس نے آگے مائیکل کی بات نہیں سنی۔ اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

''دو ملین ڈالرز۔''

''ممکن ہے اس سے زیادہ مل جائیں۔'' مائیکل نے کہا۔ ''بینک کے سیف میں بھی اچھی خاصی رقم ہوتی ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ لالچ مت کرنا۔ صبح نو بج کر تیس منٹ پر آرمرڈ ٹرک آتا ہے اور رقم کا بیگ اتار کر جاتا ہے۔ اس کے جاتے ہی تم بینک میں گھس جانا اور صرف یہی بیگ لے کر وہاں سے نکل جانا۔ اس کے بعد تمہیں کوئی نہیں گرفتار کرسکے گا۔''

''ہاں، اس کے بعد میں مکھی بن کر غائب ہو جاؤں گا۔'' جیف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہاں، دوسروں کو ایسا ہی لگے گا کہ تم مکھی بن کر غائب ہوگئے ہو۔ وہ تمہیں تلاش کرتے رہ جائیں گے۔''

جیف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چھوٹے شہر میں یہ خرابی ہوگی کہ پولیس کو مجھے تلاش نہیں کرنا پڑے گا محدود سڑکوں پر میں آرام سے پکڑا جاؤں گا۔''

''تم سڑک کے راستے فرار نہیں ہوگے۔''

''تب کیا میرے لیے ہیلی کاپٹر آئے گا؟'' جیف کا انداز مزید طنزیہ ہوگیا۔

''نہیں، بینک کے برابر میں چھوٹی سی گلی ہے۔ اس کی کل چوڑائی سات فٹ ہے اگر اس میں ایک کار رک جائے تو دائیں بائیں سے کسی کو گزرنے کا راستہ نہیں ملے گا۔''

''یہ گلی فرار میں کس طرح مدد کرے گی؟'' جیف نے غور کیا۔ ''دوسرے یہ کہ گلی کسی نہ کسی سڑک پر نکلے گی اور بات وہی ہوجائے گی۔''

''تمہیں زمین پر فرار نہیں ہونا ہے، اس گلی میں ایک مین ہول ہے۔ اس کے نیچے سیوریج کی بڑی لائن گزر رہی ہے آٹھ فٹ قطر والی... لیکن اوپر سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ معمولی سی سیوریج لائن ہے جیسی کہ چھوٹی گلیوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے امکان ہے کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دے گا اور اگر کسی نے توجہ دی بھی تو اتنی دیر ہوجائے گی کہ تم آرام سے اس سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر جا چکے ہوگے۔''

جیف نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا؟''

مائیکل چڑ گیا اس نے کہا۔ ''ہاں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم میرا منصوبہ خاموشی اور توجہ سے سن لو... اس کے بعد کوئی سوال کرنا ورنہ اس طرح تو میری عمر پوری ہوجائے گی اور میں تمہیں منصوبہ نہیں سمجھا سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے، اب میں نہیں بولوں گا۔''

مائیکل اسے تفصیل سے بتانے لگا کہ اس بینک کو کس طرح لوٹا جاسکتا ہے اور اس کے بعد وہاں سے فرار کیسے ہونا ہے۔ جیف توجہ سے سن رہا تھا اور جیسے جیسے مائیکل کی بات آگے بڑھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں چمک آتی جارہی تھی۔ ایک ملین ڈالرز سے اوپر دولت مل جاتی تو وہ ملک کے کسی کونے میں کیا، ملک چھوڑ کر بھی جاسکتا تھا۔ مائیکل کا منصوبہ واقعی قابلِ عمل تھا۔ اسے مائیکل کی بیوی اور بچوں کو نصف حصہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ اس کے راستے کی رکاوٹ بنتے تو ایک ملین ڈالرز کے لیے وہ انہیں قتل بھی کرسکتا تھا۔ جب مائیکل خاموش ہوا تو وہ چونکا۔ اس نے شاطرانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

''تم نے مجھے سارا منصوبہ بتا دیا ہے، اگر میں اپنے وعدے سے مکر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' مائیکل نے سادگی سے کہا۔ ''میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ بینک امریکا کے کس شہر میں ہے اور کس بینک کی برانچ ہے۔''

جیف ہڑبڑا گیا، واقعی مائیکل نے اسے یہ تو بتایا نہیں تھا۔ اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''میں مذاق کر رہا تھا۔''

''لیکن میں مذاق نہیں کروں گا۔'' مائیکل نے آہستہ سے کہا۔ ''دو ہفتے بعد میں یہاں سے اسپتال منتقل کر دیا جاؤں گا جہاں میں زندگی کے آخری ایام گزاروں گا اور جانے سے پہلے میں تمہیں بتا کر جاؤں گا کہ تم شہر اور بینک کا نام کیسے حاصل کرو گے۔ صرف نام ہی نہیں، تمہیں منصوبے پر عمل درآمد کے لیے رقم اور چیزوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ وہ بھی تمہیں اسی ذریعے سے حاصل ہوں گی۔''

جیف نے پہلی بار اسے کسی قدر شک سے دیکھا۔ ''تمہاری باتوں سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے شروع سے سب طے کر رکھا تھا۔''

''منصوبہ شروع سے طے تھا لیکن باقی چیزیں ابھی میرے ذہن میں آئی ہیں اور یہ کوئی بہت دور کی سوچ نہیں ہے۔ میں اتنے دنوں میں تمہارے بارے میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں اور میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا اس لیے سب عین موقع پر ہوگا۔''

جیف کے ذہن میں آنے والا شک دور ہوگیا۔ ویسے بھی وہ یک طرفہ دماغ کا مالک تھا، ایک وقت میں ایک ہی سوچ آسکتی تھی۔ مائیکل کی طبیعت کبھی کبھی خراب ہوجاتی تھی اور اسے اسپتال لے جایا جاتا تھا لیکن یہ جیل کا اسپتال ہوتا تھا۔ اسے کینسر کے علاج کی دوائیں نہیں دی جارہی تھیں کیونکہ اب ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ البتہ اسے درد کم کرنے والی دوائیں دی جاتی تھیں لیکن وہ بھی محدود مقدار میں... ان کی زیادہ مقدار اس کے لیے خطرناک ہوسکتی تھی۔ مائیکل تکلیف کو بھی صبر سے برداشت کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو اٹھ کر کراہتا مگر وہ بھی دبی آواز سے۔ اگر جیف جاگ جاتا تو اس کے رونے اور کراہنے کی آوازیں سنتا رہتا۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ کسی دن مائیکل اچانک مرگیا تو اس کا منصوبہ جیف تک کیسے پہنچے گا؟ اس نے یہ سوال مائیکل سے کیا۔ اس نے جواب دیا۔

''تم فکر مت کرو، میں جیل سے باہر اطلاع بھیج چکا ہوں۔ جب تم باہر جاؤ گے تو تم سے رابطہ کرلیا جائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کنکٹی کٹ سے گزرنے والی ہائی وے ایک سو نو پر گلین ٹاؤن کے پاس موجود ہمفرے موٹیل میں ٹھہرو تم سے وہیں رابطہ کرلیا جائے گا۔ تم نومبر کے پہلے ہفتے میں آزاد ہوجاؤ گے اس لیے دس نومبر تک وہاں پہنچ جانا۔''

جیف نے یہ ساری باتیں ذہن نشین کرلی تھیں۔ اب اسے اطمینان تھا کہ مائیکل مر بھی گیا تو اس کا کام ہوجائے گا۔ اسے لگ رہا تھا کہ قدرت نے اسے خاص طور سے اسی کام کے لیے جیل پہنچایا تھا۔ اس لڑکی کا ریپ تو صرف بہانہ تھا۔ نہ جانے اس نے یہ کام کیوں کیا؟ اسے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی پھر بھی وہ اس مرگھلی سی لڑکی پر دست درازی کر بیٹھا۔ جیف نے سوچ لیا تھا کہ کبھی نہ کبھی اس لڑکی سے بدلہ ضرور لے گا۔ بہت دن بعد جب وہ اسے بھول کر اپنی نئی زندگی میں مگن ہوجائے گی، تب وہ اچانک پہنچ جائے گا اور اسے ایسا زخم دے گا کہ پھر وہ مرتے دم تک اسے نہیں بھولے گی۔

دو ہفتے بعد مائیکل چلا گیا۔ جیل کے گارڈ نے آکر اپنے ڈنڈے سے سلاخیں بجائیں اور مائیکل سے کہا۔ ''تمہاری رہائی کا وقت آگیا ہے۔''

جیف چونکا۔ ''رہائی کا...؟''

مائیکل نے سرد آہ بھری۔ ''دنیا سے رہائی کا...''

اس نے اپنا سامان سمیٹا اور جیف کی طرف دیکھے بغیر رخصت ہوگیا۔ جیف کسی قدر مضطرب ہوگیا۔ اسے لگا جیسے ایک ملین ڈالرز اس کے ہاتھ سے جارہے ہیں لیکن پھر اس نے خود کو تسلی دی۔ اگر مائیکل نے اس کے ساتھ ڈبل کراس کرنا ہوتا تو وہ اسے یہ سب بتاتا ہی کیوں؟ اسے صبر کے ساتھ مزید تین مہینے جیل میں گزارنے تھے۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ اسے مکمل سزا ہوئی تھی، پیرول پر رہائی کا چکر نہیں تھا ورنہ وہ پابند ہوکر رہ جاتا۔ یہ تین مہینے اس نے ایک ایک دن گن کر گزارے تھے۔ خدا خدا کرکے اس کی رہائی کا دن آیا۔ جیل سے باہر آکر اس نے سکون محسوس کیا۔ اب عمل کا وقت آگیا تھا۔ اگرچہ اب بھی اسے شک تھا کہ مائیکل نے اسے بے وقوف بنایا ہے یا وہ اسے استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن ایک ملین ڈالرز کے لیے وہ ہزار بار بے وقوف بننے اور کسی کا آلۂ کار بننے کے لیے تیار تھا۔

جیف نے ایک جگہ کچھ رقم چھپا رکھی تھی، یہ اس کی تمام جمع پونجی تھی۔ کسی بڑی ضرورت کے خیال سے اسے چھپا رکھا تھا اور اس کے خیال میں اب رقم نکالنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے رقم نکالی اور کنکٹی کٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے ایک پرانی بیوک کار لی... جو دیکھنے میں خستہ حال لگتی تھی لیکن چلنے میں بہترین تھی۔ خاص طور سے طویل سفر کے لیے یہ ایک اچھی گاڑی تھی۔ نیویارک سے گلین ٹاؤن کا سفر تیس گھنٹے میں طے ہوا۔

گلین ٹاؤن وسطی امریکا کا ایک خاموش اور کسی قدر پسماندہ سا قصبہ ہے۔ اس کی واحد خوبی اس کا ملک کی اہم ترین شاہراہ پر ہونا ہے۔ اس وجہ سے یہاں بڑی تعداد میں گیس اسٹیشن، موٹیل، سروس سینٹرز اور اسٹورز تھے جہاں سب مل جاتا تھا۔ ہمفرے موٹیل میں اسے آسانی سے جگہ مل گئی۔ یہ سبز چھتوں اور طویل بیرک نما کمروں والا موٹیل تھا۔ یہاں سہولتیں تھیں لیکن کرایہ مناسب تھا۔ اس کے باوجود یہاں کم لوگ ٹھہرتے تھے کیونکہ یہاں کھانے اور پینے کی سہولت نہیں تھی۔ یہاں ٹھہرنے والوں کو اس کے لیے

دوسری جگہ جانا پڑتا تھا۔ مائیکل نے اسے دس نومبر کو آنے کو کہا تھا لیکن وہ نو نومبر کو ہی ہمنگرے موٹیل میں موجود تھا۔ یہاں اس نے اپنا اصل نام لکھوایا تھا تاکہ کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو اسے پتا چل جائے کہ جیف یہاں مقیم ہے۔ اب اسے انتظار تھا کہ مائیکل یا اس کے لواحقین کب اس سے رابطہ کرتے ہیں۔ مائیکل کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے لیکن زیادہ امکان اسی کا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ اس صورت میں جیف سے کوئی اور رابطہ کرتا۔

ساری رات سو کر گزارنے کے بعد اس نے دس نومبر کا دن بڑی مشکل سے گزارا۔ وہ سارا دن انتظار کرتا رہا کہ کب اس سے رابطہ کیا جائے گا مگر رات تک کسی نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ مایوس ہو کر وہ کھانے کے لیے روانہ ہو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی، اس نے جھٹ کر دروازہ کھولا۔ سامنے وہ نوجوان کھڑا تھا جس نے گزشتہ رات اسے کمرا دیا تھا۔ جیف کا انداز دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”تمہاری کال آئی ہے... میں نے ہولڈ کرایا ہے۔“

جیف اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ فون کاؤنٹر پر موجود تھا۔ جیف نے ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ بولا۔ ”ہیلو! جیف بات کر رہا ہوں۔“

”جیف!“ دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا۔ ”تم موٹیل سے نکل کر ہائی وے پر مغرب کی طرف روانہ ہو جاؤ، راستے میں جہاں تمہیں ایک سفید بند وین نظر آئے، وہاں رک جانا۔ وین میں تمہیں سب مل جائے گا۔“

”تم کون بات کر رہی ہو؟“ جیف نے پوچھا لیکن دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز آئی، اس نے بے ساختہ گالی دی اور ریسیور رکھ دیا۔ نوجوان کاؤنٹر کے دوسری طرف بیٹھا ایک باتصویر رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ جیف باہر آیا، اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن اب یہ کام پہلے کرنا تھا۔ وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ رات ہوتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ کار کا ہیٹر کام نہیں کر رہا تھا اور وہ جیکٹ میں بھی ٹھٹھر رہا تھا۔ اسے شدت سے اس عورت پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا وہ اسے دن میں نہیں بلا سکتی تھی؟ اتنی رات گئے رابطہ کیا تھا۔ عورت نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وین اسے کس طرف ملے گی اس لیے وہ ہائی وے کے دونوں اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھا۔

تقریباً دس کلومیٹرز کے بعد اسے اپنی طرف ہی سفید وین سڑک سے ذرا ہٹ کر کھڑی نظر آ گئی۔ جیف نے کار اس کے آگے روکی اور جیسے ہی اتر کر وین کی طرف بڑھا، دوسری طرف سے ایک گاڑی اسٹارٹ ہو کر سڑک پر آئی اور مغرب کی سمت ... روانہ ہو گئی۔ جیف رکا اور ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اس گاڑی کے پیچھے جائے، اس میں یقیناً مائیکل کی بیوی یا بیوہ تھی اور دیکھ رہی تھی کہ وہ کب وین لینے آتا ہے۔ یہ بالکل ویسی وین تھی جس کا ذکر مائیکل نے کیا تھا۔ اس کا ڈرائیونگ کیبن چھوٹا سا اور آگے سے رکشے جیسا تھا۔ جیف نے دروازہ کھولا تو اسے اگنیشن میں چابی لٹکتی نظر آئی۔ اسٹیئرنگ کے ساتھ ایک پرچہ بھی تھا جس پر لکھا تھا۔ ”سامان پیچھے رکھا ہے۔“

ایک گھنٹے بعد وہ وین چھپا کر اور سامان لے کر موٹیل واپس آ گیا۔ راستے میں اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریستوران سے کھانا پیک کروا لیا تھا۔ اسے چیزیں دیکھنے کی جلدی تھی۔ موٹیل واپس آتے ہی اس نے کھانا کھایا اور سامان کا کارٹن کھول کر دیکھا۔ اس میں واردات سے متعلق تمام سامان تھا اور اسے مکمل طور پر گائڈ لائن نقشوں اور چھپی ہوئی ہدایات کی مدد سے دی گئی تھی۔ ان کی مدد سے وہ بہ آسانی اپنا کام کر سکتا تھا۔ ڈبے میں اسلحہ بھی موجود تھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے جیف مارے جوش کے بے قابو ہونے لگا۔ ایک ملین ڈالرز اسے اپنی جیب میں نظر آنے لگے۔

☆☆☆

اس چھوٹے شہر کے مرکزی چوراہے پر خاصا ہجوم تھا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ چوراہے سے ذرا آگے سڑک کے ساتھ ہی بینک کی بڑی سی عمارت تھی۔ شاید حفاظت کے نقطۂ نظر سے اسے باقی عمارتوں سے الگ رکھا گیا تھا اس لیے اس کے دونوں طرف گلیاں تھیں۔ جیف نے اگلی گلی میں اپنی وین گھما دی اور ذرا آگے جا کر روک دی۔ یہ کام اسے احتیاط سے کرنا پڑا تھا ورنہ وین دیواروں سے رگڑ کھاتی اور اس کا شور بلاوجہ لوگوں کو متوجہ کرتا۔ گلی وین سے کچھ ہی چوڑی تھی۔ جیف کی نظر گلی کے وسط میں موجود مین ہول پر تھی۔ اس سے آگے بائیں طرف موجود ریستوران کے کچن کا کچرا اور ڈبے پڑے تھے جنہوں نے گلی کو تقریباً بند کر دیا تھا۔ اب اس سے کوئی پیدل آدمی ہی گزر سکتا تھا، گاڑی گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

جیف نے وین روکی اور ڈرائیونگ سیٹ سے عقبی حصے میں آ گیا۔ وین اندر سے کھلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک وائلن بیگ اٹھایا اور وین سے نیچے اتر آیا۔ عقبی دروازہ بند کر کے وہ

گلی سے نکلا اور بینک کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر جانے سے پہلے اس نے چہرے پر ایک جھلی کھینچ لی، یہ ٹوپی کی طرح اس کے سر پر چڑھی تھی۔ اب اس کا چہرہ بدل گیا تھا اور بہت غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی چیز ہے۔ اس کے ہاتھوں پر پہلے ہی ٹرانسپیرنٹ ربر کے دستانے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے وائلن بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک شاٹ گن نکال لی۔

”خبردار!“ جیف چلایا۔ ”کوئی حرکت نہ کرے... یہ بینک ڈکیتی ہے۔“

بینک میں اس وقت عملے کے ساتھ کوئی درجن بھر گاہک بھی موجود تھے اور وہاں عورتوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ہال خوف زدہ چیخوں سے گونج اٹھا۔ لوگوں نے ہاتھ اوپر کر دیے تھے جبکہ گارڈ متذبذب کھڑا تھا کہ کیا کرے۔ جیف نے دہاڑ کر سب کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا۔ ”سب لیٹ جائیں... تم سب بھی...“ اس نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود بینک کے عملے سے کہا۔ ”اگر کسی نے الارم بجایا تو سب مارے جائیں گے۔“ اس نے وائلن بیگ کاؤنٹر پر رکھ کر اسے کھول دیا۔ ”اس میں بم ہے۔“

بم کا سنتے ہی لوگوں کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ شاٹ گن کی گولی تو کسی ایک کی جان لیتی لیکن بم پھٹ جاتا تو سب مارے جاتے۔ یہ سنتے ہی گارڈ بھی رضاکارانہ طور پر زمین پر لیٹ گیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے تمام عملہ اور گاہک ہال میں فرش پر اوندھے منہ لیٹے تھے۔ جیف نے گارڈ سے اس کا پستول لے لیا۔ پھر اس نے چلا کر پوچھا۔ ”منیجر کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ وہ کاؤنٹر کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ جیف نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔

”میری بات غور سے سنو، اس بیگ میں ایک بم ہے جو ریموٹ کنٹرول ہے اور اس کا ریموٹ میرے پاس ہے۔“ جیف نے اسے ریموٹ دکھایا۔ ”اس لیے کوئی چالاکی مت دکھانا اور پولیس کو اشارہ مت کرنا ورنہ یہاں پولیس نہیں تم سب کی موت آئے گی۔“

بینک منیجر لرزنے لگا۔ ”پلیز... ایسا مت کرنا، میں کچھ نہیں کروں گا، کوئی الارم کا بٹن نہیں دبائے گا۔“

”گڈ! یہ بات اپنے عملے کو بھی سمجھا دو۔ کوئی بینک کی رقم کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔“ جیف نے کہا اور منیجر کی طرف دیکھا۔ ”اب تمہارے پاس صرف تین منٹ ہیں، اندر سے رقم والا تھیلا لے آؤ جو ابھی آدھے گھنٹے پہلے آرمرڈ ٹرک لایا ہے۔ اگر تم نے تین منٹ سے زیادہ لگائے تو میں یہاں موجود افراد میں سے کسی ایک کو شوٹ کر دوں گا۔ تین منٹ شروع ہو گئے ہیں۔“

”پلیز! یہ وقت کم ہے مجھے سیف بھی...“ منیجر نے کہنا چاہا۔

”دس سیکنڈ کم ہو گئے ہیں۔“

منیجر تیزی سے آگے بڑھا۔ سیف روم کاؤنٹر کے پیچھے تھا۔ اس کا بڑا سا فولادی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس بڑے سے دروازے کو کھولنا اور لاک کرنا خاصا پیچیدہ عمل تھا اس لیے اسے صبح ایک بار کھول لیا جاتا تھا اور شام کو ہی بند کیا جاتا تھا۔ منیجر اس کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جیف کی دھمکی کا سن کر ہال میں سنسنی پھیل گئی اور بعض کمزور دل حضرات اور خواتین دبی دبی آواز میں رو رہے تھے۔ جیف نے اندر آتے ہی شیشے کا دروازہ بند کر دیا تھا اس لیے اب باہر سے کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ اصل خطرہ یہ تھا کہ کہیں پولیس نہ آ جائے مگر پولیس بھی دس منٹ سے پہلے نہیں آ سکتی تھی اور وہ دس منٹ سے پہلے اپنا کام کر کے بینک سے نکل جاتا۔ ایک منٹ بعد اس نے بلند آواز سے اعلان کیا۔

”ایک منٹ ہو گیا ہے۔“

یہ سن کر ہال میں موجود کمزور دل خواتین و حضرات کے رونے دھونے میں شدت آ گئی مگر دوسرے منٹ سے پہلے منیجر رقم کا تھیلا اٹھائے نمودار ہوا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ مضبوط پلاسٹک کا شاپر تھا جو ابھی تک سربمہر تھا اور اس پر بینک کی مہر لگی تھی۔ اسے کھولا نہیں گیا تھا۔ منیجر نے ہانپتے ہوئے تھیلا اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”اس میں رقم ہے، ابھی ہم نے کھولی بھی نہیں ہے۔“

ممکن ہے جیف خود یہ کام کرتا تو اسی وقت تھیلا اٹھا کر چل دیتا لیکن اس وقت وہ ایک ایک قدم دی ہوئی ہدایات کے مطابق اٹھا رہا تھا اور اندر سے بہت خوش تھا کیونکہ وہ خود کو ماسٹر آف سچویشن محسوس کر رہا تھا۔ دو درجن سے زیادہ لوگ اس کے رحم و کرم پر تھے۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ سر بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ جیف نے منیجر سے کہا۔ ”تھیلا اوپر سے پھاڑ دو، میں نوٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

منیجر نے کانپتے ہاتھوں سے تھیلے کے اوپر سے پلاسٹک پھاڑ دیا۔ اندر سے نوٹوں کی گڈیاں جھانکنے لگیں۔ یہ سارے سو ڈالرز کے نوٹ تھے اور گڈیاں ملی جلی تھیں، یعنی نئی بھی تھیں اور پرانی بھی۔ گڈیاں ترتیب سے نہیں تھیں بلکہ انہیں... ... بھرنے والے انداز میں تھیلے میں بھرا گیا تھا۔ جیف مارے خوشی کے ایک بار پھر بے قابو ہونے لگا۔ اس کے اندر

سے خواہش ابھری کہ وہ ان گڈیوں کو اٹھا کر دیکھے مگر فوراً ہی اسے عقل آ گئی۔ یہ وقت اس کام کے لیے نہیں تھا، اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ تھیلا بتا رہا تھا کہ اس میں گڈیوں کی تعداد سو سے خاصی زیادہ ہے۔ یعنی یہ ایک ملین ڈالرز سے زیادہ رقم تھی۔ جیف نے اندر ہاتھ مار کر دیکھا، اسے ساری گڈیاں ہی محسوس ہوئیں۔ مطمئن ہو کر اس نے وائلن بیگ سے ایک چھوٹا تہ ہو جانے والا پیراشوٹ کے کپڑے سے بنا بیگ نکالا اور منیجر کو حکم دیا۔

''یہ تھیلا اس میں ڈال دو۔''

منیجر نے اس بار بھی بنا تذبذب حکم کی تعمیل کی۔ رقم والا تھیلا کسی قدر پھنس کر بیگ میں فٹ آ گیا تھا۔ جیف نے بیگ منیجر سے لے کر اسے اسکول بیگ کی طرح پشت پر باندھ لیا۔ اس کی ایک اسٹرپ اس کے پیٹ پر بھی بندھی تھی، اس طرح بیگ اس کے جسم کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ جیف بہت خوش تھا، ہر کام پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔ اسے بینک میں آئے ہوئے آٹھ منٹ ہوئے تھے اور وہ دس منٹ سے پہلے یہاں سے نکل جاتا۔ اس نے بیگ باندھنے کے بعد منیجر سے کہا۔ ''غور سے سنو، میں یہ بم یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

اس نے وائلن بیگ میں موجود ڈائنا میٹ اسٹکس کے ساتھ لگے الیکٹرانک سرکٹ کو باہر نکال کر اس کا نظارہ کرایا اور اسے احتیاط سے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ''اسے ہلانا بھی خطرناک ہوگا۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد تک تم لوگوں نے کوئی حرکت نہیں کرنی ہے، نہ الارم کا بٹن دبانا ہے۔ اس کے بعد تم جو چاہے کرو لیکن یاد رکھنا، اگر دس منٹ سے پہلے الارم بجا اور میرے کانوں نے اس کی آواز سنی تو میں اس ریموٹ...'' اس نے جیب سے ریموٹ نکال کر بلند کیا۔ ''...کا بٹن دبا دوں گا۔''

ہال میں خوفزدہ چیخیں گونج اٹھیں۔ منیجر نے جلدی سے کہا۔ ''کوئی حرکت نہیں کرے گا دس منٹ تک... سب خاموش رہیں گے۔''

''اسی میں تم لوگوں کی زندگی ہے۔'' جیف نے کہا اور وائلن بیگ اٹھا کر پیچھے ہٹتے ہوئے اچانک ہی بینک کے دروازے سے باہر آ گیا۔ سڑک پر گہما گہمی تھی لیکن کسی نے توجہ نہیں دی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلا تھا کہ بینک میں ڈکیتی پڑ گئی ہے۔ باہر آتے ہی جیف نے چہرے سے جھلی اتار کر جیب میں ڈال لی۔ شاٹ گن وہ پہلے ہی وائلن بیگ میں ڈال چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے گلی میں آیا۔ اس نے وین کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی تیزی سے وہاں پہلے سے موجود ہلکے پلاسٹک کا اوور آل پہننے لگا۔ یہ اوور آل اسے پاؤں سے گردن تک ڈھک لیتا۔ یہ ہاتھوں اور پیروں والی جگہ سے بھی بند تھا۔ اب صرف اس کا سر اس لباس سے باہر تھا۔ اس قسم کا لباس عام طور سے سیوریج لائنوں کی صفائی کرنے والے پہنتے تھے۔

وہ وین کے اگلے حصے میں آیا اور اس کا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ اسے ذرا مشکل پیش آئی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق گلی سنسان تھی۔ کسی نے اسے مین ہول کا ڈھکن اٹھاتے اور اس میں اترتے نہیں دیکھا تھا۔ اندر جانے سے پہلے اس نے ڈھکن کو پہلے کی طرح جما کر بند کر دیا تھا تا کہ اس کے اپنی جگہ سے ہٹے ہونے سے کسی کو شک نہ ہو۔ یہ آٹھ فٹ قطر والی سیوریج لائن تھی جس میں چار فٹ تک غلیظ پانی اور گندہ مواد بہہ رہا تھا۔ بدبو ایسی تھی کہ ایک لمحے کو جیف چکرا گیا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا بہت سارا وقت ایسی بدبودار جگہوں پر گزرا تھا جہاں کسی شریف آدمی کو الٹیاں لگ جاتیں۔ مگر یہاں موجود بدبو جیف کے لیے بھی ناقابل برداشت تھی۔ یہ صرف بو نہیں تھی بلکہ یہاں گٹر کی زہریلی گیس بھی تھی۔ آدمی اگر زیادہ وقت اس میں سانس لے تو اس پر غشی طاری ہونے لگتی ہے اور اگر بے ہوش ہونے کے بعد بھی اسی زہریلی ہوا میں سانس لیتا رہے تو آدمی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

جیف کو یہ سارا منصوبہ بنا کر دینے والے مائیکل نے اس کا خیال بھی رکھا تھا اس لیے پلاسٹک کے لباس کے کالر کے ساتھ ایک گیس ماسک بھی موجود تھا۔ اسے منہ پر لگاتے ہی جیف کی جان میں جان آئی۔ ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا اور پھر اسی غلیظ کیچڑ میں ڈوب کر مر جائے گا۔ گیس ماسک لگا کر وہ سیوریج کے پانی کی روانی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں مائیکل کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا، اسے پانی کے خلاف نہیں جانا پڑا تھا۔ ورنہ چار فٹ گہرے اور کیچڑ کی طرح گاڑھے پانی کے خلاف چلنا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں تو وہ جیسے خود بہ خود چلتا جا رہا تھا۔

گیس ماسک لگانے کے بعد بدبو بھی کم ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد سیوریج لائن سے نکل جائے۔ اسے وحشت ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے زندہ قبر میں دفن کر دیا گیا ہو۔ اسے سیوریج لائن میں گھسے ہوئے ابھی دس منٹ ہوئے تھے لیکن اسے لگ رہا تھا

جیسے وہ گھنٹوں سے اس جگہ سفر کر رہا ہے اور یہ سفر شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس نے ذہن میں واضح کیا کہ اسے کس طرح سفر کرنا ہے۔ پہلی کراسنگ پر اسے بائیں طرف مڑنا تھا اور اگلی کراسنگ پر دائیں طرف... اسی ترتیب سے دو بار بائیں اور دائیں مڑ کر وہ اس جگہ پہنچ جاتا جہاں اسے سیوریج لائن سے باہر آنا تھا۔ اس جگہ نشانی کے طور پر ایک چمکیلی اورنج رسی پہلے سے موجود تھی۔

دوسری بار مڑنے پر اسے وہ رسّی نظر آ گئی جو اوپر سے آتے مین ہول کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ رسّی دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ یہاں سے نکل جائے گا۔ اس جگہ پانی کم تھا... تقریباً تین فٹ گہرا تھا۔ مین ہول کے پاس پہنچ کر جیف نے سب سے پہلے اوور آل کا اوپری حصہ اتار دیا اور اب وہ صرف ٹانگوں پر چڑھا ہوا تھا، اس کا باقی حصہ جیف کی کمر کے ساتھ جھول رہا تھا۔ اوپری حصہ اس سے باہر آنے پر اسے اندازہ ہوا کہ ائیر ٹائٹ ہونے کی وجہ سے اس کا کیا حال ہوا تھا۔ جب سرد ہوا پسینے سے شرابور جسم سے ٹکرائی تو وہ لرز اٹھا۔ کمر سے اوپر تک لباس غلیظ ہو رہا تھا اور اس نے اتارتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا کہ اس کا لباس یا ہاتھ گندے نہ ہوں۔ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔

مین ہول کی سیڑھیاں چڑھ کر اس نے بقیہ لباس بھی اتار کر پھینک دیا۔ وائلن بیگ جس میں شاٹ گن تھی، وہ پہلے ہی گندے پانی میں پھینک چکا تھا۔ اب اس کے پاس صرف بینک گارڈ کا پستول تھا۔ لیکن اسے اعتماد تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہیں سکے گا۔ کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے عام سی سفید شرٹ اور نیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ مین ہول سے باہر آ کر اس نے آس پاس دیکھا۔ یہ آبادی کے ساتھ ایک جنگل تھا اور اگر یہاں کوئی ہوتا تو جیف کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ مین ہول کے بالکل ساتھ وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ باہر آتے ہی جیف نے پستول نکال لیا اور چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

اب تک جیف نے سب کچھ پلان کے مطابق کیا تھا لیکن آگے اس کا ارادہ پلان کے مطابق کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ اسے یہاں سے نکل کر ہائی وے پر مشرق کی طرف جانا تھا اور راستے میں اسے کہیں روک لیا جاتا۔ اسے روکنے والے کو لوٹ کی رقم میں سے نصف ادا کرنی تھی۔ سفید وین کے ساتھ یہ چھوٹی کار بھی اسے مائیکل کی بیوی کے توسط سے ملی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بھی وین کی طرح چوری کی ہوگی۔

مولیاں

ایک نو بیاہتا بیوی نے شادی کے بعد نئے گھر میں کیاریاں بنائیں اور خوب پودے لگائے۔ جب اس کی ایک سہیلی ملنے آئی تو اس نے بڑے چاؤ سے اپنا باغیچہ اسے دکھایا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے پودوں کے کئی گچھے نظر آ رہے تھے۔ سہیلی نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

''مولیاں۔'' جواب ملا۔

''اچھا!'' سہیلی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن عموماً مالی تو مولیاں قطار میں لگاتے ہیں؟''

''اچھا!'' وہ حیران رہ گئی... ''مگر دکان میں تو مولیاں گچھوں کی شکل میں بکتی ہیں۔''

(کراچی سے میمونہ عزیز کی منطق)

اس کا خیال تھا کہ جیسے وہ ڈبل کراس کرنے جا رہا تھا، عین ممکن تھا یہی کام مائیکل کی بیوی بھی کرتی اور اسے مین ہول سے نکلتے ہی ہینڈز اپ کرا لیتی۔ اسی لیے وہ بہت چوکنا تھا۔ کامیابی حاصل کر کے وہ ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مگر خلافِ توقع اسے کار یا اس کے آس پاس کوئی نظر نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جیف نے کار میں بیٹھنے کے بجائے جنگل کا رخ کیا اور درختوں کے درمیان دوڑنے لگا۔ بھاگنے کے دوران میں اس نے ربر کے دستانے بھی اتار پھینکے تھے۔ اس نے کہیں اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے تھے حتیٰ کہ وین کو بھی ممکنہ حد تک صاف کر دیا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ جنگل سے گزرنے والی سڑک کے ساتھ کھڑی اپنی کار کے پاس موجود تھا۔ اس نے پشت سے بیگ اتارا اور ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی اپنی جیکٹ اٹھا کر پہنی۔ کار اس نے گھنے درختوں کے درمیان اس طرح کھڑی کی تھی کہ وہ سڑک سے گزرنے والوں کو نظر نہ آئے۔ وہ بیگ لے کر ڈکی کی طرف آیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اس لیے ڈکی کھولنے پر اسے پہلے کچھ نامانوس سا لگا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، تاریکی سے کوئی چیز حرکت میں آئی اور اس کے سر پر لگی۔ چوٹ شدید تھی، وہ ایک لمحے میں حواس کھو بیٹھا۔ اسے سوچنے کا موقع نہیں ملا۔

جب اسے ہوش آیا تو دن ڈھل رہا تھا اور وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں بے ہوش ہوا تھا بلکہ وہ کسی دوسری جگہ بندھا ہوا پڑا تھا۔ ایک رسّی سے اس کے ہاتھ پشت پر اور دونوں پیر ٹخنوں سے باندھ دیے گئے تھے۔ پاس ہی الاؤ روشن تھا اور

اس کی کار بھی پاس کھڑی تھی مگر اسے بے ہوش کرنے والا نظر نہیں آرہا تھا۔ درد کی شدت سے اس کا سر پھٹا جارہا تھا لیکن یہ موقع نہیں تھا کہ وہ سر کے درد کو روتا۔ یہاں اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اسے اس طرح بے ہوش کرنے اور باندھنے والا اس کا خیر خواہ نہیں تھا۔ وہ دشمن تھا اور جیف کی زندگی بھی خطرے میں تھی لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے بے ہوش کرنے والے نے اسے یہاں لانے کی زحمت کیوں کی؟ وہ چاہتا تو اسے وہیں مار سکتا تھا یا ویسے ہی پڑا چھوڑ جاتا، بعد میں پولیس خود اسے تلاش کرلیتی۔

یہاں تک لانے کا کوئی خاص مقصد تھا۔ جیف کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ مائیکل کی بیوی کا کام ہے۔ پتا نہیں وہ اکیلی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی شامل تھا؟ یہ سب کرنا اکیلی عورت کے بس کی بات نہیں تھی... لیکن نہیں، جس کا شوہر مائیکل جیسا منصوبہ ساز ہو، وہ اپنی بیوی کو بھی ایسا منصوبہ بنا کر دے سکتا تھا جس پر وہ اکیلے عمل کرسکتی تھی۔ سوچتے ہوئے جیف کو یاد آیا کہ مائیکل نے اپنے دو بچوں کا ذکر بھی کیا تھا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ممکن ہے وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ شامل ہوں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی تاریکی سے نکل کر اس کے سامنے آبیٹھا۔ جیف ایک لمحے کو ڈر گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، وہ مائیکل تھا۔ وہی مائیکل جو جیل میں اس کے ساتھ تھا... وہ زندہ اور پہلے سے زیادہ صحت مند ہوکر موجود تھا۔

''تت... تم مائیکل ہو؟''

''ہاں، میں مائیکل ہوں۔'' اس نے مزے سے کہا۔

''تو تم مرے نہیں؟'' جیف چلا اٹھا۔

''ظاہر ہے، ورنہ تمہارے سامنے کیسے ہوتا۔ اور چلاؤ مت، میں بہرا نہیں ہوں۔''

''لیکن تمہیں تو کینسر تھا اور تمہیں اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔''

''کس نے کہا کہ مجھے کینسر تھا؟''

''تم نے خود کہا تھا۔''

''اور تم نے یقین کرلیا؟'' مائیکل کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

جیف کو شدت سے بے وقوف بن جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ مائیکل اس کے سامنے زندہ موجود تھا اور اس کی صحت بھی خاصی بہتر ہوگئی تھی، صاف ظاہر تھا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا اور اسے اپنے دام میں الجھایا تھا۔ اسے کینسر نہیں تھا۔ اس نے جیف کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی خاطر جھوٹ بولا اور وہ اس کے دام میں آگیا۔ جیف نے کچھ دیر بعد پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے دھوکا دیا۔''

مائیکل ہنسا اور الاؤ کو ایک لکڑی سے کریدتے ہوئے بولا۔ ''تو تم کیا کر رہے تھے، کیا تم نے مجھے دھوکا دینے کا بندوبست نہیں کیا تھا؟ بلکہ تم ایک عورت کو دھوکا دینے جارہے تھے۔''

''تم نے اس بارے میں بھی جھوٹ بولا تھا... تمہارے بیوی بچے نہیں ہیں۔''

''میں نے سچ کہا تھا، میری سچ مچ کی بیوی ہے اور سچ مچ کے بچے ہیں۔ جسے میں نے الّو کا پٹھا قرار دیا تھا، وہ میرا ہی برخوردار ہے۔ میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ میں مجرم ہوں، بینک لوٹتا ہوں لیکن اس میں خون کا اثر آیا..... وہ اسکول کے زمانے سے جرم کی راہ پر چل نکلا اور جب تک مجھے پتا چلا، وہ پکا ہوگیا۔''

''اگر تمہیں پتا چل جاتا تو کیا تم اسے سدھارتے؟ شریف انسان بنانے کی کوشش کرتے؟'' جیف کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ ''ایک باپ کی طرح... جو اپنی اولاد کو شریف دیکھنا چاہتا ہے، چاہے وہ خود دنیا جہان کا بدمعاش ہو۔''

''بکواس مت کرو۔'' مائیکل نے ناگواری سے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ جرم کی راہ پر آنا چاہتا ہے تو میں اس کی اسی لحاظ سے تربیت کرتا۔ اس نے اپنی حماقتوں سے جو سیکھا ہے، اس سے کہیں کم وقت میں اسے میں کہیں زیادہ سکھا دیتا۔ جب میں تم جیسے نسلی گدھے سے اس طرح کام لے سکتا ہوں تو وہ میری اولاد ہے۔''

''تم سچ مچ بیمار تھے، دوائیں کھاتے تھے اور راتوں کو اٹھ کر تکلیف سے روتے تھے۔''

''میرا اپنڈکس پھٹ گیا تھا، پیٹ کی صفائی کے باوجود زہر کے اثرات نہیں گئے تھے اور مجھے اس کی تکلیف ہوتی تھی۔ بہرحال، اب میں ٹھیک ہوں اور امید ہے ایک دو مہینے میں مکمل صحت یاب ہوجاؤں گا۔''

تاریکی سے ایک نوجوان نکل کر آیا اور مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی صورت مائیکل سے اتنی مل رہی تھی کہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ لڑکے نے آہستہ سے کہا۔ ''پاپا! وہ روانہ ہوگئی ہے۔''

''انہیں یہاں تک آنے میں کم سے کم آدھا گھنٹا لگے گا۔''

''کسے... پولیس کو؟'' جیف چوکنا ہوگیا۔ ''اگر تم نے مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی تو خود بھی جیل میں ہو

گے۔''

''بے فکر رہو، میں تمہیں گرفتار نہیں کرا رہا۔'' مائیکل نے اسے تسلی دی۔

''پھر کس لیے لائے ہو یہاں؟'' جیف کسمسانے لگا۔ ''مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟''

مائیکل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ڈاکو ہوں لیکن میں نے آج تک کسی انسان کو قتل نہیں کیا، زخمی بھی نہیں کیا۔''

''تو میرے سر پر یہ زخم کس نے لگایا ہے؟'' جیف نے سر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ لڑکے نے دانت نکالے۔

''یہ میرا کام ہے، میں پاپا کی طرح عدم تشدد کا قائل نہیں ہوں۔''

''تب تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو اور باندھ کر کیوں رکھا ہے؟'' جیف چلا اٹھا۔

''تمہارے چلانے سے کوئی نہیں آئے گا۔'' لڑکے نے اسے آگاہ کیا۔ ''یہ ویران جنگل ہے، ہائی وے یہاں سے کوئی ایک کلومیٹر دور ہے۔''

جیف کے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ ''تم... مجھے یہیں بندھا چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور میں بھوک پیاس سے مر جاؤں گا؟''

''نہیں، میں اتنا اذیت پسند نہیں ہوں۔'' مائیکل الاؤ کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں تمہارے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔''

''کک... کیسا انصاف...؟''

''تم نے کسی کے ساتھ برا کیا۔ اب وہی لڑکی لے لو جس کے ساتھ تم نے زیادتی کی۔ یہی نہیں بلکہ تمہارے وکیل نے اسے عدالت اور ساری دنیا کے سامنے اس فعل میں برابر کا شریک بھی قرار دلوا دیا۔ تمہیں صرف سات مہینے کی سزا ہوئی اور وہ ساری عمر کے لیے دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہوگئی۔ اس بے چاری کی ابھی عمر ہی کیا ہے، صرف پندرہ سال۔''

جیف نے لڑکی کو گالی دی۔ ''وہ... پندرہ سال کی ہے لیکن پوری... ہے۔''

''یہ بات تم اسے بتا دینا۔'' لڑکا ہنس کر بولا۔

جیف کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ ''اسے کیسے بتا دوں... وہ یہاں کہاں ہے؟''

''ہے نہیں لیکن آنے والی ہے۔'' لڑکا اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

''وہ یہاں کیوں آنے والی ہے؟''

''تاکہ تمہارے ساتھ انصاف کیا جاسکے۔'' مائیکل نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے لڑکے سے پوچھا۔ ''رقم کا بیگ رکھ دیا ہے؟''

''یس پاپا۔''

''سنو مائیکل! میں نے تمہارے لیے یہ کام کیا ہے، ٹھیک ہے، تم مجھے کچھ مت دو لیکن خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

مائیکل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نہایت کینہ پرور انسان ہو اگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔ تم اس معصوم لڑکی کی زندگی دوبارہ برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔''

جیف حیران ہوا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ایک رات سونے کے دوران تم نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا منصوبہ بیان کیا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم کس قسم کے انسان ہو اور تمہیں رعایت دینا حماقت ہو گی۔ میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے اگر کرتا تو تمہیں ضرور کرتا لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس کا موقع اس لڑکی کو کیوں نہ دوں جس کے تم مجرم ہو۔ جیل سے نکل کر میں نے اس سے رابطہ کیا۔ وہ سنتے ہی تیار ہوگئی۔ اس کا بوائے فرینڈ بھی اس کے ساتھ ہے اور وہ تمہارے ساتھ انصاف کرنے آرہے ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' جیف چلایا مگر مائیکل اور اس کا بیٹا جیف کی فریاد سنے بغیر تاریکی میں غائب ہوگئے۔ جیف نے دہشت زدہ نظروں سے تاریک جنگل کی طرف دیکھا۔ وہ کسی طرح اپنی رسی کھول لیتا تو یہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن اسے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔ رسی اس کے ہاتھوں اور پیروں میں گڑی جارہی تھی۔ اس نے سوچا اور الاؤ کی طرف سرکنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ رسی کار سے بندھی ہے اور وہ الاؤ کے پاس نہیں جاسکتا۔۔ ورنہ اپنے جلنے کی پروا کیے بغیر رسی جلا کر کھول دیتا۔ اس انکشاف نے اس کا دماغ الٹ دیا اور وہ بے اختیار گالیاں دینے لگا۔ اسی لمحے ہائی وے کی طرف سے روشنی لہرائی۔ کوئی گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ چند منٹ بعد ایک چھوٹی فور وہیل گاڑی وہاں آکر رکی اور اس کی فرنٹ سیٹ سے وہی لڑکی اتری جس کے ساتھ جیف نے زیادتی کی تھی۔ وہ اس سے انصاف کرنے آئی تھی اور اس کا انصاف اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ جیف پاگلوں کی طرح چلانے اور گالیاں دینے لگا۔ جنگل اس کی آوازوں سے گونجنے لگا لیکن کچھ دیر بعد اس کی چیخیں اور گالیاں تھم گئیں اور جنگل میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے ۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ...... جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے ...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ...... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و
شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ......
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ...... ایک للکار ہے ۔

طاہر جاوید مغل

تیسویں قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور ترل پانی۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔

ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جکی کی حالت خراب تھی۔ جکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے، میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صغورا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو اب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر عمران نے ایک انگریز افسر اینڈرسن کو قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ وہ راضی ہو گیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آگئے۔ ہم لوگ شفاخانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور طویل سفر کے بعد الٰہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں مجھے اور عمران کو ڈی ایس پی سجاد نے گرفتار کر لیا اور ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ ہمیں اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعد ازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر میں نے اچانک ثروت کی بہن نصرت کو دیکھ لیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ثروت نظر آگئی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ پھر میں نصرت سے ملا اور ثروت کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا پتا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرونِ ملک کر دیا۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ "خاص چیز" کیا ہے۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ اسے بھی اس اہم شے کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ ڈاکٹر مہناز کو ہم پر شک ہو گیا تھا کہ ہم جو نظر آرہے ہیں، وہ نہیں ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اسے بعد میں حقیقت بتا دوں گا۔ پھر میری آنکھوں نے جلالی اور مہناز کی قربت کا منظر دیکھا۔ عمران کی جانوروں میں دلچسپی کے باعث وہ جلالی صاحب کے تیزی سے قریب آرہا تھا۔ پھر ایک دن میں نے جلالی صاحب کی گاڑی سے الیکٹرانک ٹریکر برآمد کر کے ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ پھر جلالی صاحب نے 23 مارچ کی چھٹی پر نہر کنارے باربی کیو کا اہتمام کیا۔ کافی ملازمین اور مہناز سمیت ہم لوگ بھی موجود تھے۔ واپسی پر ہم جب فارم ہاؤس پہنچے تو پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے وہاں دھاوا بول کر سب کچھ تہس نہس کر ڈالا ہے۔ ایک گارڈ مارا گیا اور کئی ملازمین زخمی ہوئے۔ دو ملازماؤں کی آبروریزی کی گئی۔ پھر عمران نے اس واقعے کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور میں اور وہ جاوا کے گرگے سلطان کے اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں تلخ کلامی ہوئی مگر کوئی ثبوت نہیں ملا۔ واپسی میں عمران کو ایرانی بلی کی آواز سنائی دے گئی جس سے ظاہر ہو گیا کہ فارم ہاؤس پر سفاکیت پر مبنی کھیل جاوا کی طرف سے ہی کھیلا گیا ہے۔ عمران نے سلطان پر حملہ کر دیا اور اسے خنجر کی زد پر لے لیا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بند دروازے سے بلی کی آواز مدھم آرہی تھی۔ وہ عمران کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شاید اس نے عمران کی خوشبو سونگھ لی تھی اور اب اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ عمران نے سلطان کی جیب سے ایک اور پستول برآمد کر لیا تھا اور اب یہ پستول اس کی کنپٹی پر تھا۔ اپنا اسپیشل ڈیزائن کا چاقو اس نے بند کر کے پتلون کی سائڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔

کمرے میں گمبھیر سناٹا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راہداریوں کے ساؤنڈ پروف دروازوں کی وجہ سے یہاں ہونے والے دو فائروں کی آواز باہر تک نہیں گئی۔ جن تین لوگوں تک یہ آواز پہنچی تھی، وہ یہاں آن موجود ہوئے تھے۔

عمران آتشیں لہجے میں بولا۔ "سلطانے! لگتا ہے کہ جانوروں سے تجھے بھی تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید چاروں بلیاں، جنگلی کتوں نے پھاڑ ڈالیں۔ لیکن تو نے بڑی نیکی کی۔ ایک دو کو شاید بچا لیا۔ کتنی بچی ہیں... ایک یا دو؟"

سلطان بالکل خاموش رہا... پتھر کی ساکت۔

اچانک ایک شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مجھ پر آنا چاہ رہا تھا۔ عمران نے گولی چلائی اور عین اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران کا پستول دوبارہ سلطان کی کنپٹی پر آگیا۔ یہ سارا عمل شاید ایک سیکنڈ کے اندر

مکمل ہوا تھا۔ بدنصیب شخص پٹ سے اوندھی پڑی نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر گرا اور تب ہمیں علم ہوا کہ وہ نازک بدن تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی ہے۔ عمران کی پھرتی اور نشانے کی سچائی نے باقی تینوں افراد کو مبہوت کر دیا تھا۔ عمران زہریلے انداز میں مسکرایا اور "ایڈورٹائزمنٹ" کے انداز میں بولا۔ "اسٹار سرکس... لاجواب کھلاڑی... بے مثال کمالات... اور تمہارے لیے آخری وارننگ ٹی ٹی! کوئی حماقت نہ کرنا۔"

نادر ٹی ٹی جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سانولے رنگ میں ہلدی گھل گئی تھی۔ اس کے ساتھی کا حال بھی یہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں نے موت کے فرشتے کو مجسم حالت میں اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔

"اپنی پینٹ نیچے کرو۔" عمران نے سفاک لہجے میں نادر ٹی ٹی کو حکم دیا۔

وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہاں، اس کے رنگ میں ہلدی کی آمیزش کچھ اور بڑھ گئی۔ عمران نے مجھے اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ "جناب سلطان صاحب کے کھوپڑے پر رائفل کی نال رکھو اور چوں چراں کریں تو ایک سیکنڈ میں ان کا بھیجا فرائی کر دو... بلکہ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگنا چاہیے۔ میں ذرا نادر جی کی خبر لے لوں۔"

میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کیا اور ٹرپل ٹو رائفل کی نال سلطان چٹا کے سر سے لگا کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران، نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "نادر جی! ذرا پینٹ اتار کر کچھ دکھائیے ہمیں۔ اب تو کرشمہ کپور صاحبہ بھی سو رہی ہیں۔ اب کون سی پردہ داری ہے؟"

نادر کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ سب کچھ بھول کر عمران پر جھپٹ پڑے گا، کبھی سکتہ زدہ نظر آنے لگتا۔ جب عمران نے دیکھا کہ نادر اپنے ہاتھ پتلون کی بیلٹ کی طرف نہیں بڑھا رہا تو اس نے پستول کا رخ نادر کی ٹانگ کی طرف کر کے بے دریغ گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ ہی نادر لڑکھڑایا اور اپنی پنڈلی پکڑ کر جھک گیا۔ اس کی گرے پتلون دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہونا شروع ہو گئی۔

عمران کی سفاک آواز پھر کمرے میں گونجی۔ "نادر جی! میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنی پتلون اتاریے۔ آپ کے یہ خادم کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چلیے، جلدی کیجیے۔"

نادر ٹی ٹی مسلسل، کھا جانے والی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا لمبوترا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ عمران نے دوسری بار گولی چلائی اور یہ اس کی دوسری ٹانگ میں گھٹنے سے تین چار انچ اوپر لگی۔ اس بار وہ درد سے چلّا اٹھا۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

"جنابِ عالی... آخری بار مؤدبانہ گزارش ہے۔ پتلون اتاریے۔ اس بار آپ کا یہ خادم جو گولی چلائے گا، وہ آپ کے ناریل شریف میں لگے گی۔" عمران نے پستول کا رخ نادر ٹی ٹی کے سر کی طرف کر دیا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے۔ نادر ٹی ٹی نے بھی شاید اس کی آنکھوں میں اپنی موت پڑھ لی تھی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے اور بل کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ بیلٹ کی طرف بڑھائے اور پتلون انڈر ویئر سمیت گھٹنوں تک اتار دی۔ عمران کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔ نادرے کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ کی بائیں طرف دو کھرنڈ سے تھے۔ ایک بڑا تھا، دوسرا قدرے چھوٹا تھا۔ یہ دراصل کھرونچوں کے پانچ چھ دن پرانے نشان تھے۔ عمران نے ذرا قریب جا کر مزید دھیان سے ان کھرونچوں کو دیکھا۔

اب اس بات میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دراز قد ڈھاٹا پوش نادرے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جس نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کیا۔ رخشی کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چٹا براہِ راست اس واردات میں شریک نہیں تھا مگر سب کچھ ہوا اسی کی پلاننگ اور آشیر باد سے تھا۔ عمران کے اشارے پر نادرے نے اپنی پتلون اوپر چڑھا لی۔

عمران اب نفسیاتی طور پر کمرے میں موجود تینوں افراد پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ تینوں اس کے سامنے ساکت و جامد موجود تھے۔ فقط سلطان چٹا میں تھوڑا بہت دم خم نظر آتا تھا مگر ٹرپل ٹو رائفل کی نال اس کی کھوپڑی سے لگی ہوئی تھی۔ نادر کو دو گولیاں لگ چکی تھیں اور خون اس کی دونوں ٹانگوں سے بہہ رہا تھا۔ قالین پر گل کاریاں کر رہا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "ذرا ہوشیار رہنا جگر! میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔"

میں نے سر ہلا کر عمران کو تسلی دی۔ وہ ساگوان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران کی گود میں وہی شاندار ایرانی بلی تھی جس کی آواز پر ہم رکے تھے اور یہ سارا نقشہ تبدیل ہوا تھا۔ یہ نایاب حاملہ بلی عمران کی گود میں آکر ایک دم شانت تھی، اس کے سینے سے اپنا سر رگڑ رہی تھی۔ اس کی ٹائی سے کھیل رہی تھی۔

عمران نے زہرناک نظروں سے نادر کو دیکھا... اور بولا۔ ”نادر صاحب! اسی لیے مشہور باکسر محمد علی کلے نے اپنی سرائیکی شاعری میں کہا ہے، جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔ ایسی خوب صورت سرائیکی میں نے کہیں نہیں پڑھی اور تم نے تو بالکل بھی نہیں پڑھی ہو گی ورنہ تم واردات کی رات یہ بلی اٹھانے کی غلطی نہ کرتے۔ اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے نادر صاحب! تم نے اس رات ہر وہ کام کیا ہے جو تمہیں سزائے موت دینے کے لیے کافی ہے۔ تو کیوں نا اس سلسلے میں جناب کی تھوڑی سی مدد کی جائے۔ کتنا لمبا سفر کرنا پڑے گا جناب کو! تھانہ، عدالت، جیل، وکیل، وکیل کی فیسیں، اپیلیں، دلیلیں... اور پتا نہیں کیا کچھ؟ تو کیوں نا آپ کو شارٹ کٹ لگوا دیا جائے۔ آپ کے رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے بھی آپ کو یہ آسانی ملنی چاہیے۔“

نادر کا رنگ یکسر ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عمران کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا، جیسے بہ زبانِ خاموشی اسے مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ لیکن سلطان کیا کرتا؟ وہ تو خود موت کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا... وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اچانک نادرے کا پندار ٹوٹ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دہشت زدہ عاجزی میں ڈھل گئی۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت میں آج پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نادرا گھگیایا۔ ”دیکھو... مم... میں بڑے کام کا بندہ ہوں۔ مجھے ایسے ضائع مت کرو۔ جو کچھ کر رہا ہوں روزی روٹی کے لیے کر رہا ہوں۔ میں... تمہارے لیے کام کرنے کو تیار ہوں۔ وقت پڑنے پر جان دے سکتا ہوں۔“

”تو وقت پڑ گیا ہے نا جناب نادر صاحب! مجھے آپ کی روح قبض کروانی ہے۔“ عمران نے انگلی کا دباؤ پھر ٹریگر پر بڑھا دیا۔ نالی کا رخ نادرے کے سر کی طرف تھا۔ بہرحال، اس نے گولی چلائی نہیں۔ نادرا تڑپ کر اوندھے منہ عمران کے پاؤں میں گر گیا۔ ”میرا کوئی قصور نہیں۔ مم... میں نے بس سلطان کا حکم مانا۔ یہ سامنے کھڑا ہے۔ پوچھ لو اس سے۔ بس یہی میری غلطی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے معاف کر دو۔“

عمران پھنکارا۔ ”تم نے سلطان کا حکم مانا لیکن اس ڈیوٹی میں سارا مزہ تو تمہیں ہی آیا نا۔ رات بھر تم نے فارم ہاؤس میں مفت کی شراب پی۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہے۔ بے وجہ قیمتی چیزیں برباد کر کے اپنے اندر کے جانور کو تسکین دیتے رہے، یہ سب کچھ تم نے کیا یا نہیں؟“

”مم... میں اپنا یہ قصور مانتا ہوں۔ میں نے یہ سب کیا۔ میں نے زیادہ شراب پی لی تھی... میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سچے دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے، میں وہ کروں گا۔ بس مجھے ایک موقع دے دو۔ خدا کے لیے... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

عمران پھنکارا۔ ”اس طرح کی منت سماجت اس ملازمہ نے بھی کی ہو گی جسے تم نے زخم زخم کر کے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا ہے... اور شاید اعجاز نے بھی کی ہو جس کے نئے نئے دولھا بنے بھائی کو تم نے دو بار سیڑھیوں سے گرا کر موت کے گھاٹ اتارا۔“

عمران نے ٹریگر پر دباؤ اور بڑھایا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب گولی کسی بھی وقت چل سکتی ہے۔ پستول کا رخ نادرے کے عین سر کی طرف تھا اور عمران کے نشانے کی سچائی تھوڑی دیر پہلے نادرا اور سلطان دیکھ ہی چکے تھے۔

سلطان ہمت کر کے بولا۔ ”دیکھ ہیرو! اتنا ہی بوجھ اٹھا جتنا جھیل سکے۔ اگر تم نے...“

”چپ۔“ عمران دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی جو سلطان کے کان کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کان پر رکھ لیا۔ خون کی ایک دھار اس کی انگلیوں کی درز سے نکل کر ہاتھ کی پشت پر بہنے لگی۔ اس کا چہرہ تکلیف اور زلزلے کی آماجگاہ بن گیا۔ عمران نے اسی لہجے میں کہا۔ ”اگر بکواس کرو گے تو دوسرے کان میں بھی جھمکا ڈالنے کی جگہ بنا دوں گا۔“

کمرے میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نادرے کی موت اب یقینی ہے۔ نادرا آخری کوشش کے طور پر بولا۔ ”میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ تمہارے کام کی باتیں... بہت زیادہ کام کی باتیں۔“ اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”تم کیا بتاؤ گے۔ تم دونوں تو خود اندھے کتے ہو اور ہرن کا شکار کر رہے ہو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی۔ یہ گولی نادرے کی دائیں آنکھ اور ناک کے بانسے کے درمیان لگی، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور پھر کروٹ کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ ایل سی ڈی پر چلنے والی فلم میں ایک بار پھر تالیوں کی گونج تھی۔

سلطان چٹا جیسے گنگ ہو چکا تھا۔ بس متوحش نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون آلود ہاتھ بدستور اپنے

زخمی کان پر تھا۔ قطرہ قطرہ خون اس کی بالوں بھری کلائی پر رینگ رہا تھا۔ اب کمرے میں ہمارے علاوہ بس دو افراد موجود تھے... اور ان میں سے بھی ایک زخمی تھا۔ یعنی سلطان چٹا۔ اس کا ساتھی صنم بگم کی تصویر بنا دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اپنے بڑوں کا حال دیکھنے کے بعد اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ عمران کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ سامنے ہی ایک شوکیس کے بالائی خانے میں ایک ویڈیو کیمرا نظر آ رہا تھا۔ اس پر ایک بڑا سا لینس چڑھا ہوا تھا۔ سائز کے اعتبار سے بھی یہ کیمرا پروفیشنل ٹائپ نظر آتا تھا۔ عمران نے سلطان چٹے کے ساتھی کو حکم دیا کہ وہ شوکیس پر سے کیمرا اتارے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ عمران نے کیمرے کی چارجنگ وغیرہ چیک کی۔ وہ ورکنگ پوزیشن میں تھا۔

”کیا کرنا ہے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”یار دیکھو! اتنا زبردست رومانی سین ہو رہا ہے بلکہ ”رومانی“ بھی چھوٹا لفظ ہے۔ دیکھو تو سہی۔“ عمران نے بے ہوش پڑی کرشمہ کپور کی طرف اشارہ کیا۔ عمران کی پہلی گولی سے ہلاک ہونے والا مشٹنڈا اوندھے منہ نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر ہی گرا تھا اور قدرتی طور پر یہ ایک عجیب سا اسٹائل بن گیا تھا۔ کوئی دور سے دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ جذبات سے مغلوب ایک جوڑا یہاں قالین پر ہی اپنی ”حسرتیں نکالنے“ کا ارادہ رکھتا ہے۔

عمران نے میرے ہاتھ سے گن لے کر مجھے کیمرا تھما دیا اور بولا۔ ”چلو جگر! تم ریکارڈنگ شروع کرو اور اوپننگ سین اسی کرشمہ کپور کا رکھو۔ چلو شاباش۔“

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسی سے دنیا و آخرت میں بھلا ہو گا۔“

میں سمجھ گیا کہ اس ریکارڈنگ سے عمران کا کوئی خاص مقصد ہے۔ میں نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ بے سدھ پڑی نیتو عرف کرشمہ کا ایک شاٹ لیا پھر کیمرے کو پین کر کے سلطان چٹا کو فوکس کیا۔ اس کی کنپٹی پر رائفل کی نال تھی اور عمران کی انگشت شہادت ٹریگر پر تھی۔ سلطان کے تاثرات کو ریکارڈ کرنے کے بعد میں کیمرے کو نادرے کی خونچکاں لاش پر لے آیا۔ وہ کروٹ کے بل پڑا تھا۔ چہرے کے علاوہ اس کی دونوں ٹانگوں سے بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے صحت مند جسم میں خون کی خاصی فراوانی تھی۔ شاید یہ فراوانی اور حرارت ہی نادرے جیسے بدمعاشوں کو درندہ صفت بناتی ہے۔ وہ سرتاپا آتش بنتے ہیں۔ لوگوں کو جلاتے ہیں اور پھر دو چار سالوں میں خود بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایرانی بلی عمران کی ٹانگوں میں لوٹ رہی تھی۔ کبھی اس کے پاؤں سے سر رگڑنے لگتی، کبھی ایک دم رخ پھیر کر نادرے اور اس کے ساتھی کی لاشوں کو دیکھنے لگی... اور یوں محسوس ہوتا کہ یہ مناظر اسے حیران کر رہے ہوں۔

عمران نے بڑی تسلی سے سلطان چٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اب تم بتاؤ سلطانے! تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔“

”مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔“ سلطان چٹے نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا۔

”لیکن اگر تم کو چھوڑ دوں گا تو تم اچھا نہیں کرو گے۔ اس نادرے کا خون چہرے پر ملو گے اور مجھے مارنے کی قسم کھا لو گے۔“

”مم... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“ اس نے آخری الفاظ زور دے کر کہے۔

”تم سامنے نہیں آؤ گے تو تمہارا وہ باپ جادا آئے گا۔ تم اس کی بات نہیں مانو گے تو لوگ تمہیں جادے کی حرامی اولاد کہیں گے۔ کیا تم حرامی کہلوانا پسند کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی لگے ہاتھوں مجھ سے اپنا قصہ پاک کروا ہی لو۔ یہاں بڑا لمبا چوڑا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ تم بڑی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے۔ بڑا فائیو اسٹار مشورہ دے رہا ہوں تمہیں۔“

سلطانے کی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے گا، یعنی نتائج سے بے پروا ہو کر عمران سے بھڑ جائے گا یا پھر اسے کوئی ہارٹ اٹیک قسم کی چیز ہو جائے گی۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا سلطانے! تمہیں ایک موقع دیتے ہیں... امید ہے کہ تم خیر سگالی کے اس جذبے کی قدر کرو گے اور اپنے والد جادے کو بھی ایسا کرنے کے لیے کہو گے۔ جب تک میں فارم ہاؤس میں ہوں، جادے نے یا اس کے کسی کتے نے جلالی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو سمجھو جنگ چھڑ گئی۔ امید ہے کہ جادا میرے بارے میں تھوڑا بہت تو جانتا ہو گا۔ مزید تفصیل اسے تم بھی بتا سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ تو خاکسار کی دو چار ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔“

سلطانے نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی موت کی زردی میں زندگی کی چمک نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن اسے اب بھی پورا یقین نہیں تھا کہ وہ موت کے اس ناگہانی گھیرے سے نکل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔ ”میں اپنے الفاظ پھر دہرا رہا ہوں۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو پہلے مجھ سے سامنا ہوگا... اور یہ سامنا معمولی نہیں ہوگا۔“ سلطان نے پھر مشینی انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔ اس کی قمیص کا ایک کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

عمران نے ٹرپل ٹو رائفل کی مہلک نال بدستور سلطان چٹے کی کھوپڑی سے لگا رکھی تھی۔ یہ بڑا ڈرامائی سا سین تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔

عمران نے میری طرف دیکھا۔ ”چلو جگر! اب چلیں۔“

”لیکن کیسے؟ سلطان صاحب کے گرگے ہمیں نکلنے دیں گے؟“

”نہ نکلنے دیں گے تو سلطان جی کا بھیجا بھی نادر صاحب کی طرح فرائی ہو جائے گا۔“

”لیکن اس کو گن پوائنٹ پر کہاں تک لے جائیں گے؟“

”اپنی گاڑی تک۔ جب گاڑی پر بیٹھ کر ڈیڑھ دو سو فرلانگ آگے نکل جائیں گے اور یقین ہو جائے گا کہ کوئی کتا بلا ہمارے پیچھے نہیں آ رہا تو سلطان جی کی تشریف پر لات مار کر... نہیں... نہیں... یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ سلطان جی کو عزت کے ساتھ گاڑی سے اتار دیں گے اور خود شیخوپورہ پہنچ جائیں گے۔“

”شاید تم بھول رہے ہو۔ ہم گاڑی پر نہیں، موٹر رکشا پر تشریف لائے تھے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا دماغ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔“ عمران نے مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر سلطان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”پارکنگ میں پہلے فلور پر۔ ستون نمبر 18 کے پاس۔ کالے رنگ کی ٹویوٹا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، چلو... یہ گاڑی تمہارا ڈرائیور شیخوپورہ سے واپس لے آئے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یار! کیا کر رہے ہو؟ پارکنگ لاٹ میں لوگ ہوں گے۔ دو چار پولیس والے بھی وہاں ٹہل رہے تھے۔ چوکیدار بھی ہیں۔ وہ اس کو گن پوائنٹ پر دیکھیں گے تو شور مچ جائے گا۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا ہے۔“

”یار! تم دیکھنا سارے نابینا ہو جائیں گے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“

”تم ضرورت سے زیادہ بے پروائی تو نہیں کر رہے؟“

”تم ضرورت سے زیادہ ناسمجھی دکھا رہے ہو۔ ذرا غور کرو یار! تمہارے ہاتھ میں اتنا بڑا ویڈیو کیمرا ہے۔ تم باقاعدہ ریکارڈنگ کر رہے ہو۔ شکل و صورت سے بھی تم کسی پرائیویٹ پروڈکشن کمپنی کے ناکام ڈراما ڈائریکٹر ہی نظر آتے ہو۔ آج کل لوگ ایسی ریکارڈنگز کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔“

”یعنی تم...“

”ہاں، یعنی یہی کچھ... تم بس کیمرا آن رکھنا۔ باقی سب میرا کام ہے۔“

دو منٹ بعد ہم بڑی شان کے ساتھ سلطان چٹا کے اس خفیہ اڈے سے باہر نکل رہے تھے۔ ہم کم از کم دو ساؤنڈ پروف سلائڈنگ ڈورز میں سے گزرے۔ یہاں چوکس مسلح محافظ موجود تھے مگر اپنے باس کے سر پر رائفل کی نال دیکھ کر اور اس کا اڑا ہوا رنگ اور رنگا ہوا کان دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔ مزید احتیاط کے طور پر سلطان نے انہیں زبانی بھی کہہ دیا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی نہ کریں۔ میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ سلطان چٹا کے قدم کانپ رہے تھے اور اس کی گردن پر تیز دھار چاقو نے جو کٹ لگایا تھا، وہ بھی مسلسل خون افشانی کر رہا تھا۔

یہ بظاہر بے آباد کوٹھی اندر سے آباد تھی۔ یہاں ہر وہ انتظام کر دیا گیا تھا جس سے یہ بے آباد ہی نظر آتی۔ کچھ کھڑکیوں کے شیشوں پر گہرا سیاہ روغن پھیر دیا گیا تھا اور کچھ کھڑکیاں ویسے ہی بند کر دی گئی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ رات کے وقت یہاں ہونے والی روشنی سڑک پر سے نظر نہ آ سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آخری دروازے میں سے نکلے اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچ گئے۔ ایرانی بلی عمران نے سلطان چٹے کو تھما دی تھی۔ وہ اس بلی کے ساتھ کسی انگریزی فلم کا زخمی ولن ہی نظر آ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب چہل پہل کافی بڑھ چکی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم آٹھ دس قدم آگے گئے تھے کہ لوگوں کی نگاہ ہم پر پڑنی شروع ہو گئی۔ دیکھنے والوں کو سب سے پہلے سلطان کے خونچکاں چہرے نے ہی متوجہ کیا ہوگا۔ پھر عمران کی رائفل پر نظر پڑی ہوگی۔ لوگ متحیر نظر آئے۔ عورتوں اور بچوں کے چہروں پر ہراس نمایاں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے اور میرے کیمرے کو دیکھا۔ وہ متذبذب نظر آئے۔ ان میں سے زیادہ تر جلد ہی خود کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ یہ کسی ڈرامے وغیرہ کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ چند پولیس والے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑے تھے۔ انہوں نے

بھی بس دیکھنے... چونکنے... اور مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس دن مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہم لوگ اپنے اردگرد کے حالات سے کتنے لاتعلق ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے سنگین وارداتیں ہو جاتی ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا... یا پتا چلتا ہے تو ہم کوئی مناسب ردِعمل ظاہر نہیں کر پاتے۔ عمران نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ سو فیصد درست تھا۔ لوگوں نے بس دور دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پولیس والے بھی جوں کے توں کھڑے رہے۔ صرف ایک کیمرے نے واقعی ہر شخص کی نظر بندی کر دی تھی۔ سلطان کے ڈرائیور نے ٹویوٹا کار کا دروازہ کھولا۔ عمران اور سلطان پیچھے بیٹھ گئے۔ عمران نے رائفل بدستور سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خطرناک ترین جگہ پر ہے۔ یہاں ہمارے اردگرد درجنوں قاتل موجود تھے۔ وہ ذرا سا موقع ملنے پر مجھے اور عمران کو چھلنی کر سکتے تھے۔ میں کیمرے سمیت اگلی نشست پر آ گیا۔ کیمرے کا رخ بدستور عمران اور سلطان چٹے کی طرف ہی تھا۔ سلطان کے ڈرائیور کی تلاشی ہم روانہ ہونے سے پہلے ہی لے چکے تھے۔ اب اس کے پاس گاڑی کی چابی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔

”کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟“ سلطان نے پوچھا۔

”نہیں، ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر یہ رہائی مشروط ہے۔ میں نے تمہیں کوٹھی پر ہی بتا دیا تھا۔ اگر تیرے پالتو کتوں نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا۔“

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ کوئی پیچھے نہیں آئے گا۔“ سلطان نے اپنا زخمی کان دبائے دبائے کہا۔

”لیکن تسلی تو ضروری ہے نا جنابِ عالی! ایک پچھلی ملاقات میں تم نے خود ہی تو ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے پیشے میں اعتبار کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح عام لوگوں کے لیے شراب اور پرائی عورت۔“

سلطان چٹا دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ آج کا دن اس دبنگ شخص پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے جب وہ اپنے کمرے میں نیتو عرف کرشمہ کپور سے اپنے گورے چٹے جسم کی مالش کروا رہا تھا اور ایک پُرسکون شب گزارنے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے دو قیمتی ساتھیوں سے ہاتھ دھونے والا ہے بلکہ ایک داداگیر کی حیثیت سے یادگار رسوائی کا شکار بھی ہونے جا رہا ہے۔

عمران نے عقب پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میں بھی گاہے بگاہے جائزہ لے رہا تھا۔ ہم مال سے گزر کر لوئر مال روڈ پر آ گئے، وہاں سے ہمارا رخ پہلے داتا دربار اور پھر راوی کے پل کی طرف ہو گیا۔ شیخوپورہ روڈ پر پہنچ کر عمران نے واقعی خیرسگالی کا مظاہرہ کیا۔ سلطان چٹے کو گاڑی سے اتار دیا۔

اب خطرے کی شرح کافی کم ہو چکی تھی۔ سلطان چٹا کسی پی سی او سے فون کر کے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرتا اور انہیں ہمارے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا بھی تو اس میں آدھ پون گھنٹا تو لگ ہی جاتا تھا۔ تب تک ہم یقیناً شیخوپورہ اور فارم ہاؤس کے آس پاس پہنچ جاتے۔ بہرحال، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم بحفاظت فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ حاملہ بلی عمران کی گود میں تھی... اور ویڈیو کیمرا میری گود میں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس ہی رہیں۔ ہم نے سلطان کے ڈرائیور کو گاڑی سمیت واپس بھیج دیا، یہاں تک کہ ٹرپل ٹو رائفل بھی واپس بھیج دی۔

☆☆☆

ہم کوٹھی میں پہنچے تو وہاں ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ ملازم سہمے ہوئے تھے۔ ملازم وحید کوریڈور میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اسے جلالی صاحب کا تھپڑ سہنا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی طرح جلالی صاحب کو ایرانی بلیوں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ اس سلسلے میں ان سے سفید جھوٹ بولا گیا ہے۔ بدھ کی رات کوٹھی میں جہاں اور بہت سے سنگین واقعات ہوئے ہیں، وہاں لاکھوں روپے مالیت کی ایرانی بلیاں بھی جنگلی کتوں نے پھاڑ کھائی ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ”بہت برا ہوا ہے۔ جلالی صاحب کا بلڈ پریشر ڈھائی سو سے اوپر چلا گیا تھا۔ ہارٹ بیٹ بھی دوگنا سے بڑھ گئی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ آج کچھ ہو جائے گا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔ میں نے انہیں سکون کا انجکشن دیا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والا کیپسول منہ میں نچوڑا ہے۔ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں چلے گئے ہیں لیکن دل کی تکلیف کے سبب انہیں زیادہ غنودگی بھی نقصان دے سکتی ہے۔“

کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ عمران نے کہا۔ ”لیکن انہیں پتا کیسے چلا ڈاکٹر... بلیوں کے بارے میں آپ کے اور ندیم کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں تھی؟“

''میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا... اور مجھے یقین ہے کہ ندیم بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے فتح محمد کسی کام سے اوپر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسری منزل کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہاں تین پنجرے ہیں۔ تینوں خالی تھے۔ فتح محمد نے آکر جلالی صاحب کو بتا دیا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا پھر جب یقین آیا تو قیامت آگئی۔ وہ اتنا گرجے برسے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ خاص طور سے... عمران صاحب آپ پر انہیں بہت غصہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ نے یا تابش صاحب نے بلّیاں کہیں غائب کر دی ہیں یا اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ آپ کے پیچھے بندے دوڑانے لگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ کام زیادہ بگڑ گیا ہے تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا...''

''آپ نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ بدھ کی رات جہاں اور بہت کچھ ہوا ہے، وہاں ان بلیوں کی بھی موت ہو گئی ہے۔ یہاں گھسنے والوں نے جنگلی کتّوں کے غول کو بلیوں والے پنجرے میں گھسا دیا تھا۔ انہوں نے انہیں مار کھایا۔ پنجرے میں بس بلّیوں کے بچے کھچے حصے ہی ملے۔ عمران نے اور ہم نے اس خوف سے کہ آپ کو صدمہ ہوگا، یہ خبر آپ سے چھپالی۔''

عمران سوچ میں پڑ گیا۔ ''لیکن ڈاکٹر صاحبہ! دوسری منزل کا دروازہ کھولا کس نے؟ میں نے وہاں تالا لگایا تھا۔ وہ تالا کس نے کھولا اور فتح محمد کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس نے کھلا ہوا تالا دیکھا ہے؟''

ڈاکٹر مہناز نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ فتح محمد کو بلا کر لائے۔ کچھ دیر بعد فتح محمد آگیا۔ یہ شخص پہلے دن سے مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ ایک دم خاموش اور گہرا شخص تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی بولا۔ ''آپ لوگوں کو مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہی کچھ نہیں تھا۔ مجھے تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ ایرانی بلّیاں دوسری منزل کے پنجرے میں ہیں۔ میں بابے طفیل کے حقّے کے لیے سوکھی لکڑیاں لینے اوپر گیا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر پنجروں کی طرف چلا گیا۔ تینوں پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر صاحب جی کو بتا دیا۔''

''دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ تالا تمہیں نظر نہیں آیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، تالا دروازے میں تو نہیں تھا۔ آس پاس بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اگر اس کی چابی صرف آپ کے پاس ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اسے کسی نے توڑ کر علیحدہ کر دیا ہوگا۔''

ہم نے دو چار سوال فتح محمد سے مزید پوچھے۔ اس نے جیسے سارے جواب پہلے سے تیار کر رکھے تھے۔

جلالی صاحب ابھی تو سوئے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ طوفان بہت دیر تک سویا نہیں رہے گا۔ وہ جلد ہی جاگ جائیں گے اور ایک بار پھر بلیوں کے حوالے سے زبردست واویلا مچے گا۔ اس واویلے کے کئی نتیجے نکل سکتے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ''حضرت'' کی حالت نازک ہو جاتی اور وہ اسپتال پہنچ جاتے۔ ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ ''بلی کہاں ہے؟''

''میرے کمرے میں؟''

''کیا یہ اکیلی بلی جلالی صاحب کے غصے اور صدمے کو کم کر سکے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔''

''لیکن یہ بچ کیسے گئی؟ ہمارا تو خیال تھا کہ چاروں کا صفایا ہو گیا ہے۔''

''یار! تمہیں محمد علی کلے کا سرائیکی شعر نہیں سنایا تھا جو چپ رہے گی زبانِ خنجر... یہی بات مشہور فلم ڈائریکٹر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی ایک پشتو فلم میں ایک کردار سے کچھ اور طرح سے کہلوائی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قاتل اور چیچک کا دانہ اپنی نشانی ضرور چھوڑتا ہے۔ اور اگر قاتل کو چیچک بھی ہو تو پھر تو اس کا پکڑا جانا ایک دم یقینی ہے...''

''تمہاری معلومات پر اش اش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہو تم۔''

''لیکن میں نے کبھی غرور نہیں کیا۔ اکبر اعظم نے اپنے بڑے بھائی سکندرِ اعظم کو غالباً پانی پت میں شکست دینے کے بعد کہا تھا... جو شاخ جتنی پھل دار ہوتی ہے، اتنی ہی جھکی ہوتی ہے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سکندر اعظم کافی پہلے پیدا ہوا تھا... کوئی پونے دو ہزار سال پہلے۔''

''اسی بات پر تو لڑائی ہوئی تھی۔ اکبر اعظم کا کہنا تھا کہ پہلے اس نے پیدا ہونا تھا۔ اکبر کا تو مطلب ہی ہوتا ہے ''بڑا۔'' یعنی بڑا بھائی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کا نام اصغر اعظم ہوتا...'' وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ صرف دو تین گھنٹے پہلے ہم نہایت سنگین حالات سے گزرے ہیں... اور ان حالات میں کم از کم دو افراد کا قتل بھی شامل ہے۔ وہ سیلانی روح تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ سیلانی بناتا چلا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد وہ چڑیا گھر والے پورشن کی طرف چلا گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی کام سے گیا ہے؟

لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے اندرونی حصے سے جلالی صاحب کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کچھ آگے جا کر سنا۔ وہ اپنے ملازم وحید کو پھر سے بُری طرح لتاڑ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ واردات کی رات وحید اور اس کا ایک ساتھی ZOO کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وحید پر جلالی صاحب کا غصہ بے وجہ تھا۔ واردات کے وقت جہاں پوری کوٹھی کے گارڈ بے بس ہو گئے تھے، وہاں وحید اکیلا کیا کرتا۔ حملہ آوروں نے رات بھر وہی کیا تھا جو ان کا دل چاہا تھا۔

آوازوں سے اندر کی صورتِ حال واضح ہو رہی تھی۔ جلالی صاحب گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی نرم ملائم آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ وہ جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی عاجزانہ کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جلالی صاحب کے غیظ و غضب کا رخ وحید سے جاوا وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔ انہوں نے غائبانہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کو بے نقط سنائیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ مقامی ایس ایچ او اکرام کے لتّے لینے لگے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص مجرموں سے ملا ہوا ہے۔ اسے ہر اونچ نیچ کی خبر ہے۔ وہ دہاڑ رہے تھے۔

''یہ حرام خور... غدار ہے۔ جب تک یہ کتا اس تھانے میں موجود ہے، مجھے انصاف نہیں مل سکتا۔ اس نے میرا بیڑا غرق کیا ہے، میں اس کا بیڑا غرق کر دوں گا۔ میں... اسے ویسے ہی ختم کر دوں گا۔ میں ختم کر دوں گا۔'' ان کی آواز غصے کی شدت سے اجنبی محسوس ہونے لگی۔

پھر شاید جلالی صاحب کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ دو تین منٹ بعد ڈاکٹر مہناز ہانپی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ ''تابش! بہت گڑبڑ ہے۔ جلالی صاحب رائفل لوڈ کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ایس ایچ او اکرام خان کی طرف جا رہے ہیں... اور ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ پورچ تک بھی جا سکیں۔ وہ ضرور اپنا نقصان کر لیں گے۔ انہیں کسی بھی وقت برین ہیمرج یا ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔''

''کیا کیا جائے؟''

''ندیم کو بلاؤ۔ اس کے پاس ایس پی حمزہ صاحب کا فون نمبر ہے۔ شاید وہ جلالی صاحب کو سنبھال سکیں۔''

اس سے پہلے کہ میں ندیم کی تلاش میں بالائی منزل کی طرف جاتا، عمران کمرے میں داخل ہوا۔ مہناز کا متغیر چہرہ دیکھ کر وہ چونکا۔ ''خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

مہناز نے وہ سب کچھ عمران کو بھی بتا دیا جو مجھے بتایا تھا۔ آخر میں وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا صبر اب جواب دے گیا ہے۔ وہ مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ باتیں ان کی صحت کے لیے بہت خطرناک ہیں... کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جناب ابھی تھوڑی دیر میں خود کو کافی بہتر محسوس کریں گے۔''

''لیکن کیسے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے۔ باقی جو تھوڑی بہت کسر رہ جائے گی، وہ میں ایک تازہ خبر سنا کر پوری کر دوں گا۔''

''تازہ خبر؟'' ڈاکٹر مہناز نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں... آیئے، میرے ساتھ آیئے۔'' وہ بڑے ایکشن سے بولا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آگ بگولا جلالی صاحب کے سامنے تھے۔ جلالی صاحب بوٹ پہننے کے لیے موزے چڑھا رہے تھے اور یہی ''مشقت'' انہیں بُری طرح ہانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، جلالی صاحب کی بوڑھی ناتواں آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا جیسے کوئی پر بریدہ پنچھی بے قراری کی انتہا کو چھو رہا ہو اور پھڑپھڑا رہا ہو۔ اس اضطراب کا تعلق یقیناً بدھ کی رات والے خونی واقعات سے تھا۔ جلالی صاحب کو اپنے تین وفادار ملازموں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ ایک درجن کے قریب سخت زخمی ہوئے تھے۔ دو عورتوں کی عزت پامال ہوئی اور بے زبان جانوروں تک کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ جلالی صاحب کا غم و غصہ سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن شدید غم و غصہ جلالی صاحب کی جسمانی حالت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ پریشان حال مہناز بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس سے آگے میں تھا۔ میرے آگے عمران۔

''کیا بات ہے؟'' وہ عمران کو اپنے سامنے دیکھ کر دہاڑے۔ ''کیا اب کوئی اور جھوٹ بولنا چاہتے ہو؟''

''نہیں سر! اپنے ایک پہلے جھوٹ پر آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''سر! میں نے اور تابش نے کل شام غلط کہا تھا کہ ہمیں ایک دوست کی شادی پر جانا ہے۔ ہم ایک اور کام سے گئے تھے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کام کے بارے میں

سن کر ضرور خوش ہوں گے۔ دراصل ہم اس شخص کی طرف گئے تھے جس نے بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں قیامت مچائی اور آپ سمیت ہم سب کو بے حد دکھی کیا۔ ہم اس سے دو دو ہاتھ کرنے گئے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں جی۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

عمران نے گہری سانس لی اور مسکین لہجے میں بولا۔ "جناب! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم کو گھوم پھر کر کام کرنے کی عادت ہے۔ ہمیں نئے نئے لوگوں سے ملنے میں مزہ آتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں کئی طرح کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ مدراس میں ہم نے سات آٹھ ماہ ایک گینگسٹر کے گھر میں بھی نوکری کی تھی۔ مجبوری تھی جناب! وہ ایک مشہور انڈین ایکٹر کا ماموں تھا۔ ہم نے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے جناب! اس گینگسٹر سے بھی بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، وہ آج رات بہت کام آیا ہے سر۔"

جلالی صاحب پھنکارے۔ "اگر تم مسخری کر رہے ہو تو میں بہت بُری طرح پیش آنے والا ہوں اور اگر سیریس ہو تو پھر... یقیناً تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"میں آپ کا خادم، ہوش میں ہوں سر! میں آپ کو زبانی بتاؤں گا تو شاید آپ یقین نہ کریں اور آپ کو مزہ بھی نہ آئے۔ میں آپ کو اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

جلالی صاحب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مہناز بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر عمران اتنا بول رہا ہے تو پھر اس کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی ہوگی۔

جلالی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عمران نے ویڈیو کیمرے کو سامنے شیشے کی ایک خوب صورت میز پر رکھ دیا۔ ویڈیو کیمرے کی اسکرین تقریباً چھ ضرب چار انچ کی تھی۔ عمران نے ریکارڈنگ چلا دی۔ پہلا منظر ہی چونکا دینے والا تھا۔ سلطان چٹے کے ساتھی کی لاش نیتو عرف کرشمہ کے اوپر پڑی تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا کہ کوئی جذبات انگیز کارروائی ہو رہی ہے۔ کیمرا پین کر کے عمران اور سلطان چٹے پر آیا... عمران نے رائفل کی نال سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی اور کہہ رہا تھا کہ "دکھاؤ دکھاؤ اس کتے کو بھی دکھاؤ جس نے صاحب کے گھر گھسنے کی حماقت فرمائی۔"

کیمرے نے حرکت کی اور فرش پر پہلو کے بل پڑے نادرے کی لاش دکھائی۔ اس کا کھوپڑا ٹوٹ چکا تھا اور ٹانگیں خونچکاں تھیں۔ خون ابھی اس کے جسم سے بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ پس منظر میں عمران کی آواز ابھری۔ "اب تم بتاؤ سلطانے! کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔"

"مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔" سلطانے نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ کیمرا اس کے تاثرات کو بڑی خوبی سے دکھا رہا تھا۔ سلطان چٹا کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ جاوا جیسے شخص کا قریبی ساتھی تھا۔ ایسے لوگوں کو مرعوب کرنا آسان کام نہیں ہوتا مگر وہ مرعوب ہو چکا تھا اور اس کی وجہ یہ یقین تھا کہ عمران اس کو مار سکتا ہے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" سلطان چٹے کی ریکارڈ شدہ آواز ابھری۔

"تم نہ آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا..." عمران نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس کمرے میں دو خونچکاں لاشوں کے درمیان عمران اور سلطانے نے جو بات چیت کی، اس نے بہت کچھ واضح کر دیا۔

جلالی صاحب حیرت سے گنگ سن رہے تھے۔ مہناز کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ہم دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ یہ ایک مکمل فلم بندی تھی۔ عمران نے سلطان کو گن پوائنٹ پر رکھا اور پھر پارکنگ لاٹ میں آ گیا۔ درجنوں لوگوں اور پولیس والوں کے سامنے اس نے زخمی سلطان کو گاڑی میں بٹھایا اور شاہراہِ قائداعظم کی جگمگاتی روشنیوں میں آ گیا۔

عمران نے ہاتھ آگے بڑھا کر کیمرا آف کیا تو جلالی صاحب چونک کر اس ریکارڈنگ کے سحر سے باہر نکل آئے۔ ان کا غیظ و غضب اب ایک طرح کی حیرت میں ڈھل چکا تھا۔

"یہ سب کیا تھا؟" وہ لرزاں آواز میں بولے۔

عمران نے انہیں بتا دیا کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے تھا۔ یہ جان کر جلالی صاحب ششدر رہ گئے کہ ہم کل شام یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سیدھے جاوا کے ایک اڈے پر پہنچے تھے اور ہم نے اس شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ہے جس نے بدھ کی رات یہاں زبردست خون خرابا کیا۔ عمران نے جلالی صاحب کو یہ نکتہ بھی وضاحت سے بتایا کہ وہ لمبا شخص نادرا ہی تھا جو پشتو لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے پشتو لہجے کا سوانگ رچایا تھا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ تفتیش وغیرہ کا رخ ریان ولیم کے گروہ کی طرف موڑنا چاہتا تھا۔

ریکارڈنگ میں گاہے بگاہے ایرانی بلی بھی جلالی صاحب کو نظر آئی تھی۔ ان بلیوں میں جلالی صاحب کی جان تھی۔ وہ بلی کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور بہت سے دیگر سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ "یہ بلی بچ گئی ہے؟"

"جی سر! یہ اکیلی ہی بچی ہے۔"

"کہاں ہے؟" انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"یہیں میرے پاس ہے۔"

"اور باقی؟"

"وہ اب نہیں ہیں۔" عمران کا لہجہ دکھ آمیز تھا۔ "جنگلی کتوں نے انہیں مار ڈالا۔"

جلالی صاحب کے چہرے پر ایک بار پھر گہرے کرب کے آثار نظر آئے۔

عمران نے کہا۔ "لیکن سر! میں نے آپ سے ایک اچھی خبر سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"کیسی... خبر؟"

عمران نے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر! کیا سر جی ہمارے ساتھ ZOO تک جا سکتے ہیں؟"

مہناز نے کہا۔ "ان کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں جانے سے سر جی کی طبیعت میں بہتری آئے گی۔"

مہناز کے اجازت دینے سے پہلے ہی جلالی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ZOO کے صاف ستھرے پنجروں تک لے آئے۔ رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا لیکن کوٹھی میں بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ سیکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور ان کی سائرن بجاتی ایک گاڑی فارم ہاؤس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہی تھی۔ ایک روشن پنجرے کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر چلے گئے اور تب ہم سب بُری طرح چونک گئے۔ پنجرے کے ایک گوشے میں نرم پرالی کا بچھونا سا بنا ہوا تھا۔ اس بچھونے پر نایاب ایرانی بلی کے چار خوب صورت بلونگڑے موجود تھے اور ان کی ننھی منی رنگ دار آنکھیں نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایرانی بلی انہیں چومنے چاٹنے میں معروف تھی۔ یہ ایک نہایت خوش کن منظر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کچھ دیر پہلے عمران مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک کدھر چلا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بچوں کی ڈیلیوری کا وقت قریب ہے۔

اس منظر نے واقعی جلالی صاحب پر حیران کن اثر مرتب کیا۔ ان کا جسم پھر کانپنا شروع ہو گیا لیکن اب یہ جسم غم و غصے کی شدت سے نہیں، خوشی سے کانپ رہا تھا... وہ بچوں کے قریب اکڑوں بیٹھ گئے۔ انہیں انگلی سے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔ ان کی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ وہ بھی اپنا جسم جلالی صاحب کے بازوؤں سے رگڑتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ واقعی قابلِ دید تھے۔ ان رنگوں میں وہ اطمینان بھی تھا جو نئی زندگی کو وجود دینے کے بعد کسی ماں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اچانک جلالی صاحب چونک گئے۔ وہ جیسے کسی سحر سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بغور مجھے اور عمران کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں خاص طور سے عمران کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ "آؤ چلیں۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پنجرے سے نکل آئے۔

پنجرے کو بند کر کے ہم بھی جلالی صاحب کے ساتھ چل دیے۔ پورچ کی تین چار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تاہم ڈاکٹر مہناز نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بی پی چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہم دونوں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔

"دیکھو، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں سچ سننا پسند کروں گا... تم کون ہو؟"

عمران نے کہا۔ "آپ کے... خادم سر۔"

"ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن تم دونوں باورچی تو ہرگز نہیں ہو۔"

"میں تو سمجھتا ہوں سر... ہم آپ جیسے بڑے آدمی کے باورچی بننے کے لائق بھی نہیں ہیں۔"

"بات کو گھماؤ پھراؤ مت... کیا تم بھی اسی چکر میں ہو جس میں دوسرے ہیں؟"

"میرا خیال ہے سر کہ آپ کا اشارہ مورتی والے باکس کی طرف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جناب! اگر ایسا ہوتا تو تابش اس رات آپ کے پیچھے بھاگ کر آپ کو روکتا نہ، جب آپ باکس چیک کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ ہم ان لالچیوں میں نہیں ہیں سر اور نہ ہی کسی حوالے سے آپ کا بُرا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر کون ہو تم؟"

عمران نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی ٹھوڑی کو کھجایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم جلالی صاحب کو بتاؤ تابش!''

''نہیں، تم ہی بتاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

عمران نے ایک لمبی سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''سر! کہا جاتا ہے کہ دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آپ ہم ناچیزوں کو دوست بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں آپ کا خادم کہلانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور آئندہ بھی لگتا رہے گا۔''

''تم میرے کس دشمن کی بات کر رہے ہو؟''

''انڈین گینگسٹر جاوا کی سر! ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر چھلانگ لگائی ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے اس حرامزادے کے ساتھ ٹکر لی ہوئی ہے۔''

جلالی کی سفید بھوؤں کے نیچے ان کی گدلی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید حیرت ابھری۔ مہناز بھی حیران تھی اور توجہ سے یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ ''اس حرامی سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا؟'' جلالی صاحب نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو یہ پھر کسی وقت آپ کو سنا دیں گے۔ فی الحال صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند ہفتے پہلے ہمیں آپ کے اسمِ گرامی کا پتا چلا تھا اور باقی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ باقی باتوں سے میرا مطلب یہی باکس والا چکر ہے جناب! ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جاوا اور اس کی پرانی رکھیل درِشہوار کسی وجہ سے بار بار فارم ہاؤس کے چکر لگا رہے ہیں اور آپ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بس ہماری رگِ عداوت پھڑک اٹھی۔ میں سیدھے سچے لفظوں میں یہی کہوں گا جناب! ہمیں اس بندے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ تین چار سال پہلے اس شخص نے ہمارا جینا حرام کیا تھا، اب ہم اس کا جینا حرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ عمران اس معاملے میں ریان ولیم کا نام لینا نہیں چاہتا اور اس نے جاوا کے حوالے سے جلالی کو سنانے کے لیے کوئی کہانی گھڑی ہوئی ہے۔ باتوں کے فن میں وہ یکتا تھا۔ اس نے فقط پانچ دس منٹ کے اندر جلالی صاحب کو بڑی حد تک شیشے میں اتار لیا۔ اس نے جلالی صاحب کو باور کرایا کہ ہم دونوں جاوے کی ٹکر کے لوگ ہیں اور اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، فی سبیل اللہ کر رہے ہیں۔ ہمیں جلالی صاحب کے باکس یا کسی اور چیز سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں نے بھی وقتاً فوقتاً اس گفتگو میں حصہ لیا۔

جلالی صاحب اپنی پتلون کی گیلوس درست کرتے ہوئے بولے۔ ''تم دونوں کی باتوں پر یقین کرنا کافی مشکل ہے لیکن جو ثبوت تم دے رہے ہو، انہیں جھٹلانا بھی آسان نہیں۔ یہاں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم جو کچھ جاوے کے ساتھیوں کے ساتھ کر آئے ہو، اس کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ اگر وہ وحشی ہو کر یہاں چڑھ دوڑے تو تم کیا کرو گے؟''

عمران نے جلالی صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ اپنے اس خادم کا پچھلا ریکارڈ دیکھ لیں۔ پچھلے دو چار ہفتوں میں، میں نے جو کچھ کہا ہے، اللہ کے کرم سے درست نکلا ہے۔ اب یہ بات بھی درست نکلے گی کہ جاوا اور سلطان وغیرہ کوئی فوری ردِعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ انہوں نے ہمارے بازو آزمائے ہوئے ہیں اور ہم نے بھی ان کے حوصلے دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے جناب تو جاوے کے ''خصوصی چمچے سلطان'' کے علاوہ پانچ چھ مزید بندے بھی پھڑکا سکتے تھے لیکن ہم نے انہیں اتنی ہی سزا دی ہے جو بہت ضروری تھی۔ اس بات کو سلطان اور جاوا بھی ضرور سمجھیں گے۔''

جلالی نے عمران کو گھورا۔ ''تم کیا چیز ہو؟ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں نے جب اخبار میں باورچی کے لیے اشتہار دیا تھا، مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس اشتہار کے نتیجے میں تم جیسا شخص میرے گھر میں گھس آئے گا۔ تم باورچی بھی ہو۔ جانوروں کے ٹرینر اور ڈاکٹر بھی ہو۔ میراثی بھی ہو اور گینگسٹر بھی... اور ابھی نہ جانے تمہارے کون کون سے روپ سامنے آنے ہیں۔''

عمران نے کمال بے تکلفی سے جلالی صاحب کے استخوانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''سر! ہمارا جو روپ بھی ہوگا، وہ آپ کی بھلائی کے لیے ہوگا۔ آپ یقین کریں۔ خاص طور سے جاوا اور اس کے گینگ کے خلاف آپ جو بھی حکم کریں گے، ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہمارے اندر ان لوگوں کے لیے آگ ہے۔ ہم ان کے دانت انشاء اللہ اس طرح کھٹے کریں گے کہ ان کے پاس... دانت نکلوانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔''

جلالی صاحب کا پارا چڑھتے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا تھا۔ عمران نے جس طرح ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک بھی سکتے تھے لیکن مجھے اور مہناز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جلالی صاحب خاموش رہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا تھا کہ جس

کو چھوتا ہے، اسے موم کر دیتا ہے۔ اگر نہ کر سکا تو اس لڑکی کو نہ کر سکا جو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ جلالی صاحب نے اپنا دوسرا ہاتھ عمران کے ہاتھ پر رکھا اور قدرے کمزور لہجے میں بولے۔ ''میں جانتا ہوں، تم بہت سی غلط بیانیاں کر رہے ہو مگر اوور آل تم بُرے نہیں ہو... کیونکہ جو بُرائی کو ختم کرتا ہے، وہ عموماً خود بُرا نہیں ہوتا۔ اس لمبے شیطان کو مار کر تم نے ایک بڑی بُرائی کو ختم کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ان حرام خور پولیس والوں کے کرنے کا تھا، وہ تم نے کیا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں اپنا کلیجا ٹھنڈا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں اپنے ملازموں اور ساتھیوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کر سکتا ہوں۔''

پھر جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہوئے۔ ''وہ کہاں ہے رخشی... اور دوسری زرینہ...؟''

مہناز نے کہا۔ ''سر! رخشی تو ابھی اسپتال میں ہے۔ تین چار دن تک ہی آسکے گی۔ زرینہ یہیں ہے اپنے کمرے میں۔ اس کا بچہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اسے کافی زیادہ مقدار میں کف سیرپ پلایا گیا تھا۔ ابھی تک اس کا پیٹ خراب ہے۔''

جلالی صاحب نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ ریکارڈنگ ان دونوں لڑکیوں کو ضرور دکھانی ہے۔ کم از کم اس کے وہ حصے جن میں تم دونوں کی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ اس سے ان بے چاریوں کے زخموں پر تھوڑا بہت مرہم رکھا جائے گا۔''

ہم ابھی تک کھڑے تھے، جلالی صاحب کو اس کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ ہم بیٹھ گئے۔ انہوں نے ملازم کو بلایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ملازم پریشانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ جلالی صاحب بھول رہے تھے کہ وہ جن کے لیے چائے منگوا رہے ہیں، انہوں نے ہی تو چائے بنانی ہے۔

جلالی صاحب کے روکتے روکتے عمران اٹھا اور ملازم کے ساتھ کچن میں آ گیا۔ چائے وغیرہ تیار کر کے اس نے ٹرالی میں رکھی اور اسے خود ہی دھکیلتا ہوا لے آیا۔ ایسے کاموں کے لیے اس میں بے پناہ انکساری موجود تھی۔

اس دوران میں جلالی صاحب نے سیکیورٹی گارڈز کے انچارج اور دو سیکنڈ انچارج کو فون کیے اور انہیں کوٹھی کی سیکیورٹی ہائی الرٹ کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے انچارج سے یہ بھی کہا کہ اے گریڈ کے کم از کم دس گارڈز کا مزید انتظام کیا جائے۔

چائے کے دوران میں جلالی صاحب نے ہمارے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے لیے ہم دونوں پہلے سے تیار تھے۔ دو تین سوالات کا جواب دینے سے عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ احتراز کیا۔ جلالی صاحب زبردست موڈ میں تھے۔ انہوں نے اس معذرت کو قبول کیا۔

عمران نے کھنکھار کر گلا صاف کیا لیکن پھر خود بولنے کے بجائے ڈاکٹر مہناز کو بولنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو دیکھا۔ وہ اپنے ٹیڈی کتے کو پچکارنے میں مصروف تھے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''سر! چند دن پہلے ایک اور اہم واقعہ ہوا تھا... ہم نے آپ کو اس کے بارے میں صرف اس لیے نہیں بتایا کہ آپ کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں تھی۔''

جلالی صاحب چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تم لوگوں نے جو جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ آج بتا ہی دو تا کہ یہ ٹینشن ختم ہو۔''

مہناز نے کہا۔ ''سر! میں آپ کو مختار ملک کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ وہ... وہ سیڑھیوں سے گر کر نہیں مرا تھا۔''

''تو پھر؟''

مہناز نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران اپنی جادو اثر آواز میں بولا۔ ''سر! مختار ملک دراصل جادے کا مخبر تھا۔ وہ چھپ کر تابش اور ڈاکٹر مہناز کی باتیں سن رہا تھا۔ تابش کو پتا چل گیا۔ اس خبیث نے ایک چھرے سے تابش پر قاتلانہ حملہ کیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور اس کی جان چلی گئی۔''

عمران نے اس واقعے کی دیگر تفصیل بھی جلالی صاحب کے گوش گزار کی۔ آخر میں جلالی صاحب بولے۔

''بہت خوب بھئی، بہت خوب۔ تم لوگ میرے ہی گھر میں رہ کر مجھ سے رازداریاں برت رہے ہو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے حکومت کے اندر حکومت قائم کر لی جائے۔''

''معافی چاہتے ہیں جناب۔'' عمران لجاجت سے بولا۔ ''ہمیں پتا تھا، آپ بڑے دل کے مالک ہیں۔ اس گستاخی کو درگزر کریں گے۔ ڈاکٹر مہناز تو ہر صورت آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھیں مگر ہماری پُرزور درخواست پر انہوں نے چند دن چپ رہنے کی ہامی بھری۔''

''کچھ اور بتانا ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔'' جلالی کا لہجہ نارمل ہی تھا۔

عمران مسکرایا۔ ''بس ایک چھوٹی سی بات اور تھی۔ تابش کو کنگ وغیرہ بالکل نہیں جانتا۔ اس حوالے سے ہماری درخواست پر ڈاکٹر مہناز، تابش کی مدد کرتی رہی ہیں۔''

جلالی نے چشمے کے پیچھے سے مہناز کو گھورا اور بولے۔ ''اس بات کا تو مجھے بھی شک تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ جو ہر وقت کچن میں گھسی رہتی ہے، اس میں کوئی چکر ہے۔''

جلالی صاحب کا اچھا موڈ دیکھتے ہوئے عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔ ''سر! ایک التجا ہے۔ یہاں ایک دو بندے ایسے ضرور موجود ہیں جو ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ فی الحال ہماری باورچیوں والی حیثیت برقرار رکھیے۔ اس حیثیت سے ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اور زیادہ کارآمد بھی ثابت ہوں گے۔''

جلالی بولے۔ ''تمہاری اس آخری بات میں وزن ہے۔ تم لوگ مار دھاڑ کے ماہر لگتے ہو۔ اور مار دھاڑ کا ماحول یہاں کسی بھی وقت بن سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عمران کی ضرورت ZOO میں ہے۔ بہرحال، مجھے اس بارے میں سوچنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل صبح تک اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گا۔''

مختار ملک والے واقعے کے بارے میں انہوں نے ہم تینوں سے مزید پوچھ گچھ کی اور اس واقعے پر حیرت آمیز غصے کا اظہار کرتے رہے۔ بہرحال، اس غصے میں ایک طرح کی ستائش بھی چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان کا موڈ بتدریج بہتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عام حالات میں بھی انہیں تھانے کچہری کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے، جب بندہ اکثر اندیشوں اور خطروں کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے، جلالی صاحب کا ہاتھ... ڈاکٹر مہناز کے کندھے پر تھا۔ وہ جیسے بے دھیانی میں گاہے بگاہے اس کے گداز کندھے کو مسلنے لگتے یا اس کے بالوں کو سہلانے لگتے۔ جلالی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے لیے ابھی تک پُراسرار تھا۔ ان کے اندر جیسے کوئی خلا سا تھا، کوئی طلب، کوئی بھوک سی۔ وہ حسن پرست بھی تھے۔ اپنے اردگرد خوب صورت ملازماؤں کو جگہ دیتے تھے اور رخشی جیسی کچھ لڑکیاں ان کے بہت قریب بھی رہی تھیں۔ اس سب کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں گناہ یا ہوس کاری کا عمل دخل نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس دور میں تھے جہاں انسان کی کیمسٹری بہت حد تک بدل جاتی ہے۔

اس روز جلالی صاحب کافی حد تک مطمئن بلکہ خوش نظر آئے۔ انہوں نے اپنے ZOO میں جا کر تادیر عمران سے بھی ملاقات کی۔ بلّی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ناتوانی کے باوجود اپنے ٹیڈی کتے کے ساتھ شام کے وقت باغیچے کی روش پر چہل قدمی کرتے رہے۔ مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ عام لوگوں کے سامنے وہ مہناز کے ساتھ کسی خصوصی لگاؤ کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر میں جان چکا تھا کہ یہ لگاؤ موجود ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا اور اس نے مجھے چونکایا۔ یہاں کے دستور کے مطابق ٹھیک نو بجے ڈنر کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد پہرے داروں کا گشت شروع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، ڈاکٹر مہناز معمول کے مطابق جلالی صاحب کو دوا وغیرہ کھلا کر ان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور گورے چٹے بازو دودھیا بلب کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اسٹیتھو اسکوپ اس کے گلے میں تھا۔ کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے وہ ذرا رکی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ جیب سے ایک رومال نکالا اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دودھیا بلب دیوار پر قریباً سات فٹ کی بلندی پر لگا ہوا تھا۔ اس نے گرم بلب کو رومال کے ذریعے ہولڈر میں سے نکالا۔ کوریڈور میں تاریکی چھا گئی۔ مہناز کا ہیولا آگے بڑھ گیا۔

میں حیران ہوا۔ دو تین دن پہلے بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوریڈور کا بلب نہیں ہے۔ تو کیا وہ بلب بھی ڈاکٹر مہناز نے اتارا تھا؟ خیر، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بلب چوری کرتی ہوگی۔ یہ یقیناً کوئی اور چکر تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ شاید رات کسی وقت اسی کوریڈور سے گزر کر مہناز کو پھر سے جلالی صاحب کے کمرے میں جانا ہو اور وہ اس آمد و رفت کو دوسروں سے چھپانا چاہتی ہو۔

ایک بار یہ بات میرے ذہن میں آ گئی تو پھر تجسس بڑھتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی نیم تاریک بالکونی میں آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا اور امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے دیکھ نہیں سکے گی۔ دس بجے کے قریب ایک ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ مہناز نے دروازہ کھولا، اب وہ براؤن پھولوں والی ایک گلابی نائٹی میں نظر آ رہی تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ ملازمہ نے رات کی رانی اور نرگس کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا دستہ مہناز کو تھما دیا۔ اس نے پھولوں کو سونگھا اور شکریہ ادا کر

کے دروازہ بند کرلیا۔

میں بالکونی کی تاریکی میں سمٹا بیٹھا رہا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتوں کا شور تھا۔ دور فاصلے پر پیٹرولنگ گاڑی کی نیلی روشنی بھی حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ ZOO کی طرف سے کسی بندر کی طویل آواز ابھرتی اور سناٹے کو چیر جاتی۔ میرے اردگرد مچھر منڈلا رہے تھے۔ میں بے سکونی محسوس کررہا تھا، اس کے باوجود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ رات کا ایک بج گیا تو مجھے مایوسی ہونے لگی۔ شاید میرا اندازہ غلط تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے کمرے کی لائٹ آف ہوگئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں نے ڈاکٹر مہناز کا ہیولا دیکھا۔ وہ کہیں جارہی تھی۔

میں نے بھی بالکونی چھوڑی اور کمرے میں آگیا۔ اب میں نے آنکھیں کھڑکی کی اس درز سے لگا دیں جہاں سے نو بجے کے قریب میں نے مہناز کو گزرتے دیکھا تھا... کوریڈور تاریک تھا۔ بہت کوشش کرکے میں اس کا بس مدھم سا ہیولا ہی دیکھ پایا... وہ جلالی صاحب کے کمرے کی طرف جارہی تھی۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا شک درست نکلا تھا۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹا وہیں انتظار کیا۔ مہناز کی واپسی نہیں ہوئی۔ میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ چڑیا گھر والے پورشن کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہی سوتا تھا۔ شاید وہ سویا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش میں اس نے کال اٹینڈ کی۔ ''کیا کھایا تھا تم نے جو آدھی رات کو مروڑ اٹھ رہا ہے؟'' اس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بکواس نہ کرو۔ ایک اہم اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟ ریما جی نے نرگس کو شوٹ کردیا؟'' وہ بھی سرگوشی میں بولا۔

''وہ دونوں مل کر تمہیں شوٹ کریں گی۔ اس وقت یہاں ایک اور چکر چل رہا ہے...''

میں نے عمران کو ساری تفصیل سے آگاہ کردیا۔ وہ سنجیدہ ہوگیا، کہنے لگا۔ ''تمہاری سراغ رسانی تو اچھی جارہی ہے۔ کیا کچھ اور پتا چل سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کمرے کے اندر کے حالات۔ کسی بہانے تم بزرگوار کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے ہو یا کوئی اور طریقہ...''

''بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔'' میں نے موبائل آف کیا اور ایک بار پھر کوریڈور کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں تاریکی اور سکوت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے کمرے میں وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔

میں نے سلیپر پہنے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ تاریک کوریڈور میں سے گزر کر جلالی صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے پتا چلتا تھا کہ اندر بہت ہلکی روشنی والا نیلگوں بلب آن ہے۔ گراموفون یا کیسٹ پلیئر پر سہگل کا کوئی بہت پرانا گیت دھیمی آواز میں پلے ہورہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس بیڈروم کا ایک چھوٹا دروازہ عقبی برآمدے کی طرف بھی ہے۔ اس دروازے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اگر جلالی صاحب کو کسی وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہو تو انہیں یہیں سے نکال کر فوراً گاڑی میں پہنچایا جاسکے۔

میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ کسی کمرے سے بابے طفیل کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ عقبی صحن میں کوئی آوارہ بلی کسی ساتھی کو آواز دے رہی تھی۔ میں برآمدے میں پہنچا، یہاں تاریکی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اردگرد دیکھا پھر دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے کمرے کا ایک چوتھائی حصہ نظر آنے لگا۔ اس ایک چوتھائی حصے میں قالین اور ایک سینٹر ٹیبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے ٹیبل پر وہی گلدستہ پڑا نظر آیا جو کچھ دیر پہلے ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ پھر ایک اور چیز نظر آئی اور اس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ بے شک میں کمرے میں اور کچھ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس ایک ''چیز'' کی دید نے کمرے کا ایک غائبانہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور یہ نقشہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

سینٹر ٹیبل کے ساتھ ہی نیچے قالین پر براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی پڑی تھی۔ بابے طفیل کی کھانسی کی آواز پھر ابھری۔ ساتھ ہی اس کی بیوی کی مدھم آواز سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا طفیل اٹھ کر پانی وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرا یہاں رکنا اب مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹا اور جس طرح یہاں آیا تھا، اسی طرح دبے پاؤں واپس چلا گیا۔

کمرے میں آکر میں بستر پر نیم دراز ہوا اور اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی آنکھوں کے سامنے کھلتی چلی گئی جس طرح کسی درخت کا ایک

پتا دیکھنے کے بعد سارے درخت کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، صرف اس ایک نائٹی کے منظر نے پورے کمرے کا ماحول آشکار کردیا تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مہناز اپنے انوکھے مریض کے ساتھ موجود تھی اور عجیب انداز سے موجود تھی۔

کیا ڈاکٹر مہناز اس حد تک جاسکتی ہے اور اگر جاسکتی ہے... اور چلی گئی ہے تو کیوں؟ وہ ہر لحاظ سے ایک معقول لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور دانش مند بھی تھی۔ اس کے کردار کی کوئی اور کمزوری ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کررہی تھی؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ہر لحاظ سے غلط ہے؟ اس کے لیے کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کتنی بھی رعایت برتی جائے، بطور ڈاکٹر اور معالج بھی مہناز کو اس طرح کی کوئی ''گنجائش'' نہیں دی جاسکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ گنجائش پیدا کی ہوئی تھی۔

مہناز کی واپسی رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی، اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں نے فون پر عمران کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی میری ہی طرح جاگ رہا تھا۔ صبح میں نے دیکھا تو کوریڈور میں بلب پھر سے موجود تھا۔

پچھلی رات کا بیشتر حصہ تناؤ اور سنسنی کی کیفیت میں ہی گزرا تھا۔ ایک تو یہ ڈاکٹر مہناز والی سنسنی تھی، دوسری اس کارروائی والی جو ہم پیر کی رات کو لاہور میں انجام دے کر آئے تھے۔ عمران نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاوا کے قریبی ساتھی نادرے کو اس کے ایک ہمنوا سمیت ان کے ڈیرے میں گھس کر ہلاک کیا تھا اور باقاعدہ اس کی ویڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ کچھ بھی تھا، میرے ذہن میں یہ شدید اندیشہ موجود تھا کہ جاوا کی طرف سے کوئی نہایت سخت ردِعمل ظاہر ہوگا لیکن عمران مطمئن تھا۔ کل رات بھی جب میں نے اسے مہناز کے بارے میں بتانے کے لیے موبائل پر کال کی تو وہ اطمینان سے سو رہا تھا۔ کوٹھی اور فارم میں سیکیورٹی ہائی الرٹ تھی۔ کوئی شخص بھی مکمل شناخت اور دو تین جگہ تلاشی دینے کے بعد ہی فارم کی حدود میں داخل ہوسکتا تھا۔

دوپہر گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے دیکھا، ڈاکٹر مہناز سبز رنگ کا سلکی سوٹ پہنے، خوش رنگ ربن میں بال باندھے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے، اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف جارہی تھی۔ جلالی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میری اور مہناز کی نگاہیں ملیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم دونوں نے سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو سلام کیا پھر وہ شڑاپ سے چھوٹے ڈرائنگ روم میں اوجھل ہوگئی۔

میں کچن کے اسٹول پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ انسان بھی کیا الجھی ہوئی پیچ در پیچ شے ہے۔ اب اس دھلے دھلائے چہرے والی ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کل شب ایک اور ساڑھے تین بجے کے درمیان وہ کہاں تھی؟

جلالی صاحب پر یہ بات اب عیاں ہوچکی تھی کہ ہم دونوں باورچی نہیں ہیں بلکہ میں تو کوکنگ کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوں اور اب تک ڈاکٹر مہناز میری مدد کرتی رہی ہے۔ اب جلالی صاحب نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کو میری مدد کے لیے کچن کی ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ کل سے کچن کا بیشتر کام وہی کررہی تھی۔ میں نے کندھوں میں اور دونوں کہنیوں میں شدید درد کا بہانہ کیا ہوا تھا اور ڈاکٹر مہناز کی ہدایت کے مطابق مکمل آرام ہی کررہا تھا۔ اس وقت بھی رضیہ دو عدد دیسی چوزوں کا گوشت بھوننے میں مصروف تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مائکروفون آن کرکے جلالی اور مہناز کی گفتگو سننے کی کوشش کروں۔ جونہی گوشت بھونا گیا اور رضیہ نے اس میں پانی ڈالا، میں نے اس سے کہا کہ وہ مٹن کا پیازا بنانے کے لیے برآمدے میں بیٹھ کر پیاز وغیرہ کاٹ لے۔ میں مرغی کا سالن دیکھ لوں گا... وہ باہر چلی گئی تو میں نے کچن کیبنٹ کھول کر ڈیکوریشن پیس میں چھپائے ہوئے ریسیور کو آن کیا اور آواز کو مطلوبہ حد تک کھول لیا۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں، پھر مائکروفون کے بالکل قریب سے مہناز کی نکھری ہوئی واضح آواز سنائی دی۔ ''سر! میں دعوے سے کہتی ہوں آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے اور میرے ساتھ...''

''کیا، میرے ساتھ؟'' جلالی نے پوچھا۔

''میرے ساتھ ہنی مون پر کاغان اور ناران چلیں گے۔''

''تم ایک بے وقوف... احمق لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ایک ایسے شخص کو زندہ کرنے کا دعویٰ کررہی ہو جو مدت ہوئی مرچکا ہے۔''

''محبت مردہ جسموں میں زندگی دوڑاتی ہے سر... ناممکن کو ممکن کرتی ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ جو درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہزار سال تک ریت میں دبا رہے، اس پر ہرے بھرے پتے کون لگا سکتا ہے؟''

"جناب! آپ درخت نہیں ہیں اور نہ ہزار سال سے ریت میں دبے ہوئے ہیں..."

جلالی صاحب نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس انوکھی شادی کے ذریعے اپنا نام گنیز بک آف ریکارڈز میں درج کرانا چاہتی ہو تو تمہیں زبردست ناکامی ہونے والی ہے۔"

"محبت کسی شہرت کی محتاج نہیں ہوتی سر! یہ تو اپنے آپ میں ایک اعزاز ہوتی ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر جلالی صاحب کی بوڑھی آواز سنائی دی۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنی ماں کو اس نکاح کے بارے میں بتا ہی دو تو اچھا ہے۔"

وہ الھڑ انداز میں بولی۔ "سر! آپ کیوں اتنی جلدی رنڈوا ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ میرا سر توڑ دیں گی... لیکن مجھے اپنے سر کی اتنی پروا نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ وہ آپ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔ میں سچ کہتی ہوں سر! آپ کی ذرا سی... بالکل ذرا سی توہین بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم ایک بے وقوف ضدی لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔"

"کیا ایک ڈاکٹر بھی نہیں ہوں؟"

خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد جلالی صاحب کی آواز ابھری۔ "نہیں... وہ تو ہو۔"

"تو پھر جناب! چپ چاپ بیٹھ جائیے۔ میں نے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے اور بی پی چیک کرنا ہے۔"

مائکروفون کے ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ میں ششدر تھا۔ اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، اس سے انکشاف ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز نے خفیہ طور پر جلالی صاحب سے نکاح پڑھوالیا ہے اور یہ تعجب خیز واقعہ شاید پچھلے دو چار دن کے اندر ہی ہوا ہے۔ میں سناٹے میں تھا اور یہ سنسنی خیز خبر جلد از جلد عمران کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ریسیور سے پھر مدھم آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے ڈاکٹر مہناز نے قدرے فاصلے سے کچھ کہا جو واضح سنائی نہیں دیا... پھر جلالی کی بالکل صاف آواز ابھری۔ "ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے مہناز؟"

مہناز نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "سر! جو کچھ انہوں نے کیا ہے، وہ تو واقعی حیران کن ہے۔ اگر ویڈیو ثبوت نہ ہوتا تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ نادر کے جسم پر وہ کھرونچے والی بات بھی انہوں نے بالکل درست بتائی ہے۔ میں نے خود رخشی کے ناخنوں میں خون اور گوشت کی آلائش دیکھی تھی..."

"اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر معمولی نہیں ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کی طرف سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ہیں اور ہر وقت ہمارے قریب موجود ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد مہناز نے کہا۔ "سر پتا نہیں کیوں، اس بارے میں میری رائے بری نہیں ہے۔ اگر میری رائے بری ہوتی تو میں اسی روز آپ کو سب کچھ بتا دیتی جب مختار ملک کی موت والا واقعہ ہوا تھا۔ میرا دل کہتا ہے سر کہ یہ لوگ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"تو کیا پھر ان کی یہ بات درست سمجھی جائے کہ یہ جاوے کے گروپ سے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے یہاں موجود ہیں؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے۔" مہناز نے کہا۔

"لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہی مطلب ہوا نا کہ یہ بھی گینگسٹر ہی ہیں۔ پھر ان کی اس بات پر کیسے اعتبار کیا جائے کہ انہیں یہاں کے دیگر حالات سے کوئی دلچسپی نہیں... جن میں مورتی والے باکس کا معاملہ بھی ہے۔"

"ہاں، اس بات پر پوری طرح یقین کرنا تو مشکل ہے سر۔"

"میں نے آج بھی عمران سے دیر تک بات کی ہے۔ اس بندے میں بہت سے "گٹس" ہیں۔ اگر اس کے بارے میں بلکہ ان دونوں کے بارے میں "چھپے رستم" والی بات کہی جائے تو شاید غلط نہ ہو..."

اچانک رضیہ کے بھاری اور تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مجھے مائکروفون کا ریسیور آف کرنا پڑا۔ وہ ایک بڑی ٹرے میں پیاز اور ٹماٹر وغیرہ کاٹ کر لے آئی تھی۔ پیاز کی وجہ سے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔ مجھے عمران کی بات یاد آ گئی۔ اس نے شروع میں کہا تھا کہ میں تو یہاں پیاز کاٹ کاٹ کر بیٹا کماری بن گیا ہوں۔ یہاں پیاز واقعی بہت استعمال ہوتی تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے عمران کو وہ دھماکا خیز خبر سنائی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ تک پہنچی تھی۔ عمران اور میں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر ڈاکٹر مہناز نے واقعی ایک انوکھا کام کیا تھا۔ ایک ایسی باغیانہ روش جو رسموں،

روایتوں اور معاشرتی بندھنوں کو چیرتی ہوئی گزرتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ایک حادثے کا ردِعمل تھا۔ اس کی جڑیں اس المیے میں تھیں جو منگنی ٹوٹنے کی صورت میں مہناز کے ساتھ ہوا تھا۔ ڈاکٹر لائبہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت خوبرو لیکن گھمنڈی نوجوان تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ تن سازی کا شوق بھی رکھتا تھا۔ پنجاب کی سطح پر اس نے کافی نام کمایا تھا۔ پھر وہ کراچی کے ایک مال دار میمن کی بیٹی سے شادی کر کے کینیڈا چلا گیا...

شام تک کا وقت بخیریت گزر گیا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس کی سیکیورٹی بدستور ہائی الرٹ تھی۔ جاوا گروپ کی طرف سے فوری ردعمل کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اندیشے بدستور موجود تھے۔ ان میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ شاید کسی طرح پولیس میں دہرے قتل کی رپورٹ کر دی جائے گی اور متعلقہ پولیس نادرے کے "قاتلوں" کو پکڑنے کے لیے یہاں فارم ہاؤس میں آ دھمکے گی۔ بہرحال، ان اندیشوں میں سے کسی نے ابھی تک حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا اور عمران کا سکون و اطمینان دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھاریں گے بھی نہیں۔ عمران نے ایک بات کی تاکید مجھے ضرور کی تھی اور وہ یہ کہ میں ابھی فارم ہاؤس کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں محتاط تھا۔ شام کے فوراً بعد جلالی صاحب سے بڑے اچھے ماحول میں طویل گفتگو ہوئی۔ عمران کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر مہناز کے سوا کوٹھی میں موجود کسی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اب ہماری حیثیت "باورچی" کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جلالی صاحب نے یہ میٹنگ ایک بند کمرے میں رکھی تھی اور کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سیکریٹری ندیم ویسے ہی فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ وہ بلی کے نومولود بچوں کے لیے کچھ ادویات اور ویکسین وغیرہ لینے کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بھی اس کے ساتھ تھا۔

آج ہم جلالی صاحب کے برابر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ جلالی صاحب کا موڈ اچھا تھا اور ان کا رویّہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ تھا۔ انہوں نے عمران سے کہا۔ "جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ تم دونوں کی نظر میں کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے باکس کے حوالے سے؟"

عمران نے کہا۔ "آپ کا رویّہ سو فیصد قابلِ تعریف ہے اور جناب! یہی وجہ ہے شاید کہ ہم ناچیز بھی اپنی ہمت کے مطابق آپ کی مدد کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اس سارے کام میں آپ کا اپنا کوئی لالچ نہیں۔ آپ نے اس بات پر اسٹینڈ لیا ہے کہ وہ باکس آپ کے پاس کسی نامعلوم بندے کی امانت ہے اور جب وہ بندہ آپ سے رابطہ کرے گا تو آپ اسے لوٹا دیں گے۔"

مہناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "لیکن سر! اس امانت کی حفاظت کے لیے آپ کو جو مشکلات اٹھانا پڑ رہی ہیں، وہ آپ کی صحت پر بہت بھاری ہیں۔ آپ... اپنی ہمت سے زیادہ... مزاحمت کر رہے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے میری ہمت کو... کیا میں چلتے چلتے گر پڑا ہوں؟ کیا میں نے بستر پر پیشاب کر دیا ہے؟ تم بھی ان لوگوں جیسی باتیں کرتی ہو جو سمجھتے ہیں کہ میری ٹانگیں قبر میں جھول رہی ہیں۔"

"نہیں سر... خدانخواستہ ایسی بات نہیں لیکن آپ بیمار تو ہیں نا۔" مہناز نے جلدی سے کہا۔

لیکن جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ چکے تھے۔ گرج کر بولے۔ "بیمار... بیمار... بیمار! میں عاجز آ چکا ہوں اس لفظ سے۔ تمہاری صورتیں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ تم کفن اور صابن تولیا لے کر میرے سرہانے بیٹھے ہو۔ میری سانسیں گن رہے ہو۔ میں زندہ ہوں... ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اپنے سارے فیصلے خود کروں گا۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے کسی سے مشورہ کرنا ہے..."

"سر! میں تو کہہ رہی تھی کہ..."

"میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تم لوگ میرے منہ پر کچھ اور کہتے ہو، میرے پیٹھ پیچھے کچھ اور... مجھے ناکارہ اور سنکی سمجھتے ہو۔ منافق ہو تم لوگ، جھوٹے ہو۔ مجھے ایسے لوگوں کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ... اٹھ جاؤ..."

مہناز کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میرے اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران جلدی سے بولا۔ "سر! ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں لیکن بلیوں کے بارے میں جو ضروری بات میں نے آپ سے کرنی تھی... وہ تو یہیں رہ جائے گی۔"

جلالی صاحب کی دکھتی رگ پر ہاتھ آیا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اب طیش کے ساتھ ساتھ الجھن اور تجسس بھی نظر آیا۔ وہ خاموش رہے۔

عمران نے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت نہیں تو میں صبح آ جاؤں گا۔"

جلالی صاحب نے عجیب تاثرات کے ساتھ عمران کو

دیکھا، جیسے نہ چاہنے کے باوجود کوئی کڑوی دوا پی رہے ہوں۔ ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سر! ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوگیا ہے کہ یہ چاروں بلونگڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک بلونگڑا ہے۔ میں پوری تفتیش کرکے آیا ہوں۔ اگر تھوڑا بہت شک ہے بھی تو صبح تک دور ہو جائے گا۔ یہ دیکھیں جی... یہ ڈیجیٹل کیمرے سے میں نے بلونگڑے کے پچھلے پورشن کی تصویریں بھی لی ہیں۔“ اس نے جیب سے کیمرا نکالا اور اسے آن کرکے ڈس پلے اسکرین (مانیٹر) پر جلالی صاحب کو تصویریں دکھانے لگا۔ ”یہ دیکھیں سر! اس تصویر کو زوم کریں... کچھ اور زوم کریں... یہ دیکھیں نر کی نشانی۔ کافی بڑی ہے لیکن سیاہ دھبے کی وجہ سے پتا ہی نہیں چل رہا تھا...“

”ہاں... یہاں سیاہ دھبا تھا نا۔“ جلالی صاحب نے اپنی مڑی ہوئی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ بعد یہ کیفیت تھی کہ جلالی صاحب اور عمران کندھے سے کندھا بھڑائے بیٹھے تھے۔ تصویریں دیکھ رہے تھے اور مہناز کی موجودگی میں ہی بلونگڑوں کی زنانہ مردانہ صفات پر سیر حاصل بحث کررہے تھے۔ جلالی صاحب کے ماتھے کے بل بتدریج کم ہو رہے تھے... عمران کی جادو بیانی کام کررہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عمران نے ایک دم پلٹا مارا اور بولا۔ ”سر! مجھے یقین ہے ایسی خوب صورت آنکھوں والی بلیاں تو ایران میں بھی اب شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہوں گی۔ آپ ان کی ملکیت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی جب یہ باکس والی پریشانی دور ہو جائے گی تو آپ صحیح طور پر ان بلونگڑوں اور ان کی ماں کی محبت سے لطف اندوز ہوسکیں گے...“

باکس کے ذکر پر جلالی صاحب نے کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور پھر سے گہری سنجیدگی نے ان کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ شاید چار پانچ منٹ پہلے کی ساری باتیں انہیں یاد آگئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان کا غصہ پھر حرارت اور رفتار پکڑتا، میں نے ہمت کرکے کہا۔

”سر! میں باکس کے حوالے سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔“

”کیا ہے؟“ انہوں نے ماتھے کی تیوریاں برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”سر! ہم جانتے ہیں کہ باکس کے حوالے سے آپ کے بہت سے اندیشے ہیں اور یہ بالکل بجا اندیشے ہیں۔ مثلاً انتظامیہ کی بات ہی لیں۔ پولیس کا حال ہی دیکھیں۔ ان پر کسی طرح کا اعتبار بھلا کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان پر اعتبار کیا جاسکتا تو میرا خیال ہے کہ آپ کب کے اس باکس والی ذمے داری سے فارغ ہو چکے ہوتے لیکن اس کا کوئی درمیانی حل تو نکالا جاسکتا ہے۔“

جلالی صاحب کے تاثرات نارمل ہی رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ خراب ماحول کے باوجود میری ایک آدھ بات ضرور ان کے دل کو لگی ہے۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے ”ویل ڈن“ کا اشارہ کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب! میں صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کچھ معزز لوگوں یا پھر میڈیا والوں کے سامنے یہ باکس کسی اہم حکومتی عہدے دار کے حوالے کردیا جائے اور یہ تب تک وہاں رہے جب تک اس کا اصل مالک سامنے نہیں آجاتا؟“

جلالی صاحب نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”اہم عہدے دار کون ہوگا؟ کوئی وزیر، مشیر یا پھر کوئی بڑا پولیس افسر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ اعتبار کے قابل ہیں؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ گرم توے پر اپنی پیٹھ رگڑیں تو بھی ان کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور میڈیا میں بھی ابھی اتنی ذمے داری کہاں پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ شکاری جانوروں کی طرح ایک خبر کے پیچھے بھاگتے ہیں، اس کو دبوچتے ہیں، اس کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ابھی وہ ”خبر“ تڑپ پھڑک ہی رہی ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اور خبر نظر آجاتی ہے۔ وہ پہلی کو چھوڑ کر اس کے پیچھے لپک جاتے ہیں اور پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔“

”یہ بات تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ عمران نے فرمائشی انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلایا۔

میں نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔ ”آپ یقیناً اس معاملے کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں سر! اور یقیناً اس سلسلے میں آپ نے کوئی مناسب پلاننگ بھی کررکھی ہوگی۔“

”پلاننگ کوئی نہیں ہے... کوئی پلاننگ نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، بس اس پر قائم ہوں۔ وہ باکس میرے پاس امانت کے طور پر موجود ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا اصل مالک مجھ سے رابطہ نہیں کرتا۔ اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے جان بھی دینا پڑے تو میں دے دوں گا۔“ جلالی کا لہجہ اٹل تھا۔

اب یہ بات ان سے کون کہتا کہ حضرت! اگر آپ نے واقعی جان دے دی اور داعی اجل کو لبیک کہہ ڈالا تو مورتی

والے باکس کو کیسے ڈھونڈا جائے گا؟ وہ تو آپ کے ساتھ ہی لحد میں اتر جائے گا۔

میں اور عمران کچھ دیر تک اشاروں کنایوں میں یہ بات جلالی صاحب کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہیں کسی طرح کا کوئی لالچ ہی نہیں ہے تو پھر وہ کسی طرح اس باکس والی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔ لیکن ڈاکٹر مہناز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ”وہ اپنے مؤقف پر فولاد کی طرح سخت رہتے ہیں۔ کسی بھی طرح کے دلائل سے ان کے مؤقف میں لچک پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر کبھی یہ لچک پیدا ہونی ہو تو پھر ان کے اندر سے ہی ہوتی ہے۔“

اس ملاقات میں کچھ اور امور ضرور طے ہوگئے۔ جلالی صاحب نے اتفاق کیا کہ یہاں کوٹھی میں ہماری موجودہ حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ یعنی ہم یہاں باورچیوں کی حیثیت سے ہی موجود رہیں۔ ضرورت پڑنے پر رضیہ کے علاوہ عمران بھی کچن میں خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں موجود کالی بھیڑوں کا سراغ لگایا جائے اور یہ کام جلد سے جلد ہو۔ سیکریٹری ندیم کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے اور اسے ہدایت کی جائے کہ وہ ہم دونوں کو بھی سیکیورٹی کے انتظامات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھے۔ جس وقت یہ گفتگو ہورہی تھی، میں نے سانولی رنگت والے فتح محمد کی آواز سنی۔ وہ کسی ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اردگرد موجود ہے حالانکہ جلالی صاحب نے کسی کو بھی اس طرف آنے سے منع کیا تھا۔ یہ فتح محمد اس کوٹھی اور فارم ہاؤس میں یقیناً ایک مشکوک شخص تھا۔ میں اور عمران جلد از جلد اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو میں نے پھر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈاکٹر مہناز اپنی والدہ سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ عمران نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا تھا اور اب وہ ڈاکٹر عدیل کا ہاتھ بٹانے کے لیے ZOO کی طرف چلا گیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے اور جلالی صاحب کا کھانا لے جانے والا ملازم وحید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پھر ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ جلالی صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی۔ میں جلالی صاحب کو دیکھتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں پہنچا تو یہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔ جلالی صاحب ایک صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ اسے نیم دراز ہونا کہا جاسکتا تھا۔ بیس بائیس سال عمر والی دو قبول صورت ملازمائیں ان کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دیگر لفظوں میں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے جلالی صاحب کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ جلالی صاحب کے دونوں ہاتھ دونوں ملازماؤں کے ہاتھ میں تھے اور انہوں نے جلالی صاحب کی انگلیوں کو یوں دبا رکھا تھا جیسے وہ سن ہوچکی ہوں اور لڑکیاں انہیں اپنی مٹھی میں دبا کر حرارت پہنچانا چاہتی ہوں۔ جلالی صاحب کی آنکھیں بند اور چہرے پر عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر میں نے ملازمہ زرینہ کو دیکھا۔ وہ ایک طرف سے آئی۔ جلالی صاحب کے پاؤں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے گداز ہاتھوں سے ہولے ہولے دبانے لگی۔

میں کچن میں واپس آگیا۔ اس چار دیواری میں جلالی ایک ایسا معما تھے جو ابھی تک پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف دو دن پہلے ہم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوچکا تھا کہ اس کوٹھی میں جلالی اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ بڑی رازداری سے خفیہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ جلالی صاحب کے قریب ترین لوگ بھی اس نئے تعلق سے بے خبر ہیں۔ یقیناً میرے کانوں میں بھی اتنی جلدی اس تعلق کی بھنک نہ پڑسکتی اگر ڈرائنگ روم میں مائکروفون نصب نہ ہوتا۔ آجا کے بابا طفیل اور اس کی بیوی دو ایسے افراد تھے جن کے بارے میں شبہ ہوسکتا تھا کہ وہ اس نئے تعلق سے آگاہ ہیں۔ کسی وقت تو مجھے شک ہوتا تھا کہ شاید جلالی اور مہناز کے نکاح کی کارروائی بھی بابے طفیل نے ہی انجام دی ہوگی۔

بابا طفیل بھی فتح محمد کی طرح اس کوٹھی کا ایک خاموش اور گہرا کردار تھا۔ وہ سفید ریش اور جھکی کمر والا شخص تھا۔ وہ اور اس کی بیوی پنج وقت کے نمازی تھے۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں اکثر تسبیح بھی نظر آتی تھی۔ ان کا بیٹا اور بہو رضیہ بھی یہاں ملازمت کرتے تھے۔ بہرحال وہ دونوں سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اس کے برعکس بابے طفیل اور اس کی بیوی کو یہاں گھر کے افراد جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سہ پہر کے وقت جلالی صاحب کی طبیعت سنبھل گئی۔ انہوں نے ZOO کا ایک راؤنڈ بھی لگایا۔ ایرانی بلی اور بلونگڑوں کی حفاظت کے لیے ایک مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے موجود تھا۔ چار بجے کی چائے کی جگہ جلالی صاحب نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر لاہور ٹیلی فون کرکے اپنے زخمی ملازموں کی عیادت کرنے کے بعد سو گئے۔

ڈاکٹر مہناز کی واپسی پانچ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کچھ تھکی تھکی اور کچھ روئی روئی سی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا

کہ وہ والدہ سے مل کر آئی ہے اور حسبِ معمول والدہ سے اس کی جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ والدہ نے اسے الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ دو ہفتے کے اندر جلالی صاحب کے لیے کسی دوسرے ڈاکٹر کا انتظام کر کے کوٹھی چھوڑ دے، ورنہ وہ زندگی بھر اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔

والدہ بے چاری کو کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر بیٹی اب کوٹھی نہیں چھوڑے گی کیونکہ وہ اس ملازمت کو باقاعدہ ایک رشتے میں بدل چکی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو آشکار ہو گیا تو زبردست قسم کی جگ ہنسائی اور طعنہ زنی کا سبب بنے گا۔ مطلع دوپہر سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور تیز بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنے اور مہناز کے لیے چائے بنائی۔ چائے سے بھرے ہوئے مگ لے کر ہم ایک برآمدے میں آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ مجھے اور مہناز کو ساتھ دیکھ کر دیگر ملازموں کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ ڈاکٹر مہناز میری شوقیہ شاگرد بنی ہوئی ہے اور مجھ سے کوکنگ سیکھ رہی ہے۔

میں نے مہناز کو آج دوپہر والی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ آج میں نے جلالی صاحب کو کس حالت میں دیکھا ہے۔

میرے اس بیان میں ایک طرح کا تجسس تھا اور کئی ایک سوالات تھے۔ میں اس تجسس کا اظہار پہلے بھی دو تین بار مہناز سے کر چکا تھا مگر وہ کنی کترا گئی تھی۔ آج میں چاہتا تھا کہ وہ کنی نہ کترائے اور مجھے کچھ نہ کچھ بتائے۔ میں کوشش کرتا رہا، آخر مہناز کو نیم آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس کوٹھی میں دو تین جگہوں پر سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر ہم جس جگہ بیٹھ تھے، وہاں اس طرح کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

مختار ملک والے واقعے کے بعد سے مہناز مجھ پر خاصا بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ میری جسمانی فٹنس اور فائٹنگ اسپرٹ سے بہت متاثر تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بھی چند دن پہلے اسے اپنی کایا کلپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں لڑکپن سے مارشل آرٹ کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں لیکن کبھی اس میدان میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ادنیٰ کھلاڑیوں میں بھی شامل نہ ہو سکا لیکن پھر حالات کی سختیاں میرا ہانکا کر کے مجھے ایک ایسے شخص تک لے گئیں جو شاید مرنے سے پہلے میری آمد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں نے مہناز کو بارونداجیکی کی کہانی سنائی تھی اور اس کے بارے میں دیگر باتیں بتائی تھیں۔

...تو میں ذکر کر رہا تھا ڈاکٹر مہناز کی نیم آمادگی کا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جلالی کے اسرار پر سے سارا نہیں تو تھوڑا بہت پردہ ضرور اٹھا دے گی۔ بادل برس رہے تھے اور ہوا کی سرسراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔

''تابش صاحب! ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست اور... ہم راز ہیں۔ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، آپ صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ڈاکٹر مہناز۔'' میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''تابش! جلالی صاحب بچپن سے... سمجھیں کہ تین چار سال کی عمر سے زبردست اکیلے پن کا شکار رہے ہیں۔ ان کا یہ اکیلا پن زندگی کے کسی حصے میں دور نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری دور میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر مہناز! آپ کس اکیلے پن کی بات کر رہی ہیں؟ بابا طفیل بتا رہا تھا کہ جلالی صاحب نے اپنا بچپن اور جوانی ایک بھری پُری فیملی میں گزارے ہیں۔ پھر ان کے والدین نے بڑے چاؤ سے ان کی شادی بھی کی۔ انہوں نے تیس سال تک ایک اچھی ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے تین بچے بھی ہوئے۔''

مہناز عجیب پھیکے انداز سے مسکرائی۔ ''اس کے باوجود تابش صاحب... جلالی ہمیشہ تنہا رہے، یکسر اکیلے۔ بابے طفیل نے آپ کو ایک خاص بات نہیں بتائی اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے... جلالی صاحب تین چار سال کی عمر سے ایک بیماری کا شکار رہے ہیں۔ یہ جِلد کا ایک متعدی مرض تھا۔ نہایت تکلیف دہ... نہایت ضدی۔ اس مرض نے جلالی صاحب کی زندگی تو اجیرن کی ہی، ان کے قریبی رشتوں کو بھی ہمیشہ ایک سخت امتحان سے دوچار رکھا۔ ماں سے زیادہ قریبی بھلا کون ہوتا ہے۔ اس ماں کے دل پر کیا گزرتی ہو گی جو اپنے تین چار سال کے بچے کو چھو بھی نہیں سکتی ہو اور اس بچے کے دل کا کیا حال ہوتا ہو گا جو اپنے ماں باپ کے لمس کو ترستا رہتا ہو۔''

''یہ بیماری کب تک رہی۔'' میں نے پوچھا۔

''سمجھو ہمیشہ رہی۔'' مہناز نے افسردگی سے کہا۔ ''عام طور پر جلدی امراض کا دورانیہ طویل ہوتا ہے لیکن یہ بیماری تو جلالی صاحب کی تقریباً تین چوتھائی زندگی کو نگل گئی۔ اس نے قریباً قریباً ساٹھ سال تک جلالی صاحب کو اپنے

پنجوں میں جکڑے رکھا۔ جلالی صاحب کے پورے جسم پر بہت باریک باریک سے دانے نکل آتے تھے... گرمی دانوں جیسے... لیکن یہ گرمی دانوں کی طرح خشک نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سرخی اور گیلا پن ہوتا تھا۔ جلالی صاحب کی والدہ اور ان کی بڑی بہن کے ہاتھ بھی اس بیماری کا شکار ہو گئے تھے اور اگر وہ دونوں ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل نہ کرتیں تو شاید وہ بھی پوری طرح اس کی لپیٹ میں آجاتیں۔''

''جلالی صاحب کی بیماری کا علاج بھی ہوا؟''

''کیوں نہیں... جلالی صاحب چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ ان کا تعلق ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے نواح میں ان کی سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین تھی۔ جلالی صاحب کے والد ایک پڑھے لکھے شخص تھے۔ انہوں نے ننھے جلالی کا علاج اندرونِ ملک ہی نہیں، بیرونِ ملک بھی کرایا۔ انہیں انگلینڈ اور جرمنی تک لے کے گئے۔ جلالی صاحب کی تکلیف کنٹرول ضرور ہو جاتی تھی مگر ختم نہیں ہوتی تھی۔ یہ چھوت کے زبردست اثرات بھی رکھتی تھی۔ معالجوں کی ہدایت کے مطابق جلالی صاحب کو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ چار پانچ سال کا بچہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لمس کو ترستا رہتا تھا لیکن ایسی کوئی راحت اس کے نصیب میں نہیں تھی۔''

''جلالی صاحب کے خاندان میں پہلے بھی یہ تکلیف موجود تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں... نہ پہلے تھی نہ بعد میں کسی کو ہوئی۔ یہ واحد کیس تھا۔ بابے طفیل اور اس کی بیوی کو ان وقتوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن وہ دونوں کسی کو بتاتے نہیں۔ ایک طرح سے وہ دونوں جلالی صاحب کے پرانے رازدار بھی ہیں۔ بہرحال، میرے ساتھ انہوں نے کافی کچھ شیئر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بیماری میں چھوت کے اثرات اتنے شدید تھے کہ کوئی بھی جلالی صاحب کے قریب نہیں جاتا تھا۔ انہیں پیاز کا زیادہ استعمال کرایا جاتا تھا تاکہ چھوت کے اثرات کم ہوں اور بیماری میں بھی افاقہ رہے۔ وہ جلن کی وجہ سے ساری ساری رات تڑپتے رہتے تھے۔ ماں انہیں دو دو گھنٹے بعد دوا پلاتی تھی... اور دیگر تدبیریں کرتی تھی۔ کسی وقت وہ انہیں گلے سے بھی لگاتی تھی لیکن اس طرح کہ جلالی صاحب کے جسم کا کوئی ننگا حصہ اس کے جسم سے چھو نہ پائے۔ خاص طور سے بیماری سے متاثرہ حصوں کو چھونا تو بہت خطرناک تھا۔ ان حصوں پر دوا وغیرہ لگاتے وقت دستانے استعمال کیے جاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹر! ہم جانتے ہیں کہ جلالی صاحب کی شادی ہوئی۔ ان کے صحت مند بچے بھی ہوئے۔''

''مگر میں سمجھتی ہوں کہ شادی جیسا رشتہ بھی جلالی صاحب کی تنہائی اور اکیلے پن کو ختم نہ کر سکا۔ ان کی ازدواجی زندگی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی۔ یہ ازدواجی زندگی ڈری سہمی اور کپڑوں میں لپٹی لپٹائی... پتا نہیں کس طرح گرتی پڑتی چلتی رہی... وہ بھی کسی متوسط گھرانے کی صابر شاکر عورت تھی، اس نے یہ سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اسے دنیا کی ہر خوشی نصیب تھی لیکن میاں بیوی کے بھرپور تعلق سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہی ہو گی۔''

''پھر جلالی صاحب ٹھیک کیسے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسکن کی کچھ بیماریاں عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سالہا سال مریض کو پریشان رکھتی ہیں لیکن عمر کے کسی دور میں یہ خودبخود مریض کا پیچھا چھوڑ دیتی ہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ جلالی صاحب کی تکلیف کے بارے میں بھی ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی وقت خود ہی ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا... لیکن بہت دیر سے ہوا۔ یہ انیس بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جلالی صاحب کی وائف کو بھی فوت ہوئے پانچ چھ سال گزر چکے تھے۔ جلالی صاحب کی تکلیف بغیر کسی خصوصی علاج یا دوا کے کم ہونے لگی اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں ناپید ہو گئی۔ اب وہ اس حوالے سے بالکل صحت مند ہیں لیکن اس طویل ترین بیماری نے ان کی شخصیت پر جو منفی اثرات ڈالے ہیں، وہ موجود ہیں اور شدت سے موجود ہیں۔''

بارش برس رہی تھی لیکن اس کی ساری خوب صورتی تاریکی میں دفن تھی، بس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی یا پھر پانی کی بوچھاڑوں کی آواز۔ آسمان پر بجلی چمکی تو جیسے برآمدے میں بھی ایک بجلی چمک گئی۔ مہناز کا پُرشباب کمان کی طرح کسا ہوا جسم ایک لمحے کے لیے روشن ہو کر نیم تاریکی میں اوجھل ہو گیا... کہا جاتا ہے کہ بادوباراں میں عورت کا حسن نکھر جاتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ جلالی صاحب کو اپنی بیماری کی وجہ سے عمر بھر لمس کی جو کمی رہی ہے، وہ اب انہیں نفسیاتی طور پر دق کر رہی ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ آج دوپہر آپ نے ان کی جو

کیفیت دیکھی ہے، وہ اکثر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے وجود کا اکیلا پن بڑی شدت سے ان کے اندر ابھرتا ہے۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ سنسناہٹ جاگ جاتی ہے۔ رگ و پے میں بے چینی بھر جاتی ہے۔ ماتھے پر پسینا آتا ہے۔ میڈیکل زبان میں اس تکلیف کے لیے لمبے چوڑے اور مشکل نام ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ شدید اعصابی بے قراری کی ایک شکل ہے۔ آپ کو میں ایک مثال دیتی ہوں۔ آپ نے پالتو جانوروں مثلاً بلیوں وغیرہ کو دیکھا ہوگا... وہ اپنے جسم کو کسی جان دار جسم کے ساتھ ٹچ کرنا پسند کرتی ہیں۔ پاؤں میں لوٹتی ہیں۔ اپنا آپ اپنے مالک کی ٹانگوں سے رگڑتی ہیں... یہ بھی اسی قسم کی اعصابی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں جلالی صاحب کو جانوروں سے جو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کی وجہ بھی شاید یہی اکیلا پن ہے... مگر کچھ بھی ہے تابش صاحب... اپنے جیسے انسان کی کمی پالتو جانوروں سے تو پوری نہیں ہوسکتی۔ یقیناً دیکھنے والوں کو بہت بُرا لگتا ہوگا کہ یہ عمر رسیدہ شخص جوان ملازماؤں کو اپنے اردگرد رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ قریب ہونا اور لیٹنا بھی پسند کرتا ہے۔ وہ اسے ایک بوڑھے کی کج روی اور شاید رنگین مزاجی سے تعبیر کرتے ہوں گے لیکن وہ اس مسئلے کی دردناک بنیاد سے واقف نہیں ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! آپ نے تو اس تصویر کا ایک بالکل دوسرا رخ پیش کر دیا ہے... آپ کا کیا خیال ہے، اس حوالے سے جلالی صاحب کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟''

''شاید کچھ بھی نہیں۔ اب بڑھاپے کی کئی بیماریاں جلالی صاحب کو چمٹ چکی ہیں... آپ جانتے ہی ہو، ان کے تین بائی پاس ہو چکے ہیں۔ زندگی کا تو پل بھر کا بھروسا نہیں لیکن ظاہری حالت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جلالی صاحب اب زیادہ عرصہ نہیں گزاریں گے۔ شاید دو تین سال... یا اس سے بھی کم۔ اب تو کوئی ایسا شخص ہو جو پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ جلالی صاحب کے ان آخری دنوں کو.... خوش گوار اور کم اذیت ناک بنا سکے۔''

میں نے کن انکھیوں سے مہناز کی طرف دیکھا۔ ہوا کی وجہ سے اس کا آنچل سرک گیا تھا اور ملائم بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہی تھی جو جلالی کی زندگی کے آخری حصے کو خوش گوار بنا سکے... اور وہ ''شخص'' وہ خود تھی۔ وہ بڑی رازداری سے ان کی زندگی میں آ چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی ایسی عورت ہو جو جلالی صاحب کو قربت مہیا کر سکے۔ لیکن یہ قربت تو وہ اپنے اردگرد موجود عورتوں سے حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔''

''لیکن یہ بھی تو ادھوری قربت ہی ہوتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ... میاں بیوی والی قربت... مگر اس عمر میں اور اتنی بیماریوں کے ساتھ...؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر بولی۔ ''آپ کے اور میرے درمیان گہرے اعتماد کا رشتہ ہے تابش! میں پھر کہوں گی کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوں، وہ ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ یہی اعتماد ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری یہ ڈسکشن جلالی صاحب کو ان کے مسئلوں سے چھٹکارا دلانے میں معاون ثابت ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ کسی طرح ہم جلالی صاحب کو باکس والی ذمے داری چھوڑنے پر آمادہ کر لیں۔''

میں نے کہا۔ ''مہناز! میں اپنی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس اعتماد کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ بس اس حوالے سے میں عمران کی بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ آپ اس معاملے میں مجھے اور عمران کو ایک ''اکائی'' سمجھ لیں تو آپ کی مہربانی ہوگی... میں حلفیہ کہتا ہوں ڈاکٹر مہناز! میں اس شخص پر اپنی ذات ہی کی طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔''

میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی اور میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ تب گفتگو کا رخ ایک بار پھر جلالی کے عجیب و غریب کردار کی طرف مڑ گیا۔ مہناز ان کی تعریفیں کرنے لگی... اور یہ تعریفیں بے جا بھی نہیں تھیں۔ جلالی صاحب ایک نہایت پڑھے لکھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص تھے۔ جنگلی حیات کے معاملات پر انہیں اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ غیر ملکی اور ملکی سلیبس کی کتابوں میں ان کا ذکر موجود تھا۔ بے شک وہ غصے کے بہت تیز تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں کج روی تھی مگر ان کے کردار کے اخلاقی پہلو بھی قابلِ ذکر تھے۔ انہیں غیر ملکی شہریت کی آفرز ہوئیں لیکن وہ پکے پاکستانی تھے، انہوں نے اپنی مٹی نہیں چھوڑی۔ وہ ماضی کی خوب صورتیوں میں زندہ رہنے والے شخص تھے۔ وہ جوانی میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے لیکن ان کا نام ہر قسم کی آلائش سے پاک رہا۔ وہ سچ کی حمایت میں بولنے والے اور

پھر ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ ایک ایسا بندہ جس کے کمزور جسم کے اندر ایک طاقتور مزاحمت کار موجود تھا۔ مہناز نے ذہانت اور معاملہ فہمی کے حوالے سے بھی جلالی کی تعریف کی۔

میں نے کہا۔ ''اس میں تو کوئی شک نہیں مہناز! اب ان کا یہ فیصلہ ہی دیکھو کہ انہوں نے ''باکس'' کے بارے میں اپنے سوا اور کسی کو بتایا ہی نہیں۔ اگر بتایا ہوتا تو باکس کب کا ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔''

''ہاں، انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ باکس کی خاطر فارم ہاؤس کے مکینوں پر تشدد کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خود ان پر بھی تشدد ہوسکتا تھا لیکن صرف ایک حد تک۔ تشدد کرنے والے انہیں زندگی سے محروم کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے اور وہ اب بھی نہیں لے سکتے... وہ اب جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کے سوا باکس کا علم اور کسی کو نہیں۔ اور وہ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کئی بیماریوں کے نشانے پر ہیں، انہیں کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے اور اگر کچھ ہو گیا تو وہ باکس آرا کوئے سمیت ہمیشہ کے لیے لاپتا ہوسکتا ہے۔''

''بے شک۔'' میں نے تائید کی۔ ''ہم یہی فرض کر لیں کہ جلالی صاحب نے باکس، کسی درخت کی جڑوں میں گڑھا کھود کر دبا دیا ہے۔ اب فارم ہاؤس کے اردگرد ہزاروں درخت ہیں... کوئی کہاں تک ڈھونڈ سکتا ہے؟''

ڈاکٹر مہناز نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں کل رات بھی دیر تک سو نہیں سکی۔ بار بار تم دونوں کی بنائی ہوئی ویڈیو کے منظر نگاہوں میں گھومتے رہے ہیں۔ ماننا پڑتا ہے، یہ واقعی دل گردے کا کام تھا۔ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے تم لوگ جاوے جیسے شخص کے ٹھکانے میں گھسے اور اس کے دو بندوں کو قتل کر کے دندناتے ہوئے واپس آ گئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ میں تم دونوں کے بارے میں الجھتی جا رہی ہوں۔ تم... بہت خطرناک لوگ ہو۔ کسی وقت ڈر لگنے لگتا ہے۔''

''دشمنوں کو تو ڈرنا چاہیے لیکن یہ ہمارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہے کہ دوست ہم سے ڈر رہے ہیں۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''انجانی چیز کا ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ تم دونوں اپنے بارے میں کھل کر بتاتے بھی تو نہیں ہو۔''

''کیا تم نے اپنے بارے میں سب کچھ کھل کر بتا دیا ہے؟'' میرے سوال پر وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ یقیناً اس کے چہرے پر رنگ بھی گزرا ہوگا جو نیم تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے جلدی سے بات بدلی۔ ''یہی کہ ہم ایک دوسرے پر جتنا زیادہ بھروسا کریں گے، اتنا ہی جلالی صاحب کا فائدہ ہوگا بلکہ یہاں موجود ہر شخص کا فائدہ ہوگا۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔''

مہناز کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''ویڈیو کے منظر یاد آتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ جاوے جیسا شخص چپکا بیٹھا رہے گا۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کا ردِعمل جتنا تاخیر سے ہو، اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔''

''ہاں ڈاکٹر! تمہاری بات کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔'' اب ہم دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے آگے کو جھک کر اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے پیالے میں رکھی اور اس کی کلائیوں کی چوڑیاں، چھن چھنا کر کہنیوں کی طرف چلی گئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''کل تم نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ ہمیں دیکھنا چاہیے... مختار ملک جیسی کوئی اور کالی بھیڑ تو کوٹھی یا فارم ہاؤس میں موجود نہیں۔''

''بالکل ڈاکٹر... سیانے یہی کہتے ہیں کہ کھلے دشمن سے چھپا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

☆☆☆

نصرت نے فون پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ثروت سے ٹیلی فونک رابطہ رکھوں لیکن پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی جھجک مانع ہوتی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، میں اس کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تھی مگر تصورات میں تو وہ میری ہی تھی۔ میں اپنے تصورات کا یہ شیش محل برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا، موبائل فون میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ثروت کو کال کروں یا نہیں...

اچانک فون پر بیل ہوئی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا۔ یہ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو'' کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک جوان مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! آپ تابش صاحب بول رہے ہیں؟''

''آپ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام یوسف ہے... یوسف فاروقی۔ میں آپ

کی کزن ثروت کا شوہر ہوں۔'' دوسری طرف سے مسکراتی آواز میں کہا گیا۔

میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''جی... جی... میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کیسے آیا؟''

''بس ایسے ہی آ گیا۔ دو تین دن پہلے تک میں آسٹریا میں تھا۔ ایک دن ویسے ہی نصرت کا موبائل دیکھ رہا تھا۔ ''کال لوگ'' میں دو تین جگہ ''تابش بھائی'' کی کال تھی۔ میں نے نصرت سے پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گئی۔ شاید آپ سے ملانا نہیں چاہتی تھی لیکن ہم تو جناب یاروں کے یار ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے لوگوں سے ملتے ہیں۔ سوچا خود رابطہ کر کے دیکھتے ہیں۔''

مجھے نصرت پر غصہ آیا۔ اس سے بے پروائی ہوئی تھی۔ اپنے بہنوئی کی متجسس طبیعت کا اسے پتا ہی تھا۔ اسے میری کال DELETE کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا۔ ''خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری تو چند دن سے بات نہیں ہوئی اس کے ساتھ۔''

''آپ کو تو باخبر ہونا چاہیے تابش صاحب! میرے اندازے کے مطابق تو آپ خاصے ''انوالو'' ہیں نصرت کے علاج میں۔''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں...''

''یہ تو آپ کا بڑاپن ہے نا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں سے نہیں۔ ورنہ یہ تو نمود و نمائش کا دور ہے۔ اور تو اور لوگ آٹے کی بوری ضرورت مند کے سر پر رکھتے ہیں اور تصویر کھچواتے ہیں۔''

''لیکن...''

''میں سب جانتا ہوں تابش صاحب! آپ چھوڑیں اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ ہی نے نصرت اور ثروت کو منع کیا ہوگا کہ اس سلسلے میں آپ کا نام نہ آئے۔ بزرگوں نے درست کہا ہے کہ کسی کے کام آیا جائے تو اس طرح کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے کو پتا نہ چلے... ویسے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہے؟''

وہ واقعی چرب زبان شخص تھا۔ میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو غالباً لاہور میں ہیں لیکن میں لاہور سے باہر ہوں اور ابھی مصروف بھی ہوں۔ چند دن بعد کوئی وقت رکھ لیتے ہیں۔''

''لیکن ملاقات ہونی بہت ضروری ہے۔'' اس نے ''ہونی'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ آپ کو ایک دو غلط فہمیاں ہیں جو دور ہونی چاہئیں۔'' میں نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

کچھ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

میں نے فوراً نصرت کو فون کیا۔ ''ہیلو تابش بھائی، کیسے ہیں؟'' اس کی ہشاش آواز سنائی دی۔

''میں زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔'' میں نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے یوسف بھائی جان کا فون آیا تھا۔''

وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور ساتھ ہی غصے کا اظہار بھی کیا کہ اس نے میری کالز کا ریکارڈ حذف کیوں نہیں کیا۔ وہ سٹپٹائی آواز میں بولی۔ ''لیکن تابش بھائی! یہ بھی تو سراسر غلط ہے نا۔ یوسف بھائی کیوں جاسوسیاں کرتے پھر رہے ہیں؟ انہیں میری اجازت کے بغیر میرا موبائل دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں ابھی انہیں فون کر کے پوچھتی ہوں۔''

''یہ تم غلطی کے اوپر ایک اور غلطی کرو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اب اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ تمہاری کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کوئی ''ٹاپ سیکرٹ'' تھا جو افشا ہو گیا ہے۔ یوسف اس بارے میں تم سے بات کرے گا لیکن تم نے ہرگز یہ تسلیم نہیں کرنا کہ میں نے علاج کے لیے کوئی رقم وغیرہ دی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ علاج کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ وغیرہ ہوتا تھا۔ میرے اور ثروت کے پرانے رشتے کے بارے میں بھی از خود کچھ نہیں بتانا۔ اگر اسے اپنے آپ پتا چل جائے تو اور بات ہے۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں بھائی جان... یوسف بھائی کو جو پتا چلنا ہے، چل جائے۔ انہوں نے جو بم پھوڑنا ہے پھوڑ لیں۔ ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ گناہ وہ کر رہے ہیں۔ باجی کو اپنے مطلب کے لیے بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔''

میں نے نصرت کو سمجھایا بجھایا کہ وہ جذباتی رویہ نہ اپنائے۔ اس کا پارا نیچے آ گیا۔ وہ مجھے اپنی صحت اور علاج کے بارے میں بتانے لگی۔ دیگر معاملات پر باتیں کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''ثروت کہاں ہے؟''

وہ پورا نقشہ کھینچتے ہوئے بولی۔ ''باہر لابی میں بیٹھی ہیں۔ میں کھڑکی سے انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ سرخ سویٹر پہن رکھا ہے، کندھوں پر ہلکی گلابی شال ہے۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے ان کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری پڑھ رہی ہیں۔ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ گریس، باجی کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ پلیز... پلیز! آپ ایک کام کریں۔ اسی وقت باجی کے نمبر پر کال کریں... پلیز۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی التجا سمٹی ہوئی تھی۔

''لیکن اگر اس نے جواب نہ دیا تو؟''

''وہ دیں گی... ضرور دیں گی۔ اچھا، اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے انہیں کال کریں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے ثروت کا نمبر ملایا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لیکن اب اسے کال کرتے ہوئے میں اندر سے کانپ رہا تھا۔ بیل ہوئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

میں نے پھر کوشش کی... پھر ناکامی ہوئی۔ تیسری کوشش بھی ناکام ہوئی تو میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے خود کو ایک دم معمولی اور بے وقعت محسوس کیا۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نہ سن سکے گا تیری صدا... جو چلا گیا اسے بھول جا۔

تیس چالیس منٹ بعد پھر بیل ہوئی۔ میں نے دیکھا، نصرت کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''کیا کر رہے ہیں بھائی جان؟''

''بیٹھا افسوس کر رہا ہوں کہ میں نے کیوں کال کی۔''

''ایسی بات نہیں ہے بھائی جان۔ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔ جب آپ کی کال آ رہی تھی، باجی کے چہرے کے رنگ دیکھنے والے تھے۔ انہوں نے خود کو پتا نہیں کس طرح کال ریسیو کرنے سے روکا۔ پھر ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر نکلی ہیں تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے پتا ہے روتی رہی ہیں لیکن کہہ رہی تھیں کہ الرجی ہو رہی ہے، چھینکیں آ رہی ہیں۔ بھلا کوئی آواز کے بغیر بھی چھینک مارتا ہے تابش بھائی جان؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟''

''اس میں خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ خوش ہونے کی بات دوسری ہے۔'' وہ اسی ترنگ میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور سے یوسف بھائی کا فون آیا تھا۔''

''پھر؟''

''باجی نے ان کا فون بھی نہیں سنا۔'' نصرت بہت خوش تھی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ ''میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے تابش بھائی جان کہ باجی نے اس طرح یوسف بھائی کی کال ریجیکٹ کی ہے۔ دن میں کم از کم چھ کالیں تو کرتے ہیں وہ۔ پتا نہیں، آج کل کیا ہو گیا ہے انہیں۔ اتنی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے باجی کی؟ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ادھر لاہور میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فاروقی انکل وہاں آئے ہوئے ہوں۔ کسی طرح وہاں کے حالات کا پتا چلے نا۔''

نصرت نے حالات کا پتا چلنے کی بات کی تو میرے ذہن میں فوراً ملازمہ حمیدن کی صورت ابھر آئی۔ اس سے پہلے لاہور میں عمران کے ساتھی جیلانی نے یوسف کی اس ملازمہ کو بڑی خوبی سے شیشے میں اتارا تھا اور گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے نصرت سے تو نہیں کہا لیکن دل میں سوچا کہ ضرورت پڑنے پر حمیدن کو پھر متحرک کیا جا سکتا ہے۔

نصرت کی صحت کے معاملات پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کوریڈور میں ایک بار پھر تاریکی چھائی ہوئی تھی جہاں سے گزر کر مہناز بڑی رازداری سے جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اپنی آمد و رفت سے پہلے وہ اس بلب کو یہاں سے اتار لیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آج وہ پھر اپنے عمر رسیدہ شوہر کے پاس موجود ہے۔

اگلے روز جب سہ پہر کے وقت جلالی صاحب عمران کے ساتھ اپنے چڑیا گھر کا دورہ کرنے کے بعد فارم کے سیکیورٹی انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، ڈاکٹر مہناز سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس نے خلافِ معمول ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ تاہم وہ کچھ ست سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے ڈاکٹر! لگتا ہے کہ رات کو آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی۔''

اس کے خوش نما چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ تاہم فوراً بولی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو تابش! رات کافی دیر تک جاگتی رہی ہوں۔ وہ تمہاری خوں خوار ویڈیو ذہن سے نہیں نکلتی۔

بہتر ہے کہ تم لوگ اسے ضائع کر دو۔ وہ تمہارے خلاف دو بندوں کے قتل کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔"

"وہ بندے نہیں تھے مہناز... خونی جانور تھے۔ ایسے جانوروں کو جہنم واصل کرنے پر تو یار لوگوں کو انعام ملا کرتے ہیں۔"

"ویسے اندر سے جلالی بھی فکر مند ہیں۔ وہ سیکیورٹی مزید سخت کروا رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ جاوا نچلا نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے کہا۔ "سیکیورٹی سے بھی زیادہ یہ بات اہم ہے کہ ہم اندر سے محفوظ ہوں۔ ہمیں پتا چلے کہ کوئی دوسرا "مختار ملک" تو یہاں موجود نہیں... اور... لگتا ہے کہ وہ ہے۔"

"مجھے بھی یہی پریشانی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہر وقت کوئی ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔"

یہ وہی موضوع تھا جس پر ہم کل بھی "ڈسکس" کرتے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "مہناز! اگر میں تم سے کہوں کہ کسی ایک شخص کا نام بتاؤ تو تم کس پر شک کر سکتی ہو؟"

اس کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ "کیا کہوں اس بارے میں... سیکریٹری ندیم تو ہر طرح بھروسے کا بندہ ہے۔ بابا طفیل اور فتح محمد وغیرہ خاندانی ملازم ہیں۔ ڈاکٹر عدیل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر ملازموں میں وحید اور مصطفیٰ کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔"

میرے ذہن میں بار بار وہ ہیولا ابھر رہا تھا جسے میں نے چند روز پہلے جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے پاس دیکھا تھا۔ وہ کس کا ہیولا تھا؟ یقیناً کسی ایسے شخص کا جو ہمارے اردگرد موجود تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لاہور سے مہناز کی والدہ کی کال آگئی۔ یقیناً ماں اور بیٹی کے درمیان وہی موضوع شروع ہونے والا تھا جو اس سے پہلے بھی زیرِ بحث رہا تھا۔ لیکن ماں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ رسموں رواجوں سے باغی بیٹی اس حوالے سے انتہائی قدم اٹھا چکی ہے۔

وہ بہار کی ایک بڑی خوشبودار شام تھی۔ سہ پہر کو ہلکی پھوار پڑی تھی، اس کے بعد چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اس دھوپ نے گل لالہ، گلِ عباسی، گلاب اور نرگس کے ان گنت پھول قرب و جوار میں مہکا دیے تھے۔ احاطے میں سفیدے اور سائپرس کے لاتعداد درخت تھے۔ ان ڈھلے ڈھلائے درختوں کے نیچے پھول دار بیلیں بہار دکھا رہی تھیں۔ ZOO کی طرف سے موروں کی "می آؤں" اور کوئل کی کوک سنائی دیتی تھی۔ ایک دم میرے سینے میں گھونسا سا لگا۔ یہ اپریل کی 18 تاریخ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں یہ تاریخ مجھے کبھی نہیں بھولی تھی۔ یہی تاریخ تھی جب میں نے آخری بار ثروت کو چھوا تھا، اسے پیار کیا تھا۔ مجھے وہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ ثروت کے کپڑوں کا رنگ، اس کی لگائی ہوئی خوشبو، اس کی کی ہوئی باتیں، اس کا پیار، اس دن اسے کتنی بار چوما تھا، کتنی بار گلے لگایا تھا، کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔

ان دنوں کتنے قریب آچکے تھے ہم۔ اپنے گھر کے لیے پردوں کے رنگ بھی ہم نے چن لیے تھے۔ وہ پکوان بھی منتخب کر لیے تھے جو ہمیں اپنے مہمانوں کو کھلانے تھے اور وہ تفریح گاہیں جہاں جہاں ہمیں پہنچنا تھا اور وہ موسم جو ہمیں دریافت کرنے تھے۔ مجھے آج بھی یاد تھا، 18 اپریل کو ہونے والی اس آخری ملاقات میں ہم نے ان پھولوں کے نام لیے تھے جو ہم نے اپنے باغیچے میں لگانے تھے۔ گل خیرو کے ذکر پر ہمارے درمیان تھوڑی سی پیار بھری لڑائی بھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پھول زیادہ پسند نہیں تھا مگر ثروت کو اچھا لگتا تھا... اور پھر وہ پھول رہا، نہ وہ پکوان، نہ وہ موسم جو ہم نے مل کر دریافت کرنے تھے۔ وہ ملاقات، پیار بھری آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی۔ پیار کی کہانیوں میں یہ "آخر" کیوں آتا ہے...؟ کیوں آخری بار چھوا جاتا ہے؟ کیوں آخری نظر ڈالی جاتی ہے؟ کیوں آخری خط؟ کیوں آخری کال؟ کیوں آخری بوسہ؟ کیوں؟ ربِ کائنات نے پیار کے ساتھ جدائی کیوں لکھی ہے... یہ "آخری" کیوں لکھا ہے؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب پیار کرنے والوں کی زندگی میں یہ "آخری" آتا ہے، تو وہ اس کی موجودگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ آخری ملاقات ہو رہی ہوتی ہے اور وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ آخری ہے۔ آخری کال ہو رہی ہوتی ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آوازیں دم توڑ جائیں گی۔ آخری بار چوما جا رہا ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی کہ اب ہونٹوں کو عمر بھر ترسنا ہے... میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس خوشبودار شام کو جانے نہ دیتا۔ اس شام کو اور اس میں موجود ساری دلکشیوں کو ثروت سمیت اپنے سینے میں چھپا لیتا اور کہیں دور نکل جاتا۔ واجی، تھانے دار اشرف اور سیٹھ سراج جیسے بدفطرت لوگوں کی دنیا سے بہت دور۔

سیٹھ سراج کا سراپا نگاہوں کے سامنے آیا تو میرا پورا وجود جلنے لگا۔ وہ میری محبت کا قاتل تھا، میری ماں کا قاتل تھا... اور وہ زندہ تھا۔ انہی گلی کوچوں میں کہیں دندنا رہا تھا۔

اپنی تمام تر خباثت اور فرعونیت کے ساتھ۔ اب وہ بونے سے دیو بن چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کچھ اور پھیلا لیے تھے۔ اب وہ ایک ملک گیر شہرت کا حامل نہایت بااثر بدمعاش تھا۔ میرے اندر وہی شعلے دہکنے لگے جو مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھاگتا چلا جاؤں، یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں۔ کوٹھی کے اردگرد مٹی کا ایک ٹریک موجود تھا۔ غالباً جب جلالی صاحب کی صحت قدرے بہتر تھی تو وہ یہاں چہل قدمی کیا کرتے ہوں گے یا پھر جاگنگ۔ میں شوز پہن کر اس ٹریک پر آیا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ میں بغیر دم لیے بھاگتا رہا... چکر پر چکر لگاتا رہا، یہاں تک کہ سانس نے سینے میں سمانے سے انکار کر دیا۔ پسینا مساموں سے دھاروں کی صورت بہہ نکلا۔ یوں لگا کہ ٹانگیں بے جان ہو جائیں گی، میں لڑکھڑا کر گروں گا اور پھر اٹھ نہ سکوں گا۔ یہ برداشت کی انتہا تھی اور بارونداجیکی نے کہا تھا، جہاں برداشت کی انتہا ہونے لگتی ہے، وہیں سے کچھ حاصل ہونا شروع ہوتا ہے، وہیں سے معجزے پھوٹتے ہیں۔

ایک جگہ میرے قدم ڈگمگائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی گر پڑوں گا۔ میں رک گیا اور سفیدے اور شیشم کے درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے فتح محمد نظر آیا۔ ہاں، وہ فتح محمد ہی تھا، وہ ایک دوسرے ملازم کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہوا درختوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے جثے اور چلنے کے انداز سے پہچانا۔ چند دن پہلے حملہ آوروں نے فارم میں گھس کر کھدائی کی تھی۔ مٹی کے وہ ڈھیر ابھی تک فارم میں موجود تھے۔ ایک ایسے ہی ڈھیر کے پیچھے ایک جگہ رک کر وہ دونوں رازداری سے باتیں کرتے رہے پھر فتح محمد نے اپنے ساتھی کا کندھا تھپتھپایا اور اس سے رخصت ہو کر آگے بڑھ گیا۔ گارڈز کے قریب پہنچ کر فتح محمد نے ان سے بھی تھوڑی سی بات چیت کی اور کوٹھی کے ایک عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ میں نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا لیکن آج یہ کھل گیا۔ اس کی چابی فتح محمد کے پاس موجود تھی۔ دروازے سے نکل کر اس نے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ذہن میں ہلچل شروع ہو گئی۔ فتح محمد باہر جانے کے لیے یہ عقبی دروازہ استعمال کر رہا تھا اور اس کا انداز بھی مشکوک تھا۔ "وہ کہاں جا رہا ہے؟" یہ سوال شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔

میرا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن سیکیورٹی ایجنسی کے نہایت چوکس گارڈز کی نظر میں آئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی عمران نے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور گارڈز کے پاس پہنچ گیا۔ صرف تین چار دن پہلے جلالی صاحب ان گارڈز کے تین اہم افسران کو یہ ہدایات دے چکے تھے کہ سیکیورٹی کے حوالے سے مجھے اور عمران کو آگاہ رکھا جائے اور ہمارے ساتھ تعاون کیا جائے۔ یہ ہدایات اس وقت بہت کام آئیں۔ میں نے ایک سیکیورٹی انچارج فراست شاہ کو بتایا کہ میں فوری طور پر کوٹھی سے باہر جانا چاہتا ہوں اور عقبی دروازے سے جانا چاہتا ہوں... وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اہم معاملہ ہے۔ اس نے نہ صرف کوٹھی کی چار دیواری پھلانگنے میں میری مدد کی بلکہ کوٹھی سے باہر موجود دوسرے سیکیورٹی انچارج کو بھی میرے بارے میں واکی ٹاکی کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ اب تک سیکیورٹی ایجنسی کے تقریباً سارے لوگ اچھی طرح جان چکے تھے کہ میری اور عمران کی اصل حیثیت باورچیوں کی نہیں ہے۔

میں نے باہر نکلتے ہی فارم ہاؤس کے سیکیورٹی انچارج قادر خان سے پوچھا کہ فتح محمد کس طرف گیا ہے۔ وہ فتح محمد کو اس کے نام سے نہیں جانتا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔ "جو ملازم ابھی نکلا ہے، وہ ادھر فش فارم کی طرف گیا ہے۔"

یہ فش فارم بھی فارم ہاؤس کا حصہ ہی تھا۔ اس کے قریب ہی فارم ہاؤس کا بہت بڑا مرغی خانہ بھی تھا۔ میں فش فارم کی طرف لپکا۔ جلد ہی میں نے فتح محمد کو دیکھ لیا۔ وہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کے پیچھے موجود تھا اور ایک پرانی موٹر سائیکل کو مسلسل کِکیں مار رہا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو کر نہیں دے رہی تھی اور اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسٹارٹ ہو گی بھی نہیں۔

میں فتح محمد سے کافی فاصلے پر تاریکی میں موجود رہا اور اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ وہ سخت جھلایا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے موٹر سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیدل چلنے لگا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بہتر تھی۔ اگر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو جاتی اور وہ آناً فاناً کسی طرف نکل جاتا تو میرے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے فتح محمد کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس وہی یادگار چاقو تھا جس کی دھار نے چند ماہ پہلے جارج کورا جیسے فرعون صفت شخص کا خون چکھا تھا۔ اپنے پاس اس چاقو کی موجودگی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

میری چھٹی حس نے کہا کہ آج کی رات فتح محمد کے لیے کچھ اچھی ثابت نہیں ہونے والی۔ آج میں بہت بُرے موڈ

میں تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے تک سیٹھ سراج کی منحوس صورت میری آنکھوں میں تھی اور میرا خون اچھالے مار رہا تھا۔ سیٹھ سراج تو نہیں ملا تھا تاہم اس کرخت چہرہ فتح محمد سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور اپنے تعاقب سے لاعلم تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا ہے جن پر سیکیورٹی گارڈز سے ملاقات ہونے کا امکان کم سے کم ہو... کچھ آگے جا کر اسے سیکیورٹی والوں کی پیٹرولنگ جیپ کی نیلی بتی نظر آئی تو وہ دو تین منٹ کے لیے گھنی جھاڑیوں میں ٹھہر گیا۔ جیپ آگے نکل گئی تو اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ آج میں اس بندے کی حقیقت جاننے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے سیل فون کے ذریعے عمران کو بھی آگاہ کر سکتا تھا اور ممکن تھا کہ وہ بھی میری اس کوشش میں شریک ہو جاتا لیکن پتا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ شاید میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں ہر کام میں عمران کا سہارا نہ لوں، عمران خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد فتح محمد اچانک اس پختہ سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر لاہور جانے والی مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تیس فٹ چوڑی سڑک پر زیادہ تر تانگے، ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکل یا موٹر سائیکل ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھٹارا لوکل بس بھی گزر جاتی تھی۔

مجھے پھر پریشانی لگ گئی۔ اگر یہاں فتح محمد کسی گاڑی پر سوار ہو جاتا تو میں اس کا تعاقب جاری نہ رکھ سکتا۔ ابھی اس اندیشے نے ذہن میں سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی عملی صورت سامنے آ گئی۔ فتح محمد نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ٹریکٹر ٹرالی والا رک گیا۔ غالباً اس نے فتح محمد کو جلالی فارم ہاؤس کے ملازم کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اردگرد کے دیہاتی جلالی صاحب کے نام کی توقیر کرتے تھے۔ فتح محمد ٹریکٹر پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹرالی روانہ ہو گئی۔ میں نے تیزی سے سوچا، اب میرے پاس راست اقدام کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس نے کیریئر پر کوئی وزنی شے باندھ رکھی تھی۔

میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گوالا ٹائپ شخص تھا۔ قد ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہوگا۔ اس نے موٹر سائیکل کی دونوں جانب دودھ والے برتن لٹکائے ہوئے تھے۔ ”کیا بات ہے بھئی؟“ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

”دیکھو... میں پولیس والا ہوں۔ مجھے تمہاری موٹر سائیکل چاہیے... تھوڑی دیر کے لیے۔ نیچے اترو۔“

”اوئے تم کون سے پولیس والے ہو؟ یہاں کے پولیس والوں کو میں جانتا ہوں۔“

وہ لمبی بحث کرنے کے موڈ میں تھا اور خاصا اکھڑ مزاج بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا جثہ تو عام ہی تھا اس وجہ سے اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ شاید میں اس سے یہ سلوک نہ کرتا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور سخت جھلاہٹ کے عالم میں کھینچ کر سڑک سے نیچے نشیبی جگہ پر لڑھکا دیا۔ موٹر سائیکل پہلو کے بل گر گئی تھی۔ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھا، گر کر فوراً ہی کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس پر جست لگائی اور جبڑے پر دو شدید ضربیں لگا کر اسے انٹاغفیل کر دیا۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

میں بھاگ کر واپس سڑک پر آیا۔ ایک برتن سے دودھ بہہ کر سیاہ سڑک پر لکیریں بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے سڑک خالی ہی تھی۔ دور اس ٹرالی کی عقبی بتیاں نظر آ رہی تھیں جس پر لفٹ لے کر فتح محمد بڑی سڑک کی طرف گیا تھا۔ گرنے کے باوجود موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور ٹریکٹر ٹرالی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ احتیاطاً میں نے ہیڈ لائٹ آف کر دی تھی۔

یہ تعاقب زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ بڑی سڑک سے ڈیڑھ دو کلومیٹر پہلے ہی ٹرالی رکی اور فتح محمد اس پر سے اتر آیا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل درختوں کے نیچے روک دی۔ یہ فیکٹری ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر چند ایک کوٹھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ فتح محمد ان کوٹھیوں کی طرف چل دیا۔ میں نے موٹر سائیکل سڑک کی ڈھلوان پر جھاڑیوں کے اندر چھپائی اور فتح محمد کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب مجھے فتح محمد سے اپنا فاصلہ کم کرنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ یکایک کہیں اوجھل ہو جاتا اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔

فتح محمد کوٹھیوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر کافی آگے جا کر وہ درختوں میں گھری ہوئی دو تین کنال کی ایک کوٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس ایک دو کھڑکیوں میں ہی روشنی دکھائی دیتی تھی یا پھر گیٹ کے قریب ایک بلب جل رہا تھا۔ فتح محمد کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ کوٹھی کی دس بارہ فٹ اونچی باؤنڈری وال پھلانگنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں کیکر کے

درختوں میں چھپ کر اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کھیت میں پرالی کے گٹھے پڑے تھے اور ایک گدھا گاڑی بندھی ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے فتح محمد نے ساری منصوبہ بندی پہلے سے کر رکھی ہے۔ وہ پرالی کا ایک گٹھا اٹھا کر لایا اور کوٹھی کی چار دیواری کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا گٹھا اٹھا لایا۔ اس نے کل پانچ گٹھے دیوار کے قریب رکھے اور اوپر چڑھنے کا انتظام کر لیا۔ وہ قدرے بھاری جسم کا تھا اور فارم ہاؤس میں سستی کا شکار نظر آتا تھا مگر اب اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوار پر چڑھ کر کوٹھی کے اندر اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ جامد کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ فتح محمد کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے اور وہ اس کوٹھی کے مکینوں کو آڑے ہاتھوں لینے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے اندر فتح محمد کا کوئی ساتھی پہلے سے موجود ہوتا۔

ایک طرف سے دو بندے نمودار ہوئے۔ انہوں نے درخت سے گدھا کھولا اور اسے ریڑھی میں جوتنے لگ گئے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک بولا۔ ''اب بتا فلم دیکھنی ہے کہ بازارِ حسن جانا ہے؟''

دوسرا بولا۔ ''تُو تو اسٹیج ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔''

پہلے نے کہا۔ ''اوئے بھوتنی دے۔ یہ اسٹیج ڈراما بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔''

دونوں گندے انداز میں ہنسنے لگے اور ان واہیات گالیوں کی بات کرنے لگے جنہیں لوگ غلطی سے جگت کہہ دیتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور لڑکا بھی اس ''فلمی بحث'' میں شریک ہو گیا۔ اس نے ماں بہن ایک کر دینے والی کچھ تازہ ''جگتوں'' کا ذکر کیا اور ایک ایسے گانے کی تشریح کی جسے سن کر بچہ بالغ اور بالغ آگ بگولا ہو سکتا تھا۔

ان تینوں نے وہاں سے ٹلنے میں دس پندرہ منٹ لگا دیے۔ میرے اندر جو چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، انہوں نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا اور پرالی کے وہ گٹھے ابھی تک وہیں موجود تھے جنہیں فتح محمد چھوڑ گیا تھا۔ گدھا گاڑی پر تفریح کے لیے روانہ ہونے والے تینوں لڑکوں میں سے کسی کی نظر ان گٹھوں پر نہیں پڑی تھی۔ چند منٹ بعد میں ارد گرد سے پوری طرح مطمئن ہو گیا اور پھر ان گٹھوں پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں کود گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اپنا سیل فون آف کر کے لمبی گھاس میں چھپا دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل تاریکی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اچانک پورچ کی طرف سے کتّوں کی آواز سنائی دی اور دو عدد دیوہیکل کتّے برق رفتاری سے میری طرف بڑھے۔ ان کے عقب میں مجھے چند افراد کے ہیولے بھی دکھائی دیے۔ مجھے لگا جیسے یہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

کتّوں کو اپنی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھنا ایک لرزہ خیز تجربہ تھا۔ مگر آج 18 اپریل کے حوالے سے میرے اندر جو آگ بھڑکی ہوئی تھی، اس نے میرے ہر خوف کو طیش کی دبیز تہوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ میں بھاگنے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج گورا کے سینے میں اترنے والا چاقو میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ جونہی بھاری جسم والے بپھرے ہوئے کتّے نے مجھ پر جست کی، میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے ساتھ ساتھ میں تھوڑا سا بائیں جانب بھی ہٹا۔ میں نے چاقو کو حرکت دی۔ وہ کتّے کی گردن کو سینے تک چیرتا چلا گیا۔ ایک لرزہ خیز آواز کے ساتھ کتّا، کچی زمین پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرا کتّا میرے پہلو سے ٹکرایا۔ یوں لگا کہ کسی بھینسے نے اپنے سینگوں سے مجھے ضرب لگائی ہو۔ اس طاقتور دھکّے نے مجھے کروٹ کے بل گرایا۔ کتّا میرے اوپر تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے خارج ہونے والی تیز حیوانی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی خونی آنکھیں ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں میں چمکیں۔ مجھے ایک ساعت کی دیر ہوتی تو وہ اپنے دانتوں میں میرا نرخرہ دبوچ لیتا۔ میں نے تیز دھار چاقو کو افقی رخ پر حرکت دی اور قریباً ایک فٹ تک کتّے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پھر اسے اپنے پاؤں پر اچھالا اور دور پھینک دیا...

دو سائے مجھ پر جھپٹے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے سر پر خون سوار ہے اور میرے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جو میری رگوں میں سیال آگ دوڑا دیتا ہے۔ آگے آنے والے شخص نے میرے سر پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور چاقو دستے تک اس کی ناف میں گھسا دیا۔ وہ دردناک آواز میں چلّایا۔ پیچھے آنے والے شخص نے جو کچھ کیا اور جواب میں، میں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ایکشن ری پلے جیسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس شخص کی رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سنگین سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور اس کی ناف میں بھی دس انچ کا پھل

اتار دیا۔

ایک گولی چلی لیکن اس نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ دو تین افراد مجھ پر جھپٹے... میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ مجھے یہ افراد مٹی کے پتلوں کی طرح نظر آئے۔ میں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میری وحشت ان پر حاوی ہو گئی۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے افراد کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے ایک اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرا۔ پورچ میں کھڑی ہنڈا اکارڈ کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔

بھاگنے والے افراد نے کوٹھی میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ وہ جیسے مورچا بند ہو گئے تھے۔ میں نے بہت سنا تھا کہ سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ آج سچ مچ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں مار دینا چاہتا تھا اور مر جانا چاہتا تھا۔ یہ دنیا زندہ رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ سیٹھ سراج جیسے لوگوں نے اسے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور آج 18 اپریل تھی۔ میری موت تو شاید اسی دن واقع ہو گئی تھی۔ آج دوبارہ میں لاش میں تبدیل ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا لیکن سیٹھ سراج جیسے لوگ تو تھے۔

پاس ہی ایک لینڈ روور جیپ کھڑی تھی، اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ غالباً میری آمد سے پہلے بوگیر کتّے اور مسلح افراد اس جیپ پر بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ اب بوگیر کتّے باؤنڈری وال کے پاس نیم مردہ پڑے تھے اور تین افراد بھی شدید زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

میں جیپ کے اندر گھسا۔ اسے پہلے گیئر میں ڈال کر میں نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ ایک برق رفتار یوٹرن لے کر میں نے بھاری بھرکم جیپ کا رخ کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ تقریباً سات فٹ چوڑا اور نہایت بیش قیمت دکھائی دیتا تھا۔ جیپ نے خوفناک رفتار سے پورچ کی دو سیڑھیاں طے کیں اور پھر ایک دھماکے سے ساگوانی دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازے کے پرخچے اڑے، شیشے کی سیکڑوں کرچیاں ہوا میں بکھرتی نظر آئیں۔ مجھے اپنے گھٹنوں اور کہنیوں میں درد کا احساس ہوا لیکن اس احساس میں ایک ہیجانی سا لطف تھا۔ اب جیپ کوٹھی کے شیش محل جیسے کامن روم میں تھی۔ میں نے ایک بندے کو رائفل تانتے ہوئے دیکھا اور اندھا دھند جیپ اس پر چڑھا دی۔ دو فیشن ایبل لڑکیاں چلّاتی ہوئی دروازوں میں اوجھل ہوئیں۔ جیپ ایک قیمتی صوفے کا کچرا بنا کر ایک

شوکیس کو الٹاتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ایک بیش قیمت فانوس پکے ہوئے پھل کی طرح چھت سے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ ارد گرد گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یکایک عقب سے کسی نے میرے سر پر رائفل کے کندے سے شدید ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں گھومتا، ایک اور ضرب لگی۔ میں نے حملہ آور کی طرف رائفل گھمائی۔ دو افراد پہلو سے آئے اور کیکڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میں اوندھے منہ گرا۔ میں سنبھلنا چاہتا تھا مگر سنبھل نہیں سکا۔ کئی اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ کسی نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور خون آلود چاقو بھی نکال لیا۔ وہ مجھ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگے۔ میری قوتِ برداشت ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ میں بُری طرح گھرا ہونے کے باوجود زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی وقت ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔ پھر میرے گھٹنے پر رائفل کے دستے کی ایک شدید چوٹ لگی۔ اسی جگہ پر لگنے والی یہ دوسری چوٹ تھی۔ مجھے اپنی ٹانگ سن ہوتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ انہوں نے ہر طرف سے مجھے دبوچ لیا۔

جس شخص نے جارج گورا والا چاقو نکالا تھا، اس نے اسے کھولا اور دہاڑا۔ ''مار دو کتّے کو۔'' وہ مجھ پر جھپٹا۔

ایک دوسرا شخص اس کے سامنے آیا۔ ''کیا کرتے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''

وہ مجھے بُری طرح پیٹنا چاہتے تھے لیکن پیٹنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ مجھے چھوڑتے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے دبوچ رکھا تھا... اور دبوچے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسی طرح میرا سر پختہ فرش سے ٹکرانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ کیا کریں۔ میری ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ ایک آواز ابھری۔ ''اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچاؤ۔''

انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر موڑ کر رسّی سے باندھے اور مجھے فرش پر اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ کامن روم میں گھسی ہوئی جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ احاطے کی طرف سے گاہے بگاہے ایک زخمی کتّے کی کربناک آواز ابھرتی تھی۔ وہ لوگ ایک کوریڈور سے گزرے۔ ایک دروازہ کھولا گیا اور مجھے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر دھکا دے دیا گیا۔ تیرہ چودہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا میں پختہ فرش پر گرا۔ ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میرا چہرہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا۔ بس کندھوں اور سینے پر

کچھ چوٹیں آئیں... سیڑھیوں والا دروازہ ایک دھماکے سے بند کردیا گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اردگرد دیکھا۔ یہ بیسمنٹ ایک ہال کمرے جیسا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا اس جگہ دو افراد اور موجود تھے۔ ایک کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کافی دیر سے یہاں بند ہے۔ غالباً وہ کسی نشے کے زیرِ اثر سویا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری دھماکا خیز آمد کے باوجود وہ اسی طرح پڑا رہا تھا۔ یہاں موجود دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بے طرح چونکا۔ یہ فتح محمد تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسے بُری طرح پیٹا گیا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ سر پھٹ چکا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ وہ بھی نیچے کھسکی ہوئی تھی اور اس کے ستر کو بس جزوی طور پر ہی چھپا پا رہی تھی۔ فتح محمد نیم بے ہوش تھا اور اسی عالم میں اس کی سیاہی مائل توند، سانس کی ضرورت کے تحت بے ساختہ پھول پچک رہی تھی۔

میرے ہاتھ افراتفری میں باندھے گئے تھے۔ میں نے معمولی کوشش کے ساتھ انہیں کھول لیا۔ میں نے فتح محمد کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ ”اٹھو، ہوش کرو۔“

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اور کراہ کر رہ گیا۔ اس کے سر کی چوٹ شدید تھی، مسلسل خون رس رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹرے میں کھانے کے جھوٹے برتن پڑے تھے۔ اسٹیل کے ایک جگ میں پانی بھی تھا۔ میں نے فتح محمد کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

میرے کانوں میں تھوڑی دیر پہلے سنا ہوا وہ فقرہ گونجنے لگا جو کسی شخص نے بولا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچا دو۔“

یعنی یہ لوگ مجھے اور فتح محمد کو ایک ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ اس کوٹھی میں گھستے ہی مجھے دھر کیوں لیا گیا تھا۔ فتح محمد کے پکڑے جانے کے بعد یہ لوگ پوری طرح الرٹ ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں جونہی احاطے میں کودا، وہ مجھ پر پل پڑے... لیکن میں ان کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے دو اور چار ٹانگوں والے کم از کم چھ کتوں کو جان لیوا طور پر زخمی کیا تھا۔ آخری زخمی وہ تھا جس پر میں نے جیپ چڑھائی تھی۔ میں اس گنتی میں اسے شامل نہیں کر رہا۔

صورتِ حال نے عجیب پلٹا کھایا تھا۔ میں جب فارم ہاؤس سے چلا تو میری نظر میں فتح محمد ایک مشکوک شخص تھا اور اس کے لیے میرے اندر ایک طیش پرورش پا رہا تھا۔ مگر اب اس طیش کا رخ اس کوٹھی میں موجود غنڈا صفت لوگوں کی طرف ہو گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک ایک معما تھی کہ فتح محمد چوری چھپے یہاں کیوں گھسا اور کیوں اسے یوں بُری طرح زخمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی واردات کی نیت سے آیا تھا، یا یہ آپس کا کوئی گروہی جھگڑا تھا؟

اسی دوران میں سیڑھیوں کے دروازے کے قریب ہنگامے کے آثار نظر آئے۔ یوں لگا کہ کوئی شخص دہاڑ رہا ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے اسے روک رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اوپر مجھ کو چاقو سے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، انور نامی یہ شخص اس زخمی کا بھائی تھا جس کی ناف میں، میں نے چاقو اتارا تھا۔ وہ اسپتال روانہ ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ اب یہ شخص غم و غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔

میرا جسم چوٹوں سے معمور تھا۔ خاص طور سے ٹانگ میں زبردست ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے مزہ دے رہا تھا۔ میرے اندر چوٹوں اور تکلیف کی طلب بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پکار رہا تھا۔ ”آؤ، میرے سامنے آؤ۔ دو دو تین تین ہو کر آجاؤ۔ مجھ سے لڑو۔ تم مجھے مار دو یا میں تمہیں مار دوں۔“ ہاں، آج 18 اپریل تھی۔ آج کے دن وہ جدا ہوئی تھی مجھ سے۔ آج کے دن میں مرا تھا۔ آج کے دن دوبارہ مر جاتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔

دو تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ میں اونگھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کہیں پاس سے ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”میں خود دیکھ لیتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔“

میں دھوکا نہیں کھا رہا تھا۔ یہ آواز جلالی صاحب کے وفادار ساتھی ”سیکریٹری ندیم“ کی تھی۔ میرے اندر امید کی کرن روشن ہوئی۔ ’تو کیا عمران اور دیگر لوگ یہاں پہنچ گئے تھے؟ کیا پولیس بھی ان کے ساتھ تھی؟ کیا انہوں نے اس کوٹھی کے مسلح مکینوں کو زیر کر لیا تھا؟‘ ایسے کئی سوال ذہن میں چمکے۔ بیسمنٹ کے ساتھ والے پورشن میں روشنی ہوئی پھر میں نے آہنی سلاخوں کی طرف سیکریٹری ندیم کو دیکھا... ہاں، وہ ندیم ہی تھا مگر جس حلیے میں تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک انڈر ویئر تھا۔ ہاتھ میں وہسکی کا جام اور

ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ ایک پری پیکر اس کے پیچھے چلی آرہی تھی۔ اس نے ایک ”نائٹ گاؤن“ پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اتنا باریک تھا کہ اپنے ہونے پر شرمندہ دکھائی دیتا تھا... اس کے اندر پری پیکر کا جسم اسی طرح دہک رہا تھا جیسے مہین چلمن کے پیچھے شمع دہکتی ہے۔ پری پیکر کے خدوخال میں ایک خاص بات تھی اور اس نے مجھے حیران کیا... لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی مجھے سیکریٹری ندیم کے حوالے سے تھی۔ اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ جلالی صاحب کا وفادار ترین ساتھی یہاں ایک بالکل مختلف روپ میں موجود تھا۔ ہم جب فارم ہاؤس میں کسی کالی بھیڑ کے بارے میں سوچتے تھے تو بہت سے ملازمین کی طرف دھیان جاتا تھا لیکن سیکریٹری ندیم کی طرف کبھی دھیان نہیں گیا۔ اس کی دھیمی شخصیت، اس کا پُرخلوص انداز، اس کی ملنساری... یہ ایسی چیزیں تھیں شاید، جو اس کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ندیم نے ایک کرسی گھسیٹی اور آہنی سلاخوں کے عین سامنے میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ پری پیکر اس کے عقب میں کسی خدمت گار داشتہ کی طرح کھڑی تھی۔ ندیم کی آنکھوں میں نشہ تھا اور زہر تھا۔ اس نے انگلی سے اپنی ناک پر نظر کی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ”جب کسی حرامی گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم خود ہی یہاں تشریف لے آئے ہو۔ ہمیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔“

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ بڑا بدحال ہے۔ بال بکھرے ہوئے، ناک اور منہ سے بار بار خون رسنے لگتا تھا۔

ندیم کے عقب میں کھڑی لڑکی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے حوالے سے خوف زدہ ہے۔ وہ مجھے انہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن سے پنجرے میں بند کسی خطرناک جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ آہنی سلاخوں کی وجہ سے تحفظ کا احساس تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی تحت الشعور میں رہتا ہے کہ سلاخیں نہ ہوں تو کیا ہو۔ اس لڑکی کے خدوخال نے مجھے چونکایا تھا اور یہ چونکنا بے وجہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے سلطان کے ٹھکانے پر میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس کی شکل و صورت بہت حد تک انڈین فلم اسٹار کرشمہ کپور سے ملتی تھی۔ اب جو لڑکی میرے سامنے تھی، اس کا چہرہ کئی زاویوں سے ایک اور معروف اداکارہ ایشوریا رائے سے مشابہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کے پاس معروف اداکاراؤں سے مشابہت رکھنے والی لڑکیوں کی ”کلیکشن“ ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ جاوا اور سلطان گروپ کے لوگ ہی ہیں...

ندیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں باورچی نہیں ہو، اس کا اندازہ تو مجھے تمہاری آمد کے دو چار روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ پھر جب تم نے جلالی کی جیپ کے پیچھے بھاگ کر اسے روکا اور جیپ کے نیچے سے ٹریکر نکالا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم بھیڑ کی کھال میں کوئی خطرناک اور پلید جانور ہو۔ مگر اتنا اندازہ پھر بھی نہیں ہوا کہ تم بھیڑیے وغیرہ سے بھی زیادہ خطرناک اور پلید ہو۔ تم نے پچھلے ہفتے سلطان جی کے ٹھکانے میں گھس کر نادر اور ایک ملازم کو جان سے مارا اور نیتو کو زخمی کیا... دراصل اس دن تم دونوں نے اپنی بدقسمتی پر مہر لگالی تھی۔“

”بدقسمت کون ہے، یہ وقت بتائے گا۔ تم دور بیٹھے ہو، اگر پاس ہوتے تو میں تمہارے منہ پر ضرور تھوکتا۔ جلالی صاحب نے تمہیں بیٹوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ تم ان کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔“

”میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جو کچھ تم بول رہے ہو اس کی سزا تمہیں تمہارے گمان سے زیادہ ملنے والی ہے۔ یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، وہ بہت بُرا ہے۔ جاوا صاحب فلمی آدمی ہیں۔ دنیا بھر کی فلموں میں آج تک جتنے بھی بڑے بڑے ولن تشریف لائے ہیں، ان کی ساری سختی اور گرمی یکجا ہو کر جاوا صاحب کے اندر آگئی ہے اور اب تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔“

اس نے ذرا توقف کیا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں رکھا۔ ایشوریا کی ہم شکل لڑکی نے جھک کر لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دکھایا۔ اس کا جسم توبہ شکن تھا۔ ندیم سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر اچانک بولا۔ ”سلطانی گواہ بننا پسند کرو گے؟“

”کیا مطلب؟“

”یوں سمجھ لو کہ تمہاری ایک طرف دوزخ ہے اور دوسری طرف جنت۔ دونوں میں داخلے کا ٹکٹ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں مشروط معافی مل سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے نادر اور دیگر دو بندوں کو براہِ راست نہیں مارا۔ اصل قاتل، وہ ماں کا ہیرو عمران بازی گر ہے۔“

”میں ان باتوں کے جواب میں بھی تمہارے منہ پر بس تھوکنا ہی پسند کروں گا۔“

”بہت گرمی ہے... بہت گرمی ہے۔“

”تمہارے خیال سے بھی زیادہ۔“

''اسی لیے تو کہتا ہوں جنت میں آجاؤ۔ یہاں ٹھنڈی ہوائیں ہیں... زمین پر بہشت کا مزہ پاؤ گے۔'' اس نے بڑی ادا سے ایشوریا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ذرا سا گھما کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''یہ فلمی دنیا ایک بہت بڑا پری خانہ ہے... اور جاوا صاحب اس پری خانے کے چار داروغوں میں سے ایک ہیں۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ پری خانوں میں کیا نہیں ہوتا۔''

میں خاموش رہا۔

وہ سمجھا شاید میں کچھ سوچ رہا ہوں لیکن میں تو وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی شان کے مطابق ہوں اور اس کے منہ سے لے کر اس کی دُم تک آگ لگا دیں۔

وہ بولا۔ ''وہ ماں کا ہیرو بہت کھوچل اور خرانٹ بندہ ہے۔ دیکھو، وہ آپ تو بیٹھا ہوا ہے اس ٹھرکی بڈھے جلالی کے پاس۔ یعنی خود تو فارم ہاؤس سے باہر نہیں نکلا اور تم دونوں کو یہاں بھیج دیا ہے مرنے کے لیے۔''

''تم دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''تم اور یہ مُردہ بھینسا۔'' اس نے فتح محمد کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا۔ ندیم اور اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ میں اور فتح محمد اکٹھے فارم ہاؤس سے یہاں آئے ہیں۔ پہلے فتح محمد دیوار پھلانگ کر اندر گھسا، کچھ دیر بعد میں بھی کود پڑا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہاں کوئی خزانہ دفن ہے جسے ڈھونڈتے ہوئے ہم یہاں پہنچ گئے ہیں؟''

''یہ تو تمہیں پتا ہوگا کہ کیا دفن ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم کیوں آئے ہیں؟''

اس نے گہرا کش لے کر الکحل کی بُو والا دھواں ''ایشوریا'' کے عین منہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ اسے ناگوار گزرا ہو لیکن وہ اس کی ذاتی خدمت گار تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو ذرا سی حرکت بھی نہیں دی اور حاکم مرو کی دیگر دست درازیوں کی طرح اس دھوئیں کو بھی خوش دلی سے قبول کیا۔

ندیم بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم دونوں نے یہاں بُوگیر کتوں والا کردار ادا کیا ہے۔ شاید آج میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔ وہ ماں کا ہیرو دیکھنا چاہتا ہوگا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کیوں؟''

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ غلط ہے اور تم خود کسی اندھے کتے کی طرح ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہو تو پھر؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری باتوں کا بُرا نہیں مانوں گا... کیونکہ اس بکواس کے بدلے میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے وہ زبانِ بیان سے باہر ہے۔ اگر تم ماں کے ہیرو کے ساتھ چمٹے رہو گے اور میری آفر سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو تم پر بھی موت کی مہر لگ جائے گی۔ جیسے اس ماں کے ہیرو پر لگی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''جاوا صاحب کے بھرت وچن کا پتا ہے تمہیں؟''

''یہ کیا ہے؟''

وہ ہنسا اور ایشوریا رائے کو دوبارہ اپنی آغوش میں کھینچ کر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا سویٹی! ان باسٹرڈز کو کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی پتا نہیں۔ وہ اس کتے کے پلّے عمران ہیرو کو زندہ سمجھ رہے ہیں جبکہ وہ مر چکا ہے۔ ایک سو دس فیصد مر چکا ہے۔ سمجھو ایک ایسا مرغا جس کا سر کٹا ہوا ہے لیکن وہ ابھی اچھل کود کر رہا ہے۔ ان احمقوں کو بتاؤ سویٹی کہ جاوا صاحب کا بھرت وچن کیا ہوتا ہے۔''

''جی... میں؟'' وہ ہکلائی۔

''ہاں تم...''

وہ ذرا سا جھجکی پھر سیکریٹری ندیم کی آغوش میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی انگلی سے پہلے خود کو اور پھر وھسکی کے جام کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جاوا صاحب کو اس سے اور اس سے بڑی محبت ہے۔ مطلب عورت اور وائن... لیکن کبھی کبھی وہ ان دونوں چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب اپنے آپ سے کوئی کام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ مثلاً... مثلاً...'' وہ ہاتھ نچا کر رہ گئی۔ شاید اسے کوئی مناسب مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔

ندیم بولا۔ ''مثلاً یہ کہ تین چار مہینے پہلے انڈیا کی ایک نئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئن زیڈ نے جاوا صاحب کے آستانے پر حاضری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ دس پندرہ حاضریاں بخوشی لگوا چکی تھی۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے اکسانے پر ایسا کیا تھا۔ اس کا بوائے فرینڈ بھی ایک بہت بڑا بزنس مین ہے۔ بڑی اکڑ تھی اس میں بھی۔ اس اکڑ کی وجہ سے اس نے معاملہ خراب کر لیا۔ جاوا صاحب نے اپنا مشہورِ زمانہ بھرت رکھ لیا۔ اور بھرت یہی تھا جو ابھی تمہیں سویٹی نے بتایا ہے۔ انہوں نے سوگند کھالی کہ جب تک زیڈ ان کے گھر پر آکر ان کے پاؤں نہیں چومے

گی، وہ عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ دیکھو، بڑے بندوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اب کیا زبردست سائنس ہے اس بات میں۔ لیکن شاید یہ تم دونوں احمقوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کو ذرا بتاؤ سویٹی۔''

''جی، آپ ہی بتائیں...'' وہ لجاجت سے بولی۔

ندیم نے کش لے کر دھوئیں کی ایک اور بدبودار پھوار سویٹی عرف ایشوریا کے منہ پر ماری جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ ندیم اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''بندے کی کمزوری ہے کہ وہ بھول جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی سے بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے غصے میں وہ تیزی اور طاقت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس غصے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ منتھی کر لیا جائے تو پھر بھولنے کا عمل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جاوا صاحب عورت اور شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان دونوں چیزوں کی دوری انہیں بُری طرح تڑپاتی ہے۔ ان کا ارادہ کمزور نہیں ہونے دیتی۔ جب جاوا صاحب عہد کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کے ہونے تک وہ ان دونوں چیزوں سے دور رہیں گے تو پھر وہ کام ہر صورت ہوتا ہے اور جلد سے جلد ہوتا ہے۔ تمہارے اس ماں کے ہیرو کے لیے بھی بھرت وچن ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اب وہ ایک سر کٹا مرغا ہے۔ نہ دانہ کھا سکے گا، نہ کسی مرغی سے میل کر سکے گا، نہ بانگ دے سکے گا۔ ایسے مردہ مرغے کے لیے اپنی جان مت گنواؤ۔ سلطانی گواہ بن جاؤ۔ بہت فائدے میں رہو گے۔ ٹھنڈی ہوائیں، پری خانہ...'' اس نے ایک بار پھر گل بدن سویٹی سے رومانی چھیڑ چھاڑ کی۔

وہ ہمارے روبرو ان حرکات پر شرمسار تھی لیکن اس نے اپنے ردِعمل سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''آپ نے ہیروئن زیڈ والی پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔''

وہ وھسکی کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''پوری بات کیا ہونی تھی۔ بس دھوبی پٹکا مار دیا جاوا صاحب نے۔ دفعہ 302 کے ایک پرچے میں ہیروئن کے بوائے فرینڈ کا نام شامل ہو گیا اور ایسا شامل ہوا کہ جناب کے کڑاکے نکل گئے۔ دفعہ 302 کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔ کینسر کی طرح بندے کو لگ جاتی ہے۔ دو ڈھائی مہینے میں ساری چوکڑی بھول گئی۔ ڈیڑھ دو کروڑ روپیا بھی لگ گیا۔ بھاگ دوڑ میں بزنس کی علیحدہ سے بینڈ بجی۔ آخر وہی ہوا جو جاوا صاحب چاہتے تھے۔ اپنے بوائے فرینڈ سے محبت نبھاتے ہوئے زیڈ نے چپکے سے جاوا صاحب کے پاس ''حاضری'' لگوا دی لیکن ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ سب کو پتا چل گیا کہ ''بوائے فرینڈ'' کا نام

پرچے سے کس طرح اور کیوں خارج ہوا ہے۔"

بات کرتے کرتے ندیم خاموش ہو گیا۔ سیل فون کی مترنم بیل سنائی دی تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا رائے نے اپنے نہایت باریک سلیپنگ گاؤن کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک سیل فون نکال کر ندیم کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ کس کی کال ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ندیم ہی کا سیل فون ہے۔ ندیم نے اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔ "جی باس... جی باس... میں آپ ہی کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ جی سر... فارم ہاؤس سے نکلنے والے سارے راستوں پر ہمارے بندے پہنچ چکے ہیں... بالکل گھیرے میں ہے جی۔ قریباً ایک گھنٹا پہلے گھیرا مکمل ہو گیا ہے... نہیں نہیں سر! آپ فکر نہ کریں، وہ نکل نہیں سکے گا۔ بالکل نہیں جناب... یہ جو اس کے دو یار پکڑے گئے ہیں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی فارم سے نکل آئے تھے۔ بہرحال تسلی کی بات ہے جی کہ دونوں خود چل کر اپنے مرنے کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ میرے سامنے پڑے ہیں دونوں پنجرے میں۔ ایک تو خاصا زخمی ہے جی۔"

وہ کچھ دیر تک دوسری جانب سے کی جانے والی بات کو غور سے سنتا رہا اور ادب سے سر ہلاتا رہا۔ اس دوران میں سویٹی چور نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میرے حوالے سے اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس موجود تھا اور یہ ہراس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ندیم نے آخر میں کہا۔ "جی باس... میں نے اسے آفر کر دی ہے۔ امید ہے اس کے کھوپڑے میں بات آ جائے گی۔"

یہ آخری فقرہ غالباً میرے بارے میں کہا گیا تھا۔ میرا دماغ بُری طرح سنسنا رہا تھا۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گمبھیر تھی۔ پورے فارم ہاؤس کو جاوے کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ راستوں کی ناکابندی کی ہوئی تھی۔

فون بند کر کے ندیم نے واپس سویٹی ایشوریا کو تھمایا اور اس نے اسے لائٹر اور سگریٹ کیس کے ساتھ ہی اپنے پیازی رنگ کے گاؤن میں رکھ لیا۔ ندیم نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی آفر کے سلسلے میں تمہیں کل بارہ بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت دوزخ اور جنت والی بات ضرور ذہن میں رکھنا۔ اور ہاں، ایک بات اور... فریب نہیں چلے گا۔ اگر سلطانی گواہ بنو گے تو اس کا سالڈ ثبوت بھی دینا پڑے گا، بالکل سالڈ۔"

میں بس اسے گھورتا رہا۔ وہ بولا۔ "یہ نہیں پوچھو گے کہ سالڈ ثبوت سے کیا مطلب ہے؟... اچھا چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔ سالڈ ثبوت یہ ہو گا کہ تمہیں اس ماں کے ہیرو کو کال کرنی ہو گی اور کال کر کے اسے ایک خاص جگہ پر بلانا ہو گا۔ ہمارے مطلب کی جگہ پر اور... اور اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے گرگوں کی فوج کے ساتھ آئے گا۔ ہمیں تو پھر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا، اس کا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس کی کوئی فوج نہیں ہے... اور نہ اس نے جاوے کی طرح پالتو کتے رکھے ہوئے ہیں... وہ اکیلا تم جیسے بھگوڑوں سے نمٹ سکتا ہے۔"

"غلط فہمیاں ہیں تمہاری۔" وہ کش لے کر بولا۔ "اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ اس کی فوج نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ چھپاتا ہے تم جیسے چچھوں سے۔ اس کے بہت سے گرگے ہیں جو اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ اپنے تئیں ڈان شان بنتا ہے وہ... لیکن اب اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ اب اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا اور یہ بھی خبر ہو جائے گی کہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانا کسے کہتے ہیں۔ اس کو تو اب مرنا ہی ہے لیکن اگر تم زیادہ خون خرابے سے بچنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ وہ کسی طرح اکیلا چلا آئے۔"

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں واقعی اس خبیث کے منہ پر تھوک دوں لیکن میں معاملے کو مزید گرم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے تھا... عین ممکن تھا کہ کوئی راستہ نکل آتا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی سویٹی کو اپنی بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس ساری بات چیت میں لکڑی کے باکس کا ذکر ہوا تھا اور نہ اس میں موجود آراکوئے کا۔ یقیناً ندیم کو بھی پتا تھا کہ ہم جلالی صاحب کے دیگر ملازمین کی طرح آراکوئے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب یہاں جو کارروائی بھی ہو رہی تھی اور ہونے والی تھی، وہ خالصتاً انتقامی تھی اور اس کے ڈانڈے یقیناً چند روز پہلے ہونے والے نادر ٹی ٹی کے قتل سے مل رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سلطان چٹا اور عمران ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور شاید ہاتھوں میں ہاتھ بھی ڈال چکے ہیں۔ دشمنی کی یہ دبی دبی چنگاریاں نادر ٹی ٹی کے قتل کے بعد ایک دم شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور اب کھلی جنگ کی صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا

کہ جاوا گروپ کے درجنوں مسلح افراد فارم ہاؤس کے اردگرد موجود ہیں۔ یقیناً اسی علاقے میں جلالی صاحب کی سیکیورٹی کے لوگ بھی موجود تھے، ان کے درمیان کسی بھی وقت ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

ندیم کے جانے کے بعد میں فتح محمد کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون رس رس کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رائفل کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی گئی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ایک کپڑے کی پٹی بنائی اور سر سے بہنے والا خون بند کیا پھر اس کے چہرے پر گیلا کپڑا پھیرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اسے مدھم آواز میں پکارتا رہا۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد فتح محمد نے پلکوں کو حرکت دی اور اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدلنے لگی۔

آخر، میں اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہمارے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا بیسمنٹ سنسان پڑا ہے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ بظاہر مجھے کوئی خفیہ کیمرا یا مائکروفون قسم کی شے دکھائی نہیں دی۔

فتح محمد مجھے دیکھ کر اور پہچان کر حیران ہوا۔ میں نے اس سے حوصلے تسلی کی باتیں کیں اور اسے باور کرایا کہ میں اس کی مدد کے لیے یہاں پہنچا ہوں۔ اس نے نہایت نحیف آواز میں پانی مانگا۔ میں نے پانی پلایا۔ ایک ڈبے میں تھوڑا سا دودھ بھی بچا ہوا تھا۔ میں نے وہ بھی فتح محمد کے گلے میں ٹپکا دیا۔ اس کا خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اور وہ سخت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "باؤ تابش! میں نے جلالی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ مجھے ان کا درد ہے۔ یہ... یہ سیکریٹری ندیم ایک دم غداری کر رہا ہے۔ جلالی صاحب کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے... اسے معاف نہیں کرنا... بالکل نہیں کرنا۔"

"پر تم یہاں کیسے پہنچے؟"

اس نے کھینچ کر دو تین سانس لیے اور بولا۔ "مجھے اس پر کئی دنوں سے شک تھا۔ دو دن پہلے میں نے اس کا پیچھا کیا۔ یہ اس کوٹھی میں گھسا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا چل رہا ہے، پر... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ میں... آہ... آہ۔" وہ بُری طرح کراہنے لگا۔

اچانک مجھے اپنے بائیں بازو پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس بازو سے میں نے فتح محمد کی کمر کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرا یہ بازو خون سے گیلا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گھوم کر نظر ڈالی اور لرز گیا۔ عقب سے فتح محمد کا پہلو کسی تیز دھار آلے سے چرا ہوا تھا۔ زیریں پسلیاں نظر آ رہی تھیں اور اندرونی چربی بھی۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ زخمی تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔

میں نے پکار کر کہا۔ "کوئی ہے؟"

تیسری چوتھی آواز پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر چوڑے جبڑوں والا ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ یقیناً نیند سے بیدار ہوا تھا۔ "کیا بات ہے وڑی؟ کیا لفڑا ہے؟" وہ مکرانی لہجے میں بولا۔

"اس کی حالت ٹھیک نہیں... اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے... فوراً۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک کراہتے ہوئے فتح محمد کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "تھوڑا صبر کرو وڑی۔ صبح ہونے والی ہے۔ اس کو درد کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔ آرام آ جائے گا۔ باقی کل دیکھا جائے گا۔"

"یہ ٹیکے کا معاملہ نہیں، اس کا زخم زیادہ بڑا ہے۔"

"ٹیکا بھی عام نہیں ہے۔ اس کو بالکل شانت کر دے گا۔ ایک دم پھسٹ کلاس۔" وہ واپس گیا اور تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی اونچی ناک والا کرخت سا شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پسٹل تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ٹیکا ہے۔ ابھی اس میں دوائی ڈالتے ہیں۔" مکرانی نے کہا۔

اونچی ناک والے نے جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نکال کر پسٹل میں لگائی۔ میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ فتح محمد کا منہ کھلا رہ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں چنگھاڑا۔

"ٹیکا لگا رہے ہیں۔ تسلی سے سو جائے گا۔ ہمیں بھی سونے دے گا۔" اونچی ناک والا سفاک لہجے میں بولا۔

"تم یہ نہیں کر سکتے۔" میں نے پھر چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟ تم نادر صاحب کو مار سکتے ہو، فضلو اور راہی کو پار کر سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں کوڑھ تو نہیں ہے۔"

میں نے فتح محمد کو دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور خود کو اس کے سامنے ڈھال بنا دیا۔

''میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ ندیم کو بلاؤ۔''

''وڑی اپن کا مغز کھراب مت کرو۔ ندیم صاحب سینئر ڈاکٹر ہیں۔ ویسے بھی ابھی وہ ایک اور مریض کو دیکھ رہے ہیں بلکہ ''مریضہ'' کو۔ اب وہ صبح ہی ''وارڈ'' کا راؤنڈ لگائیں گے۔ وڑی، انہوں نے ہمیں بتادیا تھا کہ اگر یہ فتح محمد زیادہ درد بتائے تو پھر اسے یہ SOS انجکشن لگا دینا۔''

اونچی پتلی ناک والے نے سائیلنسر لگا پسٹل فتح کی طرف سیدھا کرلیا لیکن فتح تو مکمل طور پر میرے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اونچی ناک والا پھنکارا۔ ''زیادہ ہمدرد مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ مریض کے بجائے تمہارا علاج ہوجائے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے کافی کوشش کی مگر میرا ارادہ اٹل تھا۔ میں سامنے سے نہیں ہٹا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کم از کم یہ لوگ فی الحال مجھے تو قتل نہیں کریں گے۔

اسی دوران میں اونچی ناک والے کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے مؤدب انداز میں کال اٹینڈ کی۔ ''جی ندیم بھائی... جی ہاں... اس کی حالت خراب ہے... کافی خراب ہے... ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی پسٹل بھی دوبارہ اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر اور چھری کے نیچے سانس لے لو... بڑے ''ڈاکٹر صاحب'' نے کہا ہے کہ ابھی ٹیکا رہنے دو۔ لیکن اگر یہ زیادہ ہائے وائے کر کے ہم ''ڈیوٹی ڈاکٹرز'' کی نیند خراب کرے گا تو پھر ٹیکا لگانا ہی پڑے گا۔''

فتح محمد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کراہیں نہ نکل جائیں۔ مکرانی اور لمبی ناک والا ہمیں گھورتے ہوئے واپس چلے گئے۔

''پپ... پانی۔'' فتح محمد نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

میں کھانے کے برتنوں کی طرف بڑھا اور تب اچانک فائر ہوا۔ یہ سائیلنسر لگے پسٹل کا فائر تھا۔ گولی فتح محمد کی عین پیشانی پر لگی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا، اس کی کھلی آنکھوں میں دہشت تھی اور خشک ہونٹ وا تھے۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہنا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا... لمبی ناک والا سفاک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے فلمی اسٹائل میں پسٹل کو پھونک ماری اور اسے بیلٹ میں اڑس کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ ''کتے... خنزیر کی اولاد! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں دیوانہ وار سلاخوں پر جھپٹا۔ میں نے سلاخوں کو جھنجوڑا۔ ان سے اپنا سر ٹکرایا، ان پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ میری آواز سارے در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ مجھے وہی وقت یاد آگیا جب بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ کی دردناک موت کے بعد میں غم و غصے سے دیوانہ ہوا تھا۔ آج بھی کچھ ملتی جلتی کیفیت تھی۔

لمبی ناک والے بدمعاش نے ڈاج دیا تھا۔ مجھے زخمی فتح محمد کے سامنے سے ہٹانے کے لیے اس نے واپسی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے شوٹ کردیا۔ یہ بڑی بے رحمی تھی اور یہ بے رحمی شاید اس لیے بھی دکھائی گئی تھی کہ میری اکڑفوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہوجائے۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اس اچانک موت نے مجھ پر الٹا اثر کیا تھا۔ میرے بدن میں شعلے بھڑک اٹھے تھے... یہ سلاخیں میرے رستے میں حائل نہ ہوتیں تو آج انڈسٹریل ایریا کی یہ کوٹھی بہت بُرا وقت دیکھتی۔

فتح محمد کا لہو فرش پر ایک نہایت افسردہ سی ماتمی لکیر بنا رہا تھا۔ سانس کے لیے اس کی مسلسل حرکت کرتی ہوئی توند اب بالکل ساکت ہوچکی تھی۔ میں نے ایک کپڑا اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ بستر کی ایک کھیس نما چادر سے میں نے فرش پر بہنے والا خون صاف کیا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا شخص بیدار نہیں ہوا تھا۔ نشہ آور نیند نے اسے اردگرد سے یکسر بیگانہ کر رکھا تھا۔

میں نے ٹھنڈے دل دماغ سے غور شروع کیا۔ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔ جاوا کے گروہ نے فارم ہاؤس سے نکلنے والے راستوں پر اپنے بندے مقرر کردیے تھے۔ یہ لوگ پوری طرح مسلح اور ہر کارروائی کے لیے تیار تھے۔ ان لوگوں کا اولین مقصد عمران کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ اب ان لوگوں کو صرف اور صرف عمران کے باہر نکلنے کا انتظار تھا۔

میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا اور گرفت میں آگیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ مجھے چارے کے طور پر استعمال کر کے عمران کو یہاں بلانا چاہ رہے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاسکتا تھا... اور بیدردی سے قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔ اپنی سفاکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ مجھے ابھی دکھا بھی دیا گیا تھا۔ انسانی زندگی کی ان لوگوں کے نزدیک قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی۔ فتح محمد کو صرف اس لیے گولی سے اڑایا گیا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا اور اس کی زندگی کی آس برقرار رکھنے کے لیے اسے لاہور کے کسی اسپتال میں

پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے فتح محمد کی بے حس و حرکت لاش کو دیکھا جو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ میں فتح محمد کو مشکوک سمجھ کر اس کے پیچھے لگا تھا لیکن وہ میرے شک سے بالکل مختلف نکلا تھا اور جس شخص کو ہم جلالی کا سب سے وفادار اور مستعد ملازم سمجھتے تھے، وہ غداری کا مثالی نمونہ بن کر سامنے آیا تھا۔ اب یقینی بات تھی کہ کچھ راتیں پہلے اس نے فارم کے نواحی درختوں میں بھی ڈراما ہی رچایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ لوگ لکڑی کے ایک باکس کو ہتھ ریڑھی پر رکھ کر لائے اور جیپ پر لادا۔ اسے خبر تھی کہ اب جلالی صاحب باکس کی لوکیشن چیک کرنے کے لیے جائیں گے اور وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد رات کے اندھیرے میں جلالی کی پوٹھوہار جیپ کے نیچے ٹریکر ڈیوائس لگانے والا شخص بھی یہی ندیم تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر بڑی سرگرمی سے مشکوک شخص کو ڈھونڈتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنی کارروائیاں بھی ڈالتا رہا۔

...صبح تک کوشش کر کے میں نے خود کو کافی حد تک پُرسکون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ صبح سویرے فتح محمد کی نیم عریاں لاش وہاں سے ہٹالی جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ لوگ اس لاش کی موجودگی کو میری زبان کھلوانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ میں جب فتح محمد کے پیچھے نکلا تھا تو میں نے عمران کو مطلع نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اندر خود بھی فیصلے کرنے کی قوت پیدا ہو... اور اب میں فیصلے کی سولی پر تھا۔ مجھے دوپہر تک کا وقت دیا گیا تھا مگر ٹھیک گیارہ بجے ہی ندیم آن دھمکا۔ اب وہ صاف ستھری پینٹ قمیص میں تھا۔ سرخ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والا محنتی اور تعلیم یافتہ شخص نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک گروہ کا حصہ بن چکا تھا۔

وہ سگریٹ سلگانے کے بعد سلاخوں کی دوسری جانب رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا۔ ''کیا ارادے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''پہلے یہ لاش یہاں سے ہٹاؤ۔''

''اٹھا لیتے ہیں، اتنی جلدی کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو اکٹھی ہی اٹھانا پڑیں۔''

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ تم نے غداری کی ایک زبردست مثال قائم کی ہے، اب تمہیں دوسرے بھی اسی بے غیرتی میں غرق نظر آتے ہیں۔''

''اپنی جان بچانے کو بے غیرتی مت کہو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، اگر تم نے ہمارے مطابق عمل نہیں کیا تو تمہاری اور فتح محمد کی لاشیں تھوڑی دیر میں اکٹھے یہاں سے اٹھیں گی۔''

''باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے یہ دو چار کتے مجھ پر چھوڑ کر دیکھو۔ نظارہ نہ آجائے تو پیسے واپس۔''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولا۔ ''رات رات میں کافی زبان لگ گئی ہے تمہیں۔ ویسے... کتے چھوڑنے والی بات تو تم نے اچھی کہی ہے۔ کل جو دو کتے تم نے قتل کیے ہیں، ان کے بھائی بند کافی غم و غصے میں ہیں۔''

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک خطرناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں رات بھر یہاں پالتو کتوں کی آوازیں سنتا رہا تھا اور وہ بڑے جسیم کتے تھے۔

میرے اور ندیم کے درمیان دس پندرہ منٹ تک معنی خیز مکالمہ ہوا۔ مکالمے کا لبِ لباب یہی تھا کہ میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کروں یا پھر نادرے اور دیگر دو افراد کے قتل کے جرم میں مرنے کے لیے تیار ہوجاؤں۔

اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمنٹ سے باہر پورچ کی طرف تین چار بڑی گاڑیاں آکر رکی ہیں۔ ان گاڑیوں کی آواز سن کر ندیم نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری اور الرٹ ہوکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی اہم شخص یہاں وارد ہوا ہے۔ رات والی سویٹی ایشوریا رائے تیز قدموں سے اندر آئی۔ اب وہ بہتر لباس میں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ ملازمہ نے فرش پر سے سگریٹ کے ٹکڑے اور دیگر فالتو چیزیں اٹھائیں۔ کرسیوں کو درست کر کے رکھا۔ سویٹی نے جلدی جلدی لائٹس آن کیں اور ایک میز پر منرل واٹر کی بوتل سجائی۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں آئیں۔ کئی افراد بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی طرف آرہے تھے، دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے مجھے ایک گرجتی برستی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے ایک غلیظ گالی دی اور کسی پولیس افسر کی شان میں ایک زبردست قصیدہ پڑھا پھر دہاڑتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ و اس کی ماں کے خصم کو۔ لعنت بھیجو۔ تم اس کے بھائی سے رابطہ کرو۔ کسٹم میں ہے۔ اس سے میرا نام لو اور کہو کہ ایک بجے سے پہلے پہلے ہمارا سامان ائرپورٹ سے نکلنا چاہیے۔ ورنہ اس کی بیوی

جب ہری پلیٹ والی ہنڈا کار پر اپنے دونوں بچوں کو لینے اسکول جائے گی تو اسے کچھ نہیں ملے گا... اور صدمے سے تیسرا بچہ جو اس کے پیٹ میں ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔“

قدم دھڑا دھڑ سیڑھیوں پر پڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے مجھے آنے والوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ قریباً ایک درجن کے قریب تھے۔ ندیم اور سویٹی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو چکے تھے۔ آنے والوں میں سب سے آگے پینتیس چالیس سال کا ایک جسیم و توانا شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے... لیکن یہ بہت نمایاں نہیں تھے۔ اس کی ناک چوڑی اور ہونٹ حبشیوں کی طرح موٹے تھے۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں جن میں سے بازوؤں کی مضبوط مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک بدصورت اور ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کے اردگرد مسلح گارڈز تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی جاوا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ گواہی درست ثابت ہوئی۔ ایک سیل فون جاوا کے ہاتھ میں تھا، دوسرا اس کے گارڈ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرے فون پر جاوا نے بات شروع کی تو پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جس دوسرے کالر سے جاوے نے بات شروع کی، وہ اس کی کوئی ساتھی عورت تھی مگر اس سے بات کرتے ہوئے بھی جاوا تواتر سے گالیاں دے رہا تھا۔

بات کرتے کرتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے سیل کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ ان لاک ہوا اور جاوا سمیت درجن بھر مسلح گارڈز اندر گھس آئے... عجیب دہشت اور سنسنی کی فضا تھی۔ ایک گارڈ تیزی سے جھکا۔ اس نے میری ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا اوپر ایک آہنی کڑا پہنا دیا۔ اس کڑے کے ساتھ ایک موٹی زنجیر منسلک تھی۔ زنجیر کے آخری سرے پر بھی ایک کڑا تھا۔ اس کڑے کو سیل کی آہنی سلاخوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ یہ سارا عمل چار پانچ سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ تین چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سیل میں موجود تیسرا شخص نشے کے زیر اثر اب بھی سویا پڑا تھا۔ دو گارڈز اسے اسی حالت میں گھسیٹ کر بیسمنٹ کے دوسرے حصے میں لے گئے۔

جاوے نے فون پر بات ختم کی۔ سرتاپا مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ ندیم نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ ”جی باس! یہی ہے ہیرو کا ساتھی۔ تابش نام ہے اس کا۔ اور یہ فتح محمد ہے۔“ ندیم نے فتح کے خون آلود چہرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ فتح کے خشک ہونٹ وا تھے اور آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔

جاوا پھنکارا۔ ”جو سالا کمینہ مر گیا ہے اس کی بات چھوڑو۔ جو زندہ ہے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالو۔ کیا کہتا ہے یہ کتا؟“

ندیم نے کہا۔ ”سر! میں نے اسے دوپہر تک کا وقت دیا تھا ہیرو کو کال کرنے کے لیے۔“

جاوا بھناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وقت تمہاری والدہ نے ایجاد کیا تھا جو ہر کسی کو دیتے پھرتے ہو؟ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بالکل نہیں ہے۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس نے اپنی قیمتی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ پھر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”بچے! ہونے کو تو تیرے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن معاملہ جلدی کا ہے۔ میں دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور یاد رکھنا میرا نام جاوا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔“ جاوے کے عقب میں سلطان بھی نظر آیا۔ اس کے گلے اور ”زخمی کان“ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جاوے نے ایک گارڈ سے سیل فون لے کر میرے ہاتھ میں دیا پھر ایک دوسرے گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اپنی جدید رائفل کا رخ میرے سر کی طرف کر دیا۔ جاوا دوٹوک لہجے میں بولا۔ ”اس کتے کو کال کرو اور اسے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہیں اس کی مدد کی فوری ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ اسے لاہور، شیخوپورہ روڈ کے تیسرے پل پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے عین سامنے بلا لو۔ یہ لو مکمل ایڈریس۔“ اس نے ایک پرچی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور آخر میں بولا۔ ”میں صرف دس تک گنوں گا بچے۔ اس کے بعد میرے کہے بغیر ہی گولی چل جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر تم نے بات کے دوران میں کوئی غلط اشارہ دینے کی کوشش کی تو بھی گولی چل جائے گی۔“

جاوے کی آواز میں ایک ایسا فیصلہ کن آہنگ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ نہ جانے اس وقت کیوں اچانک ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں آ گیا۔ کیا اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا؟ کیا محبت کے راستے میں صدیوں کا سفر رائگاں گیا؟ کیا یہ اختتام ہے؟ مجھے عمران کو ہرگز نہیں بلانا تھا اور میرے دشمن کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ گولی چلانے سے ہرگز نہیں جھجکے گا۔ جاوا سفاک لہجے میں گنتی شروع کر چکا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا... ایک... دو... تین... چار...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ٹکٹ کی چوری

تنویر ریاض

انسانی نفسیات ہے کہ جو چیز دسترس میں نہ ہو... اس کی طلب چین لینے نہیں دیتی... اور جو سامنے ہو اس کی طرف توجہ مبذول نہیں ہوتی... فریب نظر کا ایک ایسا ہی شاہکار پارہ... ایک ٹکٹ کے غائب ہونے سے شروع ہونے والا واقعہ... جس نے بڑھتے بڑھتے سنگین نوعیت اختیار کرلی...

ایک سراغ رساں کو درپیش صورت حال

جو اپنی ذمے داری نبھانا جانتا تھا...

”یہ بہت ہی ہولناک واقعہ ہے۔ بہت ہی ہولناک...“ بوڑھے یونیکر نے کاؤنٹر پر اپنی کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”اب نیویارک میں دن دہاڑے ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ یہ میرے بہت ہی پرانے گاہک ہیں۔ مسٹر ہیزل! انہیں بھی آج ایک تلخ تجربہ ہوا۔ یہ مسٹر کون ہیں۔

مشہور سراغ رساں اور انسپکٹر رچرڈ کوئن کے بیٹے۔ تم نے ان کے بارے میں اخبارات میں پڑھا ہوگا مسٹر ہیزل۔''

ایلری کوئن نے قہقہہ لگایا اور مسٹر ہیزل کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''یونیکر نے مجھے تمہاری دردناک کہانی سنا دی ہے لیکن میں تمہاری زبان سے تفصیل سننا پسند کروں گا۔''

''تو تم ایلری کوئن ہو؟'' چھوٹے قد کے شخص نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا اور وضع قطع سے کسی مضافاتی بستی کا رہائشی لگتا تھا۔ وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ ''مجھے لوٹ لیا گیا ہے۔''

ایلری نے بے اعتباری سے یونیکر کی بک شاپ کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ یہاں ایسی واردات ممکن ہے؟ یونیکر نے اس کے تیور بھانپ لیے اور جلدی سے بولا۔ ''یہاں کچھ نہیں ہوا۔'' پھر اس نے بتایا کہ یہ واردات مین ہٹن کے وسط میں واقع ایک بغلی گلی میں ہوئی تھی اور یہ دنیا میں آخری جگہ ہوگی جسے چور کسی جرم کے ارتکاب کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔

''یہ واقعہ گزشتہ شب دس بجے پیش آیا۔ میں اسی وقت اپنے دفتر سے نکلا تھا کیونکہ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے دیر تک دفتر میں رکنا پڑ گیا تھا۔ ایک لڑکے نے میرا راستہ روک کر سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس مانگی۔ گلی میں تاریکی تھی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے لڑکے کا یہ انداز پسند نہیں آیا لیکن میں نے اسے ماچس دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ جب میں اپنی جیب سے ماچس نکال رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکے کی نظریں میری بغل میں دبی ہوئی کتاب پر تھیں۔ شاید وہ اس کا عنوان پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''وہ کون سی کتاب تھی؟'' ایلری نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ اسے بھی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا۔

ہیزل نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''یورپ کی ابتر حالت..... اس کتاب کو سب سے زیادہ فروخت ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ میرا تعلق برآمدی شعبے سے ہے اس لیے مجھے بین الاقوامی حالات کے بارے میں تازہ ترین معلومات رکھنا ہوتی ہیں۔ بہرحال، اس لڑکے نے سگریٹ جلا کر ماچس واپس کی۔ میں نے اس کا شکریہ قبول کر کے دوبارہ اپنے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ پھر کسی نے عقب سے میرے سر پر ضرب لگائی اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین پر گرتا ہوا محسوس کیا۔ جب ہوش آیا تو میں ایک گٹر میں پڑا ہوا تھا۔ میرا ہیٹ اور چشمہ دور پتھروں پر جا گرے تھے۔ سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ مجھے لوٹ لیا گیا ہے۔ میری جیب میں خاصی معقول رقم تھی اور میرے کف لنکس میں بھی ہیرے جڑے ہوئے تھے لیکن...''

''لیکن اس نے کتاب کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' ایلری اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر ہیزل! کیا تم اس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

''اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس سے زیادہ میں نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہاں بہت زیادہ اندھیرا تھا۔''

''یہ کچھ نہیں بتا سکتا۔'' بوڑھے یونیکر نے تلخی سے کہا۔ ''یہ بھی تم جیسے امریکنوں کی طرح اندھا اور بہرہ ہے جنہیں سامنے کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اس کتاب کو کیوں چرائے گا؟''

''بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔'' ہیزل بولا۔ ''جب میں گزشتہ شب اپنے گھر پہنچا، میری رہائش نیوجرسی کے علاقے میں ہے تو میں نے اپنے گھر کا تالا ٹوٹا ہوا پایا اور جانتے ہو کہ کیا چیز چوری ہوئی؟''

''میں کوئی نجومی تو نہیں لیکن اپنے قیاس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہاں سے بھی کوئی کتاب چرائی گئی ہوگی۔''

''بالکل.... اور وہ اسی کتاب کی دوسری کاپی تھی۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے ایک ہی کتاب کی دو کاپیاں کیوں خریدی تھیں؟'' ایلری نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنے ایک دوست کو دینے کے لیے دو روز قبل یونیکر سے دوسری کاپی خریدی تھی اور اسے کتابوں کی الماری میں سب سے اوپر رکھ دیا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں ہے۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور دروازے کی چوکھٹ پر بھی کچھ نشانات نظر آرہے تھے۔ صاف لگتا ہے کہ کوئی میرے گھر میں داخل ہوا ہے۔ میری نظر میں تو یہ ڈکیتی کا کیس ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گھر میں اور بھی قیمتی اشیا تھیں لیکن چور نے ان میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا اور صرف وہی کتاب لے کر چلا گیا۔ میں نے فوراً ہی ایسٹ اورنج پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروا دی۔ انہوں نے خانہ پُری کے لیے میرے گھر کا ایک چکر لگایا۔ مجھے تمسخرانہ انداز میں دیکھا اور چلے گئے۔ شاید وہ مجھے پاگل سمجھ رہے تھے۔''

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی کتاب غائب ہے؟'' ایلری نے پوچھا۔

''نہیں، اس ایک کتاب کے علاوہ باقی سب کتابیں

اپنی جگہ پر موجود ہیں۔''

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی۔'' ایلری نے کاؤنٹر پر سے اپنا چشمہ اٹھایا اور اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ ایک ہی شخص کا کام ہو سکتا ہے؟ کیا اسے اتنا وقت مل گیا ہوگا کہ وہ تمہارے پہنچنے سے قبل ہی ایسٹ اورنج جائے اور تمہارے گھر میں چوری کر سکے؟''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔'' ہیزل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے گٹر سے باہر نکلنے کے بعد ایک پولیس والے کو اس واقعے کی اطلاع دی جو کچھ ہی فاصلے پر گشت کر رہا تھا۔ وہ مجھے ایک قریبی پولیس اسٹیشن لے گیا جہاں انہوں نے مجھ سے ڈھیر سارے سوالات کیے۔ اس طرح چور کو اپنا کام کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا ہوگا کیونکہ میں رات ایک بجے کے قریب گھر پہنچا تھا۔''

''تم نے جو کہانی سنائی ہے، اس میں یہی نکتہ قابلِ غور ہے۔'' ایلری اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔ یہ ایک بہت دلچسپ کیس ہے اور مجھے اس پر کام کر کے خوشی ہوگی۔''

یہ کہہ کر ایلری دکان سے باہر نکلا اور شہر کے مرکز میں واقع سینٹر اسٹریٹ کی جانب چل دیا۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں پہنچا لیکن وہ سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ پھر اس نے سارجنٹ ویلی کو ڈھونڈا جو پریس روم میں کسی رپورٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایلری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا میں جلدی میں ہوں اور ایک اہم معاملے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ دو دن پہلے پانچویں اور چھٹے ایونیو کے درمیان انچاسویں اسٹریٹ پر پولیس کسی شخص کو تلاش کر رہی تھی اور اس تعاقب کا اختتام کتابوں کی ایک دکان پر ہوا تھا جو میرے دوست یونیکر کی ملکیت ہے۔ گو کہ اس نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتایا ہے لیکن میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

سارجنٹ ویلی نے اپنے چوڑے جبڑوں کو جنبش دی اور رپورٹر پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دس منٹ بعد وہ ایک کاغذ لے کر واپس آیا اور ایلری کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رپورٹ کے مطابق دو دن پہلے دوپہر کے وقت ایک شخص یونیکر کی دکان سے تین دروازے چھوڑ کر ایک عمارت سے چلاتا ہوا باہر نکلا۔ وہ پولیس کی مدد مانگ رہا تھا۔ اس کی چیخ پکار سن کر گشت پر مامور پولیس مین مائیکل اس کی طرف لپکا۔ اس شخص نے چلاتے ہوئے بتایا کہ کوئی شخص اس کا قیمتی ڈاک ٹکٹ چھین کر بھاگ گیا ہے۔ وہ شخص مسلسل یہی کہے جا رہا تھا۔ میرا ایک پینی کا ٹکٹ، میرا ایک پینی کا ٹکٹ... اس نے بتایا کہ سیاہ مونچھوں اور سیاہ چشمہ لگائے ہوئے وہ شخص ابھی ابھی فرار ہوا ہے۔ مائیکل کو یاد آگیا کہ اس حلیے کا شخص چند منٹ پہلے قریبی کتابوں کی دکان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس شخص کے ہمراہ دکان میں داخل ہو گیا۔

اس کے استفسار پر یونیکر نے بتایا۔ ''ہاں، وہ اندر ہے اور دکان کے عقبی حصے میں کتابیں دیکھ رہا ہے۔''

مائیکل اور متاثرہ شخص تیزی سے دکان کے عقبی حصے میں گئے لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ پچھلی گلی میں کھلنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یقیناً وہ شور و غل سن کر وہاں سے فرار ہو گیا ہوگا۔ مائیکل نے باہر نکل کر قرب و جوار کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

رپورٹ درج کرانے والے شخص کا نام فریڈرک تھا اور وہ ڈاک کے ٹکٹ بیچا کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کے شوقین تین افراد کو قیمتی اور نایاب ٹکٹ دکھا رہا تھا۔ ان میں سے دو تو چلے گئے جبکہ تیسرا جس نے اپنا تعارف بینسن کے نام سے کروایا تھا، عقب سے آکر اس پر جھپٹ پڑا اور اس کے سر پر لوہے کی ایک چھوٹی سی سلاخ دے ماری۔ فریڈرک کے ماتھے سے خون بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ پھر چور نے اسی سلاخ سے شیشے کی الماری کا تالا توڑا جس میں بیش قیمت اور نادر ٹکٹس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چمڑے کا بکس کھول کر اس میں سے ایک انتہائی قیمتی ٹکٹ نکالا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کی مالیت ایک پینی تھی۔ پھر وہ اطمینان سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

فریڈرک کو ہوش آنے اور دفتر کا دروازہ کھول کر باہر آنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ اتنی دیر میں چور کو یونیکر کی دکان میں پناہ لینے اور پھر وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ مائیکل اس کی جانب سے مایوس ہو کر فریڈرک کے ساتھ اس کے دفتر آیا۔ الماری کا معائنہ کیا۔ ان تینوں افراد کے نام اور پتے نوٹ کیے جنہیں اس روز خاص طور پر فریڈرک نے ٹکٹ دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ ایوری بینسن کے بارے میں جو کچھ فریڈرک نے بتایا تھا اس کو خاص طور پر نوٹ کیا اور اپنی رپورٹ ہیڈ آفس روانہ کر دی۔

دوسرے ٹکٹ جمع کرنے والوں کے نام جان اور پیٹر تھے۔ اس واقعے کی تحقیقات کرنے والے سراغ رساں نے

باری باری ان تینوں افراد سے ملاقات کی۔ تیسرے شخص بینسن نے اس واقعے سے مکمل لاعلمی ظاہر کی اور اس کا حلیہ بھی مختلف تھا۔ اس کے چہرے پر مونچھیں تھیں اور نہ ہی اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسے فریڈرک کی جانب سے ٹکٹوں کی نمائش کے بارے میں کوئی دعوت نامہ نہیں ملا۔ البتہ اس نے یہ انکشاف ضرور کیا کہ اس حلیے سے ملتا جلتا ایک شخص دو ہفتے تک اس کی ملازمت میں رہا ہے جسے اس نے اپنے ذاتی ٹکٹوں کے ذخیرے کی دیکھ بھال کے لیے معاون کے طور پر رکھا تھا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش تھی لیکن دو ہفتے بعد وہ اچانک ہی کوئی اطلاع دیے بغیر غائب ہو گیا اور اس روز کام پر نہیں آیا جس دن یہ واقعہ ہوا تھا۔

کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اس واقعے کے اگلے روز یونیکر نے پولیس کو ایک اور عجیب کہانی سنائی۔ جس دن فریڈرک کے یہاں چوری ہوئی، اسی رات ایک شخص اس کی دکان میں آیا اور یورپ کی ابتر حالت، نامی کتاب کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت وہ دکان سے جا چکا تھا۔ البتہ رات کی ڈیوٹی کرنے والا کلرک وہاں موجود تھا۔ اس وقت دکان میں اس کتاب کی سات کاپیاں موجود تھیں جو ساری کی ساری اس شخص نے خرید لیں۔ کلرک کے بیان کے مطابق اس شخص کی سیاہ مونچھیں تھیں اور اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔

''مجھے تو یہ پاگل پن لگتا ہے۔'' سارجنٹ ویلی نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' ایلری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔''

''یہ کہانی ابھی ادھوری ہے۔'' ویلی نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کیس کا ایک نیا رخ سامنے آیا ہے اور گزشتہ شب دو چوریوں کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ ان میں سے پہلی ہارنیل نامی شخص کی ہے جو برونکس کے علاقے میں رہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی نے اس کے اپارٹمنٹ میں گھس کر یورپ کی ابتر حالت، نامی کتاب چرالی جو اس نے دو روز قبل یونیکر کی دکان سے خریدی تھی۔ اس کے علاوہ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دوسری رپورٹ گرین وچ کے گاؤں میں رہنے والی جینٹ میری نے درج کروائی ہے کہ اسی رات اس کے گھر میں بھی چوری ہوئی اور چور یورپ کی ابتر حالت، نامی کتاب کا وہ نسخہ لے گیا جو اس نے اسی روز دوپہر میں یونیکر کی دکان سے خریدا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ، یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟''

''بالکل نہیں ویلی! اپنی عقل کا استعمال کرو۔'' یہ کہہ کر ایلری نے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور بولا۔ ''میرے ساتھ چلو۔ میں یونیکر سے دوبارہ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

''یونیکر!'' ایلری نے پیار سے بوڑھے کتب فروش کے گنجے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''جس وقت وہ چور تمہاری دکان کے عقبی حصے سے نکل کر بھاگا تو تمہارے پاس اسٹاک میں اس کتاب کی کتنی کاپیاں تھیں؟''

''گیارہ۔'' یونیکر نے مختصر سا جواب دیا۔

''جب وہ شام میں ان کتابوں کو خریدنے آیا تو اس وقت بھی تمہارے پاس اسٹاک میں سات کاپیاں موجود تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوپہر سے شام تک چار کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ یونیکر! کیا تم اپنے گاہکوں کا کوئی ریکارڈ رکھتے ہو؟''

''ہاں، بہت کم لوگ کتابیں خریدتے ہیں۔'' یونیکر نے افسردگی سے کہا۔ ''میں ان گاہکوں کے نام اور پتے اپنے پاس نوٹ کر لیتا ہوں۔ کیا تم دیکھنا چاہو گے؟''

''اس وقت میں اس سے زیادہ بڑی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔'' ایلری نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

یونیکر انہیں لے کر دکان کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا اور پھر ایک دروازے سے گزر کر وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں کاغذوں، فائلوں اور پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یونیکر نے ایک بھاری رجسٹر کھولا اور ان لوگوں کے بارے میں بتانے لگا جنہوں نے اس روز اس کتاب کی چار کاپیاں خریدی تھیں۔

''مسٹر ہیزل۔ یہ وہی شخص ہے جس سے تم مل چکے ہو اور اس نے اس کتاب کی ایک اور کاپی خریدی تھی جو بعد میں اس کے گھر سے چوری ہو گئی۔ دوسرا نام مسٹر ہارنیل کا ہے۔ وہ بھی میرے پرانے گاہک ہیں۔ تیسری کتاب خریدنے والی مس جینٹ تھی اور چوتھا نام مسٹر چیسٹر سنگر مین کا ہے۔''

''خدا تمہارا بھلا کرے۔'' ایلری نے بوڑھے سے کہا پھر ویلی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے غور کیا کہ یہاں بھی دکان کے عقبی حصے کی طرح ایک دروازہ ہے جو پچھلی گلی میں کھلتا ہے۔''

پھر اس نے دروازے کے تالے کو غور سے دیکھا جس کے اطراف میں لکڑی نے جگہ چھوڑ دی تھی۔ ایلری نے دروازہ کھولا تو تالے کا بیرونی حصہ اکھڑا ہوا تھا۔ ویلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اس پر زور آزمائی کی گئی

ہے۔ یہ لڑکا مجھے پکا چور لگتا ہے۔"

بوڑھے یونیکر نے غور سے ٹوٹے ہوئے تالے کو دیکھا اور بولا۔ "یہ دروازہ کبھی استعمال نہیں ہوا۔ میں نے بھی اس کا نوٹس نہیں لیا اور نہ ہی اس سراغ رساں نے اس پر غور کیا۔"

"اسے مقامی پولیس کی ناقص کارکردگی ہی کہا جاسکتا ہے ویلی۔" ایلری نے طنزیہ انداز میں کہا پھر یونیکر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہاری کوئی چیز تو چوری نہیں ہوئی؟"

یونیکر ایک قدیم کتابوں کی الماری کی طرف بڑھا جو کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے الماری کا تالا کھولا اور انگلیوں سے کتابوں کو ٹٹولنے لگا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "نہیں، میری کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔"

"میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔" ایلری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایک بات اور۔ تمہارے رجسٹر میں گاہکوں کے کاروباری پتے کے علاوہ گھر کے پتے بھی ہوں گے؟"

یونیکر نے سر ہلایا تو ایلری بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ویلی! ہم پہلے مسٹر چیسٹر سے مل لیتے ہیں۔"

وہ دکان سے باہر آکر ففتھ ایونیو پر چلنے لگے پھر شمال کی جانب مڑ گئے۔ ایلری بولا۔ "ناک کی سیدھ میں چلتے رہو۔"

"مجھے تو اب بھی یہ سب کچھ پاگل پن نظر آتا ہے۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے۔" اس بار ایلری نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے سامنے انتہائی منطقی حقائق موجود ہیں۔ اس چور نے ایک قیمتی ڈاک ٹکٹ چرایا ہے۔ پھر وہ یونیکر کی دکان میں گھس گیا اور یہ ظاہر کیا کہ عقبی حصے میں کتابیں دیکھ رہا ہے۔ جب اس نے پولیس آفیسر اور فریڈرک کے قدموں کی آواز سنی تو سوچ میں پڑ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں وہ ٹکٹ اس کے پاس سے برآمد ہو چنانچہ اس نے جلدی سے وہ ٹکٹ اس کتاب کے صفحات میں رکھ دیا جو شیلف میں رکھی ہوئی تھی اور اس کے فوراً بعد ہی وہ عقبی دروازے سے فرار ہو گیا۔ رات کو جب وہ گاہک بن کر آیا تو اس دوران میں کتاب کی چار کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ اس نے یونیکر کو دکان سے باہر جاتے دیکھا اور اس کی غیر موجودگی میں کلرک سے اسٹاک میں موجود ساتوں کاپیاں خرید لیں لیکن ان میں سے کسی کتاب میں وہ ٹکٹ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ واپس آیا اور رات کی تاریکی میں یونیکر کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ گلی کی جانب کھلنے والے دروازے کے ٹوٹے ہوئے تالے سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے یونیکر کے رجسٹر سے ان چاروں گاہکوں کے نام اور پتے نوٹ کیے جنہوں نے اس روز سہ پہر میں اس کتاب کی کاپیاں خریدی تھیں۔ اگلی رات اس نے مسٹر ہیزل کو لوٹ لیا۔ لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ وہ چند ہفتے پہلے خریدی گئی کتاب تھی اور اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے صرف ایک روز قبل نہیں خریدا گیا ہے۔ لہٰذا اس نے مسٹر ہیزل کے مکان کی طرف دوڑ لگا دی۔ یونیکر کے رجسٹر سے اسے گاہکوں کے دونوں یعنی کاروباری اور گھریلو پتے معلوم ہو گئے تھے۔ وہ مسٹر ہیزل کے گھر واقع ایسٹ اورنج پہنچا اور وہاں سے ایک روز پہلے خریدی ہوئی کتاب چرا لی لیکن وہ ٹکٹ اس میں بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے مسٹر ہارنیل اور مس جینٹ کے گھروں میں نقب لگائی اور وہاں سے بھی اس کتاب کی کاپیاں چرا لیں۔ اب صرف مسٹر چیسٹر باقی رہ گئے ہیں۔ اگر اس چور کو مسٹر ہارنیل اور مس جینٹ کے ہاں سے ملنے والے نسخوں میں وہ ٹکٹ نہیں ملا تو وہ یقیناً مسٹر چیسٹر کے گھر کا رخ کرے گا اور اگر ممکن ہو سکے تو ہم اس چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں گے۔"

چیسٹر سنگر مین ایک نوجوان طالب علم تھا اور اپنے والدین کے ساتھ ایک پرانی وضع کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ ابھی تک اس کے پاس یورپ کی ابتر حالت، نامی کتاب کا نسخہ موجود تھا اور وہ سیاسی معاشیات کے مضمون کی تیاری کے لیے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایلری کے کہنے پر اس نے وہ کتاب فوراً اس کے حوالے کر دی۔ ایلری نے اس کا ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا لیکن وہ گم شدہ ٹکٹ وہاں بھی نہیں تھا۔

"مسٹر چیسٹر! کیا تمہیں اس کتاب کے صفحات میں رکھا ہوا کوئی ڈاک کا ٹکٹ نظر آیا؟" ایلری کو مجبوراً اس سے یہ سوال کرنا پڑا۔

طالب علم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ابھی تک اس کتاب کو کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔ آپ کس ٹکٹ کی بات کر رہے ہیں؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟ میرے پاس تو اپنا ایک چھوٹا سا ذخیرہ ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ایلری نے جلدی سے کہا۔

وہاں سے واپسی میں اس نے سارجنٹ ویلی سے کہا۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ چور کو وہ ٹکٹ مسٹر ہارنیل یا مس جینٹ کی کتاب سے مل گیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان میں سے کس کے گھر پہلے چوری ہوئی تھی؟"

"جہاں تک مجھے یاد ہے مس جینٹ کا نمبر بعد میں آیا تھا۔"

"تب تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ٹکٹ اس کی کتاب میں تھا۔"

اچانک ہی اس کی نظر ایک عمارت پر گئی۔ وہ بولا۔ "مسٹر فریڈرک کا دفتر اسی عمارت میں ہے۔ آؤ اس سے بھی مل لیتے ہیں۔"

ایلری اور سارجنٹ ویلی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے دفتر میں پایا۔ دیواروں پر شیشے کے کیس لگے ہوئے تھے جن میں سیکڑوں کی تعداد میں منسوخ اور غیر منسوخ شدہ ٹکٹ نظر آرہے تھے جبکہ زیادہ قیمتی ٹکٹوں کے لیے خصوصی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں وہاں تین افراد دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کے رخسار کی ہڈی پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ وہ یقیناً فریڈرک تھا۔ دوسرا شخص طویل قامت اور دبلا پتلا تھا اور اس میں فریڈرک سے بہت زیادہ مشابہت نظر آرہی تھی جبکہ تیسرا شخص خاموش اور پُرسکون نظر آرہا تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

ایلری نے اپنا اور سارجنٹ ویلی کا تعارف کروایا تو تیسرا آدمی اپنے کان مروڑتے ہوئے بولا۔

"میرا نام ایشلے ہے اور میں انشورنس کمپنی کی طرف سے تحقیقات پر مامور ہوں۔ یہ دونوں بھائی مسٹر فریڈرک اور مسٹر البرٹ اس دفتر کے مالک ہیں۔ جس روز یہ واقعہ پیش آیا' مسٹر البرٹ دفتر میں نہیں تھے ورنہ چور موقعِ واردات پر ہی پکڑا جاتا۔"

فریڈرک نے جلدی جلدی وہ واقعہ سنایا۔ ایلری اس کے لہجے پر مسکراتا رہا اور ہر لفظ پر سر ہلاتا رہا۔ "مسٹر فریڈرک! جہاں تک میں صورت حال کو سمجھ سکا ہوں' وہ کچھ یوں ہے کہ تم نے ان جانے پہچانے ٹکٹ جمع کرنے والوں کو نایاب ٹکٹوں کو دیکھنے کے لیے بلایا کیونکہ تم سمجھتے تھے کہ یہ شوقین حضرات ان ٹکٹوں کی منہ مانگی قیمت دے سکیں گے۔ ان میں ہنچ مین، پیٹر اور بینسن شامل تھے۔ پہلے دو لوگوں کو تم شکل سے پہچانتے تھے لیکن بینسن کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں نے بہت سے ٹکٹ خریدے لیکن بینسن ان کے جانے کے بعد بھی رکا رہا اور موقع ملتے ہی اس نے تم پر حملہ کر دیا۔ یہ سب باتیں میں پہلے سے جانتا ہوں۔ کیا تم مجھے وہ الماری دکھاؤ گے؟"

دونوں بھائی اسے دفتر کے وسط میں رکھی ہوئی ایک میز پر لے گئے جس پر لکڑی کا بنا ہوا ایک بڑا سا بکس رکھا ہوا تھا اور اس کے اوپری حصے کو شیشے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ بکس کے اندر سیاہ ساٹن کے ٹکڑے پر کئی ٹکٹ رکھے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک چمڑے کا کیس رکھا ہوا تھا جو خالی تھا۔

ایلری کی تیز نگاہوں نے لکڑی کے باکس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مسٹر فریڈرک! تم جس ٹکٹ کے چوری ہو جانے کی بات کر رہے ہو، کیا وہ اسی چمڑے کے بکس میں رکھا ہوا تھا۔"

"ہاں، لیکن یہ باکس اس وقت بند تھا جب چور نے بڑے بکس کا ڈھکنا ہٹایا۔"

"لیکن اس نے وہی ٹکٹ کیوں چرایا جبکہ اس بکس میں اور بھی کئی نایاب و قیمتی ٹکٹ رکھے ہوئے ہیں؟"

فریڈرک نے اپنے زخمی گال پر ہاتھ رکھا اور کراہتے ہوئے بولا۔ "اس بکس میں رکھے ہوئے ٹکٹ بیچنے کے لیے نہیں ہیں اور ان کی مالیت سیکڑوں میں ہے لیکن جب وہ تینوں ٹکٹ دیکھنے آئے تو فطری طور پر ان نایاب ٹکٹوں کا بھی تذکرہ ہوا۔ میں نے انہیں یہ قیمتی ٹکٹ دکھانے کے لیے بکس کھولا تو اس چور نے اس قیمتی ٹکٹ کو نگاہ میں رکھ لیا۔ وہ یقیناً ٹکٹوں کی پہچان رکھتا تھا ورنہ اسی مخصوص ٹکٹ کو چوری کے لیے منتخب نہ کرتا۔"

"کیا ان ٹکٹوں کی کوئی تاریخی اہمیت ہے؟" ایلری نے پوچھا۔

"یقیناً۔" انشورنس کمپنی کا نمائندہ ایشلے بولا۔ "مارکیٹ میں سب لوگوں کو معلوم ہے کہ مسٹر فریڈرک کے پاس دو ایک جیسے منفرد ٹکٹ ہیں جنہیں ایک پینی میں بلیک کیا جاتا ہے۔ یہ ٹکٹ پہلی بار برطانیہ میں 1840ء میں جاری ہوا۔ اب بھی ایسے ٹکٹ مل جائیں گے اور امریکن کرنسی میں ان کی قیمت زیادہ سے زیادہ سترہ ڈالرز ہے لیکن مسٹر فریڈرک کے پاس جو دو ٹکٹ ہیں، ان میں سے ہر ایک تیس ہزار ڈالرز کا ہے اور اسی وجہ سے چور اس ٹکٹ کی جانب متوجہ ہوا۔ میری کمپنی اس معاملے میں بُری طرح پھنس گئی ہے کیونکہ ہم نے ان ٹکٹوں کا پوری مالیت کا بیمہ کیا تھا۔"

"تیس ہزار ڈالرز۔" ایلری نے حیرت سے کہا۔ "ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے کی یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

البرٹ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ان دونوں ٹکٹوں پر ملکہ وکٹوریہ کے دستخط ہیں۔ دراصل سر رولینڈ ہل نے یہ ٹکٹ جاری کیے تھے۔ ان دنوں انگلستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح ڈاک کا نظام ٹھیک نہیں تھا۔ لہٰذا ملکہ بہت خوش ہوئی اور اس نے پہلے دو ٹکٹوں پر اپنے دستخط کر دیے جن کی وجہ سے ان ٹکٹوں کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ یہ ٹکٹ ہمارے ہاتھ لگ گئے۔"

"دوسرا ٹکٹ کہاں ہے؟ میں بھی ایک نظر اس نایاب ٹکٹ پر ڈالنا چاہتا ہوں۔"

دونوں بھائی اٹھ کر دفتر کے کمرے میں رکھے ہوئے سیف کی طرف گئے۔ واپسی میں البرٹ کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا کیس تھا اور وہ اسے اس طرح پکڑے ہوئے تھا جیسے اس میں سونا بھرا ہوا ہو۔ ایلری نے اس ٹکٹ کو انگلی سے پکڑ کر دیکھا، وہ اسے سخت اور موٹا محسوس ہوا۔ وہ ایک عام سا ٹکٹ تھا جس کے گرد سیاہ حاشیہ بنا ہوا تھا اور درمیان میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر سیاہ روشنائی سے ملکہ کے دستخط نظر آرہے تھے۔

"دونوں دیکھنے میں ایک جیسے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ دستخطوں میں بھی کوئی فرق نہیں۔" فریڈرک بولا۔

"واقعی بڑی دلچسپ بات ہے۔" ایلری نے انہیں کیس واپس کرتے ہوئے کہا۔ دونوں بھائی اسے لے کر ایک بار پھر سیف کی طرف گئے اور ایک دراز میں وہ کیس رکھ کر سیف کو بند کر دیا۔

"کیا تم نے مہمانوں کے معائنے کے بعد لکڑی کے بکس کا ڈھکنا بند کر دیا تھا؟" ایلری نے پوچھا۔

"ہاں۔" فریڈرک نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے ایک پینی والے ٹکٹ کا کیس بند کیا اور اس کے بعد بڑے کیس کو بھی تالا لگا دیا تھا۔"

"کیا تم نے ان تینوں کو دعوت نامے خود بھیجے تھے کیونکہ مجھے اس دفتر میں کوئی ٹائپ رائٹر نظر نہیں آرہا؟"

"ہم تمام خط و کتابت کے لیے ایک اسٹینوگرافر کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو اسی عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھتا ہے۔"

ایلری نے ان دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کیا اور ویلی کو لے کر دفتر سے باہر آگیا۔ اسٹینوگرافر کے کمرے میں ایک دلکش نقش و نگار والی نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ سارجنٹ ویلی نے اسے اپنا کارڈ دکھایا اور دوسرے ہی لمحے اس لڑکی نے وہ فائل ان کے سامنے رکھ دی جس میں ان تینوں مہمانوں کو بھیجے جانے والے دعوت ناموں کی نقل رکھی ہوئی تھی۔ ایلری نے ان تینوں کے نام اور پتے نوٹ کیے اور لڑکی کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل دیا۔

سب سے پہلے وہ جان ہنچ مین کے پاس گئے۔ وہ ایک فربہ اندام سفید بالوں والا بوڑھا شخص تھا۔ اس نے بڑی بیزاری سے ان کے سوالوں کے جواب دیے اور اعتراف کیا کہ دو دن پہلے وہ فریڈرک کے دفتر گیا تھا۔ وہ پیٹر کو جانتا ہے لیکن بینسن سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ ایک پینی ٹکٹ کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ تمام ٹکٹ جمع کرنے والے جانتے ہیں کہ فریڈرک کے پاس ایسے دو نایاب ٹکٹ موجود ہیں جن پر ملکہ وکٹوریہ نے دستخط کیے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ بینسن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور وہ ٹکٹ چوری ہونے سے پہلے وہاں سے چلا آیا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ٹکٹ کس نے چرایا، بس وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

سارجنٹ ویلی کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن ایلری نے اسے گھورا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔ اب ان کی منزل پیٹر کا گھر تھی۔ وہ ایک درمیانی عمر کا لمبا اور دبلا شخص تھا۔ جب ایلری نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ فوراً تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے تصدیق کی کہ وہ اور جان تیسرے آدمی سے پہلے ہی دفتر سے چلے گئے تھے لیکن اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ البتہ اس نے دوسرے لوگوں سے بینسن کا نام سن رکھا تھا۔ وہ بھی ایک پینی والے ٹکٹ کے بارے میں جانتا تھا اور اس نے دو سال پہلے اس ٹکٹ کو خریدنے کی کوشش کی تھی مگر فریڈرک نے اسے بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

"بہت ہی عجیب شوق ہے۔" ایلری نے باہر آکر سارجنٹ ویلی سے کہا۔ "میں تو اسے دیوانگی ہی کہوں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ لوگ اپنے مطلوبہ ٹکٹ کی خاطر کسی کا قتل بھی کر سکتے ہیں۔"

ایوری بینسن سے ملنے کے لیے انہیں دریا کے نزدیک ایک پرانے مکان میں جانا پڑا۔ وہ ایک شائستہ شخص تھا اور اس نے ایلری کے سوال کے جواب میں کہا۔ "میں نے وہ دعوت نامہ نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ حرکت ولیم پلینک کی ہے۔ اسے میں نے دو ہفتے پہلے معاون کے طور پر ملازم رکھا تھا تاکہ وہ میرے ٹکٹوں کے ذخیرے کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ان تمام خطوط کو بھی دیکھ سکے جو بہت بڑی تعداد میں مجھے موصول ہوتے ہیں۔ وہ شخص ٹکٹوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ دو ہفتے تک اس نے مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ یقیناً وہ دعوت نامہ اس نے ہی وصول کیا ہوگا اور موقع غنیمت جان کر میری جگہ فریڈرک کے دفتر چلا گیا جہاں اس نے خود کو بینسن کے طور پر متعارف کروایا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ کرنا بہت آسان تھا کیونکہ فریڈرک یا اس کا بھائی مجھے چہرے سے نہیں پہچانتے تھے۔"

"اس واقعے کے بعد تمہاری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی؟" ایلری نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس حرکت کے بعد اس کے واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"وہ تمہارے لیے کیا کام کرتا تھا؟"

"عام نوعیت کے کام جیسے ٹکٹوں کو الگ کرنا، ان کی کیٹلاگ بنانا، خطوط کے جوابات دینا وغیرہ وغیرہ۔ وہ گزشتہ دو ہفتوں سے میرے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں کنوارا ہوں اور اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہوں لہٰذا اس کو ساتھ رکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ گو کہ وہ کچھ خبطی سا تھا۔"

"خبطی۔" ایلری نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ کسی سے نہیں ملتا تھا اور نہ ہی کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ ان دو ہفتوں کے دوران میں اس روز وہ پہلی بار گھر سے باہر گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب میرے دوست ملنے آتے تو وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا جیسے وہ لوگوں میں گھلنا ملنا نہیں چاہتا ہو۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی شخص اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا؟"

"بدقسمتی سے ایسا ہی ہے۔ وہ ایک لمبے قد اور درمیانی عمر کا شخص ہے البتہ اپنی گھنی سیاہ مونچھوں اور سیاہ چشمے کی وجہ سے بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔"

ایلری نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اس شخص کی عادتوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ بعض اوقات لوگ چہرے سے معصوم نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر ایک مجرم چھپا ہوتا ہے۔ براہِ کرم اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔ کیا تمہیں وہ اپنی عادت کے اعتبار سے انوکھا اور عجیب محسوس نہیں ہوا؟"

بینسن نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے جیسے کچھ غور کر رہا ہو پھر اس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ہاں، یاد آگیا۔ اسے زور زور سے سانس لینے کی عادت تھی۔"

ایلری اور سارجنٹ ویلی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر ایلری مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے والد کو بھی یہی عادت ہے اور میں بچپن سے ہی انہیں اس طرح دیکھتا آرہا ہوں۔ کیا وہ باقاعدگی سے اس طرح سانس لیتا تھا؟"

"میں اس بارے میں ٹھیک طرح نہیں بتا سکتا۔" بینسن نے جواب دیا۔ "دراصل ان دو ہفتوں کے دوران میں نے اسے صرف ایک مرتبہ ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا حالانکہ میں اس کمرے میں سارا دن اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے گزارتا تھا۔ یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے جب میں کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور جب واپس آیا تو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں ایک بکس پکڑے ہوئے اسے سونگھ رہا ہے جیسے زور زور سے سانس اندر لے رہا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے وہ بکس دور رکھ دیا۔ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ اگر وہ سگریٹ پی رہا ہوتا تو میں اسے فوراً ملازمت سے برخاست کر دیتا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک معاون کو اسی وجہ سے نکال چکا تھا۔"

ایلری کے چہرے پر تازگی آگئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کا پتا بھی معلوم نہیں ہوگا؟"

"نہیں، مجھ سے غلطی ہوئی کہ کسی تحقیق کے بغیر اسے ملازم رکھ لیا۔" بینسن نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں خوش قسمت ہوں کہ اس نے میرے یہاں سے کوئی چیز نہیں چرائی حالانکہ میرے پاس بھی بڑے قیمتی ٹکٹ ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" ایلری نے خوش گوار لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"مسٹر بینسن! کیا میں تمہارا ٹیلی فون استعمال کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔"

ایلری نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کھولی اور اس میں سے نمبر دیکھ کر کئی جگہ فون کیے۔ اس نے اپنی آواز اتنی آہستہ رکھی کہ بینسن اور ویلی میں سے کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا کہ وہ کیا بات کر رہا ہے۔ پھر اس نے ٹیلی فون رکھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر بینسن! اگر تم آدھا گھنٹا دو تو میں تمہیں اپنے ساتھ سیر کے لیے شہر کے مرکز میں لے جانا چاہتا ہوں۔"

بینسن حیران رہ گیا لیکن مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہارے ساتھ چل کر خوشی ہوگی۔"

باہر آکر انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس میں سوار ہو کر انچاسویں اسٹریٹ کی طرف چل دیے۔ یونیکر کی دکان کے باہر پہنچ کر اس نے ٹیکسی رکوائی اور وہ تینوں باہر آگئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی اور دوڑتا ہوا دکان میں داخل ہوگیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوگئی۔ اب اس کے ساتھ یونیکر بھی تھا جو لرزتے ہاتھوں سے دکان کو تالا لگا رہا تھا۔

فریڈرک کے دفتر میں دونوں بھائیوں کے علاوہ انشورنس کمپنی کا نمائندہ اینشلے اور یونیکر کا گاہک ہیزل، ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ایلری نے انہیں دیکھتے ہی خوش مزاجی

سے کہا۔ ''تم لوگوں کو یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہورہی ہے۔'' پھر وہ فریڈرک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں ایک چھوٹی سی کانفرنس کرنا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد یہ معما حل ہوجائے گا۔''

فریڈرک نے اپنا سر کھجایا جبکہ البرٹ ایک کونے میں خاموش بیٹھا رہا البتہ اس نے ایلری کی تائید میں سر ہلا دیا۔

''ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے مسٹر پیٹر اور مسٹر جان کو بھی بلایا ہے، وہ بس آتے ہی ہوں گے۔''

اس دوران میں سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی بے چینی کا اظہار نہیں کررہا تھا۔ ایلری نے نظریں گھما کر دفتر کا جائزہ لیا اور تجسس سے اس دیوار کی جانب دیکھنے لگا جہاں نصب الماری میں قیمتی اور نایاب ٹکٹ رکھے ہوئے تھے۔ سارجنٹ ویلی بھی اس کی حرکتوں کو نوٹ کررہا تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ جان اور پیٹر ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازے کی دہلیز پر رک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کندھے اچکائے اور اندر چلے آئے۔

جان تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر ایلری! یہ کیا تماشا ہے؟ تم جانتے ہو کہ میں مصروف شخص ہوں۔''

''میرے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں ہے۔'' ایلری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تعارف کروانے کی ضرورت نہیں۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں ـــ براہِ کرم سب لوگ تشریف رکھیں۔''

دروازہ کھلا اور ایک چھوٹے سے شخص نے اندر جھانکا۔ سارجنٹ ویلی اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ پھر ایلری نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''ڈیڈی! اندر آجائیں۔ آپ بالکل صحیح وقت پر پہنچے ہیں۔ پہلا سین شروع ہونے والا ہے۔''

انسپکٹر رچرڈ کوئن نے اپنا سر گھمایا۔ ایک نظر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹے! کیا میں تم سے اس طلبی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''کچھ زیادہ ہیجان خیز بات نہیں اور نہ ہی یہاں کوئی قتل ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میں آپ کے لیے دلچسپی کا پہلو ضرور ہوگا انسپکٹر کوئن۔''

انسپکٹر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایلری کرسیوں کے درمیان کھڑا ہوا سب لوگوں کے متجسس چہرے پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''جس کسی نے بھی ایک پینی والا وہ قدیم ٹکٹ چرایا ہے، اس نے ہمارے لیے غیر دلچسپ مسئلہ پیش نہیں کیا کیونکہ یہ کیس حل ہوچکا ہے۔''

''کیا یہ ٹکٹ چوری کا وہی کیس ہے جس کی بازگشت ہیڈکوارٹر میں بھی سنی جارہی ہے؟'' انسپکٹر کوئن نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ایلری نے سر کو جھکاتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''تم نے ابھی کہا کہ کیس حل ہوگیا ہے؟'' بینسن چونکتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔ کیا تم نے مطلوبہ شخص پلینک کو تلاش کرلیا؟''

ایلری نے سر انکار کرنے کے انداز میں ہلایا اور بولا۔ ''میں نے کبھی بھی مسٹر پلینک کو پکڑنے کا ارادہ نہیں کیا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ سیاہ مونچھیں اور تاریک شیشوں کا چشمہ اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ جس شخص کو بھی جرم کا کھوج لگانے سے تھوڑی بہت واقفیت ہے، وہ بتا سکتا ہے کہ کوئی بھی عام آدمی کسی چہرے کو ایسی ہی معمولی نشانیوں سے شناخت کرسکتا ہے۔ سیاہ مونچھیں لوگوں کی نظروں میں فوراً آجاتی ہیں اور اسی طرح تاریک شیشوں کا چشمہ بھی آپ کی یادداشت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ مسٹر ہیزل جو یہاں موجود ہیں اور یونیکر کے کہنے کے مطابق ان کی قوتِ مشاہدہ کافی کمزور ہے، انہوں نے بھی وقوعہ کی رات اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں یہ دیکھ لیا تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے شخص کی سیاہ گھنی مونچھیں تھیں اور اس نے تاریک شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس سے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ پلینک نے جان بوجھ کر یہ حلیہ اختیار کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ ان خصوصیات کی وجہ سے اسے یاد رکھیں۔ میں اس خیال سے متفق ہوں کہ اس نے اپنی اصل شخصیت کو چھپانے کے لیے یہ روپ اختیار کیا۔ اس کی مونچھیں نقلی تھیں اور عام طور پر وہ چشمہ نہیں پہنتا تھا۔''

اس کی یہ بات سن کر سب سر ہلاتے رہے۔

''یہ ان تین نفسیاتی نشانیوں میں سے پہلی تھی جو مجرم نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنائی تھیں۔'' پھر وہ اچانک ہی انسپکٹر رچرڈ کوئن کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈی! آپ کو بہت پرانی سانس کی بیماری ہے۔ آپ دن میں کتنی بار شیشی کے ذریعے دوا اپنی سانس کی نالی میں کھینچتے ہیں؟''

انسپکٹر نے پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ''ہر آدھ گھنٹے بعد یا کبھی اس سے بھی زیادہ۔''

''مسٹر بینسن نے مجھے بتایا ہے کہ دو ہفتوں کے دوران میں انہوں نے پلینک کو صرف ایک مرتبہ کوئی چیز ناک میں لے جاتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ پورا دن ساتھ بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے۔ اس روشن حقیقت پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔''

وہاں موجود لوگوں کے بے تاثر چہرے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ روشنی دیکھنے کے باوجود یہ نکتہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور ان کے ذہن بدستور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ البتہ انسپکٹر رچرڈ سمجھنے کے انداز میں سر ہلا رہا تھا اور خاموشی سے سب کے چہرے پڑھ رہا تھا۔

ایلری نے سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کا مرغولہ فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ دوسری نفسیاتی علامت تھی اور اب ہم تیسری کی جانب آتے ہیں۔ مسٹر فریڈرک کا کہنا ہے کہ پلینک نے ایک قیمتی ٹکٹ چرانے کے لیے سرِعام ان پر حملہ کیا جبکہ ان حالات میں کوئی بھی چور تیزی سے اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ مسٹر فریڈرک نیم بے ہوش ہوئے تھے اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ ہوش میں آکر چلانا شروع کردیں یا اس اثنا میں کوئی اور گاہک وہاں آجائے یا غیر متوقع طور پر مسٹر البرٹ کی واپسی ہوجائے وغیرہ وغیرہ...''

''ایک منٹ۔'' انسپکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر فریڈرک کے پاس اس طرح کے دو ٹکٹ تھے۔ میں وہ دوسرا ٹکٹ دیکھنا چاہتا ہوں جو اب بھی یہاں موجود ہے۔''

ایلری نے سر ہلاتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم دونوں میں سے کوئی یہ ٹکٹ نکال کر لاسکتا ہے؟''

فریڈرک اپنی جگہ سے اٹھا اور بے دلی سے الماری کی جانب بڑھا۔ اس نے لوہے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھر ایک چمڑے کا کیس لیے ہوئے واپس اپنی جگہ پر آگیا جس میں وہ دوسرا ٹکٹ رکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے اس دبیز ناکارہ کاغذ کے ٹکڑے کا تجسس بھری نظروں سے جائزہ لیا جس کی قیمت تیس ہزار ڈالرز تھی۔ ایلری کی طرح وہ بھی اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ٹکٹ تقریباً اس کے ہاتھ سے گرنے والا تھا جب اس نے ایلری کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

''سارجنٹ ویلی! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اپنا ریوالور مجھے عاریتاً دے سکتے ہو؟''

ویلی نے اپنی پشت کی جیب سے لمبی نال والا ریوالور نکال کر اسے پکڑا دیا۔ ایلری نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور کمرے کے وسط میں رکھے ہوئے بڑے بکس کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اپنے تیسرے نکتے کی طرف آتا ہوں اور یہ کہ پلینک نے اس بکس کو کھولنے کے لیے ایک لوہے کی سلاخ استعمال کی اور شیشے کے ڈھکنے کو اٹھانے کے لیے ضروری تھا کہ اس نے ڈھکنے اور بکس کی دیواروں کے درمیان سلاخ کو چار مقامات سے اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ جیسا کہ ڈھکنے پر پڑے ہوئے چار نشانات سے ظاہر ہورہا ہے۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ اس باکس میں تالا لگا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک چمڑے کے بکس میں وہ ٹکٹ رکھا ہوا تھا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں ایک چور کو کیا کرنا چاہیے؟''

وہ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے جبکہ انسپکٹر کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ سارجنٹ ویلی بھی طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایلری نے اپنی بات جاری رکھی۔

''یہ سب کچھ بالکل واضح ہے۔ ایک منٹ کے لیے تصور کیجیے کہ میں پلینک ہوں اور میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں بلکہ لوہے کی سلاخ ہے اور میں اس بکس کے پاس کھڑا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ وہ اپنا ریوالور والا ہاتھ سر سے اوپر لے گیا پھر جان بوجھ کر اس کی نال بکس کے اوپر لگے ہوئے شیشے کے قریب لانا شروع کردی۔ اچانک ہی البرٹ کی چیخ ابھری۔ ایلری کا ہاتھ شیشے سے نصف انچ دور رہ گیا۔

''بے وقوف۔ شیشے کو مت توڑو۔'' البرٹ چلاتے ہوئے بولا اور آگے بڑھ کر بکس کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلا دیے جیسے وہ اس میں رکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کرنا چاہ رہا ہو۔

ایلری طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔''

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' البرٹ نے گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ تم ہی ولیم پلینک ہو اور فریڈرک تمہارا ساتھی ہے۔'' ایلری نے شریفانہ لہجے میں کہا پھر اس نے دونوں بھائیوں کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سارجنٹ ویلی ان دونوں کے سر پر سوار تھا۔ البرٹ کی حالت غیر ہوچکی تھی۔

''یہ سب بہت سادہ اور بنیادی نوعیت کی قیاس آرائی ہے۔'' ایلری نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''سب سے پہلے ہم تیسرے نکتے کی بات کرتے ہیں۔ چور کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ لوہے کی سلاخ سے شیشے کو توڑ دیتا پھر اس نے اپنا قیمتی وقت چار جگہ سے اس ڈھکنے کو ہٹانے کے لیے کیوں ضائع کیا؟ شاید بکس میں رکھے ہوئے دوسرے ٹکٹوں کو بچانے کے لیے جو ساٹن کے ٹکڑے پر رکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ابھی مسٹر البرٹ نے ظاہر کیا تھا جب میں ریوالور کی

نال سے شیشہ توڑنے والا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ان ٹکٹوں کو بچانے کے لیے کیوں فکرمند ہوگا۔ ہنچ مین، پیٹر، بینسن یہاں تک کہ فرضی ولیم پلینک بھی نہیں۔ صرف ان ٹکٹوں کے مالکان ہی اس طرح سوچ سکتے ہیں۔''

بوڑھا یونیکر اپنی جگہ پر کسمساتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ بہت چالاک اور ہوشیار شخص ہے؟ لیکن ایسا تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''کیا وجہ تھی کہ پلینک نے اس بکس میں رکھے ہوئے دوسرے ٹکٹوں کو ہاتھ نہیں لگایا؟ ممکن ہے کہ ان کی مالیت ایک پنی والے ٹکٹ جتنی نہ ہو۔ بہرحال وہ بھی قیمتی ٹکٹ ہیں اور کیا کسی چور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ موقع ملنے کے باوجود انہیں چھوڑ کر صرف ایک مخصوص ٹکٹ ہی لے جائے؟ لیکن پلینک نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اگر یہ دونوں بھائی ہی چور ہیں تو دوسرے ٹکٹوں کی چوری ان کے لیے غیر اہم تھی۔''

''اور وہ سونگھنے والا کیا قصہ ہے؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''یہ حقیقت ہے کہ مسٹر بینسن کے ہاں دو ہفتے کام کرنے کے دوران پلینک نے صرف ایک بار ناک کے ذریعے کوئی چیز اندر لینے کی کوشش کی جبکہ سانس کے مریض وقفے وقفے سے ناک کے ذریعے دوا لیتے رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پلینک اس کا عادی نہیں تھا۔ اس روز بھی وہ کوئی دوا یا تمباکو قسم کی کوئی چیز نہیں لے رہا تھا بلکہ وہ ہیروئن تھی۔ اس نشے کے عادی افراد کی جو کیفیت ہوتی ہے' وہ ساری علامات البرٹ میں موجود ہیں۔ تاریک شیشوں کی عینک لگانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کے ذریعے بہروپ دھارنے کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں کو بھی چھپایا جائے جو اس کے نشئی ہونے کا پتا دیتی ہیں اور جب میں نے مسٹر البرٹ کو دیکھا تو میرے شبہے کی تصدیق ہوگئی۔''

یہ کہہ کر وہ البرٹ کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں پر لگا ہوا سبز رنگ کا غلاف اتار دیا۔

''اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اسی شخص نے فرضی ولیم پلینک کا روپ دھارا تھا۔'' ایلری نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

ہیزل اب تک خاموش تھا لیکن وہ اپنے ساتھ ہونے والی واردات کو کس طرح بھلا سکتا تھا چنانچہ اس نے پوچھا۔ ''لیکن اس شخص کو کتابیں چوری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''یہ بھی ان کے منصوبے کا ایک حصہ تھا تاکہ پولیس اور انشورنس کمپنی کو گمراہ کیا جاسکے۔ فریڈرک کا زخمی ہونا پھر پلینک کا بھاگ کر کتابوں کی دکان میں جانا۔ اس کے بعد اگلے روز جاکر وہ تمام کتابیں خریدنا پھر خریداروں کے گھروں سے وہ کتابیں چرانا۔ یہ تمام واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں تاکہ یہ ظاہر کیا جاسکے کہ چور نے وہ قیمتی ٹکٹ چرا کر کسی کتاب میں چھپا دیا تھا اور بعد میں وہ اس ٹکٹ کو ان کتابوں میں تلاش کرتا رہا۔ اس طرح پولیس اور انشورنس کمپنی کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ وہ قیمتی ٹکٹ چوری ہوگیا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ ٹکٹ چوری نہیں ہوا بلکہ غائب کردیا گیا ہے تاکہ اس کے عوض انشورنس کمپنی سے بھاری رقم وصول کی جاسکے۔''

ایشلے نے مضطرب انداز میں اپنے بھاری بدن کو حرکت دی اور بولا۔ ''بہت عمدہ۔ تم نے بڑی ذہانت سے اصل حقیقت کا کھوج لگالیا ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ٹکٹ انہوں نے خود چرایا بلکہ بقول تمہارے غائب کردیا' وہ اب کہاں ہے؟ اسے کس جگہ چھپایا گیا ہے؟''

''میں نے اس بارے میں بہت سوچا کیونکہ جانتا تھا کہ ان تمام حقائق کے باوجود جب تک وہ ٹکٹ ان کے قبضے سے برآمد نہیں ہوجاتا انہیں مجرم ثابت کرنا مشکل ہے۔ جب میں نے دوسرے ٹکٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا تو میری چھٹی حس بیدار ہوگئی اور جب میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا تو ایک ہی سوال ذہن میں ابھرا کہ اس ٹکٹ کو چھپانے کی سب سے مناسب جگہ کون سی ہوسکتی ہے پھر مجھے یاد آیا کہ وہ دونوں ٹکٹ ایک جیسے ہیں۔ یہاں تک کہ... ملکہ کے دستخط بھی دونوں ٹکٹوں پر ایک ہی جگہ ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو کسی ایسی ظاہری جگہ پر چھپاتا جہاں ہوتے ہوئے بھی کسی پر اس کی نظر نہ جاتی اور وہ مناسب ترین ظاہری جگہ کون سی ہوسکتی ہے؟''

ایلری نے گہری سانس لی اور ویلی کو ریوالور واپس کرتے ہوئے انسپکٹر کوئن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر آپ اپنے دفتر سے کسی ٹکٹوں کے ماہر کو بلاکر اس سے دوسرے ٹکٹ کا معائنہ کروائیں جو اس وقت بھی آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے تو میرے اس شبہے کی تصدیق ہوجائے گی کہ پہلے ٹکٹ کو دوسرے ٹکٹ پر رکھ کر نقصان نہ پہنچانے والے ربر پلیٹ سے جوڑ دیا گیا ہے اور انہیں کسی بھی وقت بڑی احتیاط سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔''

ایلری نے فخریہ انداز میں نقطہ بیان کردیا... اور مسکرانے لگا۔

اپنا راستہ

مریم کے خان

مجبوری... یا ضرورت انسان کو غلط راستوں کا مسافر بنا دے تو... ایسی صورت میں اس کا ضمیر ضرور ملامت کرتا ہے... جبکہ عادی مجرم اس احساس سے بالاتر ہو کے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں... اپنے جرم کو بے ضرر اور ازحد ضروری سمجھنے والوں کی کارروائیاں...

اپنی بقا کے لیے انتہائی قدم اٹھا لینے والے نوجوان کا قصہ

جین بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھا میکس بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ عقب میں ڈیک اور گورشیو تھے۔ گورشیو نے کہا۔ ''بار بار پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم پولیس کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔''

لیکن میکس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی قدر طویل قامت اور دل کش صورت والا نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا جین گول چہرے والا عام سا نوجوان تھا۔ ڈیک ان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا اور اس وقت سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔ جین نے پوچھا۔ ''رقم کتنی ہاتھ آئی ہے؟''

''دونوں بیگ بھر گئے ہیں وہاں مزید رقم تھی۔'' گورشیو نے بتایا۔

صرف بارہ منٹ پہلے وہ ایک بینک سے ڈاکا مار کر نکلے تھے۔ اس ڈاکے کی ریہرسل وہ ایک مہینے سے کر رہے تھے۔ بینک کے حفاظتی انتظامات کیا تھے، ڈاکا کیسے مارنا ہے اور ڈاکا مار کر فرار کیسے ہونا ہے۔ انہوں نے ایک ایک چیز کا خیال

رکھا تھا۔ بینک سے روانہ ہونے کے ٹھیک پندرھویں منٹ پر ان کی کار ایک گودام میں موجود تھی۔ گودام کا دروازہ کار اندر آتے ہی بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں ایک بڑی سیاہ وین موجود تھی۔ انہوں نے پھرتی سے سارا اسلحہ اور رقم ایک بیگ میں منتقل کیے اور علاوہ میکس کے باقی سب بھی وین میں منتقل ہو گئے اور وین گودام سے نکل کر روانہ ہو گئی۔ گودام میں موجود ان کے ایک اور ساتھی جارج نے میکس سے کہا۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں سب پلان کے مطابق ہوا۔“ میکس نے جواب دیا۔ البتہ اس کے ذہن میں وہ معصوم سی لڑکی آ گئی جو کیشیئر کا کام کر رہی تھی اور گورشیو نے اسے بے دردی سے رائفل کی نال ماری تھی کیونکہ وہ کاؤنٹر پر موجود کیش دینے میں تاخیر کر رہی تھی قصور اس کا نہیں تھا مارے خوف کے اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ گورشیو اسے پھر مارنے جا رہا تھا لیکن میکس نے اسے روک دیا۔ میکس کو تشدد اچھا نہیں لگتا تھا خاص طور سے جب وہ کسی غیر متعلق فرد پر کیا جائے۔

پولیس کے مطابق ڈاکو جن کی تعداد چار تھی اور وہ ایک سیاہ بڑی کار میں آئے تھے۔ تقریباً سولہ لاکھ ڈالرز کی رقم لے اڑے تھے۔ میکس رقم کا سن کر پہلی بار مسکرایا تھا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گیا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف مائیکا تھی۔ مائیکا اس کی بیوی تھی لیکن ان دونوں میں علیحدگی طے ہو چکی تھی۔ لیکن اس علیحدگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میکس جرائم پیشہ تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مائیکا چاہتی تھی وہ زیادہ حصہ لے۔ میکس اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ نتیجے میں مائیکا اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ میکس نے اس علیحدگی کا اثر نہیں لیا تھا۔

”کیوں فون کیا ہے؟“

”تمہیں مبارک باد دینے کے لیے۔“ مائیکا طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم ایک بار پھر بچ گئے۔“

”پلیز۔“ میکس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”فون پر اس قسم کی باتیں مناسب نہیں۔“

”میکس تم کب تک ان لوگوں کے ہاتھ بے وقوف بنتے رہو گے؟“

میکس نے فون رکھ دیا اور پھر اس کا ریسیور الگ کر دیا۔ مائیکا کا آخری جملہ اس کے کان میں گونج رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر اس نے دوسرے کپڑے پہنے۔ پرانے کپڑے اس نے ایک شاپر میں ڈالے پھر اپنے جوتے بھی اسی شاپر میں ڈال دیئے۔ ان کا اصول تھا کہ ڈاکے کے بعد اپنا لباس اور جوتے ضائع کر دیتے تھے تاکہ پولیس کو سراغ نہ مل سکے۔ جدید فارنسک سائنس نے پولیس کا کام آسان بنا دیا تھا اور بعض اوقات صرف ایک دھاگے یا جوتے کی مٹی سے بھی جرم ثابت ہو جاتا تھا۔ میکس گھر سے نکلا اور راستے میں اس نے شاپر ایک بڑے کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک اسپورٹس کمپلیکس کے اندر تھا۔ وہ باسکٹ بال والے حصے میں آیا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد پہلے جین آیا اور پھر گورشیو۔ گورشیو نے ان سے ہاتھ ملایا اور پھر دو چھوٹے بنڈل ان کے سپرد کیے جو انہوں نے جیکٹس میں رکھ لیے۔ وہ جانتے تھے بنڈل میں ان کے حصے کی رقم تھی۔

”پاپا کیسے ہیں؟“ میکس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔“ گورشیو نے مختصر جواب دیا۔ ”پرسوں کمیونٹی میٹنگ ہے، تم شامل ہو گے؟“

”نہیں۔“ میکس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”میں پہلے ہی اس میں شامل ہوں۔“

گورشیو نے کچھ کہا نہیں، وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جین رکا رہا تھا۔ اس نے گورشیو کے جانے کے بعد معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا خیال ہے؟“

جین اس سے نائٹ کلب جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ آج ان کے پاس رقم آئی تھی اور وہ کھل کر عیاشی کر سکتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے جب ڈاکے کی رقم میں سے حصہ ملتا تھا تو وہ عیاشی کرتے اور چند ہفتے میں وہ ساری رقم خرچ کر چکے ہوتے تھے لیکن اس بار میکس کا موڈ نہیں تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ جین نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ میکس کھڑا ہو گیا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں، اس بینک والی لڑکی پر تشدد تمہیں پسند نہیں آیا ہے۔“ جین سنجیدہ ہو گیا۔

”غیر ضروری تشدد اچھی چیز نہیں ہے۔“ میکس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اس سے اچھا پیغام نہیں جاتا ہے۔ ہمیں آگے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“

”اس کے برعکس میرا خیال ہے، مزاحمت کرنے والے دس بار سوچیں گے۔“ جین نے اختلاف کیا۔ ”خیر چھوڑو اسے یہ بتاؤ کہ آج رات کا کیا پروگرام ہے؟“

”کچھ نہیں، میں تھک گیا ہوں اب آرام کروں گا۔“ میکس نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے

بنڈل کو ذرا سا کھول کر دیکھا اس میں دس گڈیاں تھیں یعنی اسے ایک لاکھ ڈالرز ملے تھے۔ سولہ لاکھ میں سے ایک لاکھ ڈالرز۔ اس کا حصہ ایک چوتھائی بنتا تھا۔ لیکن یہ شروع سے طے تھا۔ اگر رقم ایک ملین ڈالرز سے اوپر جاتی تھی تو ان کو چوتھائی ملتا تھا اور باقی رقم کمیونٹی فنڈ میں چلی جاتی تھی۔

ٹیکساس میں اسپینش نژاد باشندے اچھی خاصی تعداد میں تھے لیکن وہ غریب اور پسماندہ تھے۔ ان کے مقابلے میں سیکسن نسل کے لوگ معیشت اور سیاست پر حاوی تھے۔ ڈلاس میں اسپینش زیادہ پسماندہ تھے اور ان میں سے زیادہ تر غربت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ میکسیکو سے آنے والے ان لوگوں کو مقامی طور پر خوش آمدید نہیں کہا گیا تھا بلکہ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ خود میکس غریب پس منظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا کیونکہ وہ بہت غریب تھے۔ اس کی ماں جیسے تیسے اس کی پرورش کرتی رہی۔ جب میکس بارہ سال کا تھا تو وہ مر گئی، اسے جگر کا کینسر ہو گیا تھا اور اسے مکمل علاج نہیں ملا تھا۔ تب میکس ایک اسپینش چرچ کے یتیم خانے کی تحویل میں آ گیا اور اس نے اسکول کی تعلیم وہیں مکمل کی تھی۔

پاپا جارجی وہاں آتا تھا اور چرچ انتظامیہ اس کا بہت احترام کرتی تھی کیونکہ وہ چرچ اور اس کے ساتھ چلنے والے یتیم خانے کو بڑی رقوم چندے کی صورت میں فراہم کرتا تھا اور یہ رقم وہ آف دی ریکارڈ دیتا تھا۔ اس کی دی ہوئی رقم چندے کے بکس کے حوالے سے ریکارڈ کی جاتی تھی۔ میکس یہ بات جانتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پاپا جارجی چندہ کھل کر اور اپنے نام سے کیوں نہیں دیتا ہے۔ پاپا جارجی کرسمس پر بچوں کے لیے تحفے بھی لاتا تھا اور ایک ایسے ہی موقع پر میکس نے اس سے پوچھ لیا۔

”پاپا جارجی تم اس چرچ کو رقم دیتے ہو تو اسے اپنے نام سے کیوں ظاہر نہیں کرتے ہو؟“

پاپا جارجی اسے پسند کرتا تھا کیونکہ میکس نے اسکول میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسے چرچ کی جانب سے انعام بھی ملا تھا۔ استخوانی چہرے والے پاپا نے اسے اپنی چمکیلی آنکھوں سے گھورا اور بولا۔ ”کیا تم یہ بات جاننا چاہتے ہو؟“

میکس نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“

”تب اسکول کی تعلیم مکمل کر کے میرے پاس آ جانا۔“

جو بچے اسکول کی تعلیم مکمل کر لیتے تھے۔ ان کو یتیم خانہ چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ یتیم خانے میں صرف اسکول جانے والے بچے رہ سکتے تھے۔ جو بچے اسکول نہیں جاتے تھے انہیں بھی اٹھارہ سال کے بعد یتیم خانے سے جانا ہوتا تھا۔ میکس کا آخری سال تھا اور اس نے ہائی اسکول بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کا ارادہ کہیں ملازمت کر کے کچھ رقم جمع کر کے کالج میں داخلہ لینے کا تھا۔ یتیم خانے سے نکلنے کے بعد اسے پاپا جارجی کی بات یاد آئی اور وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ پاپا جارجی ایک اسٹور کا مالک تھا اور اس کے عقب میں اس کی رہائش تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ گورشیو اور جین، لیکن وہ الگ رہتے تھے۔ میکس حیران ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پاپا جارجی دولت مند آدمی ہو گا تب ہی وہ چرچ کو اتنی بڑی رقومات دیتا ہے لیکن اس کے رہن سہن سے نہیں لگتا تھا کہ وہ دولت مند ہے۔

پاپا جارجی نے اسے اپنے پاس پناہ دی اور پھر اپنے اسٹور میں ملازم رکھ لیا۔ اس نے میکس کو بتایا نہیں تھا کہ اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آتی تھی کیونکہ اسٹور کی کمائی محدود تھی اور اس سے پاپا کا اپنا گزارا ہوتا تھا۔ ایک دن گورشیو اور جین آئے اور انہوں نے الگ لے جا کر پاپا جارجی سے ملاقات کی۔ پاپا نے اسے طلب کیا۔ ”میکس تم جاننا چاہتے تھے کہ میں چرچ کو اتنی بڑی رقم کہاں سے دیتا ہوں تو اب وقت آ گیا ہے، تم جان لو۔“

پھر میکس یہ جان کر حیران رہ گیا، وہ لوگ جرائم پیشہ تھے۔ بینکوں اور سپر اسٹورز کو لوٹتے تھے۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”جرم کرنا تو اچھی بات نہیں ہے۔“

”یہ ہماری مجبوری ہے بیٹے۔“ پاپا جارجی نے تحمل سے کہا۔

”انہوں نے ہمارے لیے اور کام ہی کیا چھوڑا ہے۔“ جین تلخی سے بولا۔ ”ہم اسپینش کاکروچوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔“

”اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ گورشیو نے بھی کہا۔ ”پھر یہ کام ہم اپنے لیے نہیں کرتے ہیں۔“

پاپا جارجی نے ایک کمیونٹی سپورٹ فنڈ قائم کر رکھا تھا جس سے غریب اسپینش افراد کو مدد دی جاتی تھی۔ اسی طرح وہ ادارے جو اسپینش افراد کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے تھے ان کو چندے دیئے جاتے تھے۔ میکس، پاپا جارجی کی فیملی سے متاثر ہوا تھا جو خود خطرہ مول لے کر دوسروں کی مدد کر رہے تھے۔

میکس کو اس وقت یہ سب اچھا لگا تھا اس لیے وہ کسی قدر

ہچکچاہٹ کے بعد پاپا جارجی کے گروپ میں شامل ہونے کو تیار ہو گیا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ گروپ میں ان لوگوں کے علاوہ بھی نصف درجن دوسرے لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح ڈاکوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ سب اپنے کام کے ماہر تھے۔ جب میکس راضی ہوا تو اس کی تربیتی مراحل شروع ہو گئے۔

ایک سال بعد اسے ایک ڈاکے میں حصہ لینے کا موقع ملا اور اس کا کام ڈرائیونگ کرنا تھا۔ اس ٹیسٹ کے بعد اسے باقاعدگی سے شامل کیا جانے لگا۔ اسے کام کرتے ہوئے سات سال ہونے کو آئے تھے اور اس دوران میں وہ کم سے کم پچاس ڈاکوں میں حصہ لے چکا تھا۔ گروپ کا ایک خاص طریقۂ کار تھا۔ اس کے ہر ممبر کو ہر مہینے پانچ ہزار ڈالرز کی رقم ملتی تھی، یہ اخراجات کے لیے ہوتی تھی اور ہر ڈاکے سے ان کو مخصوص حصہ ملتا تھا۔ اسے وہ جیسے چاہے خرچ کر سکتے تھے۔ میکس نے اس طرح سے اب تک جو کمایا تھا، وہ خرچ کر چکا تھا۔ اسے رقم بچانے کی عادت نہیں تھی دوسرے اسے احساس تھا کہ اس کام میں کسی وقت بھی دی اینڈ آجاتا ہے جس کے بعد قبر یا جیل کی کوٹھری ملتی ہے اور دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لیے جب تک موقع ہے، خوب عیش کر لو۔

☆☆☆

مائیکا بھی اسپینش تھی اور اپنی کمیونٹی کی وفادار بھی تھی اس لیے میکس یا اس کے ساتھیوں نے کبھی اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کیا۔ میکس سے الگ ہونے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ میکس نہیں جانتا تھا کہ اس کی گزر اوقات کیسے ہو رہی ہے لیکن جب اسے حصہ ملتا تو وہ اس میں سے کچھ رقم مائیکا کو دے آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بہت سارے شاپرز تھامے اس کے فلیٹ کے باہر موجود تھا۔ کال بیل کے جواب میں مائیکا نے دروازہ کھولا اور اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ میکس نے شاپرز کچن کی میز پر رکھے، ان میں کھانے پینے کی اشیا اور دوسرا سامان تھا۔ مائیکا دل کش عورت تھی۔ اس کی براؤن آنکھیں اور اسی رنگ کے ریشمی بال دیکھنے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ جسمانی طور پر وہ دبلی اور نازک اندام تھی۔ اس نے ڈھیلا سا لبادہ پہن رکھا تھا۔ میکس کو بیئر کی ایک بوتل دے کر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ میکس نے ایک گھونٹ لیا اور بولا۔

''تم نہیں لے رہیں؟''

''نہیں میں آج کل نہیں پی رہی ہوں۔'' وہ اپنے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

میکس چونکا۔ ''کیوں؟''

مائیکا نے کچھ دیر سوچا اور پھر بتا دیا۔ ''میں امید سے ہوں ڈاکٹر نے ٹیسٹ کیا ہے۔''

''امید سے۔'' میکس چونکا۔ ''تم نے پہلے نہیں بتایا۔''

''مجھے خود ایک مہینے پہلے پتا چلا ہے اور اگر تمہیں بتا دیتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے اب بتا دیا۔''

میکس اور مائیکا تین سال پہلے ملے اور فوراً ہی ایک دوسرے سے محبت کر بیٹھے تھے۔ مائیکا بھی اس کی طرح یتیم خانے میں پلی تھی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ پاپا جارجی کے اسٹور میں کام کرنے لگی۔ میکس سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے شادی کرنے میں دیر نہیں کی تھی اور شادی سے پہلے مائیکا جان گئی تھی کہ میکس کیا کام کرتا ہے۔ اس وقت اسے پروا نہیں تھی۔ لیکن شادی کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی غیر یقینی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے میکس پر زور دیا کہ وہ اپنے لیے کام کرے کیونکہ اسے جو ملتا ہے، اس میں بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ کچھ رقم بچا لیتے تو میکس جرم کی دنیا سے نکل سکتا تھا، وہ اپنا کوئی کام کر سکتے تھے۔ لیکن میکس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار ایک ننھی سی لکیر کی طرح ان کی ازدواجی زندگی میں نمودار ہوا اور بڑھتے بڑھتے ایک وسیع دراڑ کی صورت اختیار کر گیا۔ چار مہینے پہلے مائیکا اس سے الگ ہو کر اس فلیٹ میں آگئی تھی۔ میکس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بچہ میرا ہی ہے نا؟''

مائیکا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تم سے الگ ہوئی ہوں ابھی طلاق نہیں ہوئی ہے جو میں دوسرے مرد کی تلاش شروع کروں۔ یہ تمہاری ہی اولاد ہے۔''

''سوری۔'' میکس نے جلدی سے معذرت کر لی۔

''کوئی بات نہیں... تم ایسا سوچ سکتے ہو۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنا اس بچے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں اس کا باپ ہوں۔'' میکس بے چین ہو گیا۔

''ہاں لیکن اسے پیدا کرنے کا فیصلہ اکیلے میں نے کیا ہے ورنہ میں چاہتی تو اسقاط بھی کرا سکتی تھی تمہیں اس کا پتا بھی نہیں چلتا اور میں نہ بتاتی تو بچے کا پتا بھی نہ چلتا۔''

''پھر بھی بچے کو باپ کی ضرورت تو ہوتی ہے۔''

''یہ خیال تمہیں آرہا ہے۔'' مائیکا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''تمہارے نزدیک تو بس جرائم کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔''

''ایسا نہیں ہے، تم جانتی ہو میں جرم نہیں کرتا ہوں، یہ

ایک کاز بھی ہے۔''

''کاز۔'' مائیکا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں اب تک عقل آگئی ہوگی۔ یہ باپ بیٹے تمہیں اور دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔''

میکس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم پہلے بھی یہ بات مجھ سے کہہ چکی ہو، تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''میرا مطلب وہی ہے جو میں کہہ رہی ہوں۔ یہ باپ بیٹے تمہیں اور دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ جرم تم کرتے ہو اور دولت ان کی جیب میں جاتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے گورشیو اور جین بھی برابر شامل ہوتے ہیں اور ان کو بھی اتنا ہی ملتا ہے۔ باقی ساری رقم کمیونٹی فنڈ میں جاتی ہے۔ پاپا جارجی اس میں سے کچھ نہیں لیتا ہے۔''

''کمیونٹی فنڈ ایک اور دھوکا ہے۔ ٹھیک ہے یہ کچھ رقم دوسروں کو دیتے ہیں لیکن وہ ساری رقم نہیں ہوتی ہے۔ اس کا کوئی حساب نہیں ہے کہ کتنی رقم کہاں گئی اور کس کام میں خرچ ہوئی۔''

''مائیکا تم نے کچھ دیکھا بھی ہے یا ایسے ہی شک کا اظہار کر رہی ہو؟''

''میں نے دیکھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس وقت مجھے یقین نہیں تھا کیونکہ میں اس چیز کو سمجھتی نہیں تھی۔ جب میں اسٹور میں کام کرتی تھی۔ ایک بار میں نے پاپا جارجی کے پاس ایک کتاب دیکھی۔ یہ شیئرز بک تھی اور اس میں کئی ملین ڈالرز کے شیئرز کا اندراج تھا۔ میں اس وقت اسے سمجھی نہیں تھی۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں ہے ان دنوں میں اکاؤنٹنگ کورس کر رہی ہوں تاکہ کسی اچھے دفتر میں جاب حاصل کر سکوں۔ اب میں جان گئی ہوں اس کتاب میں کیا درج تھا۔''

''کئی ملین ڈالرز کے شیئرز۔'' میکس کے لہجے میں بے یقینی آگئی۔ ''نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا ہے میکس۔ آج کی دنیا میں کون اس طرح دوسروں کے کام آتا ہے۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر کوئی کسی کے لیے دولت نہیں کماتا ہے۔''

''مائیکا، تم بلاوجہ ان کے پیچھے پڑ گئی ہو۔'' میکس کھڑا ہو گیا اور اس نے خالی بوتل میز پر رکھ دی۔ ''تمہیں میری جس مدد کی ضرورت ہو بلا جھجک مجھ سے کہہ دینا۔''

مائیکا پھر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔ میکس اس کے فلیٹ سے نکل آیا۔ اسے مائیکا کی باتیں ستانے لگیں تو اس نے سر جھٹک دیا۔ ''احمق عورت، اسے کچھ نہیں معلوم ہے۔''

شام کو وہ ایک کلب گیا لیکن زیادہ دیر وہاں نہیں رکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ یہاں اپنی رقم اور وقت ضائع کر رہا ہے۔ وہ واپس گھر آگیا۔ اگلے دن وہ پھر مائیکا سے ملنے گیا اور اس سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن مائیکا نے انکار کر دیا۔

زبردستی میکس اسے نیچے لایا اور اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا۔ مائیکا بولی۔ ''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟''

''دیکھتی رہو اور بے فکر رہو، تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

میکس ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس پہنچا اور اس نے ایک فرد کے لیے کسی معقول جگہ رہائش کا پوچھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے بتایا کہ ایسی کئی جگہیں ہیں۔ میکس نے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو اور مجھے دکھاؤ۔''

اسٹیٹ ایجنٹ ان کو کئی عمارتوں میں لے گیا جہاں کرائے پر اپارٹمنٹس مل رہے تھے۔ آخر ایک جگہ مائیکا کو پسند آگئی۔ یہ ایک بڑے پارک کے بالکل سامنے کا اپارٹمنٹ تھا اور اس کی بیڈ روم کی کھڑکی سے پارک کا منظر واضح نظر آرہا تھا۔ اس کا کرایہ زیادہ تھا لیکن جب میکس نے سال بھر کے لیے کرایہ دینے کی بات کی تو اس نے رعایت بھی کر دی۔ میکس نے اسی وقت اسے مکمل کرائے کی ادائیگی کر دی۔ مائیکا کچھ بے چین نظر آرہی تھی جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو اس نے کہہ دیا۔ ''میکس مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے، میرا تم پر حق نہیں ہے۔''

''تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تم اب بھی میری بیوی ہو اور اب میرے بچے کی ماں بھی بننے والی ہو۔'' میکس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ''کل میں اپارٹمنٹ کو فرنش کر دوں گا اور شام تک تم یہاں منتقل ہو جاؤ گی۔''

مائیکا خوش نظر آنے لگی۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''

میکس نے اگلے دن اپارٹمنٹ کو فرنش کر دیا تھا اگرچہ یہ سب خاصا مہنگا پڑا تھا لیکن اس کے پاس رقم تھی۔ اس کے وعدے کے مطابق مائیکا اس شام اپنے سامان سمیت اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی تھی۔ جاتے ہوئے میکس نے اسے اپنے پاس بچنے والی باقی رقم بھی دے دی تھی۔ مائیکا لیتے ہوئے ہچکچائی۔ ''تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے، میرے پاس یہ رقم ویسے بھی نہیں رہتی دو تین دن میں اسے بارز، نائٹ کلب اور کیسینو میں اڑا چکا ہوتا۔''

مائیکا فکرمند ہو گئی۔ ''سنو تم مجھ سے ملنے آؤ گے نا، جب سے میں امید سے ہوئی ہوں مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میں آتا رہوں گا۔''

مائیکا اس کے سینے سے لگ گئی۔ ’’میکس تم بہت اچھے انسان ہو کاش تم کوئی عام آدمی ہوتے تو میں ہمیشہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہتی۔‘‘

’’تم پہلے سے جانتی تھیں میں عام آدمی نہیں ہوں۔‘‘ میکس نے اسے یاد دلایا تو وہ تڑپ گئی۔

’’میں محبت کے ہاتھوں مجبور تھی اور تمہیں اکسانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں تمہیں ان لوگوں کے چنگل سے نکالنا چاہتی تھی۔‘‘

’’اب نہیں چاہتی ہو؟‘‘

’’اب تم پر میرا اختیار باقی نہیں ہے۔‘‘ مائیکا نے حسرت سے اسے دیکھا۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔ ’’کاش تم اب بھی واپس آجاؤ۔‘‘

میکس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’یہ ممکن نہیں ہے، میں بہت دور نکل گیا ہوں جرم کی اس دلدل میں گلے تک پھنس گیا ہوں۔‘‘

میکس وہاں سے نکلا تو اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اسے جین کو وہاں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کسی بھی قسم کا تالا کھول لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ لیکن اس وقت اسے جین کی غیر متوقع آمد ناگوار گزری تھی اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’تم اچانک؟‘‘

’’ہاں ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔‘‘ جین نے کہا۔

’’پیڈرو غائب ہے۔‘‘

میکس نے حیرت سے دہرایا۔ ’’پیڈرو غائب ہے لیکن کہاں؟‘‘

’’یہی معلوم کرنا ہے۔ وہ ایک ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور اب اس کی ضرورت پڑی ہے تو وہ غائب ہے۔ مکان چھوڑ چکا ہے اور اس کا سیل نمبر بند جا رہا ہے۔‘‘

پیڈرو، پاپا جارجی کے گروپ کا ایک پرانا رکن تھا اور کئی بار میکس نے اس کے ساتھ بھی ڈاکے میں حصہ لیا تھا۔ وہ پلاننگ کرنے کا ماہر تھا۔ میکس نے جین کی طرف دیکھا۔ ’’وہ کیسے اور کیوں غائب ہوا ہے؟‘‘

’’یہ بات وہی بتا سکے گا۔‘‘ جین نے شانے اچکائے۔ ’’ممکن ہے وہ غدار ہو گیا ہو۔‘‘

’’غدار... لیکن کس سے؟‘‘

’’ہم سے۔‘‘ جین کا لہجہ سرد تھا۔ ’’وہ ہم سے غداری کر گیا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر جانے کا مطلب غداری ہے۔‘‘

’’اب کیا کرنا ہے؟‘‘ میکس نے مزید بحث سے گریز کیا۔

’’میرے ساتھ چلو میں تمہیں لینے آیا تھا۔ اس کی تلاش کے لیے ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔‘‘

میکس جین کے ساتھ روانہ ہوا۔ جین نے اپنی کار چھوڑ دی اور میکس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ میکس کو راستہ بتا رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ شہر سے باہر ایک ٹوٹے پھوٹے احاطے میں داخل ہو رہے تھے یہاں چھوٹے چھوٹے کاٹیجز تھے جن میں وہ غریب ترین افراد رہ رہے تھے جن میں شہر کی غریب بستیوں میں رہنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ ان میں سے بیشتر کا گزارا سرکاری امداد پر ہوتا تھا اور یہاں رہنے والوں کی اکثریت اسپینش نژاد تھی۔ وہ گاڑی سے اترے تو بچوں کے ایک غول نے انہیں گھیر لیا۔ جین نے بچوں کو ایک تصویر دکھائی۔

’’جو اس آدمی کے بارے میں بتائے گا اسے دس ڈالرز انعام ملے گا۔‘‘ اس نے کہا اور دس ڈالرز کا نوٹ لہرایا۔

’’یہ سیلیما کے گھر آتا ہے۔‘‘ ایک بچے نے جلدی سے بتایا اور ایک کاٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ جین نے نوٹ اسے دیا اور خود میکس کے ساتھ اس کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دستک دی تو جواب میں ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

’’کون ہے؟‘‘

جین نے آہستہ سے کہا۔ ’’سیلیما سے ملنا ہے۔‘‘

عورت نے ذرا سا دروازہ کھولا تھا کہ جین نے دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میکس نے اس کے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ سیلیما جوان اور خوب صورت تھی۔ میکس کو حیرت ہوئی وہ اس کباڑ خانے میں پڑی تھی۔ اس نے ناکافی اور سستا سا لباس پہن رکھا تھا۔ سیلیما چلّانے والی تھی کہ جین نے پستول نکال لیا، وہ سہم کر رہ گئی پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

’’کیا... کیا چاہتے ہو تم؟‘‘

’’پیڈرو کہاں ہے؟‘‘

’’میں کسی پیڈرو کو نہیں جانتی ہوں۔‘‘

جین نے اشارے سے میکس کو کہا کہ سیلیما پر نظر رکھے اور اس نے کاٹیج کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ جلد اس نے ایک دراز سے پیڈرو کی تصویر برآمد کر لی۔ ’’یہ ہے پیڈرو۔‘‘ اس نے تصویر سیلیما کے سامنے رکھ دی۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ’’یہ بہت پہلے کبھی آیا تھا اور میں نے دو مہینے سے اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔‘‘

جین نے اتنی تیزی سے سیلیما کے سر پر گھونسا مارا کہ میکس بھی حیران رہ گیا۔ گھونسے میں اتنی طاقت تھی کہ وہ فوراً

بے ہوش ہو گئی۔ جین نے بستر کی چادر پھاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر کچھ کپڑا اس کے منہ میں بھی ٹھونس دیا۔ میکس بے چینی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کے اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی جین نے ایک چاقو نکال لیا اور سیلیما کی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی تھام لی۔ ’’سیلیما ہمیں پیڈرو کا پتا چاہیے۔‘‘ یہ کہتے ہی اس نے انگلی پر چاقو پھیر دیا۔ وہ تڑپ گئی تھی لیکن منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔ بندھے ہونے کی وجہ سے ٹھیک سے تڑپ بھی نہیں سکتی تھی۔ ’’میں اسی طرح ایک ایک کر کے تمہاری ساری انگلیاں کاٹ دوں گا۔ ہاتھوں کے بعد پیروں کی باری آئے گی اور اس پر بھی تم نے زبان نہیں کھولی تو تمہارے ناک، کان اور ہونٹ بھی کاٹ دوں گا، آخر میں تمہاری آنکھیں نکال دوں گا اس کے بعد تمہارا یہ خوب صورت وجود صرف کچرے کا ڈھیر رہ جائے گا۔‘‘

جین کی دھمکی نے سیلیما کو سہما دیا تھا اور اس نے جلدی جلدی سر ہلانا شروع کر دیا جیسے کچھ بتانا چاہ رہی ہو۔ جین نے منہ سے کپڑا نکالنے سے پہلے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے چیخ ماری تو یہ اس کی زندگی کی آخری آواز ہوگی۔ کپڑا منہ سے نکلتے ہی اس نے روتے اور کراہتے ہوئے کہا۔ ’’پلیز مجھے مت اذیت دو، میں اس کے بارے میں سچ مچ نہیں جانتی ہوں سوائے ایک بات کے۔‘‘

’’کون سی بات؟‘‘

سیلیما نے ایک دن پیڈرو کے منہ سے ایک رہائشی عمارت کے بارے میں سنا تھا۔ اس نے عمارت کے بارے میں ان کو بتا دیا۔ ’’مجھے اس کے بارے میں بس یہی معلوم ہے۔‘‘

جین نے کہا۔ ’’اگر یہ بات غلط نکلی تو میں دوبارہ آؤں گا اور اس بار سچ مچ تمہاری انگلیاں کاٹ دوں گا۔‘‘ اس نے کہتے ہوئے سیلیما کی بندشیں کاٹ دیں اور وہ وہاں سے نکل آئے۔ میکس کے چہرے سے ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ جین اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے اترا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اگلی صبح وہ بیدار ہوا اور اس نے ٹی وی لگایا اور چونک گیا۔ رپورٹر ایک قتل کی واردات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پھر مقتول کا فوٹو دکھایا تو میکس ساکت رہ گیا۔ یہ پیڈرو تھا۔ پولیس کے مطابق اسے سر سے پستول لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میکس چند لمحے بعد اٹھا اور اس نے فون پر جین کا نمبر ملایا۔ اس نے خاصی دیر بعد کال ریسیو کی۔ ’’میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’میں بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہاں آجاؤ۔‘‘ جین نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہاں سے مراد باسکٹ بال کورٹ تھا۔ میکس وہاں پہنچا تو جین کے ساتھ ڈیک بھی تھا۔ ڈیک رشتے میں جین کا کزن لگتا تھا۔ اس کا باپ پاپا جارجی کا بھائی تھا اور میکسیکو کی سرحد پر رینجرز کی فائرنگ سے مارا گیا تھا۔ میکس کچھ دیر جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہلتا رہا پھر اس نے جین کی طرف دیکھا۔

’’یہ تم نے کیا ہے؟‘‘

’’یہ ہم نے کیا ہے۔‘‘ جین کے بجائے ڈیک نے کہا۔ جین بولا۔ ’’وہ ہم سے الگ ہو گیا تھا اور ہمارے لیے خطرہ بن گیا تھا۔‘‘

’’کیسا خطرہ؟‘‘

’’کیا تم نہیں جانتے۔‘‘ جین کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ’’ہم کیا کام کرتے ہیں اور اگر پولیس کو اس بارے میں پتا چل جائے تو ہم سب جیل میں ہوں گے۔‘‘

’’لیکن پھر بھی...‘‘

جین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ’’میکس ہمارے لیے گروپ کا تحفظ ایک فرد سے کہیں بڑھ کر ہے، ہم نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔‘‘

ڈیک نے میکس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ’’اب اس کی فکر چھوڑو، ایک نیا کام ہے۔‘‘

میکس خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’ابھی نہیں... میں کل آؤں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے ابھی تم جا کر آرام کرو۔‘‘ ڈیک نے کہا اور میکس وہاں سے نکل آیا۔

’’لگتا ہے اس نے پیڈرو کی موت کا بہت اثر لیا ہے۔‘‘ جین نے کہا۔

’’فکر مت کرو چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور ہم نے دوسروں کو خبردار کر دیا ہے کہ ہمیں چھوڑ کر جانے کا سوچیں بھی مت۔‘‘

لیکن جین مطمئن نہیں تھا۔ اس کے خیال میں میکس کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ دوسرے دن صبح کے وقت باسکٹ بال کورٹ میں ان تینوں کے ساتھ گورشیو بھی موجود تھا۔ اس نے ان کے سامنے ڈاؤن ٹاؤن کا نقشہ پھیلایا اور اس پر ایک جگہ ہاتھ رکھا۔ ’’یہ بینک ہے، یہاں ہر وقت کم سے کم دو ملین ڈالرز کی نقد رقم موجود رہتی ہے۔ آس پاس کے کاروباری اداروں کو نقد رقم کی ضرورت رہتی ہے۔‘‘

’’پلان کیا ہے؟‘‘ میکس نے دلچسپی سے نقشہ دیکھا۔

”خاص طور سے فرار کا پلان؟“
”کام صبح صبح کرنا ہے۔“ جین نے کہا۔ ”اس وقت جانے والے راستے خالی ہوتے ہیں۔“
میکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بات خالی راستوں کی نہیں ہے۔ جب پولیس پیچھے لگے گی تو متبادل راستہ کون سا ہو گا؟“
”یہ راستہ جو پرانے انڈسٹریل ایریا سے گزرتا ہے۔ یہاں پولیس کو چکر دینے کی بہت گنجائش ہے۔“ ڈیک نے نقشے پر انگلی رکھ کر بتایا۔
اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اصل منصوبے کی طرف آ گئے۔
ڈیک نے جین کی طرف دیکھا۔ ”میں نے کہا تھا نا یہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“
جین مسکرانے لگا۔ ”میکس ہمارے گروپ کا لازمی حصہ ہے۔ بعض اوقات تو مجھے اس سے جلن ہوتی ہے جب پاپا اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔“
میکس خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا، اس نے کوئی رَدِّعمل ظاہر نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اور ڈیک بینک کی طرف جا رہے تھے۔ میکس ان کے گروپ میں بنیادی کردار ادا نہیں کرتا تھا ان کا سربراہ گورشیو تھا لیکن اس کی رائے کی اہمیت تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ مسائل کو بہت جلد سمجھ لیتا تھا اور جلد ہی ان کا حل بھی تلاش کر لیتا تھا۔ چند دن انہوں نے بینک اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا جائزہ لیا اور پھر اپنے منصوبے کو حتمی صورت دے دی۔
”تم اب بھی مائیکا سے ملتے ہو؟“
میکس چونکا۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“
جین نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔ ”وہ امید سے ہے تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“
میکس کی گرفت اپنے گلاس پر سخت ہو گئی۔ ”جین تم یہ سب کس طرح جانتے ہو؟“
جین نے ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ”پیڈرو والے واقعے کے بعد ہم محتاط ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اپنے ساتھیوں پر نظر نہیں رکھتے تھے۔“ جین اچانک کھڑا ہو گیا اس نے ایک نوٹ گلاس تلے رکھا۔ ”پھر ملتے ہیں دوست۔“
وہ چلا گیا اور میکس اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ کیا جین اسے دھمکی دے کر گیا تھا؟ پھر اس نے بھی اپنا گلاس ختم کیا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اگلے روز وہ پاپا جارجی اور آنٹی روزا کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی حیثیت اس گھر کے فرد کی سی تھی اور وہ جب چاہتا، یہاں آ سکتا تھا۔ بہت عرصے وہ یہاں رہا بھی تھا۔ آنٹی روزا اسے پسند کرتی تھی۔ وہ خاموشی سے.... پچھلی طرف سے اندر آیا۔ اس وقت پاپا جارجی اور آنٹی دونوں اسٹور میں ہوتے تھے۔ کچھ دیر بعد آنٹی روزا اندر آئی تو وہ لاؤنج میں بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔
”میکس تم کب آئے؟“ آنٹی نے خوشی سے کہا۔
”ابھی آیا ہوں، آپ مصروف ہیں۔“
”ہاں اس وقت اسٹور میں رش ہوتا ہے زیادہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔“
”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں بس آپ کو دیکھنے آیا تھا۔“ اس نے بیئر کی خالی بوتل میز پر رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔ ”پاپا کو میری طرف سے پوچھ لیجیے گا۔“
باہر آ کر اس نے مائیکا کو کال کی اور اس سے کہیں باہر ملنے کو کہا۔ مائیکا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ مان گئی۔ اس سے مل کر میکس بینک کی طرف روانہ ہوا جہاں انہیں آنے والے ہفتے کی صبح ڈاکا مارنا تھا۔ آج جمعرات تھی۔ وہ شام کو اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گیا۔ جمعے کی صبح ان کی جمنازیم میں میٹنگ تھی جس میں ہر ایک کو اس کی ذمے داری سمجھائی تھی۔ تاکہ عین موقع پر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ جب میکس پہنچا تو جین، ڈیک، گورشیو اور جارج وہاں موجود تھے۔ گورشیو نے سب کو سمجھایا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ اس بار ڈرائیونگ میکس کے ذمے تھی لیکن بینک کے اندر وہ بھی جاتا۔ میٹنگ کے بعد گورشیو اور جارج رخصت ہو گئے۔ ڈیک اور جین، میکس کے ساتھ وہیں رکے رہے۔ میکس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اس سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ اس نے پوچھ لیا۔
”کوئی خاص بات ہے؟“
”ہاں مائیکا آج اپنے فلیٹ سے کہیں چلی گئی ہے۔“
میکس چونکا۔ ”چلی گئی ہے لیکن کہاں؟“
”کسی کو نہیں معلوم ہے۔ بلڈنگ کے نگران کا کہنا ہے اس نے صبح سویرے ٹیکسی منگوائی اور اس میں دو بڑے سوٹ کیس رکھ کر چلی گئی۔ اب فلیٹ میں اس کی ایک بھی ذاتی چیز نہیں ہے۔“
”لیکن وہ اس طرح کہاں جا سکتی ہے؟“ میکس بے چین ہو گیا۔
ڈیک نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم نہیں جانتے؟“
”اگر جانتا تو فکر مند کیوں ہوتا کیونکہ ابھی تو میں نے اسے یہ فلیٹ دلایا ہے اس کا سال بھر کا کرایہ بھرا ہے اور اسے فرنش کیا ہے۔ وہ پہلے جہاں رہ رہی تھی اس جگہ کی حالت ٹھیک

نہیں تھی۔“
”تب وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟“ جین بولا۔
میکس نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہارے لیے اس بات کی بہت اہمیت ہے؟“
”اہمیت تو ہے آخر اسے ایک سجا سجایا فلیٹ چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اس کا کرایہ بھی تم ادا کر چکے ہو؟“
”ممکن ہے وہ اپنے کسی رشتے دار کے گھر چلی گئی ہو یا اس کی کوئی فرینڈ ہو۔ ایسی حالت میں عورتوں کو کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔“
”شاید۔“ جین کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”ایسا ہی ہوا ہو تو بہتر ہے۔“
میکس خاموش رہا۔ اس نے جین کی بات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر میں وہ تینوں وہاں سے نکل آئے اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میکس نے رخ تو وہی اختیار کیا تھا اور اس دوران میں وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں ہے تو اس نے کار کا رخ بدلا اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ وہ رات گئے گھر پہنچا۔ اس نے وہ کپڑے حاصل کر لیے تھے جو اس واردات میں پہننے تھے۔ میکس کو صبح چار بجے تیار ہو کر اس جگہ پہنچنا تھا جہاں باقی سب جمع ہوتے۔ گاڑی کی تبدیلی کے لیے جارج نے ایک متروک ورکشاپ حاصل کر لی تھی۔ وہ ڈاکا مار کر وہیں پہنچتے اور گاڑی میں تبدیلی کر کے آگے روانہ ہوتے۔ ڈاکے کے لیے انہیں اسی ورکشاپ سے روانہ ہونا تھا۔
جیکب گاڑیوں کا مکینک تھا اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ ان کے لیے گاڑیاں مہیا کرنا، ان کو بہترین حالت میں رکھنا اور بہ وقتِ ضرورت ان میں تبدیلی کرنا اس کی ذمے داری تھی۔ اس بار اس نے ایک نئی فورڈ کار تیار کی تھی اس کا طاقت ور انجن فرار کے کام کو آسان بنا دیتا اور یہ فلی آٹومیٹک تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ پلاسٹک چپکا دیا تھا۔ وہ آٹھ بجے روانہ ہوئے اور میکس نے کار لے جا کر بینک کے ساتھ والی گلی میں کھڑی کر دی اور وہ چاروں اپنا سامان اسی میں چھوڑ کر اتر آئے۔ سڑک پار ایک کیفے تھا وہ دو دو کی ٹولی میں وہاں آ بیٹھے اور انہوں نے کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دیا۔ یہاں بیٹھ کر انہیں رقم لانے والے آرمرڈ وین کا انتظار کرنا تھا اس کے بعد ہی وہ اپنی کارروائی شروع کر سکتے تھے۔ ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے اور وین ساڑھے نو بجے آئی تھی۔ وہ بینک کے بالکل سامنے رکی اور اس میں سے تین محافظوں نے اتر کر پوزیشن سنبھال لی۔ ایک محافظ وین کے اندر سے دو بڑے سائز کے سوٹ کیس نکال کر بینک میں چلا گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی اور اس وقت اس نے خالی سوٹ کیسز اٹھا رکھے تھے۔ چاروں محافظ وین میں سوار ہوئے اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ چاروں بھی اٹھے تھے اور سڑک پار کر کے بینک کے ساتھ والی گلی کی طرف بڑھے۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ انہوں نے سروں پر مخصوص طرز کی ٹوپیاں پہنیں اور اپنی خودکار رائفلیں ڈھیلی جیکٹوں میں چھپا لیں۔ پھر وہ سر جھکائے بینک کے داخلی دروازے تک آئے اور ٹوپیوں سے جڑی نقاب چہروں پر کھینچ لیں۔ دروازے کے اوپر لگا کیمرا ان کی تصویر نہیں لے سکا ہو گا۔ لیکن انہیں پروا بھی نہیں تھی کیونکہ وہ سیف روم سے کیمروں کی ٹیپ بھی ساتھ لے جاتے۔
جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا۔ بینک کے ہال میں سنسنی پھیل گئی۔ جین نے ایک ہوائی فائر کیا اور پاس کھڑی عورت کو کھینچ کر اپنے آگے کر لیا۔ بینک میں دو گارڈز موجود تھے لیکن وہ ان چاروں کے سامنے بے بس ثابت ہوئے۔ انہوں نے گارڈز کا اسلحہ رکھوا لیا اور اتنی دیر میں باقی سب بھی اپنے اپنے حصوں سے نکل کر ہال کے وسط میں فرش پر اوندھے منہ لیٹ گئے تھے۔ دس منٹ میں وہ سیف روم میں تھے۔ جین اور گورشیو رقم جمع کر رہے تھے جبکہ میکس اور ڈیک لوگوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ بینک کے منیجر نے سیف روم کی چابی دینے میں ہچکچاہٹ دکھائی تو جین نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہہ کر اس کے چہرے اور کپڑوں کو رنگین کرنے لگا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر چابی دے دی تھی۔
میکس بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا، انہیں پندرہ منٹ کے اندر یہاں سے نکل جانا تھا ورنہ اس دوران میں پولیس کے آنے کا امکان تھا اور ایک بار پولیس آ جاتی تو اسے ڈاج دے کر نکلنا بہت مشکل کام تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ”جلدی کرو پندرہ منٹ ہونے والے ہیں۔“
ایک منٹ بعد گورشیو اور جین سیف روم کی طرف سے بڑے سائز کے بیگ اٹھائے نمودار ہوئے۔ پیراشوٹ سے بنے یہ بیگ خالی حالت میں آرام سے جیب میں آ جاتے تھے۔ میکس نے اندازہ لگایا کہ رقم ان کی توقع سے زیادہ ہی تھی۔ ان کے آتے ہی وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے بغلی راستہ اختیار کیا تھا جہاں ان کی گاڑی موجود تھی۔ وہ

گاڑی میں آیا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ چند لمحے بعد وہ تینوں بھی نکل آئے اور اس دوران میں وہ بٹن دبا کے کار کی ڈکی کھول چکا تھا۔ جینن اور گورشیو نے رقم والے بیگ ڈکی میں رکھے اور اس دوران میں ڈیک فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ لاک تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''دروازہ کھولو۔''

''ایک منٹ مجھے ڈکی بند کرنے دو۔'' میکس نے جواب دیا۔ ''اس سے پہلے دروازہ نہیں کھل سکتا۔''

اس نے بٹن دبایا اور پھر وہ ہوا جو ان تینوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میکس نے اچانک کار ریورس کی۔ گورشیو اور جینن عقب میں تھے اور اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ کار ان سے ٹکرائی اور وہ پیچھے جا گرے۔ ڈیک حیران پریشان سامنے کھڑا تھا۔ میکس نے گیئر چینج کیا اور کار آگے بڑھائی۔ ڈیک نے خطرہ بھانپ کر ہٹنے کی کوشش کی لیکن کار اسے ٹکر مار کر ایک طرف اچھالتی ہوئی نکل گئی تھی۔ جب تک وہ تینوں سنبھل کر اپنی رائفلیں سیدھی کرتے میکس کار کو گلی سے نکال کر دوسری طرف سڑک پر لے گیا تھا۔ وہ عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ کار سو گز دور نکلی تب وہ سڑک پر نمودار ہوئے تھے۔ مگر وہ بے بس تھے اس بھری پری سڑک پر اس پر فائرنگ نہیں کرسکتے تھے اس لیے بے بسی سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ اس دوران میں چاروں طرف سے پولیس سائرن کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

میکس نے کار کی رفتار نارمل رکھی اور اپنے سر سے سیاہ ٹوپی اتار دی نقاب وہ پہلے ہی ہٹا چکا تھا۔ ایک پولیس کار اس کے برابر سے گزرتی چلی گئی لیکن اس میں موجود پولیس والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ان کو چار ڈاکوؤں کی اطلاع ملی تھی۔ کوئی ایک کلومیٹر بعد میکس نے کار ایک گلی کے ساتھ روکی اور پھر اسے ریورس کرکے اندر لے گیا۔ وہاں ایک اور پرانی اور چھوٹی کار موجود تھی۔ میکس نے اترنے سے پہلے بٹن دبا کر کار کی ڈکی کھولی اور اتر کر چھوٹی کار تک آیا اس کی ڈکی اس نے ایک چابی سے کھولی اور پھرتی سے رقم والے بیگ چھوٹی کار کی ڈکی میں منتقل کیے۔ دونوں کاروں کی ڈکیاں بند کیں اور پھر واپس آکر فورڈ کار میں ایک بوتل اسپرٹ چھڑک کر اسے آگ دکھا دی اور جب تک اس میں شعلے بلند ہوتے وہ دوسری کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوچکا تھا۔

بیس منٹ بعد وہ پاپا جارجی کے گھر پر تھا۔ وہ اور آنٹی روزا اسٹور میں تھے۔ میکس نے اسٹور میں جھانکا تو پاپا جارجی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ میکس نے اشارہ کیا تو وہ روزا کو اسٹور دیکھنے کا کہہ کر اندر چلا آیا۔ وہ میکس کو یہاں پا کر پریشان ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت ان لوگوں کو کہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''میکس کیا بات ہے باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''ڈاکا ناکام رہا۔'' میکس نے کہا۔ ''میں بڑی مشکل سے نکلا ہوں باقی بھی بھاگ نکلے۔ مجھے رقم کی ضرورت ہے۔''

''میرے خدا۔'' پاپا جارجی نے کہا اور اسے اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ وہاں اس کی خفیہ تجوری تھی جس میں وہ رقم رکھتا تھا۔ جیسے ہی پاپا جارجی نے تجوری کھولی میکس نے عقب سے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ تجوری میں خاصی رقم تھی لیکن اصل چیزیں وہاں رکھی کچھ بکس تھیں ان میں شیئرز بکس بھی تھیں اور چیک بکس بھی۔ اس نے یہ سب رقم سمیت ایک تکیے کے غلاف میں ڈالیں اور وہاں سے نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کم سے کم جینن سیدھا گھر آئے گا۔ وہ اسے سب سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا اور وہاں سے بھی روانہ ہوگیا۔ اس نے تصدیق کرلی تھی کہ پاپا جارجی اسے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کررہا تھا۔ اس نے سچ مچ بہت ساری دولت جمع کرلی تھی جس کا ثبوت یہ بکس تھیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ اٹلانٹا سٹی جانے والی ہائی وے پر تھا۔ وہ سارا دن سفر کرتا رہا اور درمیان میں وہ صرف گیس ڈلوانے کے لیے دو بار رکا تھا۔ دوسری بار اس نے گیس اسٹیشن کے ساتھ موجود سپر اسٹور سے کھانے پینے کا کچھ سامان لے لیا تھا۔ اس نے راستے میں لنچ کیا تھا اور جب وہ اٹلانٹا سٹی پہنچا تو رات ہوچکی تھی۔ اس نے ہائی وے سے شہر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ایک جگہ رک کر اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا اور ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مائیکا نے کال ریسیو کی اور بے تابی سے بولی۔ ''میکس... کہاں ہو تم؟''

''میں آگیا ہوں ہنی تم کہاں ہو؟''

''میں ہائی وے کے ساتھ برائٹ مون موٹیل کے کمرا نمبر بارہ میں ہوں۔''

یہ موٹیل ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ میکس نے کہا۔ ''میں آرہا ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ برائٹ مون موٹیل کے کمرا نمبر بارہ کے سامنے تھا۔ اس نے دستک دی تو مائیکا نے باہر جھانکا اور اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول کر اس سے لپٹ گئی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

میکس اسے لے کر اندر آگیا۔ ''ہاں میں ٹھیک ہوں تم نے ٹی وی پر دیکھ لیا ہوگا۔''

مائیکا نے سر ہلایا۔ ''پولیس نے گورشیو اور جینن کو پکڑ لیا ہے۔ ڈیک کی تلاش جاری ہے۔''

''یہ اچھا ہوا۔'' میکس بستر پر لیٹ گیا۔ صبح سے وہ مسلسل سفر میں تھا اور اب تھک گیا تھا۔ مائیکا اس کے پاس آگئی۔

''لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ لوگ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن ابھی تو ان کو اپنی پڑی ہے اور دوسرے میں اپنے تحفظ کا سامان لے آیا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''رک جاؤ ابھی دکھاتا ہوں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کھانے کو کچھ ملے گا؟''

''یہاں کھانے کا بندوبست ہے روم سروس بھی ہے۔ میں کھانے کا آرڈر دیتی ہوں۔''

''لیکن ابھی نہیں پہلے میں تمہیں سامان دکھا دوں۔'' میکس نے کہا اور اٹھ کر کار کی ڈکی سے چیزیں نکال لایا۔ مائیکا نے جب بیگز میں بھری گڈیاں دیکھیں تو دنگ رہ گئی۔

''میرے خدا اتنی دولت؟''

''یہ کم سے کم ڈھائی ملین ڈالرز کی رقم ہے۔'' میکس نے اسے بتایا۔ ''لیکن اصل چیز یہ ہے۔'' اس نے تکیے کا غلاف بستر پر الٹ دیا اور اس میں موجود رقم کے ساتھ چیک بکس اور شیئرز بکس بستر پر پھیل گئیں۔ مائیکا نے جلدی سے ایک شیئر بک اٹھائی اور میکس کو دکھائی۔

''دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ پاپا جارجی تمہیں اور دوسرے لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے وہ کمیونٹی کے نام پر تمہیں استعمال کرکے خود دولت مند بنتا جارہا ہے۔''

''اب میں جان گیا ہوں۔'' میکس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اسے بہت اچھا انسان سمجھتا تھا۔''

''تم یہ سب پولیس کے حوالے کردو۔''

''نہیں اگر یہ سب پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا تو میں بھی پھنسوں گا۔ مجھے یقین ہے ابھی پاپا جارجی نے جینن اور گورشیو کو پولیس کے سامنے میرا نام لینے سے روک دیا ہوگا کیونکہ اسے بھی معلوم ہے یہ بکس میرے پاس ہیں۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ آیا تو یہ بکس بھی پولیس کے ہاتھ لگ جائیں گی اور پھر اسے جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

مائیکا نے شک سے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے پاپا جارجی اور اس کے آدمی ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔''

''مجھے یقین ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' میکس نے کہا۔ ''میں ذرا پاپا جارجی سے بات کرلوں۔'' اس نے موبائل پر پاپا جارجی کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''پاپا میں بات کررہا ہوں۔''

''میکس۔'' پاپا جارجی نے کہا۔ ''کہاں ہو تم اور تم کیا سمجھتے ہو ہم سے چھپ جاؤ گے؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتا لیکن مجھے امید ہے تم مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''تمہیں ایسی امید کیوں ہے؟'' پاپا جارجی کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

''کیونکہ تم جانتے ہو میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہیں تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔''

یہ سن کر پاپا جارجی کو کچھ دیر کے لیے چپ لگ گئی پھر اس نے بدلے لہجے میں کہا۔ ''میکس مجھ سے ڈیل کرلو، میری چیزیں مجھے دے دو اور اس کے بدلے میں ضمانت دیتا ہوں کوئی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔''

''ڈیل یہ نہیں ہوگی پاپا بلکہ ڈیل یہ ہوگی اگر میرے پیچھے کوئی نہیں آیا تو میرا وعدہ ہے کہ میں یہ چیزیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔''

پاپا جارجی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن رقم؟''

''پاپا اسے بھول جاؤ مجھے اپنی نئی زندگی کی بنیاد جرم پر نہیں رکھنی ہے تمہاری سلامتی بھی اسی میں ہے کہ میں جرم سے دور شریف شہری بن کر رہوں ورنہ مجرم پولیس کی گرفت سے زیادہ دیر نہیں بچ سکتے ہیں اور ایک بار میں پولیس کے ہاتھ آگیا تو پھر تم بھی نہیں بچو گے۔ تو یہ بات طے ہے میرے پیچھے کوئی نہیں آرہا ہے۔''

''جینن اور گورشیو گرفتار ہیں اور دوسرے غصے میں ہیں۔''

''تم انہیں سمجھا سکتے ہو۔'' میکس نے کہا اور موبائل بند کردیا۔

''یہ کال کا سراغ نہ لگالیں۔'' مائیکا بولی۔

''یہ ممکن نہیں ہے یہ کام صرف پولیس کرسکتی ہے۔'' میکس نے اسے بازو میں سمیٹ لیا اور مائیکا نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

''میری پہچان میرا خاندان ہوگا میری کمیونٹی نہیں۔'' میکس نے گہری سانس لے کر سوچا۔ ''اب میں کبھی دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ میں نے اپنا راستہ تلاش کرلیا ہے۔''

اسماقادری

قسط 37

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف وتشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے -پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو-محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے -دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے -زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے -بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے -جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل ہے . ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو اغوا ہو کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ للی راستے میں اسلم اور نمرو کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ماری جاتی ہے۔ نمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔

اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیرتے ہیں۔ پھر وہاں دوبدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہر یار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہر یار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ ٹالی والا جاکر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہر یار کو مشابرم خان کے ذریعے ٹالی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہر یار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ٹالی والا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی ہے وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہر یار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہر یار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہر یار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کرلیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہر یار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف بیٹی کی موت پر شدید غم و غصے کا شکار ہوتی ہے اور ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ ادھر شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی کے خراب ہونے پر وہ ایک جگہ رکتے ہیں۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہر یار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں اور اس کی شناخت بدلنے کے معاملات پر غور ہوتا ہے۔ شہر یار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہر یار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہر یار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی اور عملی طور پر بھی ایسا دکھایا جائے گا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ اسپتال میں کوئی دوسرا شخص ہوتا جبکہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کردی جاتی۔ مشابرم خان کو جب شہر یار کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملتی ہے تو اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار، ماہ بانو، اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ ادھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کردیا جاتا ہے اور را اور موساد والے سمجھتے ہیں کہ شہر یار کا پتا صاف ہوگیا۔ شہر یار انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ ادھر موساد والے عابد انصاری کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہوجاتی ہے تاہم مراد شاہ کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔ کشور کے خدشات دور ہوجاتے ہیں اور وہ بھائی سے مل کے بہت خوش ہوتی ہے۔ ادھر شہر یار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں کے ایک گرو بوبی کو اس مشن میں اپنے ساتھ شامل کرلیتا ہے۔ بوبی اسے ایک ہندو خواجہ سرا شالنی کے پاس لے جاتا ہے۔ شالنی اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیتی ہے مگر بوبی کے جانے کے بعد اس کے تیور ایک دم بدل جاتے ہیں اور وہ اسے فوراً کراچی بھیجنے کا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ جاوید علی اس صورتِ حال پر پریشان ہوجاتا ہے اور اس سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شالنی اسے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی جبکہ جاوید علی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح کراچی جانے سے بچنے کی تدبیر سوجھ جائے۔

''کیا بات ہے رنجنی! تُو کس سوچ میں پڑ گئی ہے؟ تجھے کراچی جانے والی بات پسند نہیں آئی کیا؟'' شالنی نے اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات نہیں ہے دیدی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میرا لاہور چھوڑنے کو من نہیں کرتا۔ یہاں رہوں گی تو جب من کرے گا بوبی دیدی سے ملنے چلی جایا کروں گی۔ کراچی تو اتنی دور ہے۔ وہاں سے یہاں آنا تو بڑا مشکل ہو گا۔'' اس نے ایک عذرِ لنگ پیش کیا۔

''بڑا پریم ہوگیا ہے تجھے بوبی سے۔'' شالنی نے طنز کا تیر پھینکا۔

''پریم تو ہوگا ہی جی۔ انہوں نے اتنے تھوڑے سے دنوں میں میرا جتنا خیال رکھا، اتنا تو میری سگی بہن بھی نہیں رکھتی تھی۔ اگر دھرم کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں کبھی ان کا گھر نہ چھوڑتی۔'' جاوید علی نے جواب دیا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تجھے دھرم کا اتنا خیال ہے۔ دھرم کو سب سے اوپر رکھنے والے بھگوان کو بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ تو دھرم کی ایسی ہی پابندی کرے گی تو مرنے کے بعد سورگ میں تیرا ٹھکانا ہوگا، پر مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تو

ہندو جاتی کی ہوکر ایک مسلمان سے اتنا پریم جتا رہی ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان پلید ہوتے ہیں۔'' شالنی نے پہلے اسے سراہا اور پھر ملامت کی۔

اس بار جاوید علی محتاط ہوگیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے خواجہ سراؤں کے ایسے گروہ تک پہنچنا تھا جو ہندو شدت پسندوں پر مشتمل ہو اور شالنی کی بات سن کر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں کامیابی کے قریب پہنچ گیا ہے۔

''بھگوان مجھے شما کرے۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ پلید مسلوں سے دور رہنا کتنا ضروری ہے۔ اصل میں بوبی دیدی نے مجھ سے جو برتاؤ کیا تھا، اس نے مجھے یہ بات بھلا ہی دی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔'' وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''بوبی کے جھوٹے پریم کے چکر میں نہ پڑنا۔ اس کا پریم وریم سب دکھاوا ہے۔ بڑی ڈرامے باز ہے۔ اپنے چیلوں کو بھی دکھاوے کے لیے نمازوں کی عادت ڈال رکھی ہے۔ اصل میں تو وہ ان سے دھندا کرواتی ہے۔ تجھے بھی اتنے لاڈ سے اس لیے اپنے پاس رکھا ہوگا کہ تُو بڑی سوہنی ہے۔ تُو رام ہوجاتی تو وہ تجھے بھی دھندے میں لگا دیتی، پر اتنے دن اس نے تجھے اپنے پاس رکھ کر دیکھ لیا ہوگا کہ تُو اس کے لیے کام کرنے کو تیار نہیں ہوگی اس لیے اپنا بوجھ میرے اوپر پھینک گئی، پر تُو چنتا نہ کر۔ میں تجھے بوجھ تھوڑا ہی سمجھوں گی۔ یہاں تیری بڑی اچھی دیکھ بھال ہوگی۔'' بوبی کے سامنے اس کے قدموں میں بچھ جانے کو تیار شالنی اب اس کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے سے نظر آنے والا میک اپ سے لتھڑا اس کا چہرہ اس نفرت کی وجہ سے بگڑا ہوا لگ رہا تھا۔

''پر آپ تو مجھے خود سے دور کراچی بھجوا رہی ہیں۔'' جاوید علی نے باقی کسی بھی بات پر تبصرہ کیے بغیر اس کے آخری جملوں کو پکڑ کر شکوہ کیا۔

''وہ تو میں تیرے بھلے کے لیے بھجوا رہی ہوں۔ تُو جھنگ کی رہنے والی ہے اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آئی ہے۔ اگر تیرے گھر والے تیری تلاش میں نکلے تو سب سے پہلے لاہور ہی کا رخ کریں گے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تُو یہاں سے دور چلی جائے۔ رہی تجھے خود سے دور بھجوانے کی بات تو اس کی تُو چنتا نہ کر۔ میرا کراچی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تیری میری ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھر فون کس لیے ہے۔ تجھے وہاں کوئی پریشانی ہو یا دل گھبرائے تو فون پر مجھ سے بات کرلینا۔'' شالنی نے اس پر فرار کے سارے راستے مسدود کردیے تھے۔

''ٹھیک ہے دیدی! اگر آپ سمجھتی ہیں کہ کراچی جانے میں ہی میری بھلائی ہے تو میں راضی ہوں۔''

آخرکار جاوید علی نے ہامی بھر ہی لی۔ اس سے زیادہ بحث شالنی کو برہم بھی کرسکتی تھی اور وہ طیش میں آکر اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے سے انکار کردیتی تو یہ اس کے حق میں کسی طرح مناسب نہیں ہوتا کیونکہ اس کا قیافہ تھا کہ وہ درست جگہ پر پہنچ گیا ہے اور یہاں اسے کامیابی ملنے کا امکان ہے۔ رہی بات کراچی جانے کی تو یہ کیا ضروری تھا کہ وہ لاہور میں رہ کر ہی کام کرتا۔ اگر شالنی کا گروہ ہی اس کا مطلوبہ گروہ تھا تو ان کی سرگرمیاں صرف لاہور تک ہی تو محدود نہیں ہوتیں۔ وہ کراچی میں رہ کر بھی وہی سب کررہے ہوتے بلکہ امکان تھا کہ زیادہ بڑے پیمانے پر کررہے ہوں... کراچی جیسا ملی جلی آبادی والا شہر بہت سی وجوہات کی بنا پر مجرموں کے لیے جنت بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

ذیشان نے اپنے سامنے بیٹھے مشابرم خان کا جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب ہورہا تھا۔ کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال، ملگجا لباس، سرخ آنکھیں اور چہرے پر چھائی تھکن اور اداسی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ شخص کسی شدید دکھ یا مشکل میں گرفتار ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جہاں اسے افسوس ہوا، وہاں شہر یار کی خوش بختی پر رشک بھی ہوا کہ ایسا کیا تھا اس شخص میں کہ لوگ اسے اتنا بے تحاشا چاہتے تھے، ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں تو یہ عالم ہو چلا تھا کہ لوگ اپنے خونی رشتوں سے بھی دور ہوتے جارہے تھے۔ ترقی کی چاہ میں لگائی جانے والی دوڑ نے ہر ایک کو اتنا مصروف کردیا تھا کہ ڈھنگ سے اپنی خوشیاں اور غم بھی منانے کی فرصت نہیں رہی تھی۔

مشابرم خان کی حالت اتنی خستہ لگ رہی تھی کہ ایک دفعہ کو اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو حقیقت سے آگاہ کردے لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ وہ جس شعبے سے وابستہ تھا اور اس کے شانوں پر جو بھاری ذمے داری تھی، وہ اسے اس قسم کی جذباتیت کی اجازت نہیں دیتی تھی چنانچہ اس نے مشابرم خان کی حالت پر مزید غور کرنے کے بجائے اسے یہاں بلانے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کرنا مناسب سمجھا۔

''کیسے ہو مشابرم خان؟'' لہجے کو بے حد سرسری بناتے ہوئے اس نے پوچھا اور براہ راست اسے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر نظروں کو بھٹکاتا رہا۔ اس وقت وہ لوگ ایک معمولی درجے کے ہوٹل میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے اس ہوٹل

کا تعین اس نے خود کیا تھا اور جگہ کے اعتبار سے معمولی سا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا۔ مشابرم خان کو تو خیر کسی ہدایت کی ضرورت تھی ہی نہیں، اپنی خستہ حالت میں وہ ویسے ہی اس ہوٹل کے معمولی حیثیت کے گاہکوں سے میل کھا رہا تھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے سر! میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے شہریار صاحب کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اتنے دن ہو گئے ان کے ایکسیڈنٹ کو لیکن ابھی تک ڈاکٹروں نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی ہے۔ جب بھی پوچھو یہی سننے کو ملتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہاں کے نالائق ڈاکٹر کچھ کہنے کے لائق نہیں ہیں تو رانا صاحب، شہریار صاحب کو علاج کے لیے باہر کیوں نہیں بھجوا دیتے؟ وہ تو اتنی حیثیت والے آدمی ہیں۔ ان کے لیے باہر کے ملک سے علاج کروانا کیا مشکل ہے؟ ایسی مجبوریاں تو ہم غریبوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔" اس کے انداز میں غصہ اور حسرت دونوں تھے۔ ایک طرف شہریار کے لیے اپنی بے تحاشا محبت کے سبب جہاں وہ اس کے لیے پریشان تھا، وہیں شاید اسے عرصے سے اسپتال میں داخل اپنی ماں بھی یاد آ گئی تھی۔ اس کے بھائی اکرم خان کی جوان موت کے بعد وہ صدمے کے باعث جو کومے میں گئی تھی تو ابھی تک ہوش میں نہیں آ سکی تھی۔ اس کے علاج پر اسپتال میں جو بھی اخراجات آتے تھے، ان کا بل اب تک شہریار ہی ادا کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی معمولی تنخواہ کے ساتھ وہ ماں کے علاج پر اتنا خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

"مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے خان! میں جانتا ہوں کہ تم شہریار سے بہت محبت کرتے ہو لیکن تمہیں اس سے وابستہ دوسرے لوگوں کی محبت پر بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔ رانا صاحب کو بھی اس کا بہت خیال ہے۔ وہ خود بھی اسے لندن یا امریکا کے کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں لیکن اس کی جو کنڈیشن ہے، اسے دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز نے اجازت نہیں دی۔ ان کے خیال میں شہریار کے لیے کسی بھی قسم کا سفر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ یہاں کے ڈاکٹرز کا لندن کے قابل ترین ڈاکٹرز سے رابطہ ہے۔ شہریار کی ساری رپورٹس انہیں بھی جا چکی ہیں اور ان کے مشوروں کی روشنی میں اس کی صحت یابی کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ بات تو تم بھی سمجھتے ہو کہ انسان کے اختیار کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے، اس حد کے آگے وہ قدرت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ تم جو جملہ سن کر یہاں کے ڈاکٹروں سے ناراض ہو، وہی رائے لندن کے ڈاکٹرز کی بھی ہے۔ وہ بھی شہریار کی حالت کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں اور انہوں نے اسے سفر سے منع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تفصیل سن کر تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی کہ شہریار کے علاج کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی یا بے پروائی نہیں برتی جا رہی... لیکن قدرت کے سامنے ہم سب مجبور اور بے بس ہیں۔"

وہ نہایت نرم لہجے میں مشابرم خان کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ سب جو اس نے مشابرم خان کو بتایا تھا، تکنیکی اعتبار سے غلط بھی نہیں تھا۔ ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے یہ سارا سلسلہ سچ مچ جاری تھا۔ شہریار کے کوائف کے ساتھ بہت سی جعلی رپورٹس لندن کے ماہرین کو بھجوائی گئی تھیں اور نہایت سنجیدگی سے ان رپورٹس پر ماہرین سے تبادلہ خیال بھی ہوتا رہتا تھا۔

"میری تسلی تو صرف اسی صورت ہو سکتی ہے کہ شہریار صاحب صحت یاب ہو کر اسپتال سے باہر آ جائیں اور دوبارہ سے اپنی سیٹ سنبھال لیں۔ اس ملک کو ان کی بہت ضرورت ہے۔ ان جیسا ایمان دار اور بہادر افسر میں نے اپنی ملازمت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کر کے دل کو خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جسے اس ملک اور اس کے لوگوں کا خیال ہے، ورنہ یہاں تو زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہے جو ملک بیچ کر بھی اپنی تجوریاں بھرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔" مشابرم خان نے شہریار کے لیے اپنے خالص جذبات کا اظہار کیا پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اتنے سارے بے ایمانوں اور چوروں میں ایک ایمان دار آدمی آ جائے تو وہ انہیں اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے اور سارے مل کر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ شہریار صاحب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ ان کے دشمنوں نے بار بار انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی اور وہ قسمت سے بچتے رہے لیکن آخر دشمنوں کا داؤ چل ہی گیا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"حوصلے سے کام لو مشابرم خان! جو کچھ ہوا، وہ واقعی بے حد افسوس ناک ہے لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سچ مچ کسی دشمن کی کارروائی تھی یا شہریار حقیقتاً حادثے کا شکار ہوا ہے۔ جو بھی معاملہ ہوا اسے ہم کھوج نکالیں گے لیکن جو سب سے بڑی حقیقت سمجھانے کے لیے اس وقت میں نے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے، وہ یہ ہے کہ شہریار کے میدانِ عمل سے نکل جانے سے دنیا کا کاروبار ختم نہیں ہو گیا ہے۔ یہاں ازل سے خیر و شر کی جنگ جاری ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہم شہریار کے

ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد حوصلہ ہار دیں اور اپنی اپنی ذمے داریاں بھول کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں... بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد سے ان کے خلاف برسرِ پیکار ہو جانا چاہیے۔ اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے ہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ شہریار کی جگہ ایک نئے بندے کو دے دی جائے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہریار نے اپنے علاقے پر بہت زیادہ محنت کی تھی اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ اس کی جگہ ایک ایسا شخص لایا جائے جو اس کے شروع کیے پروجیکٹس کو محنت اور ایمان داری سے جاری رکھ سکے۔ ہمارا انتخاب ایک ینگ افسر عمیر آفندی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم عمیر کے لیے بھی ویسی ہی محنت سے کام کرو جیسے اب تک شہریار کے لیے کرتے رہے ہو۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے ساتھ کام کر کے تم ناامید نہیں ہو گے۔" اس نے مشابرم خان کو بلانے کا مقصد بیان کیا۔

"میرا دل شہریار صاحب کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔" مشابرم خان نے اداسی سے جواب دیا۔

"اگر تم ایک سچے اور محبِ وطن پاکستانی ہو تو اس انداز سے سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا کیونکہ وطن کی محبت کسی فردِ واحد سے مشروط نہیں ہوتی۔ مانا کہ تم شہریار کی شخصیت اور اس کی خوبیوں سے بہت متاثر ہو لیکن شہریار کوئی واحد شخص تو نہیں ہے جسے اس وطن سے محبت تھی۔ آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی لیکن اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو وطن سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بھلے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ عمیر کو شہریار کی جگہ دی ہی اس یقین کی بنیاد پر جا رہی ہے کہ وہ شہریار کے مشن کو لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" اس بار ذیشان نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں تھوڑی سی تلخی بھر لی۔ وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کے ذہن میں لگی گرہ کو کھولنے کے لیے نشتر زنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ مشابرم خان کے چہرے کا بدلتا تاثر گواہ تھا کہ اس کی حکمتِ عملی ناکام نہیں رہی ہے۔ اس نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کے خیال سے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

"شہریار نے ہمیشہ مجھ سے تمہاری بہت تعریف کی۔ وہ تمہیں آخری سانس تک لڑنے والا سپاہی قرار دیتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اگر میں ملکی مفاد میں تمہیں کوئی کام کرنے کا کہوں گا تو تم کبھی انکار نہیں کرو گے۔"

"انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔" مشابرم خان نے جھکے سر کے ساتھ اسے جواب دیا۔

"تو بس اس وقت ملکی مفاد میں سب سے اچھی خدمت جو تم انجام دے سکتے ہو، وہ یہی ہے کہ تم اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاؤ۔ عمیر کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے پہلے سے ایک مضبوط ٹیم تیار ملے اور اس کا وقت قابلِ اعتبار لوگوں کی تلاش میں برباد نہ ہو۔ دوسرے تم وہاں رہو گے تو عمیر پر چیک بھی رہے گا۔ اس کے ڈرائیور کی حیثیت سے تم ہر جگہ اس کے ساتھ رہو گے تو اس کی کوئی بھی بے ضابطگی فوراً ہی تمہاری نظروں میں آ جائے گی۔" اب پھر وہ اپنے لہجے کو اعتدال پر لے آیا تھا اور نہایت متانت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ کی بات مجھے سمجھ تو آ رہی ہے لیکن یہاں سے جانے کو دل بھی نہیں مان رہا۔ میں ہر وقت اسپتال میں موجود رہتا ہوں تو مجھے تسلی سی رہتی ہے۔ ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا تو یہاں کی فکر لگی رہے گی۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ اپنے تئیں تم دن رات اسپتال میں ڈیرا ڈال کر شہریار کی سیکیورٹی کے فرائض انجام دے رہے ہو لیکن یقین کرو کہ تمہیں یہ تکلیف اٹھانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ شہریار کے معالجین سمیت وہاں موجود پورا اسٹاف ہمارے لیے قابلِ اعتبار ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس کی سیکیورٹی کا مناسب انتظام کر رکھا ہے۔ اس بات کا اندازہ تم اس دن کے واقعے سے بھی لگا سکتے ہو جب میں نے تمہیں فون کر کے معاملے سے الگ رہنے کی ہدایت کی تھی۔" ذیشان نے اسے اس واقعے کا حوالہ دیا تھا جب رائے چند نامی را کا ایک مبینہ ایجنٹ اشیش کمار کے کمرے میں ڈیوٹی دینے والی نرس سے رقم کے عوض شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے لے گیا تھا۔

"اس واقعے نے تو ابھی تک مجھے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے خود مجھ سے ذکر کر دیا۔ ورنہ میں آپ سے پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا اور اس رات وہاں کیا ہو رہا تھا؟"

مشابرم خان فوراً ہی ذہن میں اٹکا وہ سوال جسے اب تک ذیشان کے لحاظ میں نہیں پوچھ سکا تھا، زبان پر لے آیا۔

"کچھ مجبوریوں کی وجہ سے میں تمہیں اس واقعے کی تفصیلات اور حقائق سے آگاہ نہیں کر سکتا لیکن اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس واقعے سے شہریار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ فائدے میں ہی رہا ہے۔" ذیشان نے نہایت سنجیدگی سے اس انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا کہ اسے مزید اس موضوع پر جرح کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی اور وہ گویا ہتھیار

ڈالتے ہوئے بولا۔

’’ٹھیک ہے سر! میں آپ کے حکم پر واپس ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہوں۔ شہر یار صاحب آپ کو جو اہمیت دیتے تھے، اس کی وجہ سے میں آپ کے حکم سے انکار کی جرأت نہیں رکھتا۔‘‘

’’گڈ... مجھے تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔‘‘ ذیشان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے سامنے دھری چائے کی پیالی پر نظر ڈالی۔ میلے سے کپ میں ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کسی طور اس لائق نہیں تھی کہ وہ اسے پینے کی جرأت کرسکتا۔ مشابرم خان نے بھی اس چائے کو منہ نہیں لگایا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ایسا اس نے ناپسندیدگی کی وجہ سے کیا تھا یا ذیشان کو چائے کو ہاتھ نہ لگاتے دیکھ کر خود بھی احتراماً اس کی تقلید کی تھی۔

’’کام جو میں نے تمہیں بتایا ہے، تم آسانی سے کر لوگے کیونکہ تمہیں اس کا خاصا تجربہ ہے۔ البتہ ہوسکتا ہے کہ میں وقتاً فوقتاً تم سے کچھ اور بھی کام لیتا رہوں۔ امید ہے کہ تم اس صورت میں بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے۔‘‘ ذیشان نے بات کو آگے بڑھایا۔

’’فی الحال آپ میرے لیے شہر یار صاحب کے قائم مقام ہیں، میں نے صاحب کو کبھی کسی کام سے انکار نہیں کیا اس لیے آپ کو بھی نہیں کروں گا۔‘‘ مشابرم خان کا جواب بہت سادہ اور واضح تھا۔

’’میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شہر یار ہی کی طرح میری بھی کسی ہدایت پر عمل کر کے تمہیں کبھی پچھتاوا یا افسوس نہیں ہوگا البتہ خیال رکھنا کہ اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے جذباتیت کا شکار نہ ہو۔ میں تمہیں جتانا نہیں چاہتا لیکن شہزادی کی موت کی مثال دے کر یہ سمجھانا ضرور چاہتا ہوں کہ جذباتیت سے بعض اوقات بہت بڑے بڑے نقصان ہوجاتے ہیں۔ اگر تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو تو اس روز تم نے شہر یار کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر لاہور کی طرف دوڑ لگا کر کوئی عقل مندی نہیں کی تھی کیونکہ یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا، تم اس میں اپنا کوئی کردار ادا نہیں کرسکتے تھے جبکہ یہاں آنے کے بجائے اگر تم اس روز اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہوتے تو ہو سکتا تھا، شہزادی کی زندگی بچ جاتی۔ مارنے والوں نے اس کے قتل کو حادثے کی شکل دینے کی بے شک بہت بھرپور کوشش کی تھی لیکن ہمیں بہت سے ایسے واقعاتی ثبوت ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بے چاری کو قتل کیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر اس رات تم اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرسکتے تھے اور کچھ نہیں تو شاید تمہیں وہ معلومات پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی جنہیں اس کے سینے میں ہی دفن کر دینے کی خاطر اسے اور اس کے معصوم بچے کو قبر کے اندھیروں میں اتار دیا گیا۔‘‘ ذیشان بول رہا تھا اور مشابرم خان منہ کھولے سن رہا تھا۔ شہزادی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر اس تک بھی پہنچی تھی اور اسے شک بھی ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی سازش کا شکار نہ ہو گئی ہو لیکن بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ منظر پر آنے پر اس نے اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا دماغ شہر یار کی وجہ سے اتنی بُری طرح الجھا ہوا تھا کہ وہ بہت زیادہ اس معاملے پر غور نہیں کرسکا تھا۔

’’جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ گیا وقت دوبارہ واپس نہیں آسکتا لیکن آئندہ کے لیے خود کو سنبھال کر تم اپنی غلطی کی تلافی کرسکتے ہو۔‘‘ اس کی کیفیت دیکھ کر ذیشان نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ جواب میں وہ صرف اثبات میں سر ہی ہلا سکا۔ ذیشان اس کی ایک ایک حرکت کا غور سے جائزہ لے رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مشابرم خان پر کی جانے والی اس کی محنت ضائع نہیں جارہی ہے۔

’’تم جگو سے بھی اچھی طرح واقف ہو گے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس سے رابطے میں رہو اور اس سے ملنے والی کوئی بھی اطلاع فوراً مجھ تک پہنچا دیا کرو۔ ویسے تو میں خود براہِ راست بھی اس سے رابطہ کرسکتا ہوں لیکن مناسب یہی ہے کہ بلاضرورت میں کسی کے سامنے نہ آؤں۔ شہر یار کے بعد اس کے حصے کی ذمے داریاں بھی میرے شانوں پر آگئی ہیں اس لیے میں بزدل نہ ہونے کے باوجود تھوڑا سا محتاط رہنا مناسب سمجھتا ہوں۔‘‘ مشابرم خان کو ایک اور نئی ہدایت دیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر ایک ایسی بات کہی جس سے اسے یہ پیغام مل سکے کہ شہر یار کی عدم موجودگی میں اب وہی سب سے اہم ہے تاکہ نادانستہ بھی وہ کہیں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہوسکے۔

’’ٹھیک ہے سر! میں آپ کی ہر بات پر عمل کروں گا۔‘‘ مشابرم خان کا لہجہ و انداز... گفتگو کے آغاز کے مقابلے میں کافی تبدیل ہو گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر کام کرنے کی آمادگی پیدا ہوگئی ہے۔

’’میں بھی تمہیں ناامید نہیں کروں گا۔‘‘ ذیشان نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مشابرم خان نے بھی اس کی تقلید کی۔

’’تمہارے لیے میرے پاس ایک خبر اور تھی۔ وہ یہ کہ اے سی کی حیثیت سے شہر یار جو کچھ کر رہا تھا، وہ سب تو انشاء اللہ عمیر سنبھال لے گا البتہ اس کے ذاتی پروجیکٹس کو خود رانا صاحب نے اپنی نگرانی میں لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہاری والدہ کے علاج کی ذمے داری بھی اب رانا صاحب ہی اٹھائیں گے۔ اس لیے تمہیں اس سلسلے میں آئندہ بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے کھڑے ہی اس نے یہ اطلاع دی اور پھر یک دم ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مشابرم خان پُرنم آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ ان حالات میں بھی شہر یار کی ذات سے اسے پہنچنے والے فیض کا سلسلہ رکا نہیں تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل کو گداز ہوتا محسوس نہیں کرتا۔ وہ پورے خلوص اور محبت سے دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ شہر یار دوبارہ میدانِ عمل میں آجاتا تو اس سے زیادہ کوئی اس بات پر خوش نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

شالنی اور جاوید علی لاہور سے بائی ائر کراچی پہنچے تھے۔ اس سفر کے دوران جاوید علی کو اپنی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا۔ لاہور ائرپورٹ سے لے کر کراچی تک اسے لوگوں کی جو نظریں، معنی خیز جملے اور مسکراہٹیں برداشت کرنی پڑی تھیں ان کی وجہ سے وہ اچھی خاصی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اسے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ معاشرہ اس تیسری جنس کے ساتھ کتنا بے ہودہ سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ اس موقع پر اس نے ان خواجہ سراؤں کو بھی تھوڑا قصوروار سمجھا تھا۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے لیے جن بھڑکیلے کپڑوں، میک اپ اور چال ڈھال کا سہارا لیا تھا، اس کی وجہ سے خود ہی تماشا بن بیٹھے تھے۔ اتنے بھڑکتے حلیے میں تو کوئی عام عورت بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی تو پھر وہ کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس نے اور شالنی نے جس حلیے میں سفر کیا تھا، اگر اس کے بجائے وہ عام سے سادہ لباس پہنے ہوتے تو اتنا زیادہ مرکزِ نگاہ نہ بنتے۔ بہرحال، موجودہ حالات میں وہ اپنے ان خیالات کا اظہار نہیں کرسکتا تھا چنانچہ ساڑی کا پلو لہرا کر بے نیازی سے چلتی شالنی کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔ ان دونوں کے پاس کوئی قابلِ ذکر سامان نہیں تھا۔ اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھا ہوا تھا اور یہ بیگ اس کے شانے سے لٹک رہا تھا جبکہ شالنی کے پاس بھی ایک بڑے ہینڈ بیگ کے سوا کچھ اور نہیں تھا اس لیے انہیں... لاؤنج سے نکل کر پارکنگ میں جانے کے لیے کسی ٹرالی وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے، ایک سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ رینگ کر ان کے قریب آگئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ ڈرائیور گاڑی روک کر تیزی سے باہر نکلا اور ’’نمستے دیدی‘‘ کہتا ہوا شالنی کے قدموں میں جھک گیا۔ شالنی نے بڑی شفقت سے اسے آشیرباد دیا البتہ جاوید علی دلچسپی سے ڈرائیور کا جائزہ لیتا رہا۔

نوجوان اور خوب صورت ڈرائیور کو مخصوص یونیفارم اور سر پر موجود کیپ کی وجہ سے پہلی نظر میں دیکھ کر کسی نوعمر لڑکے کا تاثر پیدا ہوتا تھا لیکن جب وہ بولا تو جاوید علی پر اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تھی اور پھر گہری نظروں سے لیے جانے والے جائزے نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ ڈرائیور کی یونیفارم میں درحقیقت وہ ایک خواجہ سرا تھا۔

’’ٹھیک تو ہے آشا؟‘‘ شالنی ڈرائیور کے گال کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

’’جی دیدی اچھی ہوں۔ آپ کے آنے کی خبر سن کر تو من ویسے ہی بہت خوش ہو جاتا ہے۔‘‘ ڈرائیور نے شرمائے ہوئے انداز میں شالنی کی بات کا جواب دیا تو اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی لیکن زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور جاوید علی کو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنا بیگ سنبھال کر فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

’’یہ رنجنی ہے۔ یہ بھی اب ادھر تم لوگوں کے ساتھ ہی رہے گی۔‘‘ گاڑی چلی تو شالنی نے تعارف کی رسم نبھائی۔

’’خوشی ہوئی تم سے مل کر۔‘‘ آشا نے جاوید علی پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے رسمی سے لہجے میں کہا۔

’’رنجنی بہت دکھی ہے۔ تم سب کو اس کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ خاص طور پر تجھے آشا! تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ پر سب سے زیادہ وشواس رکھتی ہوں۔‘‘ اس کا انداز دیکھ کر شالنی نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

’’آپ چنتا نہیں کریں دیدی! رنجنی کا کھلی بانہوں سے سواگت ہوگا۔ اس کا خیال رکھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اسے آپ اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں۔‘‘ آشا نے سنبھل کر فوراً یقین دہانی کروائی پھر جاوید علی کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’آج سے تو اور میں سکھی ہیں۔ تو اپنا ہر دکھ سکھ مجھ سے بانٹ سکتی ہے۔ دیکھ، تکلف کر کے شالنی دیدی کے سامنے میرا سر نہ جھکانا۔‘‘

’’دھنیواد آشا! بھگوان نے مجھ پر کرپا کی ہے کہ یہاں آتے کے ساتھ مجھے اتنی پیاری سکھی مل گئی ہے۔ میں بھی ہمیشہ تیری قدر کروں گی۔‘‘ جاوید علی نے فوراً ہی نہایت انکساری کے ساتھ اسے جواب دیا۔ وہ ایک خواجہ سرا کا کردار بڑی خوبی سے نبھا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے لے کر بول چال تک میں کوئی ایسی کسر نہیں رہ گئی تھی کہ اس پر شک کیا جا سکتا۔ اس کامیابی میں اس کی فطری ذہانت اور صلاحیت کے علاوہ بوبی کی تربیت کا بھی دخل تھا اس لیے وہ دل ہی دل میں متعدد بار اس کا شکریہ ادا کر چکا تھا۔

’’ارے بھئی کہیں یہ نہ ہو کہ دونوں سکھیاں مل کر مجھ نگوڑی کو بھول جائیں۔‘‘ شالنی نے یوں تو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی گفتگو میں حصہ لیا تھا لیکن آشا کو گویا کرنٹ لگ گیا۔

’’ایسا سوچنا بھی نہیں دیدی! میں ایسی سو سکھیاں آپ پر سے وار کر پھینک دوں۔ آپ کی جو جگہ میرے من میں ہے، وہ کسی دوسرے کو کبھی نہیں مل سکتی۔‘‘ وہ بڑی تڑپ کے ساتھ شالنی کے آگے وضاحت کر رہی تھی۔

’’تو بھی نہ آشا... بس ذرا سی بات من پر لے لیتی ہے۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہی تھی ورنہ کیا مجھے معلوم نہیں ہے کہ تو مجھے کتنا چاہتی ہے اور میری جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔‘‘ پچھلی نشست پر بیٹھی شالنی نے ذرا جھک کر آشا کا شانہ تھپتھپایا تو اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہوئے اور وہ ایک بار پھر پوری توجہ سے گاڑی چلانے لگی۔ جاوید علی بہت گہری نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ آشا کی شالنی سے والہانہ محبت کی کیا وجہ تھی؟ وہ سمجھ نہیں سکا تھا لیکن اس کے دل میں ایک عجیب بے نام سا احساس ضرور جاگ گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ آنے والے وقت میں اسے وجہ بھی سمجھ آ جاتی، ابھی تو ابتدا تھی۔ وہ جس بھید بھری دنیا میں داخل ہونے والا تھا، وہاں جانے اسے کن کن حقائق اور حیرتوں کا سامنا کرنا تھا۔

سبک رفتار سے دوڑتی گاڑی نے بہت آرام سے انہیں ایک پوش علاقے میں پہنچا دیا۔ اپنی متنازعہ جنس سے قطع نظر آشا بہت اچھی ڈرائیور ثابت ہوئی تھی اور اس نے کراچی کے منہ زور ٹریفک میں اتنی مہارت سے گاڑی چلائی تھی کہ کہیں انہیں ایک جھٹکا نہ لگنے دیا تھا۔ پوش علاقے میں داخل ہونے کے بعد گاڑی جلد ہی ایک بڑی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے جا رکی۔ کوٹھی باہر سے ہی اتنی خوب صورت نظر آ رہی تھی کہ مکینوں کی امارت کے بارے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ حقیقتاً یہاں پہنچ کر جاوید علی کو تھوڑی حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں تو شالنی اسے یہاں بھی ایسے کسی تنگ گلیوں والوں والے محلے کے کسی گھر میں لے جانے والی تھی، جیسے گھر میں وہ لاہور میں رہتی تھی لیکن اس کے اندازے کے بالکل برعکس وہ ایک عالی شان کوٹھی تک پہنچ چکا تھا۔ آشا نے ہارن بجایا تو کوٹھی کا بڑا سا آہنی گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔

اس بار اس نے گیٹ کے قریب کھڑے چوکیدار کے حلیے اور لباس سے کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ وہ بھی سو فیصدی ایک خواجہ سرا ہی تھا۔ یعنی وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا تھا جہاں خواجہ سراؤں کی حکمرانی تھی لیکن کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر موجود نام نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہاں کسی نواب نوازش علی کا نام لکھا تھا۔ نام سے جنس اور مذہب دونوں ہی کی وضاحت ہو رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کسی مسلمان نواب صاحب کا ہندو خواجہ سراؤں کے اس ہجوم سے کیا تعلق تھا؟ ڈرائیور اور چوکیدار کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوٹھی کے دوسرے ملازمین بھی اسی صفت سے تعلق رکھنے والے ہوں گے۔

گاڑی آہستگی سے دوڑتی سرخ بجری سے بنی روش سے گزر کر کوٹھی کی مرکزی عمارت کے سامنے جا رکی۔ وہاں استقبال کے لیے پہلے ہی ایک خواجہ سرا موجود تھا۔ یہ خواجہ سرا بہت خوب صورت تھا اور اس نے چوڑی دار پاجامے اور فراک پر مشتمل نہایت خوب صورت و بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جاوید علی کا یہاں پہنچنے کے بعد تیسرے خواجہ سرا سے سامنا ہو رہا تھا اور تینوں میں یہ خصوصیت مشترک تھی کہ وہ بہت خوب صورت تھے۔ خود جاوید علی نے اپنی ذات پر غور کیا تو اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس کے انتخاب کی بھی وجہ یہی ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے بڑی فراوانی سے خوب صورتی عطا کی گئی تھی۔ اس خوب صورتی اور اپنی کم عمری کا فائدہ اٹھا کر اس نے خود کو نہایت آسانی سے خواجہ سرا کے روپ میں ڈھال لیا تھا اور اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں شاید کسی نے خواجہ سراؤں کی اِندر سبھا سجا رکھی تھی۔

’’پرنام شالنی جی! نواب صاحب کی طرف سے میں آپ کا سواگت کرتی ہوں۔‘‘ آشا نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو شالنی باہر نکلی اور وقار سے چلتی ہوئی سامنے آنے والے نئے نمونے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جاوید علی بھی اس کے پیچھے تھا اور دلچسپی سے اس پروٹوکول آفیسر نما شے کو دیکھ رہا تھا جس کے شوخ لباس کے باوجود لہجے میں خاصی متانت تھی۔

’’کیا نواب صاحب کوٹھی میں تشریف نہیں رکھتے ہیں؟‘‘ شالنی نے پوچھا۔ اس وقت وہ اس بے تکلفی سے گریز کر رہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے ڈرائیور آشا کے ساتھ کیا تھا۔

’’نواب صاحب ابھی ابھی ایک میٹنگ سے واپس آئے ہیں اور فریش ہو رہے ہیں۔ آپ کے لیے ان کی تاکید تھی کہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ان کے آنے تک خاطر مدارت کی جائے۔‘‘ اس نے احترام سے شالنی کے سوال کا جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے پھر وہیں چلتے ہیں۔‘‘ اس کا جواب سن کر شالنی نے قدم آگے بڑھا دیے۔ جاوید علی کو تو اس کی تقلید ہی کرنی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا اس کوٹھی میں آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ کوٹھی کا ڈرائنگ روم شان دار اور ان تمام لوازمات سے مزین تھا جن سے صاحب خانہ کی امارت اور خوش ذوقی کا اظہار ہو سکے۔ ان دونوں کے وہاں بیٹھتے ہی مشروبات پیش کر دیے گئے۔ شالنی خاموشی سے ایک گلاس تھام کر اس میں سے گھونٹ گھونٹ مشروب اپنے حلق سے نیچے اتارتی رہی۔ اس کی خاموشی کی صورت میں جاوید علی نے بھی تکلم کو نامناسب جانا۔ اس کے ذہن میں بے شک بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب کے لیے صبر سے انتظار کرنا ہی مناسب تھا۔ ابھی اسے ان میں شامل ہوئے دیر ہی کتنی گزری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کب اور کیا بات کرنا مناسب ہے البتہ اس نے اتنا ضرور محسوس کر لیا تھا کہ گاڑی سے اترتے ہی شالنی نے شوخی اور بے تکلفی کو بھلا کر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اس وقت بھی ڈرائنگ روم کی فضا کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ بوجھل سی خاموشی کے چند منٹ رینگ رینگ کر گزرے تو ڈرائنگ روم کے دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر سرخ و سپید رنگت والا ایک پچپن سے ساٹھ سال کے درمیان وجیہہ آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے وجیہہ سراپا پر سفید کرتہ پاجامہ خوب کھل رہا تھا اور بغیر کسی تعارف کے بھی یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ وہی نواب نوازش علی ہے۔ شالنی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر نواب صاحب کو تعظیم دی۔ جاوید علی کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

’’تشریف رکھیں شالنی جی۔‘‘ نواب صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود بھی ایک گداز صوفے پر نشست سنبھال لی اور گمبھیر لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

’’ہمیں افسوس ہے کہ اس بار آپ کی آمد کی وجہ.... خوش گوار نہیں ہے۔‘‘

’’افسوس تو مجھے بھی ہے نواب صاحب، پر بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چل سکتی ہے۔ وہ جیون دیتا ہے تو واپس

بھی لے لیتا ہے۔ بس غم ہے تو یہ کہ رتی بڑی بھری جوانی میں سنسار چھوڑ کر سورگ باشی ہو گئی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔‘‘ شالنی کے چہرے پر غم کے سائے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آنے لگی تھی۔ جاوید علی نے ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ کسی خواجہ سرا کی موت واقع ہو گئی ہے اور یقینی طور پر وہ خواجہ سرا اس کوٹھی میں ہی مقیم تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس خواجہ سرا سے شالنی کا کیا تعلق تھا کہ وہ اس کے مرنے کی اطلاع سن کر اتنی ایمرجنسی میں لاہور سے کراچی پہنچ گئی۔ تعلق جو بھی تھا، وہ تو بالآخر اسے معلوم ہو ہی جاتا لیکن اس وقت وہ شالنی کے رویّوں میں لمحہ بہ لمحہ ہوتی تبدیلیوں پر حیران تھا۔ لاہور میں جب اس نے اسے کراچی جانے کا فیصلہ سنایا تھا، اس وقت سے لے کر دورانِ سفر اور آشا سے لاڈ بھری گفتگو تک کہیں اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا کہ وہ کسی المناک خبر کو سن کر یہاں آئی ہے اور کسی بات پر دکھی ہے لیکن اب وہ سراپا غم نظر آ رہی تھی۔ کمال یہ تھا کہ نہ تو اس نے آنسو بہائے تھے، نہ لبوں سے سسکی نکلی تھی اور نہ ہی زبان پر کوئی حرفِ شکایت لائی تھی... پھر بھی مجسم غم نظر آ رہی تھی۔

’’ہمیں خود بھی رتی کی جوان موت پر بہت دکھ ہے۔ اس نے تھوڑے سے عرصے میں ہمیں بہت سکھ دیا تھا اور ہمارے بہت قریب ہو گئی تھی۔ ہم نے بھی بدلے میں اسے نوازنے میں کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمیں جتنا نہال کیا تھا، ہم نے اسے اس سے زیادہ نوازا تھا لیکن ہم کسی کی قسمت بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔ وہ جتنی عمر لکھوا کر لائی تھی، اتنا ہی جی۔ ڈینگی بخار تو سمجھو کہ موت کا بہانہ بن گیا۔ ورنہ تو ہم نے کتنوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد صحت یاب ہوتے دیکھا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو تو اتنا اچھا ٹریٹمنٹ بھی نہیں ملا جتنی توجہ سے ہم رتی کا علاج کروا رہے تھے۔‘‘

’’میں سب جانتی ہوں نواب صاحب! آپ کی میری کوئی آج کی جان پہچان نہیں ہے جو میں آپ کی دریا دلی کو نہ جانتی ہوں۔ پر جب اس بے چاری کا وقت ہی پورا ہو گیا تھا تو آپ کیا کر سکتے تھے۔‘‘ شالنی نے فوراً نواب صاحب کی دل جوئی کی ذمے داری سنبھال لی۔ خاموش سامع بنے جاوید علی نے اس بار غور کیا تو اسے نواب صاحب، شالنی سے بھی بڑھ کر دکھی نظر آئے۔ اگر یہ ان کی شان کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس وقت وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہوتے۔

’’ہم رتی کی کمی کو بہت محسوس کریں گے۔‘‘ شالنی کے تسلی دینے کے باوجود نواب صاحب سخت آزردہ نظر آ رہے تھے۔

''مجھے آپ کے دل کی حالت معلوم ہےنواب صاحب! اسی لیے رتی کا بدل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔'' شالنی کے الفاظ نے جاوید علی کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ صورتِ حال خاصی حد تک اس کے سامنے واضح تھی۔ بظاہر وجیہہ اور بارعب نظر آنے والا نواب نوازش علی یقینی طور پر اخلاقی ابتری کا شکار تھا اور اپنی اس اخلاقی پستی کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے گرد ملازموں کے روپ میں خوب صورت خواجہ سراؤں کا ہجوم جمع کر لیا تھا۔

''یہ تو وقت بتائے گا کہ یہ رتی کا بدل ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ فی الحال آپ جائیں اور آرام کریں۔ رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے آپ کا تازہ دم ہونا ضروری ہے۔'' نواب صاحب نے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے شالنی کو جواب دیا۔ اس ایک نظر میں جو کچھ تھا، اسے محسوس کر کے جاوید علی مرد ہونے کے باوجود اندر سے کٹ کر رہ گیا۔

''دھنیواد نواب صاحب! واقعی مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ بھی آرام کریں۔ اگر کہیں تو رنجنی خدمت کے لیے آپ کے ساتھ آپ کی خواب گاہ میں چلی جائے گی۔'' اس سے کچھ بھی پوچھنے یا اسے بتانے کی زحمت کیے بغیر شالنی نے فراخ دلی سے نواب صاحب کو پیشکش کی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تین دن تک رتی کے مرنے کے سوگ میں اپنے ہر شغل سے دور رہیں گے۔'' نواب نوازش علی نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے ہاتھ سے بھی اشارہ کیا۔ اس کا جواب سن کر جاوید علی کے وجود میں سکون کی لہر سی دوڑ گئی ورنہ تو وہ ڈر گیا تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی صورتِ حال سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔

''جیسی آپ کی اِچھا۔ بندی تو حکم کی غلام ہے۔'' شالنی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر درباری انداز میں اپنی تابع داری کا اظہار کیا۔

''ہم اب آرام کریں گے۔ رتی کے کریا کرم کے لیے آپ کو جس قسم کی بھی ضرورت ہو، ہمارے سیکریٹری کو بتا دیجیے گا۔ وہ آپ سے مکمل تعاون کرے گا۔'' نواب صاحب اتنا کہنے کے بعد کمرے میں مزید رکے نہیں۔ جاوید علی نے اس بار ان کا دوسرے زاویے سے جائزہ لیا تو ان کے قدم غم کے باعث بوجھل محسوس ہوئے۔

''چل رنجنی! تو بھی چل کر تھوڑا آرام کر لے۔ رات کو رتی کا کریا کرم کرنا ہے اس لیے آرام کا سمے ملنا مشکل ہو گا۔'' نواب صاحب کے جاتے ہی شالنی نے جاوید علی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر کا رخ کیا۔ باہر ان کا اسی خوب رو خواجہ سرا سے سامنا ہوا جسے جاوید علی نے یہاں کا پروٹوکول آفیسر قرار دیا تھا۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں کاجل! تم رنجنی کے لیے کسی کمرے کا انتظام کر دو۔'' شالنی نے اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے شالنی جی! میں ایسا کرتی ہوں کہ اسے ابھی آشا کے کمرے میں بھیج دیتی ہوں۔ بعد میں اسے رتی کا کمرا دے دیا جائے گا۔'' کاجل نے اسی متانت سے جواب دیا جس کا مشاہدہ جاوید علی یہاں آتے وقت ہی کر چکا تھا۔ اسے کاجل کے حوالے کرنے کے بعد شالنی خود آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد کاجل نے کسی ملازمہ کو آواز دی اور اسے، رنجنی یعنی جاوید علی کو آشا کے کمرے تک پہنچانے کی ہدایت کی۔ ملازمہ فوراً ہی اسے لے کر چل پڑی۔ جاوید علی کی توقع کے خلاف وہ اسے کوٹھی کی مرکزی عمارت سے ہٹ کر کسی سرونٹ کوارٹرز وغیرہ پر مشتمل حصے میں نہیں لے گئی تھی بلکہ مرکزی عمارت کی ایک بغلی گلی سے گزر کر اس کے پچھلے حصے میں لے گئی تھی۔ اس حصے میں قطار سے آمنے سامنے بنے کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ انہی دروازوں میں سے ایک پر اس نے دستک دی تو دروازہ کھول کر آشا سامنے آ گئی۔ وہ اس وقت بھی ڈرائیور کے یونیفارم میں تھی۔ البتہ سر پر کیپ موجود نہیں تھا اور اس کے بوائے کٹ بال نظر آ رہے تھے۔ یونیفارم کے ساتھ یہ ہیئر اسٹائل اس پر خاصا جچ رہا تھا۔

''کاجل دیدی نے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ آج یہ تمہارے کمرے میں ہی رہے گی پھر کل سے اسے رتی کا کمرا دے دیا جائے گا۔'' ملازمہ نے آشا کو پیغام دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ملازمہ کو مختصر جواب دیا اور مسکراتے ہوئے جاوید علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''آؤ رنجنی! اندر آ جاؤ۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں خود اکیلے رہنے سے گھبرا رہی تھی۔ بہت اچھا ہوا کہ کاجل دیدی نے آج کے لیے تمہیں میرا مہمان بنا دیا۔'' وہ ہاتھ تھامے تھامے اسے اندر لے گئی۔ یہاں موجود خواجہ سراؤں کا جو عجیب و غریب کردار ذرا سی دیر میں اس کے سامنے آیا تھا، اس کے پیشِ نظر اسے آشا کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کی وجہ سے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی لیکن مصلحت کا

تقاضا تھا کہ وہ کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر برداشت کرے۔

''بڑے سخت ہاتھ ہیں تمہارے؟ کیا اب تک اینٹیں ڈھونے کا کام کرتی رہی ہو؟'' وہ سی ایف پی کا ایک تربیت یافتہ نوجوان تھا جسے لڑائی بھڑائی اور ہتھیار چلانے جیسے مردانہ اوصاف سکھائے گئے تھے، اس کے ہاتھوں کو سخت تو ہونا ہی تھا اور یہ بات آشا نے فوراً ہی محسوس کر کے اسے ٹوک دیا تھا۔

''اینٹیں تو نہیں ڈھوئیں لیکن بڑی مشقت میں جیون بِتایا ہے اس لیے ہاتھ تو سخت ہونے ہی تھے۔'' جاوید علی نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں اسے جواب دیا۔ ساتھ ساتھ وہ آشا کے کمرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ فردِ واحد کی ضروریات کے اعتبار سے سجایا گیا یہ کمرا کسی بھی طرح ایک ملازم کا کمرا نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں ٹیلی ویژن سے لے کر روم ریفریجریٹر تک ہر سہولت موجود تھی۔ فرش پر بچھا قالین اور کھڑکیوں پر پڑے پردے بھی خاصے بیش قیمت تھے۔ غرض بغیر تعارف کے اس کمرے میں داخل ہونے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی ملازم کے کمرے میں آیا ہے۔

''دکھیاری معلوم ہوتی ہو۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ یہاں تھوڑے دن رہو گی تو سارے غم بھول جاؤ گی۔ یہاں جیون کا ہر سکھ موجود ہے، بس ایک نواب صاحب کا من جیت لو پھر کوئی پریشانی تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔'' اسے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آشا نے خود ایک کرسی سنبھال لی۔

''ان کا من جیتنے کا گر تو تم ہی مجھے سکھانا۔ میرے لیے تو یہ بڑی انوکھی دنیا ہے اور مجھے یہاں کی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ شالنی دیدی اتنی جلدی میں مجھے یہاں لے کر آئی ہیں کہ انہیں کچھ بتانے اور مجھے پوچھنے کا سمے ہی نہیں ملا۔ مجھے تو نام کے علاوہ نواب صاحب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔'' اس نے پلکیں جھپکا کر نہایت معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتیاط سے آشا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں تمہیں بتا دیتی ہوں نواب صاحب کے بارے میں۔ نواب صاحب کا تعلق بھارت کی ایک ریاست سے ہے۔ ان کے آبا ؤ اجداد وہاں رہتے تھے۔ پاکستان بنا تو ان کے ماتا پتا اپنا سب مال اسباب سمیٹ کر یہاں چلے آئے۔ نواب صاحب اپنے ماتا پتا کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ماتا پتا دونوں کا ہی دھیانت ہو چکا ہے۔ نواب صاحب اپنے سورگ باشی ماتا پتا دونوں سے ہی بڑا پریم کرتے تھے اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند سے دو الگ الگ عورتوں سے بیاہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں رہتی ہیں۔ بڑی بیگم کے دو بیٹے ہیں اور دونوں مری کے کسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ چھوٹی بیگم کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی یہیں رہتی ہے جبکہ بیٹا مری میں پڑھ رہا ہے۔ نواب صاحب کے پریوار میں عورتوں کو پردہ کروانے کا رواج ہے اور شروع ہی سے یہ ریت چلی آ رہی ہے کہ زنان خانے میں کسی مرد ملازم کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ ان کی جگہ خواجہ سراؤں سے کام لیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے پرکھوں کی اس ریت کو قائم رکھا اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پوری کوٹھی میں کسی مرد ملازم کا گزر نہیں ہے۔ ڈرائیور، خانساماں، مالی، چوکیدار سب کے سب خواجہ سرا ہیں۔ نواب صاحب کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا مرد رہتا ہے تو وہ ان کا بڈھا سیکریٹری ہے۔ اسے بھی بغیر نواب صاحب کی اجازت کے کوٹھی کی مرکزی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اور وہ پیچھے انیکسی کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ نواب صاحب کے بہت کم دوست ایسے ہیں جنہیں انہوں نے کوٹھی پر آنے کی اجازت دے رکھی ہو۔ جنہیں اجازت ہے، وہ بھی انیکسی میں بنے ڈرائنگ روم تک ہی آتے ہیں۔ باقی پوری کوٹھی میں ہم لوگوں ہی کا راج ہے۔''

آشا نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں جو اضافہ کیا، اس سے نواب نوازش علی کا کردار اور بھی الجھ گیا۔ وہ عجیب ہی آدمی تھا جس نے دو دو بیویوں اور بچوں کے ہوتے ہوئے کوٹھی میں یہ اِندر سبھا سجا رکھی تھی۔ شاید بیٹوں کو یہاں سے دور مری میں رکھ کر تعلیم دلوانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ ان کے سامنے باپ کا کردار نہ کھل سکے۔ رہی بیٹی اور بیویاں تو یقینی طور پر ان خواتین کو اس نے اتنی پابندیوں میں جکڑ رکھا ہو گا کہ وہ کوٹھی کے اوپری پورشن سے نیچے اترنے کی بھی جرأت نہ کر پاتی ہوں گی۔

''پہلی بار ایسے کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔ سن کا بڑا عجیب لگ رہا ہے۔'' اس نے آشا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''نواب صاحب عجیب ہیں پر بڑے دیالو ہیں۔ ایسا عیش تمہیں یہاں کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا۔ یہ میرا کمرا تم دیکھ رہی ہو۔ اس کوریڈور میں موجود سارے کمرے ایسے ہی بلکہ بعض اس سے بھی زیادہ شان دار ہیں۔ میرے سامنے والا کمرا رتی کا ہے۔ آئندہ تم وہاں رہو گی اور جانتی ہو کہ رتی

کا کمرا میرے کمرے سے بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ رتی، نواب صاحب کی بہت لاڈلی تھی اور یہ تمہاری لک ہے کہ تم بغیر کسی محنت کے اس کی جگہ لے رہی ہو۔" آشا کے لہجے میں اس کے لیے ایک غیر محسوس سا حسد تھا۔

"یہ تو شالنی دیدی کی مہربانی ہے۔ وہ ہی مجھے رتی کی جگہ لے کر آئی ہیں۔" اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

"جب ہی تو کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ شالنی دیدی ہم سب کی محسن ہیں۔ انہی کی وجہ سے ہم سڑکوں پر ماری ماری پھرنے کے بجائے یہاں عیش آرام سے رہ رہی ہیں۔ وہ یہاں جس کو جو چاہے، جگہ دلوا دیں۔ ہم میں سے کوئی ان کے سامنے منہ نہیں کھولتا۔" آشا نے اسے بتایا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔

"شما کرنا، باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ تمہاری کچھ خاطر کرنی چاہیے۔ کہو تو اورنج جوس دے دوں؟ کیونکہ میرے خیال میں ابھی تم کچھ اور تو پینے کی عادی نہیں ہوئی ہوگی؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"اورنج جوس ٹھیک ہے۔" اس کی بات پر کوئی کمنٹ دیے بغیر جاوید علی نے محتاط جواب دیا۔ وہ اس کے لیے اورنج جوس کا ٹن پیک نکال کر لے آئی جبکہ خود اپنے لیے اس نے جس سنہری سیال کا انتخاب کیا تھا، اس کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ ام الخبائث ہے۔

"ڈیوٹی ٹائم میں مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے لیکن نواب صاحب نے بتا دیا ہے کہ اب وہ کل دوپہر سے پہلے کہیں نہیں جائیں گے اس لیے میں آزاد ہوں۔" وہ اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"نواب صاحب رتی کی موت پر بہت دکھی معلوم ہوتے ہیں۔" جاوید علی نے مزید جاننے کی خواہش میں یہ چھوٹا سا فقرہ ادا کیا۔

"چنتا نہ کرو۔ چند دن کا دکھ ہے۔ تم نے انہیں سنبھال لیا تو پھر وہ بھول کر بھی دوبارہ رتی کا نام نہیں لیں گے۔ یہاں تو یہی چلتا ہے۔ جو موجود ہے، وہ سب کچھ ہے... جو چلا گیا اسے کوئی یاد نہیں کرتا۔" آشا نے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"یہ رتی کیا شالنی دیدی کی کوئی رشتے دار ہے جو وہ اتنی دور سے اس کے کریا کرم کے لیے آئی ہیں؟" آشا کو شغل میں مصروف ہوتا دیکھ کر اس نے اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ ترنگ میں آ کر اسے جتنا بتا دیتی، وہ جاننے کے لیے شاید اسے یہاں کئی دن سر کھپانا پڑتا اور یہاں کے جو حالات تھے، انہیں دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ نواب صاحب اسے رتی کی جگہ دینے پر تل جاتے تو وہ ان سے اپنی اصلیت کیونکر چھپا پاتا اور اصلیت کھل جانے کے بعد اس کا یہاں ایک پل کے لیے بھی ٹکنا ممکن نہیں تھا۔

"شالنی دیدی کا ہم میں سے کسی سے بھی کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے لیکن وہ ہمارے لیے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ وہی ہیں جن کے کارن ہم میں سے کئی کا جیون بدلا۔ تمہیں یہاں جو ملازمائیں نظر آ رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر شالنی دیدی کی مہربانی سے ہی یہاں پہنچی ہیں۔ تم ہم میں سے ہو اس لیے اچھی طرح جانتی ہوگی کہ سماج ہمارے ساتھ کتنا برا سلوک کرتا ہے اور ہمیں کیسے ترس ترس کر جیون بتانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر ہمارا ہر دکھ سکھ میں بدل گیا اور اس احساس کے بدلے اگر ہمیں شالنی دیدی پر اپنا جیون بھی وارنا پڑے تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔" آشا کچھ زیادہ ہی شالنی سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

جاوید علی کو اندازہ تھا کہ چالاک اور مکار شالنی کے لیے ان ٹھکرائی ہوئی انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لینا کتنا آسان ثابت ہوا ہوگا اور یقیناً اس کی یہ ساری جدوجہد بے مقصد نہیں تھی۔ اس سارے سیٹ اپ کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا اور اسے اسی راز تک پہنچنا تھا۔

"مجھے تو شالنی دیدی اور نواب صاحب کی دوستی بھی عجیب لگ رہی ہے۔ نواب صاحب اتنے کٹر مسلمان ہیں کہ اس دور میں بھی اپنے گھر کی عورتوں کو پردہ کرواتے ہیں، ایسے میں ان کی ایک ہندو خواجہ سرا سے اتنی دوستی سمجھ نہیں آتی۔" اورنج جوس کا گلاس خالی کرتے ہوئے اس نے آشا کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"کٹر مسلمان...." آشا استہزا سے ہنسی۔ "اپنے نواب صاحب کی ساری مسلمانی بس عورتوں کو پردہ کروانے تک ہی ہے۔ عیدوں کے علاوہ میں نے کبھی انہیں نماز کے لیے جاتے نہیں دیکھا۔ روزوں کو وہ اپنی صحت کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ شراب ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔ باقی بھی ہر وہ شغل فرماتے ہیں جس سے انہیں ان کا دھرم روکتا ہے۔ یہاں ہم خواجہ سراؤں کی اتنی بڑی نفری دیکھ کر بھی کیا تمہیں نواب صاحب کے مزاج کی سمجھ نہیں آئی؟" نواب صاحب کی شخصیت پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے آشا نے اس سے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن پیسے والوں کے اپنے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ میں نے تاریخ میں ایسے کئی سورماؤں کے قصے پڑھے ہیں جو کہنے کو تو اسلام کی سربلندی کے لیے ساری عمر لڑتے رہے لیکن ان کے سارے شوق و مشاغل وہی تھے جو تم نے جناب نواب صاحب کے بتائے ہیں۔" جاوید علی کے پاس معقول جواب موجود تھا۔

"بس تو سمجھ لو کہ نواب صاحب بھی انہی دوغلے لوگوں میں سے ہیں۔ شالنی دیدی سے انہیں ان کے کسی دوست نے ملوایا تھا۔ دیدی کو معلوم پڑا کہ نواب صاحب اپنی کوٹھی پر صرف جوان اور خوب صورت خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنا پسند کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے پاس سے انہیں دو ملازمائیں تحفے میں بھیج دیں۔ بس اس کے بعد سے یہ سلسلہ چل پڑا۔ اب نواب صاحب بس اسی خواجہ سرا کو ملازم رکھتے ہیں جس کی سفارش شالنی دیدی نے کی ہو۔ نواب صاحب پچیس چھبیس سے اوپر کی ملازمہ کو پسند نہیں کرتے اس لیے یہاں آنے والوں کو جلدی ریٹائرمنٹ مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کسی ملازمہ سے نواب صاحب کا دل بھر جائے تو وہ اسے عمر سے پہلے بھی ریٹائر کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہر ایک اتنا کما لیتی ہے کہ بعد میں بھی زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ خود شالنی دیدی یہاں سے ریٹائر ہونے والیوں کو اپنے پاس رکھ لیتی ہیں یا پھر اپنے جاننے والوں میں سے کسی کے ہاں جگہ دلوا دیتی ہیں۔" آشا اسے بڑی کارآمد معلومات فراہم کر رہی تھی۔

"تمہاری زبانی شالنی دیدی کے بارے میں سن کر میں تو ان کی گرویدہ ہو گئی ہوں۔ وہ واقعی مہان ہیں جو انہیں اپنی برادری کا اتنا خیال ہے۔ اب دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ وہ کوئی ناتا نہ ہونے کے باوجود اتنی دور سے رتی کے کریا کرم میں شامل ہونے کو آئی ہیں۔" جاوید علی نے جان بوجھ کر ایسے جملے ادا کیے جن سے آشا کو لگے کہ واقعی وہ شالنی سے بہت متاثر ہو گیا ہو۔

"دیدی ایسی ہی ہیں۔ میں جب سے یہاں ہوں یہی دیکھ رہی ہوں کہ وہ ہمارے ہر دکھ سکھ میں جی جان سے شریک ہوتی ہیں۔ انہیں تو ہماری ان ضرورتوں کا بھی خیال ہے جنہیں عام لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں تیسری صنف میں رکھنے والوں کو لگتا ہے کہ ہم ہر جذبے سے عاری ہیں اور ہمیں کسی آسودگی کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن دیدی اس بات کو سمجھتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی نواب صاحب سے تعلق پر اعتراض نہیں ہے۔ جواب میں دیدی نے ہمیں ان سے اجازت دلوا رکھی ہے کہ وہ ہمارے آپس کے تعلق پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک خوش ہے۔ نواب صاحب اگر ہمیں اپنے کسی دوست کے پاس بھیجیں تو بھی ہمیں انکار نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سے بھی ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ میں بائیس سال کی ہوں۔ ابھی میرے پاس تین سے چار سال اور ہیں۔ اس عرصے میں، میں جتنا کما سکتی ہوں کما لوں گی۔ کمائی کے علاوہ دوسرے مزے اپنی جگہ ہیں۔ پھر بعد میں تو مجھے شالنی دیدی کے چرنوں میں ہی جا کر بیٹھنا ہے۔ ان کا ساتھ جو مزہ دیتا ہے وہ آج تک مجھے کہیں نہیں ملا۔" آشا نے آنکھیں میچ کر چٹخارا لیا تو جاوید علی نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ وہ بوبی کے پاس کئی دن رہا تھا لیکن اس کی رہائش گاہ پر اسے ایسی کسی خرافات کی ذرا سی بھی سن گن نہیں ملی تھی بلکہ اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے بوبی نے اس کے دل میں اپنے لیے خاصی عزت بنالی تھی جبکہ شالنی کو اس نے ملاقات کے پہلے لمحے میں ہی ناپسند قرار دے دیا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ اسے یہاں آ کر سمجھ آ رہی تھی۔ شیطانی کھیل کھیلنے والی شالنی یقینی طور پر شیطان کے ان چیلوں میں سے تھی جن کی کارکردگی پر شیطان جھوم جھوم اٹھتا ہوگا لیکن پاکیزہ روحوں کے لیے تو ان کے وجود کی بو بھی ناگوار تھی۔

"باتوں میں بہت سمے بیت گیا۔ تو تھوڑی دیر آرام کر لے۔ تیری وجہ سے میرا من بہل گیا ورنہ سامنے رتی کے خالی کمرے سے تو مجھے ہول آ رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی اس کا بھوت نکل کر یہاں آ گھسے گا۔" جاوید علی کی طرف سے مزید کوئی سوال نہ اٹھائے جانے پر خاموشی کا وقفہ آیا تو آشا کو اس کے آرام کا خیال آیا۔

"کیا رتی کی لاش ابھی اس کے کمرے میں رکھی ہے؟" اس کی بات سن کر جاوید علی نے پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ آشا جس دھرم سے تعلق رکھتی ہے، وہاں مُردوں سے بڑا ڈرا جاتا ہے اور وہ لوگ مرنے کے بعد اپنے ہی پیاروں کا بھوت چمٹ جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان سے یہ بدعقیدگی مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئی تھی اور اس نے ایسے کئی مسلمانوں کو دیکھا تھا جو مُردے کے ساتھ تنہا کمرے میں بیٹھتے ہوئے خوف کھاتے تھے حالانکہ روح نکل جانے کے بعد باقی رہ جانے والے خاک کے پتلے میں تو اتنی سکت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو ہی اڑا سکے۔ کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کا تو کیا ہی سوال تھا۔

"رتی کی لاش سامنے کمرے میں رکھی ہوتی تو میں تمہیں ہرگز بھی یہاں نظر نہیں آتی۔ اسے تو تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہی شالنی دیدی کے کچھ جاننے والے اپنے ساتھ

لے گئے تھے۔ وہ اسے اشنان وغیرہ کروا کر پوری تیاری کے ساتھ رات کو ادھر لائیں گے پھر یہاں سے ہم سب اسے اپنے ساتھ شمشان گھاٹ لے جا کر اگنی دیں گے۔'' آشا کے جواب سے اس پر باقی کا پروگرام بھی واضح ہوگیا۔

''اچھا تو آرام کر، میں جا کر شالنی دیدی سے پوچھ لوں کہ انہیں کوئی کام تو نہیں ہے۔'' باتونی آشا اسے خاصی معلومات فراہم کر چکی تھی اس لیے اس نے اسے روکا نہیں۔ یوں بھی اسے اندازہ تھا کہ شالنی اور اس کے درمیان جس نوعیت کے تعلقات ہیں، وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوگی اور روکے نہیں رکے گی۔ اسے ائرپورٹ پر ہونے والی ان دونوں کی ملاقات میں عجیب و غریب رویے کی وجہ بھی اب اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ آشا اپنے باتونی پن کی وجہ سے اسے اتنا سب کچھ بتا گئی تھی یا پھر شالنی نے خاص طور پر اسے آگاہ کرنے کی ذمے داری آشا کو سونپی تھی کہ اگر اس کی طرف سے کوئی اعتراض یا رکاوٹ ہو تو اس کے علم میں آجائے۔ لیکن جاوید علی نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی ناگواری کا اظہار ہو سکتا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر ہی ان کے درمیان رہ سکتا تھا لیکن یہ تھا بہت نازک کام۔ اسے اپنی حقیقت کھلنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کر سکے لیکن پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت کم مہلت ہے۔ وہ مصنوعی سہاروں سے بہت دن تک انہیں دھوکا دے کر ان کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا۔

☆☆☆

ہینگرز میں لگے ملبوسات کو ادھر سے اُدھر سرکاتے ہوئے ذیشان نے کچھ فاصلے پر موجود حسینہ کو دیکھا۔ وہ موہنی تھی۔ وہی قتالہ جس سے وہ ایک وزیر موصوف کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ پر ملا تھا اور اس کی حرکات و سکنات دیکھتے ہوئے اسے شک گزرا تھا کہ یہ عورت دشمن کی جاسوس بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہود و ہنود دونوں کا ہی یہ وتیرہ تھا کہ وہ مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے عورتوں کے حسن اور مکّارانہ اداؤں کو جنگی حکمتِ عملی سمجھتے ہوئے ان کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ موہنی اسے اسی قبیل کی فرد لگی تھی اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو اس کی مستقل نگرانی پر مامور کر دیا تھا اور نگرانی کے نتیجے میں یہ حقائق سامنے آئے تھے کہ اس کا اہم حکومتی شخصیات اور سیاست دانوں سے قریبی تعلق تھا۔ وہ ان میں سے کئی کے ساتھ تواتر سے دیکھی گئی تھی اور بعض ملاقاتوں کے بعد کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں جنہیں سامنے رکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ ان بارسوخ شخصیات کو صرف دادِ عیش دینے کے لیے ان سے ملتی تھی۔ وہ محض پیسے کے لیے کام کرنے والی کال گرلز سے کہیں اوپر کی چیز لگتی تھی۔ آخری بار اس نے جس شخصیت سے ملاقات کی تھی، اس نے پاکستان اور بھارت کے مابین قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس تبادلے کا جو سب سے قابلِ اعتراض نکتہ تھا، وہ یہ تھا کہ پاکستان کی طرف سے پندرہ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا جبکہ بھارت جواب میں صرف چھ قیدی رہا کر رہا تھا۔ ذیشان نے بھارت کے رہا کیے جانے والے قیدیوں کی فہرست اپنے پاس منگوالی تھی اور ان کے بارے میں دیگر معلومات بھی۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا کہ رہائی کے لیے جن قیدیوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں دو نام ایسے بھی ہیں جن پر جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا تھا لیکن خاطر خواہ ثبوت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی گئی۔

ان دونوں کا کہنا تھا کہ وہ ماہی گیر کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا بیان کتنے فیصد درست تھا، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ مبینہ طور پر دشمن کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے اور انہیں موقع ملتا تو وہ ایسی کارروائی کرتے جس سے ملک کو نقصان پہنچایا جا سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کو اگر سخت سزا نہ بھی دی جاتی تو بہرحال وہ اس لائق تو نہیں تھے کہ انہیں آزاد کر دیا جاتا۔ اس طرح تو دشمن کے حوصلے بلند ہو جاتے کہ وہ جب چاہتے شرپسند عناصر کو پاکستان کی حدود میں داخل کر دیتے اور جب چاہتے نکال کر لے جاتے۔ اس واقعے کے بعد ضروری ہوگیا تھا کہ موہنی کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ موہنی جیسی ساحروں کے توڑ کے لیے ابھی کچھ لوگ پاکستان میں موجود ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی آخری سانس تک پاکستان کی سلامتی کے لیے لڑتے رہیں گے۔

آج وہ موہنی جیسے فتنے کے سدباب کے لیے ہی اس شاپنگ مال میں موجود تھا۔ موہنی کی نگرانی پر مامور افراد کو اس کی ہدایت تھی کہ جب بھی انہیں موہنی کسی پبلک پلیس پر تنہا نظر آئے، اسے آگاہ کر دیا جائے۔ اتفاق سے یہ موقع جلد ہی مل گیا تھا اور اب وہ یہاں اس کے قریب موجود تھا۔ ملبوسات دیکھتی ہوئی موہنی قدم اٹھاتی اسی جانب آ رہی تھی جہاں وہ ایک ہینگر اسٹینڈ کے پیچھے کھڑا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ اسٹینڈ کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا۔

''واٹ آ فنٹاسٹک سرپرائز! آپ کو یہاں دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔'' اس کا حیرت و خوشی کا ملا جلا اظہار بڑا بے ساختہ تھا۔ موہنی نے اس کی آواز پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور چند ثانیوں میں پہچان کے مراحل طے کر گئی۔

''یقین نہ آنے کی کیا بات ہے؟ ساری خواتین کی طرح مجھے بھی شاپنگ کا شوق ہے اس لیے میرا کسی شاپنگ سینٹر میں موجود ہونا کوئی اتنا ناقابلِ یقین واقعہ نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کر تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے آپ کی یہاں موجودگی پر حیرت نہیں ہے بلکہ میں اس اتفاق پر خوش ہو رہا ہوں کہ ہم دونوں ایک وقت میں یہاں موجود ہیں ورنہ اس رات فنکشن میں جس طرح آپ نے مجھے ہری جھنڈی دکھائی تھی، مجھے امید نہیں رہی تھی کہ میں پھر کبھی آپ سے مل سکوں گا۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار جاری رکھا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ہمارا دوبارہ ملنا اس اتفاق کے سوا ذرا مشکل ہی تھا۔ ایکچوئلی میں بہت معروف رہتی ہوں۔ آج بھی بڑی مشکل سے شاپنگ کے لیے وقت نکال سکی ہوں... بلکہ سچ پوچھیں تو سب سے چھپ کر بھاگ نکلی ہوں ورنہ کوئی نہ کوئی جان کو اٹک ہی جاتا ہے۔ بے شک میں بہت سوشل ہوں لیکن کبھی کبھی تو بندے کا اکیلے رہنے کا بھی دل چاہتا ہے، خصوصاً شاپنگ میں اکیلے کسی کے مکمل دخل کے بغیر کرنا پسند کرتی ہوں۔'' وہ جس لیول کی عورت تھی، ایک سیکیورٹی ایجنسی کے منیجر کی حیثیت سے ذیشان اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لیے صاف لفظوں میں بہت کچھ جتا گئی۔

''اوہ...'' اس کی بات سن کر ذیشان نے افسردگی سے چہرہ لٹکا لیا۔ ''میں تو خوش ہوگیا تھا کہ اگر آپ یہاں شاپنگ کر رہی ہیں تو میری بھی تھوڑی سی ہیلپ کر دیں گی۔ اصل میں، میں اپنی سسٹر کے لیے کوئی اچھا ڈریس خریدنے کے لیے آیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایک خاتون کی پسند مجھ سے بہتر ہوگی۔'' موہنی کا موڈ دیکھنے کے باوجود اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کے قریب رہنے کا موقع نکال سکے۔

''سوری مسٹر! ایک تو میرے پاس خود اپنی شاپنگ کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے آپ کی ہیلپ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ دوسرے میرا اندازہ ہے کہ میرے اور آپ کی سسٹر کے ٹیسٹ میں بہت فرق ہوگا۔ مجھ جیسی ماڈرن لڑکی کے لیے کسی گھریلو خاتون کے ڈریس کی خریداری میں مدد دینا کسی طور ممکن نہیں ہے۔'' اس نے صاف انکار کیا۔ اب ذیشان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مزید اصرار کر سکتا چنانچہ 'بہت بے آبرو ہو کہ تیرے کوچے سے ہم نکلے' کی تفسیر بنے اس سے رخصت لینا ہی مناسب سمجھا۔

''ٹھیک ہے موہنی جی! جیسی آپ کی خوشی۔ آپ آرام سے اپنی شاپنگ کیجیے، میں بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گا۔'' مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ وہاں سے چل پڑا اور اس حد تک دور ہٹ گیا کہ موہنی کو نظر نہ آسکے لیکن حقیقتاً اب بھی اس کی نظریں موہنی کی نگرانی کر رہی تھیں اور وہ نیا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ اصل میں اس نے طے کر لیا تھا کہ اب موہنی کو مزید ڈھیل دینا مناسب نہیں ہے اس لیے آج اسے اغوا کرنے کا سوچ کر ہی روانہ ہوا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ کسی بہانے موہنی کے ساتھ نتھی ہو جائے گا اور ادھر اس کے آدمی پارکنگ میں کھڑی موہنی کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کر دیں گے۔ موہنی کے ساتھ ہونے کی صورت میں وہ اس کے ساتھ ہی پارکنگ تک پہنچتا اور جب وہ گاڑی کی خرابی کی وجہ سے اسے اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہتی تو وہ فوری طور پر اسے لفٹ کی پیشکش کر دیتا۔ اس طرح بغیر کسی ہنگامے کے بہت آسانی اور خاموشی سے اس کا اغوا عمل میں آجاتا لیکن موہنی نے تو پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیا تھا اور کسی صورت اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ صورتِ حال میں اسے نئی حکمت عملی سے کام لینا تھا۔ ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کے عادی اس کے دماغ نے فوراً ہی متبادل حل سوچ لیا اور وہ باہر موجود اپنے آدمیوں کو کوڈ ورڈ میں احکامات جاری کرنے لگا۔

اس دوران بھی اس کی نظریں موہنی سے نہیں ہٹی تھیں اور وہ اسے مسلسل نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ پے در پے کئی ملبوسات دیکھنے کے باوجود ابھی تک اس نے کسی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک مخصوص حصے سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور بار بار انہی ملبوسات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھی۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر اسے یہاں کچھ پسند نہیں آ رہا تھا تو وہ کسی اور پورشن کا رخ کر لیتی۔ اتنے بڑے شاپنگ سینٹر میں یہ واحد جگہ نہیں تھی جہاں زنانہ ملبوسات دستیاب تھے اور بھی کئی جگہ اس سے اچھی ورائٹی موجود تھی لیکن جب سے شاپنگ سینٹر پہنچی تھی، ایک خاص حصے تک ہی محدود تھی۔ اگلے دو تین منٹوں میں اس کی یہ الجھن بھی سلجھ گئی۔ وہ درمیانی عمر کا جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک آدمی تھا جو بظاہر وہاں خریداری کی غرض سے ہی آیا تھا لیکن جب وہ اس اسٹینڈ پر پہنچا جہاں

موہنی ملبوسات دیکھ رہی تھی تو اس نے موہنی سے کچھ کہا۔ موہنی نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ اس آدمی کے وہاں پہنچتے ہی اس کے چہرے پر موجود کوفت بھرے تاثرات غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔ موہنی کی مسکرا کر کہی بات کے جواب میں وہ ایک بار پھر کچھ بولا اور اس بار موہنی نے کچھ کہے بغیر اپنے شانے پر لٹکے اسٹائلش سے پرس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پرس کی زپ کھولنے کے بعد اس کا ہاتھ رینگتا ہوا اندر گیا اور پھر پرس میں سے کوئی شے نکل کر جینز والے کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔ وہ کیا چیز تھی، یہ تو ذیشان نہیں دیکھ سکا لیکن اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ دراصل اسی شے کی منتقلی کے لیے موہنی شاپنگ کے بہانے یہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ملاقات کا مقام طے ہوگا اس لیے وہ ایک مخصوص ایریے سے باہر نہیں نکلی تھی اور جو کچھ اسے آنے والے کو دینا تھا وہ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد دے چکی تھی۔ وہ آدمی انٹیلی جنس سے براہِ راست سی ایف پی میں آیا تھا اس لیے خاص اشیا کے تبادلے کے لیے اس قسم کا طریقۂ کار اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنے ماتحت سے رابطہ کیا۔

''نیلی جینز اور خاکی ٹی شرٹ میں ایک بندہ یہاں موجود ہے۔ اس کی ناک کی پھننگ پر ایک موٹا سا مسّا ہے۔ اس شخص پر پوری نظر رکھنی ہے اور موقع ملتے ہی قابو کر کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دینا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کام کے لیے تمہیں زیادہ افراد کی ضرورت پڑے اس لیے پلان نمبر ون پر کام کرنے کے لیے میں خود آرہا ہوں۔ یوسف سے کہو کہ وہ گاڑی سے باہر نکل آئے۔'' اس نے صرف وقت بچانے کے لیے آپریٹس کا استعمال کیا تھا ورنہ اس کے قدم تیزی سے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بات پوری ہونے تک وہ سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ چکا تھا اور اب تقریباً بھاگتا ہوا پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ماتحت کو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیوں تک آجائے تاکہ مطلوبہ شخص نظر میں آئے بغیر وہاں سے نکل نہ سکے۔ پارکنگ ایریا میں رک کر انتظار کرنے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ شخص کسی سواری پر نہ آیا ہو اور پیدل ہی یہاں سے نکل جائے۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے اپنے ماتحت کو سیڑھیوں کے قریب دیکھ لیا تھا۔ وہ خود تیزی سے پارکنگ میں پہنچا۔ وہاں اس کا ماتحت موجود تھا۔

''وہ بلیک کرولا سر!'' اس نے موہنی کی گاڑی کی نشاندہی کی۔ ذیشان تیزی سے آگے بڑھا اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کے بعد اپنے جسم کو سمیٹ کر پائدان میں سما گیا۔ گاڑی کے دروازے کا لاک کھولنے کا کارنامہ یقیناً اس کے کسی ماتحت نے ہی انجام دیا تھا۔ پہلے ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس کا کوئی ماتحت موہنی کی گاڑی میں چھپ جائے گا اور موقع دیکھ کر راستے میں اسے قابو میں کر لے گا۔ باقی لوگ الگ گاڑی میں ان کا پیچھا کرتے تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں مدد کر سکیں لیکن شاپنگ سینٹر میں موہنی سے ملنے والے مشکوک شخص کے سامنے آنے کے بعد اس نے پروگرام میں فوری تبدیلی کر لی تھی۔ اب وہ اکیلا موہنی کو قابو میں کرتا جبکہ اس کے ساتھی اس دوسرے آدمی سے نمٹتے۔ پائدان میں پڑا وہ پوری طرح سے چوکنا تھا اور موہنی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی آجائے گی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق وہ جس مقصد کے تحت شاپنگ سینٹر آئی تھی، وہ پورا ہو چکا تھا۔

اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد ہی اس نے گاڑی کے قریب قدموں کی آواز سنی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی فرنٹ ڈور کا لاک کھول رہا ہے۔ لاک کھلتے ہی اس کے نتھنوں سے وہ خوشبو ٹکرائی جو تھوڑی دیر پہلے وہ شاپنگ سینٹر میں موہنی کے وجود سے اٹھتی محسوس کر چکا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے اطمینان سے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی پارکنگ سے باہر لے آئی۔ ذیشان چپ چاپ پائدان میں دبکا رہا۔ وہ پُرہجوم جگہوں سے نکلنے سے قبل اسے نہیں چھیڑنا چاہتا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ شور مچا دیتی اور خواتین کی ہمدردی میں مبتلا کچھ سورما خوامخواہ اس معاملے میں کود پڑتے۔

وہ اس قسم کی کسی الجھن سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ انتظار کرتا رہا۔ موہنی خاصے خوش گوار موڈ میں تھی اور ٹیپ ریکارڈر پر انگریزی گانوں کا کیسٹ لگائے خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ جیسی خوش ذوق خاتون نے مجھ جیسے ہینڈسم آدمی کے ساتھ بے رخی کیوں برتی؟ آپ کو تو فوراً سے پیشتر مجھ سے دوستی کر لینی چاہیے تھی۔'' مناسب مقام دیکھ کر وہ پائدان سے نکل کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ موہنی نے اس کے بولنے سے قبل اسی وقت اس کو دیکھ لیا تھا جب وہ پائدان سے نکل کر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ چونکی بھی تھی لیکن کمال پھرتی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد اب چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجائے اسے بیک ویو مرر میں

دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اسے خاموش دیکھ کر ذیشان نے اسے چھیڑا۔

''اس طرح لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والے کسی شخص سے دوستی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور آواز میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''میں گاڑی سائڈ میں کر کے روکتی ہوں۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے نیچے اتر جائیں اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دینا میرے لیے بہت آسان ہے۔''

''میں تمہاری پہنچ کو جانتا ہوں لیکن گاڑی روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے بھی تمہارے خوب صورت بدن میں چھید کرتے ہوئے سخت افسوس ہوگا۔'' اس نے پستول کی نال اطمینان سے موہنی کے پہلو سے لگا دی۔

''اس کھلونے کی تباہ کاری سے تو تم اچھی طرح واقف ہوگی۔ اس میں سے نکلنے والی چند انچ کی گولی کئی فٹ کے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتی ہے... اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ جن کے بل بوتے پر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو، ان کی ساری دلچسپی تمہارے خوش نما بدن کی گرمی تک محدود ہے۔ تم نہ رہیں تو وہ چند دن تمہارے لیے اداس رہیں گے اور پھر کسی دوسری سیمیں بدن کے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔'' وہ اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے واقعی اس کا کوئی جنونی عاشق ہو اور اس کے دوستی سے انکار پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہو مگر مقابل بھی موہنی تھی۔ مبینہ طور پر تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ جو کسی طور بھی اس امکان کو رد نہیں کر سکتی تھی کہ کسی دشمن کی نظر میں آگئی ہے چنانچہ بیک ویو مرر میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہدایات کے مطابق گاڑی چلاتی رہو۔'' اپنے لہجے میں تبدیلی لائے بغیر ذیشان نے جواب دیا۔

''اگر تم میری قربت کے خواہش مند ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد تم سے رابطہ کر کے تمہیں وقت دوں گی۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ اگر میں واپس نہیں پہنچی تو جلد بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی اور تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔'' وہ نرم گرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں جو تمہارے وعدے پر اعتبار کر لوں۔ جو بھی مشکل پیش آئے گی، میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم صرف خاموشی سے میرے کہے پر عمل کرو۔ اور ہاں، اب جو چوراہا آئے، اس سے بائیں طرف گاڑی موڑ لینا۔'' اس نے کسی جنونی ہی کی طرح بے لچک لہجے میں اسے جواب دیا۔ موہنی ہونٹ بھینچ کر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پینترا بدلا اور نرمی سے بولنے لگی۔

''تم واقعی ہینڈسم آدمی ہو۔ مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ میرا کس لیول کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار اور وزرا میرے عاشق ہیں۔ میری وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جیلس بھی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ آپس میں دشمنی مول لینے کی صورت میں نقصان کسی ایک کا نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور ہے کہ خود ہی ٹکراؤ کا نتیجہ بھی جانتا ہے اس لیے میری وجہ سے دلوں میں بغض رکھنے کے باوجود اس بغض کو چھپا کر رکھتا ہے لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تم ان کی ٹکر کے آدمی نہیں ہو۔ اگر میں نے تم سے دوستی رکھی تو وہ سب کے سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اس طرح سے تمہیں غائب کریں گے کہ مجھے یا تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔''

''میں جانتا ہوں اس لیے میں نے تم سے کھلے عام دوستی رکھنے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تم سب سے چھپ کر شاپنگ کے لیے نکلی ہو، یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو اور جب کسی کو یہ نہیں معلوم تو یہ بھی نہیں پتا چل سکتا کہ تم یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ گئیں۔'' ذیشان نے مزے سے اسے جواب دیا۔

''پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ہر حال میں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' موہنی جھنجلائی۔

''ڈھونڈ نکالیں گے، تب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے میرے ساتھ کریں گے۔ تم آرام سے سارا بوجھ مجھ پر ڈال سکتی ہو کہ میں نے زبردستی تمہیں اغوا کیا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا، جواباً موہنی نے عجیب حرکت کی۔ اس نے بالکل اچانک ہی گاڑی کو بریکس لگا دیے۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے زوردار جھٹکا لگا

اور ذیشان کا پستول اس کے پہلو سے ہٹ گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح پلٹ کر اس پر جھپٹی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے ذیشان پہلے ہی اپنا توازن تھوڑا سا کھو چکا تھا، اس حملے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائدان میں جا گرا۔

''اترو میری گاڑی سے باسٹرڈ! ورنہ میں تمہارا بھیجا اڑا دوں گی۔'' اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال کر اس نے ذیشان پر تانا اور غرائی۔

''گولی مت چلانا، میں اتر رہا ہوں۔'' حالات پلٹا کھا چکے تھے لیکن ذیشان نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور نہایت خوف زدہ شخص کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تم نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر کی اترنے میں تو میں گولی چلا دوں گی۔'' اسے خوف زدہ دیکھ کر وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس وقت وہ اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر گاڑی کے فرش پر تھا جبکہ دوسرے کا گھٹنا موڑ کر اس نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور وہ عقبی نشست کی طرف منہ کیے ذیشان کو کور کیے ہوئے تھی۔ کسی بے انتہا خوف زدہ شخص کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ذیشان نے اس طرح حرکت کی جیسے وہ گاڑی سے اترنے والا ہو لیکن اس کی نظریں پوری طرح موہنی کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ موہنی کی پسٹل پر گرفت اس کی مشاقی کو ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ اس حد تک ہوشیار نظر نہیں آ رہی تھی جتنا اسے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے بدِمقابل ہونے کی صورت میں نظر آنا چاہیے تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس نے ذیشان کو سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر لیا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے طور پر نمٹ رہی تھی جو اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر ایسی جنونی حرکت کر بیٹھا تھا اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

ذیشان نے اس کی اس غلط فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اترتے اترتے پلٹ کر اس زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ وہ الٹ کر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔ الٹنے سے اس کا پسٹل والا ہاتھ اوپر کی طرف ہو گیا تھا چنانچہ جھٹکا لگنے سے گولی چلی اور گاڑی کی چھت میں پیوست ہو گئی۔ موہنی نے کوشش کی کہ خود کو سنبھال کر دوسرا فائر ذیشان پر کر سکے لیکن ایک تو وہ اس پوزیشن میں گری تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا، دوسرے ذیشان بھی برق بنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے موہنی کا پسٹل چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''آرام سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ ورنہ مجھے تمہارے اس حسین بدن میں چھید کر کے کوئی دکھ نہیں ہو گا۔''

''تم کون ہو؟'' سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پہلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے، پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔'' ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

''یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔'' ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو...؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہو گی۔ میں اتنا با اختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی ادھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔'' ذیشان نے غراتی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''دیکھو، یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔'' ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا

پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر ٹکا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔ ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بغیر کسی الجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہوگیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دورانِ سفر ہی سوگئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسب توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس لیے مزاحمت پر اتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو میں کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی، اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہوگیا۔'' یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سیکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ انٹیلی جنس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکاران کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کرسکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہےاس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سرہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کررہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہوسکی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کردیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی بازیاب ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیے گئے ہیں جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔'' یوسف بولتا جارہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بنتی جارہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہوگا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابلِ مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آچکے تھے جن میں غیر مسلم افراد مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند ثانیوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہرخند کردیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''لے رنجنی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔'' آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کرلو تاکہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر

یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک حاصل ہونے والی معلومات منتقل کرنے کے ساتھ ہی آج رات کے پروگرام سے بھی آگاہ کردیا تھا اور پھر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوگیا تھا۔ بستر بے حد آرام دہ تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام بھی موجود نہیں تھا چنانچہ آشا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے آرام کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا لیکن وہ اتنی چوکنی نیند سویا تھا کہ آشا کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل جب وہ دروازے کا ہینڈل گھمارہی تھی، اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے آشا کو ایک سیاہ لباس کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں نے بتادیا کہ وہ یہ لباس اسی کے لیے لے کر آئی ہے۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کے کپڑوں میں سیاہ رنگ کا کوئی لباس موجود نہیں تھا اس لیے ازخود بندوبست کردیا تھا۔

''رتی کی ڈیڈ باڈی کوٹھی پہنچ گئی ہے کیا؟'' وہ انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اترا اور آشا سے پوچھا۔

''بس پہنچنے والی ہے۔ ابھی شالنی دیدی کے پاس فون آیا تھا کہ دس منٹ میں رتی کو یہاں پہنچا دیا جائے گا۔ سب لوگ تیار ہیں بس مجھے اور تمہیں ہی تیار ہونا ہے۔'' آشا نے اسے جواب دیا۔

''ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کپڑے ہی تو بدلنے ہیں۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ سے لباس لے کر خود جلدی سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اس نے تیار ہونے میں پانچ چھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ آشا بھی اس دوران تیار ہو چکی تھی۔

''تو تو اس سیاہ لباس میں بھی بڑی پیاری لگ رہی ہے۔'' جاوید علی کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا جس کے جواب میں لازماً اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

''تم خود کون سی کسی سے کم ہو...... سچ بولوں تو اگر میں نے تمہاری جگہ یہ بلیک پینٹ شرٹ پہن رکھا ہوتا تو ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ تو بس تم ہی ہو جو مردانہ لباس میں بھی خوب جچتی ہو۔''

''کیا کروں، یہ لباس بھی میری مجبوری ہے۔ بے بی کی ڈرائیور ہوں نا اس لیے ایسے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ ورنہ بے بی صاف کہتی ہے کہ میں کسی ہیجڑے کو اپنے ساتھ لے جا کر تماشا نہیں بننا چاہتی۔ زرق برق زنانہ لباس تو مجھے مشکل سے ہی پہننے کو ملتا ہے۔ ایک تو نواب صاحب خدمت کے لیے بلاتے ہیں جب اور دوسرے کسی خوشی کے موقع پر بے بی مجھے چھٹی دے دے تب۔'' آشا نے اداسی سے بتایا۔

''بے بی سے تمہاری مراد نواب صاحب کی بیٹی ہے؟'' جاوید علی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آشا نے سرہلایا اور مزید بولی۔ ''اصل میں تو میں یہاں بے بی کی ڈرائیور کے طور پر ہی اپائنٹ ہوئی ہوں لیکن بے بی کوئی ہر وقت تو باہر آتی جاتی نہیں ہے اس لیے ضرورت پڑنے پر نواب صاحب مجھے دوسرے کام بھی سونپ دیتے ہیں۔ جیسے آج میں تم لوگوں کو ائرپورٹ لینے گئی تھی۔ خود نواب صاحب کا ڈرائیور الگ ہے لیکن وہ یہاں کوٹھی میں نہیں رہتا۔ نواب صاحب کو جب کہیں جانا ہو تو اسے فون کر کے بلوا لیتے ہیں یا پھر کبھی کبھار خود بھی اپنی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔'' آشا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ اس موقع پر کچھ اور بھی سوال تھے جو جاوید علی کے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن وہ انہیں زبان پر اس لیے نہ لا سکا کہ کمرے کے باہر خاصی ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ کسی نے دروازے پر دستک دے کر آشا کو آواز بھی دی تھی۔

''چلو، چلنے کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' آشا اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے باہر لے گئی۔ کوریڈور میں اس وقت سیاہ لباس پہنے کئی خواجہ سرا نظر آرہے تھے۔ یہ سب کے سب جوان اور خوب صورت تھے۔

''باہر گاڑی میں چل کر بیٹھو۔'' کوریڈور میں شالنی کی آواز گونجی اور وہ سب فوراً ہی متحرک ہوگئے۔ جاوید علی اور آشا بھی ان میں شامل تھے۔ باہر ایک میت بس کھڑی تھی۔ وہ لوگ بس کے قریب پہنچے تو اس میں سے نواب صاحب کو اترتے دیکھا۔ انہیں اس خواجہ سرا نے سہارا دے رکھا تھا جس نے کوٹھی آمد کے بعد ان لوگوں کا استقبال کیا تھا۔ وہ خواجہ سرا باقی سب کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟'' شالنی نے قریب پہنچ کر استفسار کیا۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ نواب صاحب اس وقت بہت دکھی ہیں اور انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ جاوید علی کو نواب صاحب کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضمحل اور اداس لگ رہے تھے۔ شاید وہ میت بس میں رکھی رتی کی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے یہاں تک آئے تھے اور اسے مُردہ حالت میں دیکھ کر کچھ

زیادہ ہی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔

"اچھی بات ہے۔ تم نواب صاحب کا دل بہلاؤ۔ ہم رتی کا کریا کرم کر کے آتے ہیں۔" شالنی نے اسے جواب دیا تو جاوید علی کو اس کا لہجہ کچھ عجیب کاٹ دار سا لگا لیکن ابھی اپنے محسوسات کی تصدیق کرنے کا موقع نہیں تھا۔ نواب صاحب کے وہاں سے ہٹتے ہی ان سب کو میت بس میں بیٹھنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ ان سب نے ہی تیزی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ بس کے درمیانی حصے میں ایک تابوت رکھا تھا جس میں یقینی طور پر رتی کی لاش موجود تھی۔ وہ سب خاموشی سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جاوید علی، آشا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا لیکن اب وہ اس سے بات چیت کرنے کے بجائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ باقی لوگ بھی اسے یہی کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس لیے وہ دکھاوے کے لیے خود بھی وقفے وقفے سے ہونٹ ہلاتا رہا۔ بس تیزی سے چلتی سفر طے کرتی رہی۔ سی آئی اے لاہور یونٹ میں شامل ہونے سے قبل جاوید علی کچھ عرصہ کراچی میں بھی رہ چکا تھا اس لیے اس کے لیے یہاں کے راستے اور علاقے اتنے اجنبی نہیں تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی سے روانہ ہونے والی بس اب کراچی اولڈ سٹی کی طرف رواں دواں ہے۔ بس کو ایک ہٹا کٹا صحت مند آدمی چلا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی چار تحیم شحیم افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک بس کے دروازے پر موجود تھا جبکہ تین نے خواجہ سراؤں سے الگ ڈرائیور کے قریب جگہ سنبھال رکھی تھی۔ بس ایم اے جناح روڈ پر پہنچی تو پولیس کی ایک پیٹرولنگ گاڑی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بغیر کسی حیل و حجت کے گاڑی روک دی اور پولیس والوں سے بات کرنے لگا۔ یقینی طور پر وہ انہیں یہی بتا رہا تھا کہ اندر ایک ڈیڈ باڈی موجود ہے جو کہ ایک خواجہ سرا کی ہے اور اس کے خواجہ سرا ساتھی اس کا کریا کرم کرنے شمشان گھاٹ لے جا رہے ہیں۔

ڈرائیور کی گفت و شنید کے باوجود ایک پولیس والا بس میں چڑھ آیا اور تابوت کے شیشے کے چوکھٹے میں سے جھانک کر اس بات کی تسلی کی کہ وہاں کوئی ڈیڈ باڈی موجود ہے۔ پولیس والے کے آنے اور تصدیق کر کے جانے تک سب لوگ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ واحد شالنی تھی جو چوکنا نظروں سے پولیس والے کو دیکھتی رہی تھی۔ جاوید علی جو کہ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پولیس والے کے اترتے ہی شالنی کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے ہیں۔ وہ الجھنے لگا کہ شالنی کے اس رویے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ شہر کے حالات کے سبب رات گئے سفر کرنے والی گاڑیوں کو روک کر پولیس کا چیکنگ کرنا اب اتنی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی جس سے کوئی گھبراتا اور بعد میں مطمئن نظر آنے لگتا۔ ایسے تاثرات تو اسی شخص کے ہو سکتے تھے جو کسی گڑبڑ میں ملوث ہو اور جاوید علی کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ شالنی کا کردار بہت مشکوک ہے اور وہ اچھی خاصی گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔

پولیس والوں سے خلاصی کے بعد گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس بار سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور وہ لوگ ایک شمشان گھاٹ کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم شمشان گھاٹ تھا۔ گاڑی شمشان گھاٹ پر رکی تو ڈرائیور اور اس کے ساتھی پھرتی سے حرکت میں آ گئے اور درمیان میں رکھے تابوت کو گاڑی سے نیچے اتارنے لگے۔ وہ چاروں اچھے خاصے طاقتور نظر آنے کے باوجود تابوت اتارتے ہوئے مشکل میں دکھائی دیے۔ یوں لگتا تھا کہ تابوت خاصا وزنی ہو اور انہیں اسے حرکت دینے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑ رہی ہو لیکن بہرحال انہوں نے تابوت کو نیچے اتار لیا۔ جاوید علی اور بس میں موجود تمام خواجہ سرا شالنی کے حکم کے مطابق تابوت اتارے جانے تک اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ البتہ شالنی خود بس سے نیچے اتر گئی تھی اور کسی سپروائزر کی طرح تابوت اتارنے والوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے انداز میں واضح برتری تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہے جسے معاشرے کا سب سے زیادہ پسا ہوا اور مظلوم طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ ایک حکمراں محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے چاروں گرانڈیل مرد بس اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ شالنی نے انہیں تابوت شمشان گھاٹ کے اندر لے جانے کا حکم دیا تو وہ فوراً ہی عمل پیرا ہو گئے۔ ان چاروں کے تابوت لے جانے کے بعد شالنی نے باقی خواجہ سراؤں کو اجازت دی کہ وہ بھی نیچے اتر سکتے ہیں۔ سب کے سب نہایت منظم انداز میں نیچے اتر آئے اور اسی تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے شالنی کی سربراہی میں شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ قبرستانوں اور شمشان گھاٹ وغیرہ کا جو مخصوص ماحول ہوتا ہے، اس سے گھبرا کر تو لوگ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خصوصاً اکیلا آدمی خاصا عجیب محسوس کرتا ہے اور یہاں تو آدھی رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کئی تھے اور ان کی آمد نے وہاں کے جامد سناٹے میں خاصی ہلچل بھی پیدا کر دی

تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود دہشت کا تاثر قائم تھا۔ دن میں جلائی جانے والی چتاؤں کی بو پوری طرح سے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جاوید علی کا کسی شمشان گھاٹ آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے اسے ہر شے اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مقابلے میں اسے باقی لوگ بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی یہی کوشش تھی کہ اس کی ناگواری اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ اسے یاد رکھنا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے دوران میں تو شمشان گھاٹ کیا، مُردہ خانے میں بھی رہنا پڑتا تو وہ رہتا۔ اس نے اپنا دھیان ماحول کی وحشت سے ہٹایا اور وہاں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تابوت سے رتی کی لاش نکال لی گئی تھی اور اب اسے پہلے سے تیار چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ لاش کو چتا پر لٹائے جانے کے بعد شالنی آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کھجور کی ہلکی سی ٹوکری میں سے گیندے اور گلاب کے پھولوں پر مشتمل بڑا سا ہار نکال کر رتی کی لاش کو پہنایا۔ دھان پان سی رتی کا سینہ اور پیٹ وغیرہ اس ہار سے ڈھک گئے۔ اس موقع پر جاوید علی کو تابوت اتارنے والوں کی محنت و مشقت یاد آ گئی۔ دھان پان سی رتی کا وزن ہی کتنا تھا کہ اس کا تابوت اتارنے والوں کو اتنی محنت کرنی پڑی۔ سوچنے کو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ تابوت بھاری لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن جاوید علی نے خود جائزہ لیا تھا کہ تابوت کی لکڑی بہت زیادہ عمدہ کوالٹی کی نہیں ہے اس لیے اس کا غیر معمولی بھاری ہونا ایک معما سا تھا بلکہ ڈیڈ باڈی کو شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے تابوت کا استعمال بھی ایک طرح سے غیر ضروری تھا۔ تابوت تو عموماً وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو اپنے مُردوں کو تابوت سمیت قبر میں دفناتے ہیں۔ یہاں تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، اس کے شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی جاری تھی۔ خواجہ سراؤں کے مربی کی حیثیت سے شالنی کو ان میں سب سے خاص مقام حاصل تھا چنانچہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر جاوید علی نے وہاں موجود خواجہ سراؤں کو خاصا دکھی پایا۔ رتی کی چتا کو آگ لگتے دیکھ کر ان میں سے کئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے تھے اور کچھ بلند آواز میں تو کچھ سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ جاوید علی نے خود اپنے دل کو بھی اس ماحول میں بوجھل پایا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹا وہ وجود کس کا تھا اور ان کے درمیان مذہب و معاشرت کی کیا تفریق تھی؟ اس سے قطع نظر وہ اس وقت ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کی زندگی کا سفر ختم ہونے پر اپنے دل کو آزردہ محسوس کر رہا تھا لیکن آزردگی کی اس کیفیت میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان کے ساتھ میت گاڑی میں آنے والے چاروں مردوں نے نہایت خاموشی سے چتا سے کچھ فاصلے پر رکھا خالی تابوت اٹھایا اور وہاں سے جانے لگے۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے تابوت میں خاصا وزن موجود ہو۔ ان چاروں کے حرکت میں آتے ہی اس نے شالنی کو بھی چپکے سے سب کے درمیان سے کھسکتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور خود بھی سب کے درمیان سے نکل کر خاموشی سے اس طرف چل پڑا جہاں شالنی گئی تھی۔ سوگوار خواجہ سراؤں نے ان میں سے کسی کی حرکت کو نوٹ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ شاید کسی نے اس حرکت کو محسوس بھی کیا ہو گا تو اس کے نزدیک اس کی وجہ جاننے کے مقابلے میں اپنی ساتھی کی جلتی چتا کے سامنے کھڑے ہو کر آنسو بہانا زیادہ اہم رہا ہو گا۔

دبے قدموں شالنی کے پیچھے جانے والے جاوید علی نے اسے ایک کنوئیں کے قریب کھڑا دیکھ لیا۔ وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال رہی تھی۔ جاوید علی کوشش کر کے بے آواز قدموں سے اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو سن سکے۔

"مال بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ میرے آدمی صرف چالیس منٹ تک اس کی حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارے آدمی۔ اگر تم اس دوران یہاں پہنچ کر مال نہیں اٹھا سکے تو آگے ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار نہیں ہو گا۔" شالنی فون پر کسی سے مخاطب تھی۔

"پروگرام کے مطابق سارا مال تابوت میں ہی ہے۔ تم میت گاڑی یا ایمبولینس لاؤ اور مزے سے اپنا مال لے جاؤ۔ اتنی بچر مچر کی کیا ضرورت ہے کہ یہ ہو گیا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گیا تو کیا کرنا ہو گا۔ ہم نے جتنی پے منٹ لی ہے، اتنا ہی کام کریں گے نا۔" دوسری طرف سے شاید مزید تعاون کی درخواست کی گئی جس کے جواب میں شالنی نے بے مروتی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر وہاں سے مزید کچھ کہا جانے لگا جسے سن کر شالنی نے اپنے رویے میں ذرا سی لچک پیدا کی اور قدرے تحمل سے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تابوت پرانے کنوئیں کے قریب ہی رکھا ہے۔ اگر تم لوگ وقت پر نہ پہنچ سکے یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تابوت کو کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ تم لوگ

بعد میں اسے نکالتے رہنا۔ اور ہاں، یاد رکھو کہ پانچ منٹ تم مجھ سے بات چیت میں برباد کر چکے ہو اس لیے اب تمہارے پاس صرف پینتیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے شالنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید علی پھرتی سے لیکن بے آواز قدموں سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ شالنی کی یک طرفہ گفتگو سن کر ہی اس کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے شکوک و شبہات غلط نہیں تھے۔ تابوت کا بھاری پن اسی وجہ سے تھا کہ اس میں رتی کی لاش کے علاوہ بھی کچھ اور موجود تھا۔ یہ کچھ اور کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قوی امکان اسلحے کا تھا کیونکہ ماضی میں بھی ایسی مثالیں ملتی رہی تھیں جب مجرموں نے اسلحے کی نقل و حمل کے لیے جنازوں کا سہارا لیا تھا۔ صورتِ حال کا تیزی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس نے محفوظ مقام پر پہنچ کر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا اور جلدی جلدی انہیں حالات و واقعات کے ساتھ شمشان گھاٹ کی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر گزرتا منٹ اس کے محکمے کے لوگوں کے پاس مؤثر کارروائی کے لیے مہلت کم کرتا جا رہا ہے اس لیے کم سے کم وقت میں اختصار کے ساتھ جامع رپورٹ دے ڈالی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کا کراچی آنا بیکار نہیں گیا تھا اور کراچی میں گزرنے والی پہلی شب ہی خاصی اہم ثابت ہوئی تھی۔ وہ جس ذمے داری کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اسے اپنی استطاعت کے مطابق احسن طریقے سے پورا کر رہا تھا اور یقیناً آگے بھی اس کے لیے خاصا کام نکلنے والا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ خواجہ سراؤں کے جس گروہ میں شامل ہوا ہے، وہاں اپنی حیثیت مشکوک نہ ہونے دے، چنانچہ رپورٹ دے کر فارغ ہوتے ہی تیزی سے اس طرف رخ کیا جہاں سارے خواجہ سرا جمع رتی کی چتا کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''تو کہاں تھی رنجی؟'' وہ ابھی اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ یقینی طور پر فون کال سے فارغ ہو کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور اس نے جاوید علی کی غیر موجودگی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اب اس سے باز پرس کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''وہ دیدی میں ذرا...'' جاوید علی نے چھنگلی سے اشارہ کر کے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ کسی جگہ سے بے وقت غائب ہونے کا اس سے اچھا کوئی بہانہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''کوٹھی سے فارغ ہو کر نہیں نکل سکتی تھی۔ لے کر مجھے پریشان کر دیا۔'' شالنی غصے سے بڑبڑائی لیکن ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ اس فطری ضرورت کے آگے تو ہر انسان ہی مجبور ہوتا ہے۔ یہ موقع محل دیکھتی ہے، نہ وقت و حالات۔

''چل، اب چل کر سب کے ساتھ کھڑی ہو۔ پانچ دس منٹ میں ہم یہاں سے واپس چلیں گے۔'' جاوید علی کا جھکا ہوا سر اس کی شرمندگی کا اظہار تھا اس لیے شالنی نے مزید ڈانٹ پھٹکار سے گریز کرتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں اسے اپنا حکم سنایا۔

''ابھی تو چتا بھی ٹھیک سے نہیں جلی دیدی! رتی کی استھیوں کا کیا ہوگا؟'' جاوید علی نے جان کر اس سے پوچھا۔

''چتا جل کر ٹھنڈی ہو جائے گی تو صبح پنڈت مہاراج استھیاں جمع کر کے رکھ لیں گے۔ میں بعد میں ان سے منگوا لوں گی۔ ویسے بھی استھیوں کے لیے اتنی جلدی نہیں ہے۔ اگلے مہینے میری ایک جاننے والی آگرہ جانے والی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے رتی کی استھیاں گنگا میں بہانے کے لیے بھیجوں گی۔'' شالنی نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' جاوید علی نے اس کے فیصلے کو سراہا پھر لہجے کو ذرا سرسری بناتے ہوئے بولا۔ ''پنڈت مہاراج چتا کو آگ دیتے سمے نظر نہیں آئے۔ ان کو تو اس سمے یہاں ہونا چاہیے تھا۔''

''مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آ سکے۔'' جاوید علی کی سوال پر سوال کرنے کی جسارت شالنی کو ناگوار گزری تھی اس لیے اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے جواب دیا اور پھر قدم بڑھا کر جلتی ہوئی چتا کے گرد کھڑے خواجہ سراؤں کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے بہ آوازِ بلند ان سب کو بھی وہی بتایا جو ابھی جاوید علی کو بتا چکی تھی۔

اس کی طرف سے روانگی کا اعلان ہوتے ہی افسردہ و آبدیدہ کھڑے خواجہ سراؤں میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ حسبِ حکم شمشان گھاٹ سے باہر نکلنے لگے۔ دس منٹ کے اندر اندر ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آ چکی تھی۔ اس دوران جاوید علی گاہے بگاہے شالنی کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ وہ بے چین تھی اور بار بار اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی جا رہی تھی۔ میت گاڑی واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی کو اس وقت بھی وہی شخص ڈرائیو کر رہا تھا جو یہاں آتے وقت اسے چلا کر لایا تھا۔ البتہ باقی تین آدمیوں

کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ تابوت میں موجود مال کی بہ حفاظت ڈلیوری کے لیے شمشان گھاٹ میں ہی رک گئے تھے۔ سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں اس کے رپورٹ کر دینے کے بعد اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ چشمِ تصور سے آگے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا جاوید علی متعدد خواجہ سراؤں کے ساتھ میت گاڑی میں سوار نواب نوازش علی کی کوٹھی کی طرف بڑھتا رہا جہاں ابھی اسے نامعلوم مدت کے لیے رنجی کا کردار ادا کرنا تھا۔

☆☆☆

موہنی سے شاپنگ مال میں ملنے والے مشکوک شخص سے برآمد ہونے والی سی ڈی دیکھ کر ذیشان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سی ڈی میں موہنی کے ساتھ وہی وزیر موجود تھا جس کی کوششوں سے پاکستان میں موجود بھارتی قیدیوں کی رہائی کا عمل انجام پا رہا تھا۔ چند منٹوں کی اس فلم میں موہنی اور وزیر صاحب جس حالت میں موجود تھے، وہ اتنی شرمناک تھی کہ اگر یہ فلم منظرِ عام پر آ جاتی تو وزیر صاحب کا برسوں کی محنت سے بنایا گیا کیریئر چند گھنٹوں میں تباہ ہو سکتا تھا۔ ذیشان سمجھ گیا کہ یہ اس فلم کی ہی کرامت ہے کہ وزیر موصوف نے بھارتی قیدیوں کی رہائی میں اتنی سرگرمی دکھائی تھی اور اپنی عزت اور کیریئر بچانے کے لیے ملکی وقار و سالمیت کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

الجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا ملتے ہی وہ غصے سے کھول اٹھا اور انٹر کام اٹھا کر اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر سے باہر نکلا اور اس ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچا جہاں موہنی کو اس کے حکم کے مطابق پوچھ گچھ کے لیے رکھا گیا تھا۔ موہنی اس کمرے کے وسط میں موجود ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر مضبوط بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے اور اس کے سر پر تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ ذیشان کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ موہنی کے چہرے پر تفکر و پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ ذیشان بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

''کون ہو تم...؟'' یہ سوال کرتے ہوئے موہنی کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ اس وقت جس ماحول میں موجود تھی، اس سے یہ اندازہ تو لگا سکتی تھی کہ وہ کسی عام شخص کی تحویل میں نہیں ہے۔ پھر اسے گاڑی میں ذیشان سے ہونے والا مقابلہ بھی یاد تھا۔ کوئی عام شخص اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اداؤں اور حسن کے بل بوتے پر مردوں کو زیر کر لینے کے ہتھیاروں سے لیس ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی خاصی ماہر تھی اور اپنے خیال کے مطابق ذیشان سے صرف اس لیے مات کھا گئی تھی کہ اسے عام شہری سمجھ کر اس کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔

''تمہارا سوال اچھا ہے۔ مجھے خاصا پسند آیا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جواب بھی تم ہی دو گی۔ بغیر کسی بہانے بازی کے سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' ذیشان کا سرد لہجہ بتدریج سخت ہوتا چلا گیا۔

''تم مجھے جانتے ہو۔ ہمارا پہلے بھی تعارف ہو چکا ہے۔'' موہنی نے کنی کترانے کی کوشش کی۔

''محفل میں ہونے والا وہ تعارف ادھورا تھا۔ اب تم مجھے اس سی ڈی کی روشنی میں اپنا تعارف کرواؤ جو ہم نے تمہارے ساتھی سے حاصل کی ہے۔'' ذیشان نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی اس کی نظروں کے سامنے نچائی جسے دیکھ کر پل بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اڑا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ذرا بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔

''یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے اس لیے تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

''بکواس بند کرو اور اگر میرے بارے میں اب تک کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو اسے بھی دور کر لو۔ میں اپنے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے کسی شخص کو ذرہ برابر بھی رعایت دینے کا قائل نہیں ہوں۔'' ذیشان غرایا۔

''تم یقیناً اسی وزیر کے ٹٹو ہو۔ اسی نے تمہیں اس کام پر لگایا ہوگا کہ میری نگرانی کرو اور موقع ملتے ہی مجھ سے یہ سی ڈی حاصل کر لو۔ اس کنجوس مکھی چوس نے وزارت میں رہ کر اتنا روپیا بنایا ہے لیکن اپنی ساکھ بچانے کے لیے بھی ایک ڈیڑھ کروڑ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور غنڈوں سے کام لے رہا ہے۔'' موہنی نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو، اس کی وضاحت کرو۔'' اس کے جواب پر الجھ جانے والے ذیشان نے سختی سے حکم دیا۔

''وضاحت کیا کرنی ہے۔ دو جمع دو چار کی طرح بات بالکل صاف ہے۔ میں ایک کال گرل ہوں اور ادائیں دکھا کر لوگوں کو لوٹنے کے علاوہ کوئی بہت زیادہ تگڑی پارٹی مل جانے پر اسے بلیک میلنگ کے سہارے بھی لوٹتی ہوں۔ مجھے

معلوم ہے کہ وہ بڑا دولت والا ہے، ملک میں جتنی پراپرٹی ہے اس سے دس گنا زیادہ مال باہر کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ خیال تھا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے خاموشی سے سودے بازی کرلے گا لیکن وہ تو سیانا کوا نکلا اور غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا حالانکہ میں نے اس پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں بھی بلیک میل کرنے والوں کے ساتھ شامل ہوں۔'' وہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ اسے ایک ایسی کہانی سنا رہی تھی جو قابلِ قبول ہوسکتی تھی لیکن وہ اس کی چال میں نہیں آیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہاری کہانی عمدہ ہے لیکن افسوس کہ میں کہانیاں سننے کے بجائے حقیقت جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اس لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اس ویڈیو اور بھارتی قیدیوں کی رہائی کے درمیان کیا لنک ہے؟'' اس کے اتنے درست اندازے پر مشتمل سوال کو سن کر موہنی بھوچکی رہ گئی لیکن پھر بھی خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''تم یہ کس قسم کی باتیں کررہے ہو؟ مجھے تو بالکل بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہے۔ تم چاہو تو میرے بارے میں کہیں سے بھی تصدیق کرسکتے ہو۔ لیکن میں یہ الزام کسی صورت نہیں مانوں گی کہ تم بھارت کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔'' نہایت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے وہ اپنے حیرت بھرے لہجے میں غصے اور طیش کی آمیزش لاچکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں موقع دیا تھا کہ تم بغیر تشدد کے اپنی زبان کھول دو لیکن تمہیں منظور نہیں تو مجھے بھی ملک دشمن عناصر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے اس ضدی پن کا خمیازہ تمہیں خود بھگتنا پڑے گا۔ مجھے تو بہرحال اپنے مطلوبہ نتائج سے غرض ہے۔'' اس نے نہایت سرد لہجے میں موہنی سے کہا اور ابھی ابھی کمرے میں داخل ہونے والے اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو اپنے ساتھ ایک ٹرالی کھینچتا ہوا لے کر آیا تھا۔ ٹرالی میں ایک شیشے کا جار اور چھوٹی سی ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ شیشے کے جار میں کوئی ایسا محلول موجود تھا جس سے گرم گرم بھاپیں اڑ رہی تھیں جبکہ ٹرے میں پینٹنگ میں استعمال ہونے والے مختلف برش رکھے ہوئے تھے۔

''یہ خرم ہے۔ اسے انسانی اعضا خصوصاً چہرے پر نقش ونگار بنانے کا بہت شوق ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے یہ اپنے برش کو رنگوں کے بجائے تیزاب میں ڈبونے کا عادی ہے۔ تمہارے حسین چہرے پر کام کرنے کے لیے اس نے خصوصی طور پر گندھک کا خالص تیزاب منگوایا ہے۔ امید ہے تمہیں اس کا کام پسند آئے گا۔'' وہ ٹرالی لانے والے کا نہایت دوستانہ لہجے میں موہنی سے تعارف کروانے لگا لیکن لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں جو سفاکی تھی، اس نے موہنی کو جھرجھری لینے پر مجبور کردیا۔

''پلیز! میرا یقین کرو۔ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے ہراساں لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس خوف و دہشت کے عالم میں اس کا حسن کچھ اور بھی دمکنے لگا تھا لیکن ذیشان متاثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک بار ایملی پارکر نامی حسینہ کے حسن کے جال میں پھنسا تھا اور شباب و شراب کے نشے میں چور اسے اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کربیٹھا تھا۔ اس کے بعد اسے ایسے احساسِ شرمندگی نے گھیرا تھا کہ اب تا زندگی وہ کسی حسینہ کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔

''اپنا کام شروع کرو خرم!'' موہنی کی درخواست پر کان دھرے بغیر اس نے سفاکی سے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ کسی مشین کی طرح حرکت میں آیا اور دیوار پر لگے سوئچ پینل کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی موہنی کی کرسی کے عین اوپر چھت سے ایک لوہے کا شکنجہ برآمد ہوا اور اس کے سر اور گردن کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دینے سے بھی محروم ہوگئی۔

''میری بات سنو، ایسا مت کرو۔ میرا ایسے کسی معاملے سے تعلق نہیں ہے جس کا تم مجھ پر الزام لگارہے ہو۔'' گردن و سر کے شکنجے میں پھنستے ہی موہنی کی رنگت زرد پڑگئی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی لیکن کمرے میں موجود وہ دونوں نفوس تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سماعت سے ہی محروم ہوچکے ہوں۔ ذیشان بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ مشینی انداز میں حرکت کرتا خرم ٹرالی کو موہنی کے بالکل قریب لے گیا تھا اور ٹرے میں سے اپنی پسند کا برش منتخب کررہا تھا۔

''آؤٹ لائن کے لیے میں عام طور پر زیرو نمبر کا برش استعمال کرتا ہوں لیکن آپ اتنی حسین ہیں کہ میں آپ کے فیس پر آپ کی چوائس کے مطابق بھی کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ٹرے میں سے ایک برش منتخب کرلینے کے بعد وہ موہنی سے کسی پیشہ ور مصور کی طرح مخاطب ہوا۔

''بند کرو یہ بکواس۔ دور لے جاؤ مجھ سے یہ سب کچھ۔'' موہنی غصے اور دہشت سے ملی جلی آواز میں چیخی اور ٹرالی کو عملاً خود سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پیر جکڑے ہونے کی وجہ سے بس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی بل کھا کر رہ گئی۔

''اوکے، اگر آپ بتانا پسند نہیں کرتیں تو میں اپنی روٹین کے مطابق ہی کام کا آغاز کردیتا ہوں۔'' اس کے چیخنے کو خاطر میں لائے بغیر خرم نے نہایت آرام سے کہا، برش کو جار میں موجود محلول میں ڈبو کر موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا۔ اس نے بے ساختہ ہی آنکھیں بند کرلیں لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں اور منہ دونوں ہی کھل گئے۔ چہرے کی شفاف جلد پر تیزاب میں ڈوبے برش سے پڑنے والی لکیر بہت واضح تھی اور موہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ یقیناً اپنے حسین چہرے کے بگڑ جانے کے خوف سے بھی چلّا رہی تھی۔

''پینٹنگ کی اس تکنیک کو استعمال کرنے میں اصل لطف ہی اس وقت آتا ہے جب ماڈل خوف سے چیختا ہے۔ آپ جوں جوں چیخیں مارتی رہیں گی میرے کام میں تیزی آتی رہے گی۔'' سنجیدہ صورت خرم نے اسے آگاہ کیا اور برش کو ایک بار پھر گندھک کے تیزاب میں ڈبو کر اس کے دوسرے رخسار پر ڈھائی انچ کے قریب لکیر ماردی۔ موہنی کے حلق سے ایک بار پھر چیخیں برآمد ہوئیں۔

''پلیز! مجھے گولی ماردو لیکن میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔'' اس نے دیکھا کہ خرم کا ہاتھ تیسری بار بھی جار کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اس کی چیخوں سے ذرا متاثر نہیں ہورہا تو خود پر قابو پاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ تیزاب میں ڈوبے برش کی دو باریک سی لکیروں نے ہی اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے اور مدہوش کردینے والی آنکھوں کے ساغر آنسوؤں سے لبالب بھرنے کے بعد چھلک پڑے تھے۔ نمکین آنسوؤں کے قطرے رخساروں سے لڑھک کے گزرتے، آگ کی ان دو لکیروں میں مزید جلن کا احساس پیدا کررہے تھے۔

''گولی سے بننے والا چھید بالکل بھی آرٹسٹک نہیں ہوتا۔ کم از کم میں اتنے حسین چہرے اور جسم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتا۔ مجھے تو برش سے کیا جانے والا کام ہی پسند ہے۔'' خرم کے اطمینان میں سرمو فرق نہیں آیا اور وہ نہایت انہماک سے ایک بار پھر برش کو محلول میں ڈبونے لگا۔

''اسے روکو۔ پلیز! اسے روکو۔ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اذیت دے دے کر ماردے گا۔'' خرم کی طرف سے مایوس ہوکر موہنی نے ذیشان سے رجوع کیا اور ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے رحم کی اپیل کرنے لگی۔

''یہ شخص صرف اسی صورت میں رک سکتا ہے کہ تمہاری زبان سچ اگلنے لگے۔'' ذیشان نے سردمہری سے اس کی اپیل کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔'' موہنی نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ کسی حسین عورت کے تشدد کا اس سے زیادہ اذیت ناک طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کا حسن برباد کردیا جائے اور یہاں تو بہت ہی ہولناک ترکیب سے اس کے حسن کو داغا جارہا تھا۔

''سب سے پہلے تو بتاؤ کہ تم کس ملک کے لیے کام کررہی ہو؟'' اسے لائن پر آتا دیکھ کر اس نے خرم کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور خود سوال داغا۔ اس کا اشارہ پاکر خرم کسی معمول کی طرح ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ ادھر موہنی نے تھوک نگلتے ہوئے اس کے سوال کا ایک لفظی جواب دیا۔

''بھارت۔''

''اوہ... تو را کی سورما ہو؟'' ذیشان نے طنز سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''کیا اس وزیر کے ذریعے پاکستانی اور بھارتی قیدیوں کے تبادلے کا مقصد ان دو قیدیوں کو رہا کروانا ہے جن پر بھارتی جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا ہے؟'' اس نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ایک ایسا سوال کیا جس کا مقصد محض اپنے اندازے کی تصدیق تھا، جواباً موہنی نے عجلت میں سر ہلا دیا۔ اس کا یہ عجلت بھرا انداز ذیشان کو ٹھٹکا گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ غلط سمت میں سوچ رہا ہے اور موہنی اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اسی سمت پر چلانے کی کوشش کررہی ہے۔

''میرے پاس جو معلومات ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں بہت ینگ ایج میں پاکستان پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی گرفتار کرلیے گئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تمہارے ملک کے لیے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے تھے پھر تم لوگوں کو ان کی رہائی میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' اس نے موہنی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم اپنے دیش کی رکھشا کے لیے بلیدان دینے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ دونوں بے شک بھارت ماتا کے لیے کچھ نہیں کرسکے لیکن انہوں نے کوشش تو کی اور اس

کوشش میں اپنے جیون کے کئی قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیے اس لیے ان کو قید سے رہائی دلوانا ہم پر قرض تھا۔'' موہنی نے جذباتی لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا یہ جذباتی پن بھی ذیشان کو مصنوعی لگا۔

''میں نہیں مان سکتا کہ تم بنیوں کی قوم نے کوئی کام انسانی ہمدردی میں کیا ہوگا۔ پھر جس طرح تم لوگوں نے اس کو پھانسا وہ خاصا غور طلب ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار یہ کام ہوتا رہا ہے۔ تم لوگ چاہتے تو ایسے کسی بھی موقع پر اپنے من پسند قیدیوں کو رہائی دلوا سکتے تھے لیکن آخر ایسی کیا ضرورت پڑی کہ ایک وزیر کو بلیک میل کر کے اچانک اس ڈیل کو طے کیا گیا؟'' موہنی کے چہرے پر پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے ظاہر تھا کہ اب وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔

''مجھے جو کہا گیا، وہ میں نے کیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے کنی کترانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے خرم! تم اس کے چہرے پر اپنا شوق پورا کرو۔ میں باقی معلومات اس کے پکڑے جانے والے دوسرے ساتھی سے حاصل کرلوں گا۔'' اس کو پٹری سے ہٹتے دیکھ کر وہ خرم سے مخاطب ہوا۔ اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بظاہر لاتعلق بنا خرم حرکت میں آگیا۔ موہنی ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگی۔ اس بار اس نے نسبتاً بڑے سائز کے برش کا انتخاب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب اس کے چہرے پر پہلے کی طرح باریک لکیر کے بجائے نسبتاً موٹی لکیر ابھرے گی۔ لکیروں کی موٹائی اور گہرائی میں اضافے کا مطلب اذیت اور بدصورتی میں بھی اضافہ تھا لیکن وہ جس راز کو آشکار کرنے سے خوف زدہ تھی، وہ بھی بہت قیمتی تھا اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''جب تم اس پر پینٹنگ کا شوق پورا کرلو تو مجھے اطلاع کردینا۔ میں اسے شہر کے سب سے مشہور چوک پر پھنکوا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے چاہنے والوں کو اس کا نیا روپ حیران کردے گا۔'' اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر ذیشان اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خرم کو مخاطب کر کے سفاکی سے کہتا ہوا جانے کے لیے پلٹنے لگا۔

''تم راون کے چیلے ہو۔ تم میں انسانیت ہے نہ عورتوں سے برتاؤ کی تمیز۔'' اسے پلٹتے دیکھ کر موہنی چیخی اور پھر ایک سانس میں اسے کئی گالیوں سے نوازنے کے بعد زور زور سے رونے لگی۔

''تم رک کیوں گئے خرم! اپنا کام شروع کرو اور اب اسی وقت رکنا جب کام مکمل ہو جائے۔'' موہنی کے چیخنے چلانے کے دوران اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ مغلظات بکنے کے بعد جب وہ بے بسی سے رونے لگی تو اس نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگانے کے خیال سے خرم سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ موہنی اندر سے ٹوٹ چکی ہے اور کسی بھی لمحے ڈھیر ہو جائے گی اس لیے اس پر نفسیاتی حربے استعمال کر رہا تھا۔ خرم اور اس کے درمیان اس وقت غضب کی انڈر اسٹینڈنگ نظر آرہی تھی اور وہ بالکل اسی طرح عمل کر رہا تھا جیسا کہ ذیشان خواہش مند تھا۔ اس وقت بھی وہ آہستگی سے برش لہراتا ہوا موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا اور کسی عظیم مصور کی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

''تمہاری ناک بہت خوب صورت ہے۔ اگر میں اس کھڑی ناک کی نوک سے لے کر پیشانی پر آنکھوں کے درمیان تک ایک لکیر بناؤں اور پھر اس لکیر کے دائیں بائیں باریک لکیریں بناتا چلا جاؤں تو ایسا لگے گا کہ میں نے کسی درخت کا پتا پینٹ کیا ہو۔''

''شٹ اپ۔ بند کرو اپنی بکواس۔'' اس کے خوفناک ارادے سن کر موہنی رونا چھوڑ کر غصے اور خوف سے چیخی لیکن اب اس کی آواز میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔

''سوری میڈم! میں اپنے باس کے حکم کا غلام ہوں اس لیے یا تو تم ان کی بات مان لو یا پھر اس حلیے میں آنے کے لیے تیار ہو جاؤ جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا ہے۔'' خرم پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت اطمینان سے اسے آگاہ کرتے ہوئے برش کی نوک اس کی ناک کی طرف بڑھائی۔ ذیشان اس دوران کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

''اپنا ہاتھ دور ہٹاؤ مجھ سے اور بلاؤ اپنے ذلیل باس کو۔ میں اسے سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ رسی جل گئی پر بل نہیں گئے کے مصداق تنتناتے ہوئے بولی تو خرم اس سے دور ہٹ گیا اور برش واپس ٹرے میں رکھنے کے بعد دیوار میں نصب انٹرکام پر ذیشان کو موہنی کی رضامندی سے آگاہ کرنے لگا۔ دوسری طرف سے ذیشان نے اس سے کچھ کہا جس کے جواب میں ''اوکے سر'' کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور کمرے میں اس جانب بڑھ گیا جس طرف موہنی کی پشت تھی اور وہ بری طرح جکڑی ہوئی ہونے کی وجہ سے پیچھے مڑ کر یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ خرم وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ چنانچہ دروازے پر نظریں جمائے رہی جہاں سے ذیشان کی

آمد متوقع تھی۔ ذیشان فوری طور پر نمودار نہیں ہوا البتہ خرم ایک پورٹیبل میز کو کھینچتا ہوا اس کے قریب لے آیا۔ اس میز پر رکھی مشین کو دیکھ کر موہنی نے اپنے لب بھینچ لیے۔ وہ جانتی تھی کہ اس مشین کی موجودگی میں اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اس کی کیفیت سے انجان بنا خرم نہایت مہارت سے اپنا کام کرتا رہا اور مختلف تاروں کو اس کے جسم سے اٹیچڈ کر دیا۔ اسی وقت ذیشان بھی کمرے میں چلا آیا اور اس کے عین سامنے موجود کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''تو مس موہنی! آپ سچ بولنے کے لیے راضی ہیں۔ مجھے آپ کے اس عقلمندانہ فیصلے پر خوشی ہے اور مزید خوشی اس وقت ہوگی جب آپ اس پولی گراف مشین کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مزید عقلمندی کا مظاہرہ کریں گی اور سچ میں جھوٹ ملانے کی کوشش نہیں کریں گی... ورنہ اس بات سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف ہوں گی کہ یہ مشین دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا خوب جانتی ہے۔ اب آپ کی زبان سے جھوٹ نکلے گا تو یہ فوراً ہی بتا دے گی۔'' موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے اس نے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''مجھے سب معلوم ہے۔ تمہیں جو پوچھنا ہے پوچھو۔'' وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ دونوں رخساروں پر موجود تیزابی لکیروں میں ہونے والی جلن سے زیادہ اس وقت وہ اپنے زیر ہونے پر تلملائی ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے حسن اور اداؤں سے اشاروں پر نچانے والی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود بھی زد پر آئے گی اور ایسے لوگوں کے درمیان پھنس جائے گی جس کے لیے اس کا حسن کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔

''بات وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ قیدیوں کا جو تبادلہ عمل میں آنے والا ہے اس میں ایسا کیا راز ہے جو سیاسی لیڈرز کے بجائے را کے سورماؤں کو میدان میں اترنا پڑا؟'' اس وقت اس کے ذہن میں سب سے بڑی الجھن یہی تھی اس لیے اسی سوال سے آغاز کیا۔ ان دو مشکوک قیدیوں کی رہائی کے لیے اس ساری بھاگ دوڑ کے امکان کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

''پہلی کوشش سیاسی سطح پر ہی کی گئی تھی لیکن تمہارے وزیر داخلہ فی الوقت اس معاملے میں انٹرسٹ لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے ہمیں یہ کشٹ اٹھانا پڑا۔ اعوان صاحب کے وزیر داخلہ سمیت وزیراعظم اور آرمی چیف دونوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لیے ہم نے انہیں ٹریپ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہماری ترکیب کامیاب بھی رہی۔ سی ڈی دیکھتے ہی اعوان صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کانٹیکٹ کر کے پوچھ گچھ کی تو میں نے لاعلمی کا اظہار کر کے رونا دھونا مچا دیا کہ کچھ بھی ہو، اس سی ڈی کو منظر پر نہیں آنا چاہیے ورنہ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔ انہوں نے میری بات کا یقین کرلیا اور اپنی اور میری جان بچانے کے لیے وہی کیا جو ان سے کہا گیا۔ انہوں نے ہماری توقع سے بھی زیادہ تیزی سے معاملات طے کروا دیے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ کام ہوتے ہی اوریجنل سی ڈی انہیں بھجوا دی جائے گی۔ سی ڈی میری کسٹڈی میں تھی اور آج میں اسے اپنے ایک مددگار ماتحت کے سپرد کرنے شاپنگ سینٹر گئی تھی جہاں تم نہ جانے کیسے میری جان سے چمٹ گئے۔'' موہنی نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''اوکے، یہ تفصیل تو ہوگئی کہ تم نے اعوان صاحب کو کس طرح قابو میں کر کے اپنا کام نکلوایا لیکن میرا اصل سوال اب بھی اپنی جگہ پر ہے۔ قیدیوں کے تبادلے کے پیچھے کون سی سازش چھپی ہوئی ہے جو را اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ موہنی جو اسے باتوں باتوں میں گھمانے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی کوشش میں ناکام ہونے پر مایوسی کا شکار نظر آئی لیکن جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے اپنی زبان کھولنی پڑی۔

''قیدیوں کا یہ تبادلہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے برسوں پہلے پلاننگ کرلی گئی تھی۔ اس تبادلے کا مقصد پاکستان کی قید میں موجود اپنے شہریوں کو آزادی دلوانا نہیں بلکہ بھارت کی قید میں موجود ایک پاکستانی کو پاکستان واپس پہنچانا ہے۔ اعوان سے لسٹ میں دو ایسے بھارتی قیدیوں کے نام شامل کروانا جو مشکوک ہیں، صرف ایک احتیاط تھی کہ اگر تمہاری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس معاملے میں دخل بھی دیں تو انہیں یہی شک ہو کہ ہم اپنے جاسوسوں کو چھڑوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت میں پاکستان صرف یہ کرتا کہ ان دونوں کے نام لسٹ سے خارج کر دیتا جس پر ہماری طرف سے ہلکا پھلکا ری ایکشن تو ظاہر کیا جاتا لیکن ڈیل ختم نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا اصل مقصد کچھ اور تھا جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔'' موہنی نے بہت کچھ بتا دیا تھا پھر بھی صورت حال ابھی پوری طرح واضح نہیں تھی۔

''بھارت کو کسی مخصوص پاکستانی کو واپس پاکستان پہنچانے میں کیا دلچسپی ہے؟ مجھے اس پاکستانی کے بارے میں تفصیل بتاؤ؟'' مبہم سی باتوں کی وضاحت کے لیے اس نے

سوال کا جواب بہت ضروری تھا۔

''وہ قیدی ایک پاکستانی مچھیرا تھا جسے صرف چودہ سال کی عمر میں بھارتی سمندری حدود کی خلاف ورزی کرنے والی ایک لانچ پر سے دوسرے مچھیروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم عرف سلو ہے اور اس کی گرفتاری کو پورے پانچ سال گزر جانے کے باوجود اب بھی اس کے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں تمہارے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل پر اس کے متعلق ایک رپورٹ بھی دکھائی گئی تھی جس میں سلو کی ماں اور بہن روتے ہوئے حکومتِ پاکستان سے سلو کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنے کی درخواست کر رہی تھیں۔ ہم نے سوچا تمہاری حکومت ملکی خزانے کو فارن اکاؤنٹس میں منتقل کرنے میں اتنی بُری طرح مصروف ہے، سلو کی ماں بہن کی درخواست پر کہاں کان دھرے گی تو چلو ہم خود اسے رہائی دلوا دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ اور استہزا کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اب تم مجھ سے یہ بکواس مت کرنا کہ تمہاری حکومت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سلو کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی پلاننگ برسوں پہلے کی جا چکی تھی۔'' موہنی کے اندازِ گفتگو پر وہ بُری طرح تلملایا چنانچہ نہایت تلخ لہجے میں اس سے بولا۔ سوال جواب کے دوران اس کی نظر پولی گراف مشین کی طرف بھی تھی۔ وہ اگر ایک طرف اپنی تربیت یافتہ نظر سے اس کے چہرے پر سچ جھوٹ کو پرکھ رہا تھا تو دوسری طرف مشین کی موجودگی سے بھی استفادہ جاری تھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی لیکن تمہیں یہ ضرور بتاؤں گی کہ سلو اب بس ظاہری شناخت کی حد تک ہی پاکستانی ہے ورنہ گزرے پانچ برسوں میں ہم اسے مکمل طور پر اپنا بنا چکے ہیں اور اب وہ پاکستان سے زیادہ بھارت ماتا کا وفادار ہے۔'' اس نے فخریہ بتایا جبکہ ذیشان کا دماغ اس انکشاف پر جھنجھنا اٹھا... وہ سمجھ گیا کہ سلیم عرف سلو کے ساتھ کیا کیا گیا ہوگا۔ پانچ سال قبل صرف چودہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والے اس پاکستانی ماہی گیر لڑکے کو برین واشنگ اور مخصوص دواؤں کے استعمال سے ایسی شخصیت بنا دیا گیا ہوگا کہ وہ جذبہ حب الوطنی تو کیا، انسانیت کو بھی فراموش کر چکا ہوگا اور صرف ان باتوں پر عمل کرنا جانتا ہوگا جس کا حکم اس کے زبردستی بن جانے والے آقا دیتے ہوں گے۔ بھارتیوں کا یہ ہتھکنڈا کوئی نیا نہیں تھا، اس سے قبل بھی وہ یہ ترکیب استعمال کر چکے تھے... اب پھر اسی قسم کی ایک اور سازش سامنے آنے پر وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ سازش کا بنیادی طریقۂ کار وہی تھا۔ ایک بار پھر پاکستان کے خلاف پاکستانی جوان کو استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے انہوں نے بھارت کی سرزمین پر دہشت گردی کا ڈراما رچا کر پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔

''سلو یہاں پہنچنے کے بعد کس کے انڈر ہوگا؟'' لمحوں میں بہت کچھ سوچ لینے کے بعد اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرا کام بس یہیں تک تھا کہ میں سلو کی پاکستان واپسی کا بندوبست کر دوں۔ آگے وہ کیا کرے گا اور کس کے کہنے پر کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔'' موہنی نے صاف جواب دیا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ ذیشان خود انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں موہنی جیسے افراد کو بس ایک حد تک ہی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور اصل مشن کو کوئی اور ہی ہینڈل کرتا ہے۔

''او کے، تم ریسٹ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا کیا کرنا ہے۔'' اس نے یک دم ہی موہنی سے سوال جواب کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''موت کے علاوہ تم مجھے کچھ نہیں دے سکتے، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔'' وہ استہزائیہ بولی۔

ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دفتر میں خرم اس کے روبرو تھا۔

''موہنی کا کیس تمہارے حوالے ہے۔ اسے اچھی طرح کھنگال ڈالو۔ بس وقت زیادہ نہیں لینا۔ آٹھ دس گھنٹے میں اس کی لاش شہر کے کسی حصے میں ہونی چاہیے۔ لاش پھنکوانے کے بعد اس بات کا بھی انتظام کر دینا کہ باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے جس ڈاکٹر تک پہنچے، وہ ہماری مرضی کی رپورٹ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ موہنی کے اغوا اور موت کو ایسا رنگ دیا جائے جس سے یہ تاثر ابھرے کہ حسین اور تنہا عورت کو دیکھ کر کسی اوباش کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے قتل کر کے پھینک دیا۔''

''او کے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔'' خرم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ سی ایف پی کا ہر جوان ایسا ہی تھا۔ پُرعزم، حوصلہ مند اور دیے ہوئے ٹاسک کو پورا کرنے کی اہلیت رکھنے والا۔

''سمیر سے کہہ دو کہ اس دوران موہنی کے ساتھی سے بھی تفتیش مکمل کر لے۔ وہ زبان کھولے گا تو موہنی سے حاصل ہونے والی معلومات کی مزید تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن خیال رکھنا کہ بندہ ایکسپائر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ موہنی اور اس کی لاشیں ایک وقت میں سامنے آ کر دشمن کو ہوشیار کرنے کا سبب بنیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت اسے دی۔

''ٹھیک ہے سر!'' خرم کا جواب اب بھی مختصر لیکن نپا تلا اعتماد سے بھرپور تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ذیشان نے اسے اپنے دفتر سے جانے کی اجازت دی اور خود دیگر مصروفیات میں الجھ گیا جس میں سب سے اہم مصروفیت کرنل توحید کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا۔

☆☆☆

''واپسی کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے سرکار! اب تو راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ کارخانے کی ملکیت سے انکار کا ثبوت دینے کے بعد پولیس کی مجال نہیں کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکے اور وہ اے سی کا بچہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، کافی ڈھنگ کا بندہ ہے۔ میں نے رواج کے مطابق اس کی آمد کے دن اے سی ہاؤس میں اس کا استقبال کیا تھا اور بہت سے تحفے تحائف بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے استقبال پر بہت خوش ہوا۔ تحائف بھی اسے بہت پسند آئے۔ میں نے اسے آپ کی غیر موجودگی کی وجہ بتا کر کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ چودھری صاحب امریکا سے واپس آ جائیں تو پھر حویلی میں اس کی شان دار دعوت کی جائے گی۔ اس نے اسی وقت دعوت قبول کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بندہ اپنے مطلب کا ہے اور آگے ہمارے لیے خاصی آسانی رہے گی۔'' منشی اللہ رکھا چودھری کا سب سے زیادہ سرچڑھا اور مقرب ملازم تھا اس لیے اس سے اتنی طویل بات کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اس کے ذریعے چودھری کو حویلی، کاروبار اور فصل ہر شے کے بارے میں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے منشی! پہلے کے مقابلے میں حالات اب کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ میں آنا چاہوں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن جانے کیوں میرا من راضی نہیں ہو رہا۔ ادھر میرے دوستوں کا بھی یہی مشورہ ہے کہ فی الحال کچھ دن نیویارک میں ہی رہوں اس لیے ابھی واپسی کا کچھ بتا نہیں سکتا تجھے۔ ویسے مجھے ملوم ہے کہ میرے پیچھے تو چنگی طرح سب سنبھال لے گا۔ نئے اے سی کی طرف سے بھی تو نے جو خبر سنائی ہے، اسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کہ بندہ اپنے مزاج کا ہے ورنہ خوامخواہ لفڑوں میں پڑ کر ٹائم برباد ہوتا ہے۔'' چودھری نے اپنے منشی کی کارکردگی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میری سات نسلیں آپ پر قربان چودھری صاحب! میرا تو کام ہی آپ کی خدمت ہے۔ آپ جو حکم دیں گے، میں بجا لاؤں گا۔ کہیں کوتاہی ہوئی بھی تو قسمت کی خرابی سے ہو گی، میں غفلت بہر حال نہیں کر سکتا۔'' منشی نے اپنی روایتی خوشامد سے کام لیتے ہوئے چودھری کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

''میں بھی یہی سوچ کر ہمیشہ تجھے چھوٹ دے دیتا ہوں ورنہ ابھی جو شہزادی والا معاملہ ہوا ہے، وہ ایسا معمولی نہیں تھا۔ بس بال بال ہی بچے ہیں سب۔ اگر وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو سب ختم ہو جاتا۔ اس کی وجہ سے انصاری جیسے کام کے بندے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اب نہ جانے نیا فاریسٹ آفیسر کون آتا ہے، اگر اپنے مطلب کا بندہ نہیں آ سکا تو وڈی مشکل پڑ جائے گی۔'' منشی کو اس کی کوتاہی جتانے کے ساتھ اس نے تشویش کا بھی اظہار کیا۔

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں چودھری صاحب! بس میں خوامخواہ شہزادی سے ہمدردی کے چکر میں دھوکا کھا گیا۔ اصل میں اسے ڈاک بنگلے پر نوکری دلواتے ہوئے مجھے بالے کی خدمات کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا مرنے والا اتنے عرصے تک جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمارے کام آتا رہا، اب اس کے بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں تو چلو ان کی روٹی کا کوئی بندوبست کر دوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ نمک حرام شہزادی درپردہ اے سی سے مل بیٹھی ہے اور ہمیں فاقوں کی کہانی سنا کر خود اے سی ہاؤس سے وظیفے وصول کر رہی ہے۔'' منشی کو شرمندگی کے ساتھ ساتھ شہزادی پر غصہ بھی تھا جس کا اظہار چودھری کے سامنے کرنے میں اس نے کوئی حرج نہ سمجھا۔

''چل خیر جو ہوا سو ہوا۔ آگے کے لیے احتیاط کر۔ یہ خوامخواہ کی ہمدردیاں آدمی کو ایسی ہی مہنگی پڑتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمارے لیے کام کرتا ہے تو اس کی تنخواہ بھی تو لیتا ہے پھر ہم اس سے بعد میں کس لیے ہمدردی کریں؟''

''درست فرمایا چودھری صاحب! آئندہ میں ایسی غلطی دوبارہ ہرگز نہیں کروں گا۔'' منشی نے چودھری کے زریں خیالات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ چنگی گل ہے کہ تو ایک ہی واری میں سمجھ گیا ہے۔ اب ذرا خیال سے میری گل سن...! میرے پیچھے اب سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ ادھر تیری مدد کے لیے

فاریسٹ آفیسر بھی نہیں ہے اس لیے جنگل کی طرف کا خاص دھیان رکھنا۔'' اس کی کوتاہی کو کمال فیاضی سے معاف کرتے ہوئے چودھری نے اسے تاکید کی۔

''ادھر کی آپ فکر نہ کریں۔ میں برابر وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ پہرا بھی پہلے سے سخت کر دیا ہے۔ ویسے بھی جب تک نیا فاریسٹ آفیسر نہیں آ جاتا، جنگل اور ڈاک بنگلے میں ہمارا مکمل راج ہے۔ فاریسٹ آفیسر آ گیا تو پھر اس کے آنے کے بعد بندہ دیکھ کر نئی پلاننگ بھی کر لیں گے۔'' منشی اپنی جگہ مطمئن تھا۔

''ٹھیک ہے فیر... تو مطمئن ہے تو تیرے کہنے پر میں بھی فکر نہیں کرتا اور کچھ دن ہور ادھر ہی رہ کر موج مستی کر لیتا ہوں۔'' چودھری نے اپنی بات کے اختتام پر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''چھوٹے سرکار کو بھی خادم کا سلام بول دیجے گا۔'' فون بند کرنے سے پہلے منشی نے چودھری سے درخواست کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ مراد شاہ کی حویلی اور گاؤں سے عملاً بے نیازی کے باوجود یہ بات سمجھتا تھا کہ وہ مستقبل کا مالک ہے اس لیے اس کی گڈ بک میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

''چنگی گل ہے۔ میں بول دوں گا۔ تو ذرا حویلی کے اندر کا بھی خیال رکھنا... فریدہ کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں رہتا... وہ چودھری بختیار کی بہن ہے اس لیے اس سے مجھے خطرہ ہی لگا رہتا ہے کہ جانے کب ہاتھ دکھا جائے۔'' فون بند کرتے کرتے بھی اس نے منشی کو ایک اور ہدایت کر ڈالی۔

''میرا دھیان ہے اس طرف، آپ فکر نہ کریں۔ پچھلے دنوں نور پور سے ایک بندہ آیا تھا کہ فریدہ بی بی کو کچھ دن کے لیے میکے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے اسے ٹال دیا کہ جب تک چودھری صاحب نہیں آ جاتے یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے فریدہ بی بی آرام سے رہ رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت تو بچے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہے۔ تھوڑا بہت خیال سائیں بہزاد شاہ کا بھی رکھ لیتی ہے۔ ابھی تک اس کی طرف سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے کہ جس کی شکایت کی جا سکے۔'' منشی کے پاس یہاں بھی اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے کی گنجائش موجود تھی۔ چودھری مزید مطمئن ہو گیا کہ غلط بندے پر بھروسا نہیں کیا ہے۔ منشی اللہ رکھا واقعی کام کا بندہ ہے۔ اس نے فون بند کیا تو بہت ہلکا پھلکا تھا۔ فراغت اور اطمینان کے اس احساس نے اس کے اندر تفریح کی خواہش کو جگا دیا۔ اس کی پسندیدہ تفریحات میں سے سرفہرست دو تھیں۔ اوّل شراب، دوم شباب...! شراب تو ہمہ وقت اس کے پاس موجود ہی رہتی تھی البتہ بیٹے کے اپارٹمنٹ میں رہ کر وہ شباب کا لطف نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت موج میں آیا تو لنڈا سے رابطہ کر بیٹھا۔

''کیسے ہیں مسٹر چودھری؟ فرمایئے کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟'' لنڈا نے فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی اور خوش گوار لہجے میں پوچھنے لگی۔

''یاد تو ہم تمہیں چوبیس گھنٹے ہی کرتے رہتے ہیں لیکن فون کر کے بتانے کی کوشش اس لیے نہیں کرتے کہ تمہاری مصروفیت کا احساس ہے اور تمہیں زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' اس نے بھی جواباً خوش مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''شکریہ، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔'' دوسری طرف سے لنڈا کی مسکراتی ہوئی کھنک دار آواز سنائی دی۔

''تم بھی تو ہمارا کچھ خیال کرو۔ اتنے دنوں سے میں نیویارک میں ہوں لیکن تم سے تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی۔ ایسا کرتے ہیں کہ آج کسی اچھے سے ہوٹل میں ساتھ ڈنر کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارتے ہیں۔'' چودھری کی خواہش اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ لنڈا فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

''سوری چودھری صاحب! فی الحال آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ آج کل مسٹر الفا یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے میں بہت مصروف ہوں۔'' اس کی طرف سے صاف انکار تھما دیا گیا تھا لیکن چودھری کے لیے اس وقت اس کے انکار سے زیادہ الفا کی نیویارک میں موجودگی کی خبر اہمیت کی حامل تھی۔ اپنے اس اَن دیکھے آقا سے وہ خاصا مرعوب رہتا تھا اور اس کی طرف سے اپنی حاکمانہ فطرت کو بار بار لگنے والی چوٹوں کے باوجود دل ہی دل میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ الفا کے اندر گُر ہے کہ وہ اس جیسے شخص پر حکم چلا سکے۔

''یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ کیا مسٹر الفا مجھ سے بھی ملاقات کریں گے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ کیا کریں گے اور کیا نہیں، یہ خود انہی کو معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ ملاقات کرنا چاہیں گے تو پہلے سے انفارم کر دیں گے۔'' لنڈا کا جواب محتاط تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی الفا سے خائف اور مرعوب ہے۔

''ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ مسٹر الفا سے ملاقات کا بھی اور تمہاری فراغت کا بھی۔'' چودھری نے خوش دلی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ الفا کی موجودگی

میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ لنڈا سے ملاقات پر زور دے سکتا۔ حقیقتاً اس وقت تو اس کے دل سے تفریح کا خیال ہی نکل گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ الفا سے اگر ملاقات ہوئی تو وہ کس طرح پیش آئے گا۔ وہ لندن میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا، وہ بھی نقاب میں۔ اس وقت بھی اس نے اس کا لنڈا کے ساتھ وقت گزارنے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا اور اب بھی وہ اس کی وجہ سے ملاقات سے انکاری ہو گئی تھی۔ یعنی الفا اس کا رقیب ثابت ہو رہا تھا اور رقیب بھی ایسا کہ وہ اس سے دوبدو مقابلہ کرنا تو دور کی بات، فون پر اس کی آواز سن کر ہی خائف ہو جاتا تھا۔ پنگوڑے سے نکلنے سے بھی پہلے حکمرانی کی لت میں مبتلا ہو جانے والے چودھری کو الفا نے عمر کے اس حصے میں زندگی کے ایک ایسے ذائقے سے آشنا کیا تھا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"اور بھئی کیا خبریں ہیں؟" حسب معمول ذیشان موقع ملتے ہی شہریار سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ شہریار کو حالات و واقعات سے آگاہ رکھنا بھی ایک طرح سے اس کی ذمے داری تھی۔ اگر وہ لوگ اس سے کوئی کام لینا چاہتے تھے تو اس کا صورتِ حال سے لحہ بہ لحہ واقف رہنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ دوستانہ خواہش کے علاوہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھانے کے لیے بھی گاہے بگاہے اس سے ملتا رہتا تھا۔ خود شہریار عملاً محدود ہو جانے کی وجہ سے اس کا منتظر رہتا تھا چنانچہ اس وقت بھی مصافحے کے بعد کوئی دوسری رسمی بات کرنے کے بجائے یہ سوال کیا۔

"خبریں خاصی ہیں اور زوردار بھی ہیں۔" ذیشان نے ایک صوفے پر جگہ سنبھالتے ہوئے اسے بتایا اور پھر ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبانے لگا۔

"چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔ مسلسل بھاگ دوڑ میں لگے رہنے سے بعض اوقات کھانے پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آج بھی دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا اس لیے رات کا کھانا ذرا جلدی کھا لیا۔ چائے البتہ نہیں پی تھی کہ یہاں پہنچ کر تمہارے ساتھ پیوں گا۔" ملازم کی آمد تک اس نے شہریار کو یہ کتھا سنائی اور پھر ملازم کے نمودار ہونے پر اسے چائے کا آرڈر دینے لگا۔

"کیا کارنامہ انجام دے آئے؟" ملازم کے جانے کے بعد شہریار نے مسکراتے ہوئے مگر تجسس سے پوچھا۔

"کارنامہ تو نہیں لیکن یہ ہے کہ کچھ بڑے معاملات سامنے آئے ہیں۔ تمہیں میں نے بتایا ہی تھا کہ تمہارے مشورے پر میں نے خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر کام شروع کروا دیا ہے۔ دونوں ہی جانب کام کرنے سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے ہیں۔ میرا ماتحت جاوید علی خواجہ سرا کے روپ میں ایک گروہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور پہلے ہی قدم پر اس نے بہت کچھ کھوج نکالا ہے۔ یہاں سے وہ شالنی نامی ایک خواجہ سرا کے ساتھ کراچی پہنچ گیا ہے۔ کراچی میں اس کا قیام نواب نوازش علی نامی ایک عجیب و غریب شخص کی کوٹھی میں ہے۔ نوازش علی نے اپنی کوٹھی میں ہر کام کے لیے خوب صورت اور جوان خواجہ سرا بھرتی کر رکھے ہیں اور حیرت انگیز طور پر وہ سب کے سب ہندو ہیں۔ شالنی، نواب کے ہاں ملازم ایک رتی نامی خواجہ سرا کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی گئی تھی۔ اس کام کے لیے آدھی رات کا وقت چنا گیا کیونکہ شالنی کے مطابق یہ خواجہ سراؤں کا رواج ہے کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے مُردوں کا کریا کرم نہیں کرتے۔ بہرحال، جاوید علی جو کہ وہاں رنجنی بن کر رہ رہا ہے، پوری طرح چوکنا تھا اس لیے وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا کہ رتی کو شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے جو تابوت استعمال کیا گیا، وہ کسی خاص مقصد کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نے موقع پر ہی ہیڈ کوارٹر اطلاع دی جس کے حکم پر کراچی میں موجود سی ایف پی کے یونٹ کو فوراً حرکت میں لایا گیا۔ جوانوں نے پوری تیاری کے ساتھ شمشان گھاٹ کا گھیراؤ کر کے تابوت سمیت اس کی لین دین کے لیے موجود افراد کو اپنی حراست میں لے لیا۔ تابوت کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دہری تہ پر مشتمل تھا اور اس کے نچلے حصے میں جدید ساخت کے مہلک ہتھیار موجود تھے۔ یعنی شالنی نے اپنی ایک ساتھی کی موت کو اسلحے کی ڈیلیوری کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان سے اس معاملے میں تفتیش کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ خاصے اہم انکشافات ہوں گے۔ شالنی پر البتہ فی الحال ہاتھ نہیں ڈالا گیا ہے اور سختی سے اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نواب نوازش علی کو بھی چیک کیا جا رہا ہے کہ اس شخص کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اس سارے چکر میں شالنی کا شراکت دار ہے یا شالنی نے کسی طرح اسے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ بہرحال، یہ ایک بہت اہم معاملہ سامنے آیا ہے جس پر ہم پوری طرح نظر رکھیں گے۔ میں نے جاوید علی کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ پوری طرح ہوشیار رہے اور خود کو بچاتے ہوئے جو کچھ معلوم کر سکتا ہے کر ڈالے۔ وہ بہت ذہین اور نڈر نوجوان ہے۔ مجھے امید ہے کہ کامیابی سے اپنے حالات سے نمٹ لے گا۔"

"یہ تو ہوئی ایک خبر جو واقعی شان دار ہے۔ اب موہنی کا قصہ بھی سنا دو۔" توجہ سے اس کی بات سنتے شہریار نے بے چینی سے پوچھا لیکن ذیشان کے جواب دینے سے قبل ملازم چائے کی ٹرے کے ساتھ آموجود ہوا۔

"تم جاؤ، چائے ہم خود بنا لیں گے۔" ملازم نے ٹرے میز پر رکھی ہی تھی کہ شہریار نے اسے حکم دیا۔ وہ تابع داری سے حکم پر عمل کرتا فوراً باہر نکل گیا۔

"موہنی کا قصہ تو اور بھی دلچسپ اور اہم ہے۔" ذیشان نے خود ہی پیالیوں میں چائے انڈیل کر دودھ، شکر ملانے کا کام شروع کر دیا اور پھر دھیرے دھیرے اسے سارے واقعات سے باخبر کرتا چلا گیا۔

اس کی تیار کردہ چائے کے گھونٹ لیتے شہریار توجہ سے ایک ایک بات سنتا رہا۔ "موہنی کی زبان کھلوانے کے لیے تم نے ترکیب خوب لڑائی۔" ذیشان چیدہ چیدہ واقعات سنا چکا تو اس نے تحسین آمیز تبصرہ کیا۔

"عورت، خصوصاً حسین عورت کی فطرت کو سامنے رکھ کر میں نے تشدد کا وہ طریقہ سوچا تھا جو اتفاق سے کارگر رہا ورنہ یہ تو میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی بھی خفیہ ادارے کے ایجنٹ کی زبان کھلوانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اگر میرا آدمی تیزاب سے اس کا چہرہ بگاڑنے کے بجائے ہڈیاں توڑنے بیٹھ جاتا تو وہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولتی۔ پھر اس صورت میں ہمارے لیے یہ بھی مشکل ہو جاتا کہ اس کے اغوا اور موت کو خفیہ ادارے کے بجائے کسی ہوس پرست کے کھاتے میں ڈال پاتے۔ اس لیے یہ ہماری خوش نصیبی رہی کہ موہنی نے زیادہ محنت کے بغیر زبان کھول دی۔ اس کے ساتھی کی البتہ ٹھیک ٹھاک مرمت کرنی پڑی ہے، تب کہیں جا کر اس نے سچ اگلا ہے۔ اس کی بتائی تفصیلات سے موہنی کی باتوں کی تصدیق ہوئی ہے۔ ہم دو چار دن مزید اسے اپنے پاس مہمان رکھیں گے پھر باڈی ٹھکانے لگا دیں گے۔ کسی ملک دشمن کو معافی یا رعایت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ذیشان کا لہجہ بہت سخت تھا۔

"میں تم سے متفق ہوں لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس بندے کو مروانے میں اتنی جلدی مت کرنا بلکہ کوشش کرو کہ کسی کو اس کے غائب ہونے کی خبر ہی نہ ہو سکے۔ اس کی گاڑی بھی فی الحال اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر اس کے بعد موہنی کے ایک ساتھ غائب ہونے کی خبر ان کے اوپر والوں کو ہو گئی تو موہنی کے سلسلے میں تمہارے کری ایٹ کیے ہوئے ڈرامے کے باوجود وہ کھٹک جائیں گے کہ دونوں واقعات کے بیچ میں کوئی لنک ہے۔ اس موقع پر جبکہ دشمن کا سارا منصوبہ ہمارے سامنے ہے، اسے ہوشیار نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ابھی وہ سب کچھ ختم کر دیں گے اور بعد میں ہم اندھیرے میں تیر چلائیں گے۔" اس نے اچھی طرح سوچتے ہوئے ذیشان کو مشورہ دیا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اب جبکہ ہم بندہ اٹھا چکے ہیں کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ منسلک لوگوں کو خبر تو ہو جائے گی کہ وہ غائب ہے۔" ذیشان فکرمندی سے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے آقاؤں سے رابطے کے لیے موبائل کے علاوہ کوئی دوسرا مواصلاتی آلہ بھی استعمال کرتا ہوگا۔ اس کی اس سلسلے میں زبان کھلوا کر آپریٹس اپنے قبضے میں لو اور تمام ضروری اور ممکنہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے کسی ایسے ماتحت کو جو اس کی آواز کی نقل اتار سکے، اس کا موبائل اور آپریٹس سونپ دو۔ تمہارے ماتحت کا کام یہ ہوگا کہ وہ گرفتار بندے کے آقاؤں کو یقین دلا سکے کہ موہنی کی موت کی خبر سن کر وہ خود احتیاطاً قیدیوں کے تبادلے تک منظر سے ہٹ گیا ہے اور اپنا ٹھکانا چھوڑ کر کسی دوسری خفیہ جگہ پر رہ رہا ہے۔ ایک بار قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آ جائے تو پھر تم اس بندے کے مستقبل کا فیصلہ کر دینا۔" اس کا مشورہ بڑا صائب تھا جسے سن کر ذیشان کھل اٹھا۔

"تمہارے ساتھ کسی مسئلے کو ڈسکس کرنا کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ واقعی ان حالات میں یہ ایک اچھی ترکیب ہے۔ میں ابھی اس سلسلے میں آرڈر کر دیتا ہوں تا کہ جب ہم موہنی کی لاش منظر پر لائیں تو ہماری یہ کارروائی پوری ہو چکی ہو۔" شہریار کی تجویز کو سراہتے ہوئے وہ فوراً ہی اپنے ہیڈ کوارٹر فون کر کے اس ماتحت کو ہدایات دینے لگا جس کے ذمے یہ کیس سونپا تھا۔

"یہ تو ہو گیا ایک کام۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا قیدیوں کا تبادلہ خاموشی سے ہو جانے دو گے؟" ذیشان اپنے ماتحت کو ہدایات دے کر فارغ ہوا تو اس نے اس سے دریافت کیا۔

"یہ ضروری ہے۔ اب میں خود یہ چاہتا ہوں کہ سلو پاکستان پہنچ جائے کیونکہ اس وقت وہ پہنچا تو ہماری نظر میں ہوگا۔ بعد میں اگر کسی خفیہ طریقہ سے پہنچایا گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"اس سے تو مجھے بھی انکار نہیں ہے لیکن جن دو مشکوک بھارتی قیدیوں کو یہاں سے رہا کروایا جا رہا ہے، وہ مناسب نہیں ہے۔ ان کا جانا روک دو۔" اس نے تجویز دی۔

"اس صورت میں وہ ڈیل سے انکار بھی کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے ان قیدیوں کو رہا کروانے سے بڑھ کر سلو کو قابو میں کرنا اہم ہے۔ وہ دونوں تو بس نام کے ہی جاسوس

ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے تھے اور آتے ہی دھر لیے گئے تھے۔'' ذیشان نے اسے اپنی ترجیحات سے آگاہ کیا۔

''اس بات سے تم مجھے پہلے بھی آگاہ کر چکے ہو لیکن میں جو مشورہ دے رہا ہوں، وہ کسی اور نقطۂ نظر سے دے رہا ہوں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے بڑے تمام معاملات پر ہر ملک کے خفیہ اداروں کی نظر رہتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور ہم نے ان کے دونوں مشکوک قیدیوں کو خاموشی سے نکل جانے دیا تو وہ کھٹک جائیں گے کہ اس خاموشی کے پیچھے کیا وجہ ہے اس لیے تھوڑی سی ہچر مچر ضروری ہے۔ موہنی تمہیں بتا ہی چکی ہے کہ بھارت کی طرف سے اس معاملے میں رکاوٹ پر تھوڑی سے ردّوکد تو ہوگی لیکن ڈیل کینسل نہیں کی جائے گی کیونکہ ان کا اصل مقصد بھی سلو کو یہاں پہنچانا ہے۔'' اس نے ذیشان کو سمجھایا تو وہ گویا اچھل پڑا۔

''زبردست یار! یہ پوائنٹ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ کرنل صاحب نے تمہیں واقعی ایک جوہری کی نظروں سے پرکھ کر منتخب کیا ہے۔ تم تو فطری طور پر خفیہ اداروں کے لیے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ خوامخواہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے بیوروکریسی میں چلے گئے تھے۔ تمہاری اصل جگہ تو یہیں ہمارے درمیان تھی۔'' اس کی اس تعریف کے جواب میں شہریار فقط مسکرا ہی سکا، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ جہاں بھی تھا اس کا جذبہ ایک ہی رہا تھا۔ وہ سرتاپا وطن کی محبت سے سرشار تھا اور چاہے جہاں بھی رہتا، وطن کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتا رہتا۔

''کچھ ادھر کی خبر بھی تو دے دو۔ وہ تمہارا بندہ عمیر آفندی کیا کر رہا ہے؟'' پہلے موضوع کو سمٹتے دیکھ کر اس نے ذیشان سے سوال کیا۔

''اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ عمیر بہت اچھا جا رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ تمہارے نقشِ قدم پر ہی چلے گا لیکن طریقۂ کار ذرا مختلف ہے۔ اس نے براہِ راست مخالفوں سے ٹکر لینے کے بجائے دوستی کی آڑ میں ان کی جڑیں کاٹنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ مشابرم خان کو بھی میں نے سمجھا بجھا کر واپس ڈیوٹی پر بھیج دیا ہے۔ اس طرح اسے تمہارے غم میں گھلنے سے بھی نجات ملے گی اور عمیر کو اچھا مددگار ملنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھروسے کا ایک نگران بھی حاصل رہے گا۔ میں نے مشابرم خان کو اس کی ڈیوٹی سمجھا دی ہے۔ وہ بہت دکھی ہے لیکن میری بات سمجھ کر ڈیوٹی پر چلا گیا ہے۔'' ذیشان نے اسے بتایا۔

''مشابرم خان بہت مخلص بندہ ہے۔ مجھے اس کی خود سے محبت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ اگر مصلحت نہ ہوتی تو میں کبھی اسے اس دکھ میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہرحال آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔ اللہ نے آدمی کے اندر بڑی گنجائش رکھی ہے۔ جس کو وہ اپنے لیے ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے، جب اس سے گزر جاتا ہے تو خود بھی حیران رہ جاتا ہے کہ کیسے یہ سب سہہ گیا لیکن قانونِ قدرت یہی ہے۔ اللہ کسی کو دکھ دیتا ہے تو سہنے کا حوصلہ بھی دے دیتا ہے۔ آخر مشابرم خان نے اپنے جوان بھائی کی موت اور ماں کی بیماری کا دکھ بھی تو سہہ ہی لیا تھا۔ میری جدائی کے صدمے سے بھی جلد سنبھل جائے گا۔'' اس نے ذیشان کی بات سن کر دل سوزی سے ایک حقیقت پر مبنی تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہی امید ہے۔ تم بتاؤ رانا صاحب اور ان کی بیگم کو تمہارا کوئی پیغام دینا ہے؟'' گفتگو کا رخ خود بخود ہی ملکی معاملات سے ہٹ کر ذاتی معاملات کی طرف ہو گیا۔

''بس سلام کہہ دینا اور میری خیریت بتا دینا۔ ملاقات کی تو مجھے پتا ہے ابھی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں جن تبدیلیوں سے گزر رہا ہوں، ان کی تکمیل سے پہلے خود بھی اپنے کسی آشنا سے سامنا نہیں کرنا چاہتا۔'' اس کا اشارہ اپنے تبدیل شدہ حلیے کی طرف تھا۔ ذہنی اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری حلیے میں جو مستقل تبدیلیاں کی جا رہی تھیں، ان کی وجہ سے وہ خاصا بدلا ہوا لگنے لگا تھا۔ ذیشان کی وہاں مستقل آمدورفت تھی، اس کے باوجود وہ تسلیم کرتا تھا کہ اس کے سامنے موجود شہریار ماضی کے شہریار سے بہت مختلف ہے۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ ابھی بہت سے معاملات اور بھی دیکھنے ہیں۔'' چائے کی پیالی تو وہ کب کی خالی کر چکا تھا۔ اس سے کہتا ہوا کھڑا ہوا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی شہریار سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ اس مختصر ملاقات میں اس کے اور ذیشان کے درمیان بہت سے اہم معاملات پر گفتگو ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن فی الحال پوری طرح سلو میں الجھا ہوا تھا جس کا خمیر اسی وطن کی مٹی سے اٹھا تھا لیکن وہ اس وطن کے لیے ایک عفریت بن کر واپس لوٹنے والا تھا۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

استاد شاگرد

منظر امام

استاد شاگرد کا رشتہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم و دائم رہے گا... استادوں کے لیے ذہین و قابل شاگرد تفاخر کا باعث بنتے ہیں... مگر اس دفعہ ناقابلِ فہم و جناتی زبان کے موجد استاد گرامی کے مقابل انہی کا ایک ہم پلہ و ہم منصب تھا...

لبوں پر مسکراہٹیں اور قدم قدم پر پھلجڑیاں بکھیر دینے والا شگفتہ سلسلہ

استاد کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔

شاید استاد کو زندگی میں پہلی بار اپنی ٹکر کا کوئی بندہ ملا تھا جو ان کی زبان میں ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے استاد کے گھٹنے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ''یا لائقان حضور، ظہیرانہ چشمِ گریہ سے کام نہ لیں۔ داضحیٰ اجلات دیم تن کر لیں۔''

''کیا فربہ کشتہ بہ زورِ انکمنی کر رہا ہے۔'' استاد نے اپنے گھٹنوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''فرمانروائی نہ فرمائیں۔ ہم ویسے کشتگانِ عزیزانِ معروشام ہیں۔'' وہ نوجوان بلکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیوں ہمیں داغ داغ کجانسہنگ آور کررہے ہیں۔ سوفتنی کو سنبھالا دیں۔ مردکی نیم عصیاں کوجائیں۔''

استاد کی توسٹی گم ہونے لگی۔ انہوں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مردود مردکو، نامدارِ بے جا کشتگانِ طفلِ آوارہ فرمودات ثقلان بے حجازی مت کر۔ واضح اکسیر چشم ہوجا۔''

جس وقت ان دونوں کی یہ تاریخی گفتگو ہورہی تھی' میں ان کے قریب ہی موجود تھا اور ہنس ہنس کر میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ استاد کو بھی کیا بندہ ٹکرایا تھا۔ اس کی جناتی زبان نے خود استاد کے بھی چھکے چھڑا دیے تھے۔

پہلے پہل تو میں یہ سمجھا تھا کہ وہ استاد کو بے وقوف بنانے کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے استاد جیسی زبان بول رہا ہے اور اس کے لیے اس نے نہ جانے کتنی پریکٹس کی ہوگی۔

لیکن وہ متواتر بولتا ہی رہا تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ناٹک نہیں کررہا بلکہ اتفاق سے ایک دوسرا استاد پیدا ہوگیا ہے جو استاد کی طرح بوڑھا اور بدشکل نہیں ہے بلکہ جوان اور خوبصورت ہے۔

''کون ہوتم؟'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں سراپائے خاکِ اقلیدس ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''آہوان سرائے خاندان گم گردوں نے مجھے کامران کے نام سے مہمیز ودل آویز کیا ہے۔''

مطلب یہ کہ اس کا نام کامران ہے۔

اس اثنا میں استاد بول پڑے۔ ''اے خلفِ راہگیر سے دردمولی افتادگاہ تو کرو کہ بسبب ملاقات معلوم اور مفہوم ہوجائے۔''

استاد کا مطلب یہ تھا کہ میں اس سے دریافت تو کروں کہ وہ استاد کے پاس کیوں آیا تھا۔

''ہاں بھئی۔ تم استاد کے پاس کیوں آئے ہو۔ کیا کام ہے ان سے؟''

''دلشاد غنچۂ نوترساں کرنا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''فراغ ماہی سے بزرگوارم کا سوختہ ساتھ لے جاکر فصلیں کج کلامی کرنا ہے تاکہ آموختہ کو قرار دستکار آجائے۔''

''استاد، یہ تو تم سے بھی دو ہاتھ آگے کی چیز ہے۔'' میں نے استاد سے کہا۔

''ناہنجار کی طفلانِ بے تیر اور شمشیرِ بے کم بخت۔''

استاد نے براسامنہ بناکر اس کے لیے تبصرہ کیا۔

اس دوران ایک مہذب اور معقول سا آدمی وہاں آگیا تھا۔ اس نے اس نوجوان کی گردن پکڑ لی۔ ''بدبخت تو یہاں کیا کررہا ہے جا گھر جا۔''

''جناب یہ کون ہے؟'' میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

''یہ نالائق میرا چھوٹا بھائی ہے، جناب، اس سے تنگ آچکا ہوں میں۔''

''اس کو ہوا کیا ہے؟ یہ کیسی زبان بولتا ہے؟''

''پورا گھر اسی زبان کی وجہ سے پریشان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ شروع ہی سے ایسا ہے۔''

''تو اس کی بات آپ لوگ کیسے سمجھ لیتے ہیں۔''

''یہ کبھی کبھی سیدھی زبان بھی بولتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر پتا چل جاتا ہے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے۔''

''اس سے وجۂ گرفتارِ عندلیب تو پوچھو۔'' استاد میری طرف دیکھ کر دہاڑے۔

''ہاں یہ بتائیں کہ یہ استاد کے پاس کیوں آیا ہے؟''

''یہ استاد کو اپنا روحانی باپ مانتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور استاد کو اپنے رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔''

یہ ایک نئی کہانی سامنے آئی تھی۔ اس نوجوان نے ہاتھ ہلا ہلا کر استاد سے زیادہ جناتی انداز میں عربا اور فارسا کا ملغوبہ اگلنا شروع کردیا اور میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ استاد کی تقلید کو باعثِ عزت سمجھتا ہے۔ اور ادھر استاد کا یہ حال تھا کہ ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ایسا شاندار حریف ملا تھا ان کو کہ جس نے ان کی زبان بند کردی تھی۔

وہ شخص اپنے چھوٹے بھائی کو کسی نہ کسی طرح سمجھا کر وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی استاد بہت دیر تک بھن بھناتے رہے۔ ''یہ کیسی درفتنی ہے، سوختنی ہے، وہ مردکیا مردود زیرہ ہوتا جارہا تھا۔''

''استاد۔ آپ کچھ بھی کہتے رہیں' آپ کو اپنی ٹکر کا مل ہی گیا۔''

استاد نے اس پر خود مجھے دس باتیں سناڈالیں۔ ان کی ناراضی دیکھنے کے قابل تھی۔ ویسے اب مجھے خود اس نوجوان میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ استاد کی بات اور تھی۔ وہ چاہے کچھ بھی بولتے رہیں، انہیں کون پوچھنے والا تھا لیکن اس نوجوان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

پھر اس کا استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھنا اور یہ خواہش کرنا کہ استاد اس کے رشتے کی بات کرنے جائیں.... یہ سب بہت عجیب تھا.... بہرحال ایک دلچسپ صورت حال تھی۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نوجوان رہتا کہاں ہے لیکن یہ مرحلہ اس طرح طے ہوگیا کہ محلے کے ایک نوجوان نے مجھے اس کا پتا بتادیا۔

میں دوسرے دن اس نوجوان سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اچھا خاصا مکان تھا۔ اس کے بھائی نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ مجھے پہچان کر اندر بیٹھک میں لے آیا۔ ''تشریف رکھیں جناب۔ شاید آپ کامران کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔''

''جی جناب۔ اس نے مجھے حیران کردیا کیونکہ میں اس طرح کے ایک بندے کو بھگت ہی رہا تھا۔ اب یہ دوسرا بھی سامنے آگیا۔''

''ہم لوگ تو پریشان ہوکر رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کون سی زبان بولتا رہتا ہے۔''

''اس کی یہ کیفیت کب سے ہے؟''

''بہت دنوں سے۔'' اس نے بتایا۔ ''بی اے کے بعد ہی اس نے ایسی جناتی زبان بولنی شروع کردی تھی۔''

''تو پھر آپ لوگوں نے کیا سمجھا؟''

''ہم لوگوں کا خیال تھا کہ شاید یہ پاگل ہوگیا ہے لیکن اس میں پاگلوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہے بس اس کی جناتی زبان نے تنگ کرکے رکھ دیا ہے۔ اس کے سوا اس سے اور کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''اور یہ استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھنا، یہ کیا چکر ہے؟''

''وہ ایک بار استاد کو دیکھ آیا تھا۔ اس نے آپ کے استاد کی باتیں سنیں۔ بس وہیں سے گرویدہ ہوگیا اور ان کو اپنا روحانی باپ سمجھنے لگا۔''

''اور یہ شادی کا کیا قصہ ہے؟ وہ استاد کو کہاں بھیجنا چاہتا ہے؟''

''ہاں یہ بھی ایک کہانی ہے۔ ایک لڑکی ہے۔ شمشاد نام ہے اس کا، اچھی لڑکی ہے۔ اچھا خاصا گھرانا ہے، کھاتے پیتے لوگ ہیں کہیں ان دونوں کی ملاقات ہوئی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ اپنے بڑے کو لے کر آؤ اور یہ کم بخت روحانی باپ کے طور پر آپ کے استاد کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''کیا ان لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ اس قسم کی جناتی

زبان بولتا ہے۔"

"ہاں وہ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو بہت حیرت کی بات ہے۔ اب بتائیں اب کیا ہوگا؟"

"اپنے استاد سے کہیں کہ وہ اس نامعقول کے لیے چلے جائیں۔" اس نے کہا۔ "ورنہ شاید یہ مکمل پاگل ہوجائے گا۔"

"چلیں اس میں کیا حرج ہے۔ میں استاد کو راضی کر لوں گا۔ ویسے آپ کی شادی ہوچکی ہے؟"

"نہیں میں ابھی زندگی بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

وہ آدمی بہت ہی معقول دکھائی دیا تھا جب کہ اس کا چھوٹا بھائی عجیب وغریب چیز تھا جس میں نہ جانے کس طرح استاد کی روح حلول کر گئی تھی۔

میں نے واپس آ کر استاد کو ساری سچویشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ "استاد آپ اس کے رشتے کی بات کرنے چلے جائیں۔"

"میں آبگینہ نہیں ہوں۔" استاد جھلا کر بولے۔ "اس مردِ بسیار خور نے مجھے گردشِ لیل ونہار سمجھ رکھا ہے۔ میں ایسا قلزم نہیں ہونے دوں گا۔"

"استاد اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بندہ ناٹک نہیں کر رہا بلکہ وہ آپ ہی کے اسٹائل میں بات کرتا ہے۔ میں نے اس کے گھر والوں اور محلے والوں سے بھی تصدیق کرلی ہے۔"

"کمال ہے۔ ورنہ اس طرزِ شیفتہ کا موجد غم ناک اور وحشت ناک تو صرف میں ہوں۔"

یعنی استاد کو اس بات پر حیرت تھی کہ آخر وہ اس طرح کیوں بولنے لگا ہے جب کہ یہ زبان تو ان ہی کی ایجاد کردہ تھی۔

"استاد اسی لیے تو وہ آپ کو اپنا روحانی باپ سمجھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس حوالے سے آپ کو رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجنا چاہ رہا ہے۔ اس میں تو آپ ہی کی عزت ہے کہ آپ اس کے بزرگ بن کر لڑکی کے گھر جائیں گے۔ آپ کی آؤ بھگت ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں تیار باشد ہوں لیکن اس دراز قد کو بھی ہمراہِ رقیباں ہونا ہوگا۔"

وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استاد چلنے کو تیار تھے لیکن وہ اس نوجوان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

وہ نوجوان اگلی شام پھر استاد کے پاس آ گیا۔ میں نے استاد کی رضامندی اس کے بڑے بھائی تک پہنچادی تھی۔ اسی لیے وہ شاید استاد کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔

"اے عز وجاہ میں خشم گیر ہوں۔" اس نے استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں بری ذاتش تہمت غسن ومملوک عصیاں ہوں۔" استاد نے فرمایا۔

"میں عزیزش جفر سنگ ہوں۔"

"اور میں درستائش خوان عفت ہوں۔" یہ استاد نے کہا۔

استاد اس وقت پورے جاہ وجلال میں تھے اور نہ جانے کہاں کہاں سے الفاظ لا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اس پاگل پن کا جیسے مقابلہ شروع ہوگیا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہونے لگا لیکن ان دونوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ دونوں ہی اپنی جناتی زبان میں لگے ہوئے تھے۔

بالآخر اس نوجوان نے کہا۔ "من شکریہ آنم کہ من دانم ہوں۔ آپ کو جانب لیلی چمن زار دعوت فرقان دینے آیا ہوں۔ آپ حدود واوقات مرتب زینہ فرمالیں تو بندہ سواری معکوس وافناطوس لے کر حاضر ہوجائے گا۔"

یعنی وہ استاد کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان سے یہ درخواست کر رہا تھا کہ استاد یہ بتادیں کہ کس دن اور کس وقت جانا ہے تاکہ وہ سواری لے کر حاضر ہوجائے۔

استاد نے دوسری شام کا وقت دے دیا پھر استاد نے میری طرف دیکھا۔ "تم بھی تو پابہ رکاب دجال ہوگے۔" یعنی تم بھی تو ساتھ چلو گے نا۔

ظاہر ہے میں کس طرح انکار کرسکتا تھا ایک تو خود استاد کی ذات گرامی اور پھر سونے پر سہاگا وہ نوجوان .... لڑکی والوں کے گھر پر جو تماشا ہونے والا تھا، وہ سوچ سوچ کر ہنسی آرہی تھی۔

بہرحال دوسری شام ہم بات طے کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس وقت استاد بازی لے گئے تھے۔ انہوں نے کیا زبردست تیاری کی تھی کہ کچھ نہ پوچھیں۔ گلے میں ایک ہار، کمخواب کی شیروانی زیب تن کی تھی۔ ایک ٹیکسی میں استاد، وہ نوجوان، میں اور اس نوجوان کا معقول بھائی بیٹھے تھے جس کا نام لقمان تھا۔ دوسری ٹیکسی میں ڈھول تاشے والے تھے۔

ہم لڑکی کے گھر سے کچھ فاصلے پر اُتر گئے۔ مکان اچھا

خاصا معقول قسم کا تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں رہنے والے بھی معقول ہی ہوں گے مگر وہ اس نامعقول سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے جارہے تھے۔

استاد نے ڈھول تاشے والوں کو حکم دیا اور انہوں نے پورا محلہ سر پر اٹھالیا۔ محلے کے لوگ گھروں سے نکل نکل کر دیکھنے لگے۔ میں اس وقت بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ رشتے کی بات کرنے کے لیے کوئی کبھی اس انداز سے نہیں آیا ہوگا جس انداز سے ہم لوگ آئے تھے۔

لڑکی والوں کی ہمت اور صبر کی داد دینی پڑی۔ انہوں نے اس طرح کی آمد کا برا نہیں مانا بلکہ بہت خوش اخلاقی سے ہمارا استقبال کیا۔

ہم سب کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھادیا گیا۔ اس کے بعد جو گفتگو شروع ہوئی وہ ایسی وحشت ناک اور انوکھی تھی کہ میں کئی بار ہنس ہنس کر گر گیا۔

سب سے پہلے اس نوجوان نے کہا تھا۔ "منکہ طرابلس کوہ کن وفرہاد بجان ہوکر حاضرِ غلمان ہوا ہوں۔"

اس پر استاد نے تڑکا لگایا۔ "شنیدہ وچکیدہ دارائے فرخ خلل غم بودیے۔"

پھر نوجوان نے کہا۔ "میں کہ خسروان شہروز شادی افروز ہونے آیا ہوں۔"

پھر استاد نے کہا۔ "یہ میرا پسر خوں بہا چوپان وچوگان را کے نکوست مالا بار ہے اور میں دریوزہ گرفتہ تاریخِ ابتلا ہوں۔"

پھر لڑکے نے کہا۔ "اور بہتر یہی ہے کہ مال واسباب بہرام وافراسیاب کی داستان امیر حمزہ ہوجائے۔"

آپ خود غور فرمائیں اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ انتہا یہ ہے کہ خود لڑکی والے بھی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسے جارہے تھے۔

استاد کو ایک دم سے جلال آ گیا۔ انہوں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ "نالائق دل پذیر، تو مال واسباب بہرام اور افراسیاب کی کیا ملوکیت کہہ رہا ہے۔"

آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اشارہ یہ تھا کہ جہیز میں کیا کیا چیزیں ملیں گی اور بس یہیں سے استاد کو جلال آ گیا انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "تم اس دوشیزہ نادان کے گھر والوں کو سمجھادو کہ جو نوجوان ابھی سے طفیان افلاطون اور ستم بریدہ شاخ آہو ہو رہا ہے وہ آئندہ کیا پارسانِ ابتلا دکھائے گا۔"

مطلب یہ کہ لڑکی والوں کو یہ سمجھادوں کہ جو لڑکا ابھی سے مال واسباب پر نظر رکھ رہا ہے وہ آگے چل کر کیا ثابت ہوگا۔

میں نے جب آسان زبان میں لڑکی والوں کو یہ بتایا تو اس لڑکے کا وہ بھائی جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے لڑکے کا گریبان تھام لیا۔ "نالائق کیا تم اس لالچ سے اس گھر میں شادی کر رہے ہو۔ لعنت ہو تم پر میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے دل میں یہ فتنہ چھپا ہوا ہے۔"

اب تو استاد کو ایک طرح کی شہ مل گئی۔ انہوں نے اس لڑکے کو بری طرح ڈانٹنا شروع کردیا۔ "فتنہ برانگیز، ابلیس نابکار، قربان رسید، چکیدی محشر، تو کس قماش بے بہا کا ستم گراں ہے۔ تو پوشیدہ ہے، رنجیدہ ہے، آب ویدہ ہے۔ تو نے اپنی فطرت ظاہر عیاں کردی ہے۔ تو شمشیرِ موج ہے۔ ہمشیرِ بے زبان ہے اور تقدیرِ بے ٹکان ہے۔ اس بچی کی شادی آبادی ہرگز تجھ جیسے افناطوس سے نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تو تیرے بھائی ہیں شریف النفس اور نصف النہار ملک التجار داشند آمد بکار مناسب رہے گا۔"

استاد نے بیٹھے بیٹھے یہ ایک نئی لائن دے دی تھی کہ اس لڑکی کے لیے اس لڑکے کا بھائی مناسب رہے گا۔

اب لڑکی والے اس کے بھائی کو ایک نئے انداز سے دیکھنے لگے۔ یہ سچویشن ایسی تھی کہ خود اس کا بھائی ہکا بکا رہ گیا۔ استاد نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم مرضی تاب وتب سے روح فراز کر کے بتاؤ کہ یہ رشتہ بے مہاراں قبول ہے یا نہیں۔"

اس پر اس کے بھائی نے گردن ہلا دی اور دھیرے سے بولا۔ "آپ فرماتے ہیں اور لڑکی کے گھر والے میرے لیے راضی ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ اس لڑکے کی سٹی گم ہوگئی وہ ذرا سی دیر میں اپنی جناتی زبان بھول گیا۔ "ارے بھائی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کیسے شادی کرلیں گے۔ رشتہ تو میں لے کر آیا ہوں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" لڑکی کے باپ نے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کی شادی تم جیسے لالچی آدمی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ہاں تمہارے بھائی معقول آدمی ہیں ہم ان کے لیے فیصلہ کرسکتے ہیں۔"

یہ لیں استاد نے وہاں پہنچ کر بازی ہی الٹ دی تھی۔ اس نوجوان کے چھکے چھڑوادیے تھے۔ بعد میں اس کے بھائی سے اس لڑکی کی شادی ہوگئی اور وہ نوجوان صاف اردو میں اپنے بھائی کو اور استاد کو برا بھلا کہتا ہوا محلے میں گھومتا رہتا ہے۔

حسرت

جمال دستی

لگی بندھی زندگی کے تسلسل میں تبدیلی ہر شخص کا خواب ہوتا ہے... وہ بھی اپنی زندگی کو ایک نیا موڑ دینا چاہتے تھے... مگر حالات کے ایک ہی تھپیڑے نے ان کی زندگی کا رخ اس جانب موڑ دیا... جہاں سے کوئی راستہ... کوئی خواہش باقی نہیں رہتی...

ایک خونی اٹیچی کیس کی تلاش وجستجو کا دلخراش معما

شام کے وقت ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں جنگل کے درختوں پر ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں۔ ہیلی کوپٹر گڑگڑاتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں طیارے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ کاسل نے کوپٹر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ قریبی پہاڑی کے پیچھے ٹرانس امریکن ائرویز کی پرواز نمبر 937 کے طیارے کا ملبا بکھرا پڑا تھا۔ ہیلی کوپٹر تھوڑی سی دیر میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں طیارے کے پائلٹ نے گڑبڑ محسوس کر کے نزدیکی ائرپورٹ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ طیارے کے دونوں بازو اب بھی ڈھانچے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور بلندی سے واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

درختوں اور پودوں کے درمیان زمین پر ایک لکیر سی بن گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ طیارہ وہاں گرنے کے بعد کافی فاصلے تک گھسٹتا چلا گیا تھا۔ طیارہ ایک خشک نالے کے قریب گرا تھا مگر اس میں جانے سے بچ گیا تھا ورنہ اس تک پہنچنا دشوار ہو جاتا۔

طیارے کے ڈھانچے کے قریب سبز، سفید اور نیلے نقطے سے جمع تھے اور حرکت بھی کر رہے تھے۔ کاسل جانتا تھا کہ سبز نقطے دراصل فوج کے باوردی جوان ہیں اور سفید نقطے حقیقت میں طبی عملے کے افراد ہیں جو سفید وردیاں پہنے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ نیلی وردی پولیس والوں کی ہو سکتی ہے!

جلے ہوئے اس طیارے کے ملبے میں کہیں نہ کہیں ایک شخص کی لاش کے قریب ایک اٹیچی کیس کا پایا جانا ممکنات میں سے تھا۔ کاسل اس اٹیچی کیس کو تلاش کرنے آیا تھا کیونکہ اس میں ملک کے خفیہ کاغذات تھے۔ اندیشہ تھا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائیں۔

وہ شخص جو یقیناً اب مر چکا ہوگا، سان فرانسسکو سے اس طیارے میں سوار ہوا تھا اور اسے نیویارک تک جانا تھا مگر طیارے کو حادثہ پیش آنے کی وجہ سے وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ اب اس شخص کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لیکن اٹیچی کیس بہرحال اہمیت رکھتا تھا۔

چار گھنٹے پہلے وہ واشنگٹن میں خفیہ ایجنسی کے آفس میں ایک میز کے سامنے کھڑا تھا جس کے پیچھے اس کا باس بیٹھا اسے کیس کی جزئیات سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ ریٹائر ایڈمرل ولیم کارلسلی تھا۔ پستہ قامت، گنجا اور سرخ چہرے والا... غصہ جس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔

دورانِ گفتگو ہدایات دیتے وقت وہ تیزی سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس کی وردی کی آستینوں پر سنہری دھاگے سے کڑھائی کی گئی تھی جو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

''اس حادثے کے چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اس طیارے کو تلاش کیا جا سکا ہے۔'' ایڈمرل کہہ رہا تھا۔ ''ابھی آدھے گھنٹے پہلے اس کی اطلاع ملی ہے۔ پنسلوانیا میں کوئی جگہ اسکوبرٹ ہے... وہاں یہ حادثہ پیش آیا ہے۔ پنسلوانیا کی پولیس کا کہنا ہے کہ حادثے میں کوئی شخص زندہ نہیں بچا ہے لہٰذا یقینی طور پر ہمارا ایجنٹ کربی بھی مر چکا ہے۔ ہرچند کہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے لیکن اسے مردہ تصور کر لینا چاہیے۔ اس کے مرنے کے بعد بہرحال اس کی نہیں، اس اٹیچی کیس کی اہمیت باقی رہ جاتی ہے جس میں خفیہ کاغذات تھے۔ اگر ہم اسے تلاش نہیں کر سکے اور وہ دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا تو پھر بحرِ اوقیانوس میں ہمارے بیشتر پراجیکٹس بند ہو جائیں گے اور دفاعی نقطۂ نظر سے ہمیں شدید نقصانات پہنچنے کا احتمال ہے۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کاغذات جل کر راکھ ہو گئے ہوں۔'' کاسل نے کہا۔

''نہیں۔ وہ اٹیچی کیس ایک خاص دھات سے بنا ہوا ہے جس پر آگ اثر نہیں کرتی۔ اسے کیلی فورنیا میں لاک کیا گیا تھا اور اس کی دوسری چابی میری تحویل میں ہے۔ اگر وہ اٹیچی کیس طیارے کے ملبے میں مل جائے گا تو اس کے کاغذات محفوظ ہوں گے۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔

''ایڈمرل! تم نے اس سلسلے میں ''اگر'' کا لفظ کیوں

استعمال کیا؟ کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ اس اٹیچی کیس کے پیچھے کچھ اور لوگ بھی ہوں گے؟''

ایڈمرل نے اپنی میز پر رکھے ہوئے لکڑی کے ڈبے سے ایک سگار نکال کر سلگایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ''سیکیورٹی کے عملے کا خیال ہے کہ کچھ لوگ سان فرانسسکو ہی سے کربی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ اس سے کاغذات حاصل کر لیں۔''

''تو کیا طیارے کو حادثہ پیش نہیں آیا ہے، وہ کسی سازش کے تحت وہاں گرایا گیا ہے؟'' کاسل نے چونک کر پوچھا۔

''اس بارے میں انہیں یقین نہیں ہے۔'' ایڈمرل کارلسلی نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ طیارے سے کوئی ریڈیو سگنل موصول نہیں ہوا ہے۔ اس قسم کی سازش تیار کرنا کوئی دشوار نہیں ہے۔ طیارے میں خفیہ طور پر ایک بم چھپا کر رکھنا پڑتا ہے جو مقررہ وقت پر پھٹ جاتا ہے۔''

''کسی ایک شخص پر قابو پانے یا چند کاغذات حاصل کرنے کے لیے دو سو افراد کو ہلاک کر دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سازش نہیں ہو سکتی۔'' کاسل نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی۔

''بہتر ہوگا کہ ہمارا کوئی ایجنٹ وہاں تیز رفتاری سے پہنچ جائے۔'' ایڈمرل نے کہا۔

''کیا وہ ایجنٹ میں ہوں؟'' کاسل نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس مشن کے لیے ہمیں ایک تجربہ کار ایجنٹ کی ضرورت ہے اور تم سے بہتر ایجنٹ ہمیں اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ ایک طیارہ تمہیں ڈیلاس ائرپورٹ سے انڈین ٹاؤن تک پہنچا دے گا۔ اس کے بعد تمہیں ایک ہیلی کوپٹر جائے حادثہ تک پہنچا دے گا۔ ہم نے ملٹری سے رابطہ کر کے کہہ دیا ہے کہ وہ طیارے کی نگرانی کرے۔''

''میں کب پرواز کروں گا؟''

''اب سے تھوڑی دیر بعد۔'' ایڈمرل نے کہا۔ ''وہ جیٹ طیارہ جو تمہیں یہاں سے لے جائے گا، ہینگر سے نکل آیا ہے اور رن وے پر کھڑا ہے۔ تمہیں اس تک کم سے کم وقت میں پہنچنا ہے۔''

''اور کوئی خاص بات جناب؟''

''ہاں۔ فضائی کمپنی کے کاغذات چیک کرنے کے بعد پتا چلا ہے کہ کربی طیارے کی چوبیسویں نشست پر فرسٹ کلاس میں بیٹھا تھا۔ اپنی تحقیقات وہاں سے شروع کرو اور مجھے رپورٹ دو۔''

کاسل سیلیوٹ کر کے دروازے کی طرف بڑھا تو ایڈمرل نے پیچھے سے کہا۔ ''اگر وہ اٹیچی کیس وہاں موجود ہوا تو ممکن ہے کہ دوسری ایجنسیاں اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ایسے موقع پر تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ تم پر کوئی سبقت نہ لے سکے۔''

جب ہیلی کوپٹر حادثے کی جگہ پر اترنے لگا تو کاسل کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگا جہاں پولیس اور ملٹری کے بہت سے جوان کھڑے تھے۔ طبی امداد پہنچانے والا عملہ ان کے علاوہ تھا۔

وہ لوگ دو ہیلی کوپٹروں میں وہاں تک پہنچے تھے جو قریب ہی کھڑے تھے۔ وہ لاشیں جو کچھ بہتر حالت میں تھیں، انہیں ملٹری کے جوانوں نے کمبلوں میں لپیٹ دیا تھا۔ ہیلی کوپٹر زمین سے ٹک گیا تو کاسل کوپٹر کا دروازہ کھول کر اتر آیا۔ مرنے والوں کی لاشیں دیکھ کر اسے صدمہ ہوا تھا۔

جب وہ آگے بڑھا تو انفنٹری کے ایک لیفٹیننٹ نے اس کا استقبال کیا اور پوچھا۔ ''کیا تم مسٹر کاسل ہو؟''

''ہاں۔'' کاسل نے کہا اور پھر اسے اپنا شناختی بیج نکال کر دکھایا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے ٹام لارنز کہتے ہیں۔ ہیڈ کوارٹر نے ریڈیو پر یہ اطلاع دی تھی۔ اس

لیے میں تم سے ملنے کے لیے تیار تھا۔''

لیفٹیننٹ غالباً وہاں دیر سے موجود تھا اور تحقیق و تفتیش میں حصہ لے رہا تھا اس لیے اس کی وردی گرد آلود تھی اور پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔

''میرا خیال ہے طیارے کے ملبے تک چلا جائے۔ اس لیے کہ سورج غروب ہونے والا ہے اور تاریکی پھیلنے والی ہے۔'' ٹام نے کہا۔

جہاں طیارہ گرا تھا، اس جگہ کو چاروں طرف سے کپڑے کی پٹی لگا کر سیل کر دیا گیا تھا۔ ''کیا حادثے کے بعد کوئی مسافر زندہ بچا ہے؟'' کاسل نے پوچھا۔

''نہیں۔ کوئی مسافر طیارے سے باہر نہیں نکل سکا اس لیے زندہ بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔'' ٹام نے جواب دیا۔

''طیارے کا ملبا کس نے سب سے پہلے دیکھا تھا؟''

''پولیس نے طیارے کو فضا میں قلابازیاں کھاتے اور اس کی دم سے سیاہ کثیف دھواں نکالتے دیکھا تھا، اس لیے وہ سب یہاں پہنچ گئے۔ طیارہ گر چکا تھا اس لیے انہوں نے درختوں کے گرد کپڑے کی پٹیاں باندھ کر اسے ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا۔''

''کچھ پتا چلا کہ یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟''

''سول ایروناٹک بورڈ کا عملہ اس کی تحقیق کر رہا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی بات سامنے آسکے گی۔'' ٹام بولا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے طیارے تک پہنچ گئے۔ طیارہ قدرے نشیبی جگہ پر گرا تھا اس لیے ایک لمبی سیڑھی لگا دی گئی تھی۔

''اب تک طیارے کی اکانوی کلاس سے لاشیں نکالی جا چکی ہیں۔'' ٹام نے بتایا۔ ''اس گرم موسم میں یہ ایک جان لیوا کام ہے۔ ممکن ہے سورج غروب ہونے کے بعد یہ کام آسان ہو جائے اس لیے کہ ہیڈ کوارٹر سے فلڈ لائٹس اور ایک جنریٹر یہاں لایا جا رہا ہے۔''

''میں طیارے کے اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''اندر دھواں اور گیسیں ہیں اس لیے تمہیں باہر کھڑے ہو کر گہرے گہرے سانس لینا ہوں گے تاکہ تمہارے پھیپھڑوں میں بہت سی تازہ ہوا بھر جائے۔'' ٹام نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' کاسل نے کہا اور اس کی ہدایت پر عمل کیا پھر وہ ٹام کے ساتھ سیڑھی اتر کر نیچے گیا۔

کاسل ہر چند کہ سول لباس میں تھا مگر وہ لیفٹیننٹ ٹام کے ساتھ تھا اس لیے وہاں موجود لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کوئی اہم شخص ہے۔

جب چند لاشیں وہاں سے اور نکالی جا چکیں تو کاسل اندر چلا گیا۔ ٹام اس کے پیچھے تھا۔ وہ اندر زیادہ آگے جا رہا تھا کہ ٹام نے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو کاسل؟''

''فرسٹ کلاس میں۔'' کاسل نے جواب دیا۔ طیارے کی چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور کئی جگہوں سے راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی آڑی کرنیں کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھیں اس لیے وہاں تاریکی نہیں تھی۔

فرسٹ کلاس میں پہنچتے ہی کاسل نے نشستوں کی گنتی شروع کر دی۔ چوبیسویں نشست پر جو شخص موجود تھا اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ کاسل نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر تقریباً چھتیس سال تھی۔ سر کے بال بھورے اور چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ اس کی گردن میں کسی دھار دار چیز سے زخم لگا تھا اس لیے گردن سے خون نکل کر خشک ہو چکا تھا۔ لاش کی آنکھیں کھلی تھیں اور کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ کاسل نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

''یہ تمہارا آدمی ہے؟'' ٹام نے سوال کیا۔ ''ایجنسی کا سیکرٹ ایجنٹ؟''

''ہاں۔'' کاسل نے کہا پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

''تم کیا تلاش کر رہے ہو؟'' ٹام نے چونک کر پوچھا۔ ''تمہیں یہاں سے کیا ملنے کی توقع ہے؟''

''مجھے ایک اٹیچی کیس کی تلاش ہے جو بے حد قیمتی ہے۔ اتنا بڑا ہوگا۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے۔''

''کیا تم اخباری رپورٹر ہو؟'' پیچھے سے ایک بھاری حاکمانہ آواز نے پوچھا۔

''نہیں۔'' کاسل نے آواز کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''اور تم؟''

''یہ مسٹر پیان ہیں اور ان کا تعلق سی اے بی سے ہے۔'' ٹام نے نووارد کا تعارف کرایا۔

کاسل نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' پیان نے کارڈ کو غور سے دیکھ کر اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی غلط فہمی کی معافی چاہتا ہوں مگر تمہارا انداز رپورٹروں جیسا تھا۔ میں نے سختی سے حکم دے رکھا ہے کہ جب تک میں اور میرے آدمی اپنی تحقیقات مکمل نہ کر لیں، یہاں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔''

''اب تک کی تحقیقات کیا ہیں؟''

''طیارہ ایک سازش کے تحت زمین بوس ہوا ہے۔ اس میں ایک ٹائم بم تھا جو اس علاقے میں آ کر پھٹ گیا۔ یہ کسی

پیشہ ور کا کام ہے۔''

''ایسی حرکت کون کر سکتا ہے؟'' لیفٹیننٹ نے بھویں سکیڑ کر کہا۔

''ممکن ہے وہ کوئی دیوانہ ہو۔'' پیان نے کہا۔ ''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون تھا؟''

کاسل نے لیفٹیننٹ کے ساتھ مل کر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی اچھی طرح تلاشی لی لیکن وہ اٹیچی کیس کہیں نہ ملا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو ٹام باہر سے دو سرچ لائٹیں لے آیا۔ انہوں نے سرچ لائٹوں کی روشنی میں ایک بار پھر تلاشی لی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

کاسل نے ایڈمرل کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کی داد دی کہ وہ اتنی دور بیٹھا ہوا انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔

کربی کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد پتا چلا کہ اس کی بائیں کلائی پر ایک سفید سا نشان ہے۔ ایسا نشان عموماً گھڑی پہننے سے بن جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی گھڑی کسی نے اتار لی ہے۔ اس لیے کہ اگر طیارے کے کریش کے دوران گھڑی ٹوٹی ہوتی تو اس کے ٹکڑے نشست کے نیچے ہی گر جاتے۔

اس نے لیفٹیننٹ ٹام سے پوچھا کہ وہاں پر موجود جو لاشیں باہر لے جائی گئی ہیں، ان کی قیمتی چیزیں مثلاً نقدی، گھڑیاں، عورتوں کے زیورات وغیرہ کہاں ہیں؟

جب ٹام وہاں سے چلا گیا تو کاسل نے سب سے پہلے کربی کا پرس چیک کیا۔ اس کی جیب میں پرس تھا لیکن اس میں رقم نہیں تھی۔ دوسری جیب کی تلاشی لینے پر پتا چلا کہ سگریٹ پیکٹ تو ہے مگر لائٹر نہیں ہے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر طیارے سے باہر آ گیا۔ ہوا تازہ اور خنک تھی۔ اس نے ٹام کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے اچھی طرح سے پھیپھڑوں میں بھر لیا۔

لیفٹیننٹ ٹام تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ ''حیرت انگیز!'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ''میرے آدمیوں نے لاشوں کو اچھی طرح سے چیک کر لیا ہے۔ ان کی تمام قیمتی چیزیں غائب ہیں۔ کسی کے پاس بھی نقدی، گھڑیاں یا زیورات نہیں ہیں۔ اس بات سے تم کس نتیجے پر پہنچے؟''

''کسی کمینے اور اچکے کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔'' کاسل نے کہا۔ ''جب ابتدا میں مجھے اٹیچی کیس نہیں ملا تھا تو میں ان خطوط پر سوچنے لگا کہ ممکن ہے کہ کچھ اور پارٹیاں اس میں دلچسپی لے رہی ہوں لیکن جب یہ احساس ہوا کہ مرنے والوں کی ساری قیمتی چیزیں اور نقدی غائب ہے تو مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا اور میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ یہ کسی لٹیرے کا کارنامہ ہے جس نے طیارے کے گرتے ہی اس کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کیا پھر مردہ مسافروں کو لوٹ لیا۔''

''ہوں۔'' ٹام نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بات سمجھ میں آتی ہے۔''

''یہاں کوئی ایسا شخص مل جائے گا جو اس علاقے سے واقف ہو؟''

''چند پولیس آفیسر اس علاقے سے واقف ہیں۔''

''آؤ، ان کے پاس چلتے ہیں۔''

جائے حادثہ کے چاروں طرف کاربن، سرچ لائٹس لگا کر اسے روشن کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ صبح سے کام کر رہے تھے، ان کی جگہ نیا عملہ آ گیا تھا۔ فضا میں گاہے گاہے کسی ہیلی کوپٹر کی گڑگڑاہٹ سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی آیا ہے یا پھر کوئی واپس جا رہا ہے۔

لیفٹیننٹ ٹام جب کاسل کو تھوڑے فاصلے پر پولیس کیمپ میں لے گیا تو وہاں دو پولیس والے ٹین کے کپوں میں چائے پیتے دکھائی دیے۔ وہ لکڑی کی بینچ پر بیٹھے تھے۔ لیفٹیننٹ کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ ٹام نے کاسل کا ان لوگوں سے تعارف کرایا۔

''تم لوگ اس علاقے سے بہ خوبی واقف ہو؟'' کاسل نے دراز قامت سارجنٹ سے پوچھا۔

''جی ہاں جناب! میں اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ یہیں پلا بڑھا ہوں۔''

''یہاں نزدیک ہی کوئی آبادی ہے؟''

''اس پہاڑی کے پیچھے فارموں میں چند چرواہے رہتے ہیں۔'' سارجنٹ نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''بس وہی ہیں، ورنہ گاؤں اور قصبے کافی دور ہیں... مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ کسی مقامی شخص نے طیارے میں داخل ہو کر مردوں کو لوٹا ہے۔ اب ان کے پاس کوئی بھی قیمتی چیز نہیں رہ گئی ہے۔''

''حیرت کی بات ہے!''

''میں ان فارموں کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''ہمیں مختلف ٹولیوں میں بٹ جانا چاہیے تاکہ ہم کم وقت میں سارے فارموں کو چیک کر لیں۔'' کاسل نے کہا۔

''مگر ہم ان نزدیکی فارموں تک کیوں جا رہے ہیں؟ وہاں ایسی کیا بات ہے؟ کیا تم اس لٹیرے کو تلاش کرنے جا رہے ہو؟''

کاسل نے اسے بتایا کہ اسے ایک اٹیچی کیس کی تلاش ہے جو اگر امریکا کے دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا تو دفاعی لحاظ

سے انہیں زبردست دھچکا پہنچنے کا احتمال ہے۔

سارجنٹ نے اسے جائے حادثہ اور نزدیکی فارموں کا خاکہ بنا کر دکھایا۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ''ان دو فارموں کو میں اور میرے ساتھی دیکھ لیں گے اور تم تیسرے کی تلاشی لینا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ یہ مناسب رہے گا۔'' کاسل نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر اس نے لیفٹیننٹ ٹام کی طرف مڑ کر کہا۔ ''اگر ہم ڈیڑھ گھنٹے میں واپس نہ آئیں تو پھر تم مقامی پولیس کو آگاہ کر دینا۔ آؤ، اب چلتے ہیں سارجنٹ!''

اس کی درخواست پر اسے ایک فلیش لائٹ دے دی گئی تھی۔ جب وہ سارجنٹ کی راہنمائی میں پہاڑی سے اتر رہا تھا تو اس نے اپنی کمر میں لگے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور اس کا چیمبر چیک کیا۔ وہ لوڈ تھا اور اس کی چھ گولیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس فارم کے قریب پہنچ گئے۔ اس کے ایک جانب چھوٹا سا کمرا بنا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کاسل کھڑکی کے راستے اندر چلا گیا۔ اندر ایک کیروسین لیمپ روشن تھا۔ کمرے کے فرش پر ایک بوسیدہ سا قالین بچھا تھا اور دائیں جانب گرد آلود صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ اس سے مخالف سمت میں طیارے سے لایا ہوا قیمتی اثاثہ پڑا تھا۔

کمرے کے وسط میں ایک میز تھی جس کے سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی اور وہ میز پر رکھے مضبوط اٹیچی کیس کو ایک اسکریو ڈرائیور سے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آہٹ ہونے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''لڑکی! تم اس اسکریو ڈرائیور سے ساری زندگی اس اٹیچی کیس کو نہیں کھول سکتیں۔''

لڑکی کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کاسل کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور لاشعوری طور پر اس کی گرفت اسکریو ڈرائیور پر مضبوط ہو گئی تھی... جیسے وہ کوئی خنجر ہو!

وہ گداز بدن والی لڑکی تھی جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور چہرے کی رنگت سفید۔ اس کا قد لمبا تھا اور بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہ چھوٹی آستینوں والا بلاؤز پہنے تھی۔ اس کا اسکرٹ چھوٹا تھا اس لیے کاسل اس کی گداز ٹانگوں کا کئی بار جائزہ لے چکا تھا۔ وہ برہنہ پا تھی۔

''تم کون ہو؟'' اس نے وحشت سے کہا۔

''مجھے کاسل کہتے ہیں۔ میں اس طیارے کی طرف سے آیا ہوں جو پہاڑی کی دوسری طرف گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ اور تم کون ہو؟''

''جینی پیٹرز!''

''کیا تم یہاں تنہا رہتی ہو؟''

''نہیں۔ میں یہاں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

''وہ طیارے کی طرف گئے ہیں مگر جلد لوٹ آئیں گے۔'' اس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ کاسل کو دھمکی دے رہی ہو۔ ''تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''میں اس اٹیچی کیس کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے میز پر رکھے ہوئے اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کیا جسے لڑکی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا تم پولیس والے ہو؟''

''نہیں۔'' کاسل نے کہا۔ ''مگر میں جن لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں، یہ کیس ان سے تعلق رکھتا ہے۔''

لڑکی نے اسکریو ڈرائیور کو میز پر پھینک دیا جو آواز کے ساتھ گرا پھر وہ بے جان سی ہو کر اسی کرسی پر گر گئی جس پر تھوڑی دیر پیشتر بیٹھی تھی۔ ''میں نے ڈیڈی کو منع کیا تھا کہ تباہ شدہ طیارے سے کوئی چیز نہ نکالیں۔ یہ خلاف قانون ہے مگر انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ میں جانتی ہوں کہ اب انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔'' اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔

کاسل نے دوسری کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کیروسین لیمپ کی روشنی کم تھی اور تاریکی اس پر غالب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

''اس کے بارے میں بتانے والی کون سی بات ہے؟'' وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ''ہم نے طیارے کو گرتے دیکھا اور دھماکے کی آواز سنی تو اس طرف گئے۔ حیرت انگیز طور پر اس میں آگ نہیں لگی تھی لیکن وہ چونکہ بلندی سے گرا تھا چنانچہ اس کے سارے مسافر ہلاک ہو گئے۔ ڈیڈی نے مسافروں کی قیمتی چیزیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ ان دنوں زراعت کی حالت اچھی نہیں ہے، کھیتوں سے زیادہ غلہ حاصل نہیں ہو رہا ہے اس لیے لوگوں نے اس میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ ہم اس رقم سے کچھ مزید زمین اور بیج خرید کر نئے سرے سے کام شروع کریں گے تو شاید پیداوار میں کچھ اضافہ ہو جائے۔''

اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے اور اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ''وہ برے آدمی نہیں ہیں۔ بس کبھی کبھار پی لیتے ہیں۔ اگر انہوں نے کھیت کی پیداوار بڑھانے کے لیے چھوٹی سی چوری کر لی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟''

''دیکھو جینی! تم اور تمہارے ڈیڈی کو چاہیے کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اسی میں بہتری ہے۔''

''کیا بہتر ہے اور کیا نہیں... یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' پیچھے سے ایک آواز آئی۔

کاسل نے بے ساختہ اس طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک تندرست و توانا شخص تھا جس نے نیلی ڈانگری پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر گریس کے نشانات تھے۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے اس کی آنکھیں دھندلی سی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن دبی ہوئی تھی اور نال کا رخ کاسل کے چہرے کی طرف تھا!

لڑکی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے اپنے باپ کی جانب چلی گئی۔ ''تم کب آئے؟ میں نے گاڑی کی آواز نہیں سنی!''

''میں نے ٹرک کو آج کچھ فاصلے پر روکا ہے۔ جب میں جائے حادثہ سے واپس آ رہا تھا تو میں نے پگڈنڈی سے دو پولیس والوں کو فارم کی طرف آتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا یقیناً میرے فارم پر بھی کوئی نہ کوئی ہو سکتا ہے۔ یہ کون ہے؟'' اس نے اپنی شاٹ گن ہلا کر پوچھا۔

''اس کا نام کاسل ہے۔ یہ وہاں سے آیا ہے جہاں طیارہ گر کر تباہ ہوا ہے۔ غالباً کوئی بڑا پولیس آفیسر ہے۔ اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ ڈیڈی! اپنی گن نیچے کر لو۔ تم کیا کرنے جا رہے ہو؟ اگر تم نے گولی چلا دی تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

جب اس کے باپ نے گن کاسل کی طرف سے نہیں ہٹائی تو لڑکی نے گن اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کی یہ کوشش بھی ناکام بنا دی اور اس سے دور ہو گیا۔

''جینی! گڑبڑ نہ کرو۔ ہم کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہونے جا رہے ہیں۔ بس، مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔''

کاسل نے اس کی بھرائی ہوئی آواز سے اندازہ لگا لیا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے تک شراب پیتا رہا ہے۔ ممکن ہے وہ قریبی گاؤں دیہات کی طرف گیا ہو اور کسی شراب خانے میں بیٹھ کر اس نے شراب پی ہو۔ ''پیٹرز! تمہاری بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بندوق میری طرف سے ہٹا لو۔ پھر ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔'' کاسل نے کہا اور غیر محسوس طور پر وہ اس کی طرف گھوم گیا تاکہ اگر اس پر چھلانگ لگانا پڑے تو وہ اسے پہلے ہی ہلے میں زیر کر لے۔

''نہیں۔ میں گن کی موجودگی میں بات کروں گا۔'' اس نے ترش لہجے میں کہا۔ ''میں پچیس سال سے ان کھیتوں میں کام کر رہا ہوں۔ پہلے پیداوار زیادہ تھی اور حالات اچھے تھے مگر پھر روز بہ روز سب کچھ خراب ہوتا چلا گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ میں اس کے لیے اچھا باپ ثابت نہیں ہو سکا۔'' اس نے اپنی لڑکی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں بہرحال اس کی آئندہ زندگی کے لیے منصوبہ بندی کر رہا ہوں۔ طیارے سے حاصل ہونے والی چیزوں کو فروخت کر کے میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

دفعتاً ایک فائر ہوا۔ گولی اس کھڑکی کی طرف سے آئی جس سے کاسل وہاں داخل ہوا تھا۔ گولی پیٹرز کے سینے میں لگی، وہ لڑکھڑایا اور فرش پر گر گیا۔ شاٹ گن اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ لڑکی نے ایک چیخ ماری اور اپنے باپ کے بدن پر گر گئی۔

کاسل نے کرسی پیچھے کھسکائی اور چھلانگ لگا کر لڑکی کے قریب پہنچ گیا تاکہ تاریکی کی طرف سے آنے والی دوسری گولی سے اسے بچا سکے۔

وہ اس کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولا گیا اور پھر درمیانے قد کا ایک پھرتیلا سا شخص اندر آیا اور اس نے گونجیلی آواز میں کہا۔ ''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔''

کاسل کو اس پر دوسری بار نگاہ ڈالنے کا موقع ملا تو اس نے دیکھا کہ نووارد کا چہرہ عقابی ہے اور اس کی آنکھیں بہت چمکیلی ہیں۔ اسی لیے اس نے اتنے فاصلے سے بالکل ٹھیک نشانہ لگا لیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں لمبی نال کا ایک میگنم ریوالور تھا جس کی نال اب کاسل کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔'' وہ بولا۔ ''اور تم...'' اس نے لڑکی کو اس کے باپ کی لاش سے کھینچ کر علیحدہ کیا۔ ''دوسری طرف جا کر کھڑی ہو جاؤ۔''

جب وہ دونوں الٹے قدموں چلتے ہوئے دیوار تک پہنچ گئے تو اس شخص نے جھک کر پیٹرز کو ٹٹولا پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔

''تم نے اسے ہلاک کیا ہے۔''

''یہ ابھی مرا نہیں ہے۔'' نووارد نے کہا۔ ''مگر بہرحال، تھوڑی دیر بعد مر جائے گا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' کاسل نے پوچھا۔ ''اس بوڑھے کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہی جس کے لیے تم یہاں آئے ہو نوجوان... کربی کے کاغذات!'' اس نے لاابالی پن سے کہا۔

''کیا تم ہی لوگوں نے اس طیارے کو اڑایا ہے؟''

''ہاں۔ مگر ٹائم بم تین منٹ تاخیر سے پھٹا اس لیے ہماری

مطلوبہ جگہ پر نہیں گرا۔ میں طیارے کے قریب کافی دیر سے پہنچا اس لیے کوئی مجھ سے پہلے ساری چیزیں لے اڑا۔ اس احمق کسان نے تو میرا مشن ناکام بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''بہر حال، اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور طیارے سے لائی جانے والی قیمتی چیزیں اور اٹیچی کیس دیکھ لیا۔

اس نے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے بریف کیسوں کو اٹھایا اور میز پر اٹیچی کیس کے برابر رکھ دیا۔ اس کے ریوالور کا رخ بہ دستور ان دونوں کی طرف تھا۔ اس نے اٹیچی کیس کو کھولنا چاہا لیکن ناکام رہا۔

''اوکے اسمارٹ لڑکے!'' اس نے کاسل سے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ کاغذات کس میں ہیں؟''

''معلوم نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو کاغذات کا پتا نہیں ہے۔ کون سے کاغذات؟''

''معصوم اور سادہ لوح بننے کی کوشش نہ کرو، ورنہ میں لڑکی کو گولی مار دوں گا۔''

''اگر تم اسے گولی مار دو گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں لڑکے!'' وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''پہلے میں لڑکی کی ٹانگ پر گولی ماروں گا اس کے بعد بہ تدریج بدن کے اوپری حصوں پر فائر کروں گا۔ یہ لڑکی اتنے ہولناک انداز میں چیخے گی کہ تمہارے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔'' اس نے کاسل کو اپنے ظالمانہ منصوبے سے آگاہ کیا۔

کاسل کو اس کی آمد پر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ دشمن طاقتوں کا ایجنٹ ہے اور اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سفاکی دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کر بیٹھے گا۔ وہ پیشہ ور قاتل تھا۔ اسے اٹیچی کیس ہی نہیں بلکہ لڑکی کو بھی موت کے منہ میں جانے سے بچانا تھا! یہ اسے معلوم تھا کہ وہ پولیس والے جو ملحقہ فارموں کی تلاشی لے رہے ہیں، گولی چلنے کی آواز سن کر ادھر ضرور آئیں گے۔ کاسل کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ نووارد اسے گولی مار دے گا کیونکہ یہ تو اس کے فرائض کی بجا آوری کا ایک حصہ تھا لیکن لڑکی بے گناہ تھی۔ وہ اسے ہلاک ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا؟

وہ کاغذات بھی اپنی جگہ پر اہم تھے اور ان کی اہمیت سے ایڈمرل اسے تفصیلی طور پر آگاہ کر چکا تھا۔ اسے ہر حال میں اٹیچی کیس دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے سے روکنا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کے لیے کیا طریقۂ کار اپنایا جا سکتا ہے؟ اس نے لڑکی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ لڑکی بہت خوف زدہ تھی اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اضطراب سے مل رہی تھی۔ اس کا باپ موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور اب وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، گولی چلاؤ۔ میں اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔'' کاسل نے کہا۔

نووارد نے لڑکی کی رانوں کا نشانہ لے لیا اور ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، فرش پر پڑے ہوئے بوڑھے کو ہوش آ گیا اور وہ کراہا۔

نووارد نے لڑکی پر فائر کرنے کا ارادہ ایک لمحے کے لیے ملتوی کر دیا اور شاید یہ سوچا کہ پہلے بوڑھے کا قصہ ختم کر دیا جائے۔ اس نے گھوم کر پیٹرز پر ایک اور فائر کر دیا۔

کاسل کے لیے یہ لمحاتی وقفہ بہت تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال لیا اور فائر کر دیا۔ نووارد، پیٹرز پر فائر کرنے کے بعد کاسل کی طرف پلٹ ہی رہا تھا کہ کاسل کے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر لگی۔

نووارد کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور گر گیا۔ وہ خود چند لمحوں تک کھڑا جھومتا رہا پھر ''دھب'' سے فرش پر گر پڑا۔

کاسل نے بڑھ کر کیروسین لیمپ اور پھر اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کی طرف گیا جو اپنے باپ کی لاش پر جھکی ہوئی تھی۔ پیٹرز کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے زندگی کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔

کاسل نے لیمپ کو فرش پر رکھ دیا اور لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ طیارے سے ساری چیزیں یہاں نہ ... لاتا تو موت اس کے قریب نہ آتی اور یہ زندہ رہتا۔''

''ڈیڈی اپنی زندگی کو ایک نیا موڑ دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک ایسا قدم اٹھا لیا جو انہیں تاریکی میں لے گیا۔ زندگی کو کوئی نیا موڑ تو نہ ملا بلکہ وہ زندگی ہار بیٹھے ... مگر تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔ اس لیے کہ تمہاری کمر سے ہر وقت ایک آتشیں ہتھیار لٹکتا رہتا ہے اور تم اسی کی زبان سمجھتے ہو۔ زندگی کے لطیف جذبوں کا تمہیں کیا پتا؟''

کاسل نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اس نے ساری زندگی خاک و خون کا کریہہ کھیل ہی کھیلا ہے۔ وہ ایسی راہوں پر چل رہا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ ''ہاں، مجھے کچھ پتا نہیں ہے ... کچھ پتا نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور وہاں سے نکل آیا۔

قیمتی کاغذات کا اٹیچی کیس اس کے دائیں ہاتھ میں جھول رہا تھا۔

عقل کا اندھا

محمد عفان آزاد

وقت اور فاصلے کے ہندسوں کو بدلتے ہوئے ... اپنی آنکھوں میں اترتے ہوئے ... خواب بنتے ہوئے اور پھر بکھر کر ٹوٹتے ہوئے دیکھنا ... ان دونوں میاں بیوی کی زندگی کا محور بن چکا تھا ... برسوں سے ساکت و جامد روز و شب کے تسلسل زندگی کو بدلنے کا انہیں اچانک ہی ایک نادر موقع میسر آگیا ... اور وہ کچھ ہو گیا ... جس کا تصور کرنا بھی محال تھا ...

زندگی کو نیا رنگ و آہنگ دینے والے دلفریب لمحات کا پر تجسس احوال

ہر روز کی طرح اس صبح بھی میں سستے بازار سے گھریلو استعمال کی چیزیں خرید کر گھر لوٹا۔ سیدھا کچن میں گیا، سبزیاں وہاں رکھیں اور لیونگ روم میں داخل ہوا۔ اسٹیفنی وھیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری شادی تیس برس پہلے ہوئی تھی مگر اب بھی میرے لیے وہ محبوبہ ہی تھی۔ اُس نے زرد رنگ کا بہت خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ لباس اُس نے دس سال پہلے خریدا تھا مگر اب بھی وہ اسے فٹ

تھا۔ اُس کے برابر، میرے پسندیدہ صوفے پر معزز شکل و صورت کا ایک اجنبی مرد بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے نہایت عمدگی سے بال سنوارے ہوئے تھے۔ اُس کے پالش شدہ سیاہ جوتے چمک رہے تھے۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ میری پہلی نظر اُس پر پڑی تو حیران رہ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے میری حیرانی پریشانی میں بدل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک میں آٹو میٹک پستول تھا جس کی نال کا رخ اسٹیفنی کی طرف تھا۔ میرے ہاتھ میں پلاسٹک کے دو بڑے تھیلے تھے۔ اُن میں کچھ کپڑے اور اسٹیفنی کے لیے جوتوں کی ایک جوڑی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا... وہ حواس باختہ کردینے کے لیے کافی تھا۔ میرے ہاتھ سے دونوں تھیلے چھوٹ کر فرش پر گر پڑے۔ میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ خود بخود سر سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ وہ کون ہے، کیا چاہتا ہے مگر ایسا لگا جیسے الفاظ منہ میں ہی گھٹ کر رہ گئے ہوں۔ خوف کے مارے میں بولنا ہی بھول گیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' کچھ دیر بعد میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' میں نے اسٹیفنی کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت بھی مجھ سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

میری بات سن کر جواب میں مسکراتے ہوئے اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر خوف سے اس کا چہرہ بھی زرد تھا۔ میری طرح اس نے بھی ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں... میں ٹھیک ہوں اب تک۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

ہماری اس مختصر سی گفتگو کے دوران میں وہ مسلح اجنبی بدستور خاموش رہا۔ وہ پہلے کی طرح پرسکون حالت میں بیٹھا رہا۔ تقریباً تین منٹ گزر چکے تھے۔ اب میں نے بھی کسی حد تک اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔ مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ پستول بردار اجنبی نے اب تک اسٹیفنی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے اس اجنبی کی طرف دیکھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ اس کی رنگت سانولی اور بال گھنے گھنگرالے سیاہ تھے۔ وہ نہایت سکون سے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ اب تک پستول کا رخ اسٹیفنی کی طرف تھا لیکن جب میں نے اسے بغور دیکھنا شروع کیا تو اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن بڑے اطمینان سے پستول کی نال میرے سینے کی طرف کردی۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' یہ دیکھ کر میں گڑبڑا گیا۔ خوف کے مارے میری آواز بھی بدل گئی تھی۔ کہنے کو تو میں نے مسلح اجنبی سے یہ پوچھ لیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ پستول تاننے والا خیریت تو پوچھنے نہیں آیا ہوگا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، میرے نہ چاہنے کے باوجود پستول کے زور پر کرسکتا ہے۔ وہ مجھے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ خوف کے باعث میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ موسم گرم تھا مگر مجھے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

''میں ایک مسئلے میں پھنس گیا ہوں۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے زبان کھولی۔ اس کے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف ہی رہا۔ ''میرا مسئلہ حل ہوسکتا ہے اگر تم چاہو تو...'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس طرح ہاتھ آگے بڑھایا جیسے گولی چلانے والا ہے۔ ''تم ہماری مدد کرسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''دوسری صورت میں اس پستول کی گولی تمہاری جان لے سکتی ہے۔ اب تم پر منحصر ہے۔ سوچ لو، تعاون کروگے یا گولی کھاؤ گے؟''

''تم چاہو تو میرے ٹرک کی چابی لے سکتے ہو۔'' میں نے اس کے تعاون کی پیشکش قبول کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کوئی چور ہے اور بنا گڑبڑ کے، اپنا کام پورا کرکے جانا چاہتا ہے۔ ''گھر میں کچھ سونے کے زیورات ہیں، وہ بھی لے لو۔ ایک ہزار ڈالرز نقد ہیں۔ وہ بھی تمہیں لاکر دے دیتا ہوں۔ میرا بینک اے ٹی ایم کارڈ بھی لے لو۔ میں اس کا پاس ورڈ بھی بتا دیتا ہوں۔'' میرا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔ ''مگر خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔ سب کچھ لے لو مگر یہاں سے چلے جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے سچ مچ میں رو پڑا۔ میں ہر شے اسے دینے کو تیار تھا۔ میں اپنی کہے جا رہا تھا اور وہ نہایت اطمینان سے چپ چاپ سن رہا تھا۔

''رومت۔'' اس نے ڈانٹا۔

''تمہیں جو چاہیے لے جاؤ مگر خدا کے لیے میری بیوی کو کچھ مت کہنا۔'' مجھے خود سے زیادہ اسٹیفنی کی فکر تھی۔

میں خاموش ہوا تو وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی پیشانی دبانے لگا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری باتوں سے اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں آٹھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کرکے یہاں اس لیے پہنچا ہوں کہ ایک ہزار ڈالرز، تھوڑے سے پرانے زیورات اور تمہارا کھٹارا ٹرک ہتھیا کر یہاں سے بھاگ جاؤں؟'' یہ کہہ کر اس

نے چشمہ اتارا۔ اس کی سیاہ آنکھیں بہت خوفناک لگ رہی تھیں۔ ''بے وقوف آدمی! تم بہت تیزی دکھا رہے ہو۔ ذرا سکون سے رہو۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے تنبیہ کی۔ ''میں چور نہیں ہوں اور نہ ہی غلطی سے یہاں آیا ہوں۔ میں تمہارے بارے میں ہر بات جانتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔ ''تمہارا نام کارل ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم یہاں کیا کام کرتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میرے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔ ''تم اس قصبے میں کچھ بڑے لوگوں کی پراپرٹی کی دیکھ بھال کرتے ہو... کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟''

یہ سن کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی باتیں سن کر میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اسی دوران میں میری نظر اسٹیفنی پر پڑی۔ اجنبی کی پشت اس طرف تھی۔ اسٹیفنی نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے اشارہ کیا مگر میں سمجھ نہیں سکا۔

''میں کئی طرح کے کام کرتا ہوں۔ جائداد کی دیکھ بھال بھی میری کئی ذمے داریوں میں سے ایک ہے۔'' اسے خاموش دیکھ کر میں نے وضاحت کی۔ اب مجھے سمجھ آرہا تھا کہ اس مسلح اجنبی کی اس طرح میرے گھر میں آمد کا تعلق ضرور ان جائدادوں سے ہوسکتا ہے جن کا میں نگران ہوں۔ وہ خاموشی سے کھڑا میری بات سن رہا تھا۔

''جن پراپرٹی کی تم دیکھ بھال کرتے ہو، مجھے اُن سب سے کوئی غرض نہیں۔'' اس نے پُراسرار انداز میں کہا۔ ''مجھے تو صرف ایک پراپرٹی سے غرض ہے، وہ بھی صرف ایک خاص مقصد کے لیے... ورنہ مجھے کسی کی جائداد میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

اس کی بات سُن کر میرا اعتماد کسی حد تک بحال ہوچکا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ چور نہیں اور شاید..... ہمارے قتل سے زیادہ اسے اپنا مقصد عزیز ہے اور اس کے مقصد کی کامیابی میں میرا کوئی کردار ضرور ہے۔ ''کس پراپرٹی سے؟'' میں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

''وہی پراپرٹی جو سامی ڈولینو کے نام پر ہے۔''

''سامی ڈولینو۔'' میں نے دہرایا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی تھا۔ میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا تھا۔ ''میرے خیال میں آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہوں، نہ ہی اس کی پراپرٹی کی دیکھ بھال میری ذمے داری ہے۔'' میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''سوری... یہ میری غلطی ہے۔'' میری بات سن کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ڈولینو کی جائداد اور گھر دراصل گوتھم لمیٹڈ ٹرسٹ کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور تم اس کی دیکھ بھال کرتے ہو۔''

''ہاں...'' یہ سن کر میں نے حیرت سے کہا۔ میں حیران تھا کہ وہ سب باتیں کہاں سے معلوم کرکے یہاں پہنچا ہے۔ ''میں ہی اس ٹرسٹ کی پراپرٹی کا نگران ہوں۔''

''تو کیا تم فون اٹھا کر اسے ایک فون کرسکتے ہو؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

''کسے؟''

''ٹرسٹ کے کرتا دھرتا کو۔''

''بالکل... کرسکتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ چوری کا نہیں، جائداد کا کھیل ہے۔ پستول اب بھی میرے سینے کی طرف تنا ہوا تھا مگر اب یقین تھا کہ فی الحال میں اور اسٹیفنی خطرے سے باہر ہیں۔

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو۔'' اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم خاصے عقل مند آدمی لگتے ہو۔''

''معاملہ کیا ہے... اور میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' میں نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک بات پوچھی تم نے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''گوتھم لمیٹڈ ٹرسٹ صرف ایک آڑ ہے۔ اس ٹرسٹ کا مقصد صرف سامی ڈولینو کی خفیہ جائداد اور اس کے خاندان کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ تم ایک ذہین شخص ہو۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ذرا تفصیل سے تمہیں سمجھاؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے غور سے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ''بہتر ہے کہ تم بھی بیٹھ جاؤ تاکہ ہم آرام سے اس معاملے پر بات کرسکیں۔''

میں خاموشی سے آگے بڑھا اور اسٹیفنی کی وہیل چیئر کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ سامنے والے صوفے پر اس رخ سے بیٹھا تھا کہ ہم میاں بیوی بیک وقت اس کی پستول کی زد میں رہیں۔ ''کہو... کیا بتانا چاہتے ہو؟'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ بیٹھنے کے بعد میری لرزتی ٹانگوں کو بھی آرام ملا تھا۔ میں خود تو کسی حد تک پُرسکون ہوچکا تھا مگر اسٹیفنی بدستور خوف زدہ تھی۔

''میں کبھی ڈولینو کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ مافیا کا بندہ ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے اس کے پاس بہت

عرصہ گزارا۔ اس دوران میں یہ بات جان گیا تھا کہ ملک کے بالائی حصوں کے بعض تفریحی مقامات پر اس نے اچھی خاصی جائداد خرید رکھی ہے مگر وہ کہاں ہے، کتنی ہے، یہ بات مجھے تو کیا کسی کے علم میں بھی نہیں ہے۔ میں بھی یہ بات نہیں جان پاتا، بس اتفاق سے یہ بات میرے علم میں آگئی تھی۔ ہوا یہ کہ میری ڈیوٹی اس کے احمق بیٹے کے ساتھ تھی۔ ایک مرتبہ اس کے بیٹے نے میرے ساتھ مل کر ایک کھیل کھیلا جس میں جیتنے کی صورت مجھے بھی اچھا خاصا مالی فائدہ پہنچ سکتا تھا مگر وہ اپنے باپ کی طرح ذہین نہیں تھا۔ نتیجتاً... میں پکڑا گیا اور کئی سال تک جیل کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ ڈولینو کا بیٹا بھی باپ کی طرح کمینہ تھا۔ اس نے سارا ملبا مجھ پر ڈال کر اپنی سزا میں تو کمی کروالی مگر میں بری طرح پھنس گیا۔ جب ہم دونوں جیل میں تھے، تب اتفاق سے اُسی کے ذریعے مجھے پتا چل گیا کہ اس کی .... پراپرٹی کہاں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر اس رات وہ نشے میں یہ راز کی بات نہ بتاتا تو میں یہاں کبھی نہیں پہنچ پاتا۔ اسی سے مجھے تمہارے اور ٹرسٹ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ وہ شراب کے نشے میں سب کچھ کہہ گیا اور میں نے وہ ساری باتیں ایک کاغذ پر لکھ کر محفوظ کرلیں اور اب جیل سے چھوٹتے ہی فوراً یہاں پہنچ گیا ہوں۔''

''پلیز پلیز...'' اسٹیفنی نے رقت آمیز لہجے میں مداخلت کی۔ ''ہمیں چھوڑ دو۔ ہمارا اُس کی پراپرٹی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تو ملازم ہیں۔''

مسلح اجنبی نے اسٹیفنی کی فریاد سنی تو سہی پر اس پہ کوئی دھیان نہیں دیا۔ ''اب وقت آگیا ہے بدلہ لینے کا اور میں یہاں بدلہ لینے آیا ہوں۔ میں نے جیل میں رہ کر جو وقت کھودیا، اُس کی قیمت حاصل کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ میں پورے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا مگر کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ یہ سب سنا کر مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتا ہے؟

''میں نے سنا ہے اور لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ ڈولینو نے اپنی پراپرٹی پر خزانہ چھپا رکھا ہے۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ ''میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ ان دنوں وہ ایف بی آئی کی تحویل میں زیر تفتیش ہے۔ پتا چلا ہے کہ ایف بی آئی کے ایجنٹ پچھلے کئی ماہ سے اس سے تفتیش کررہے ہیں مگر اب...'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ''پتا نہیں اسے مارشل سروسز سے ضمانت ملتی ہے یا نہیں، البتہ خدا نے چاہا تو وہ جلد چھوٹ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ان دنوں وہ سخت بیمار ہے اور ایف بی آئی کی نگرانی میں کوئنز کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہے۔ وہ کھانے پینے سے بھی معذور ہوچکا ہے۔ اسے نلکی سے خوراک دی جارہی ہے۔ ٹیوب کے ذریعے ملنے والی آکسیجن پر وہ سانس لے رہا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر پھر خاموش ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا۔ ''مجھے دیکھو، میں نے اس کے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی قربانی دی۔ اس کی سزا کم کروانے کے لیے خود جیل کی بدبودار کوٹھری میں کئی سال پڑا سڑتا رہا مگر کیا ملا؟ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں آیا ہوں اور اب تم سے اس بارے میں بات کررہا ہوں تاکہ اس کہانی کا انجام اچھا ہو۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور مسکرایا۔ ''مگر یہ آدھی کہانی ہے۔''

''مجھے اس سارے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''نہ تو میں ڈولینو کو جانتا ہوں، نہ ہی اُس کے پوشیدہ خزانے کے بارے میں... جو بقول تمہارے اُس پراپرٹی پر موجود ہے جس کا میں نگراں ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے غصے سے مجھے ٹوکا۔

''صرف ایک بات...'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''میری بیوی معذور ہے۔ میں خود بوڑھا ہوں اور تم ہمیں پستول کی زد پر لیے ہوئے ہو۔ ایسے میں تمہاری بات ماننے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں۔''

''سمجھ گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری اب تک کی باتوں سے میں صرف یہی سمجھا ہوں کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں پراپرٹی پر ڈولینو کے پوشیدہ خزانے کو ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں تاکہ تم اسے سرکار کو لوٹا سکو جس کے لیے ایف بی آئی نے ڈولینو کو زیر تفتیش رکھا ہوا ہے اور پھر سرکار سے انعام حاصل کرکے جیل میں گزارے دنوں کا معاوضہ سمجھ کر چین کی بانسری بجاؤ۔'' میں نے وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خزانہ تلاش کرکے سرکار کو دینا اور انعام کی بھیک حاصل کرنا میرے لیے غیر اہم ہے۔'' اس نے ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔ ''میری تمام تر دلچسپی صرف خزانے میں ہے اور وہ بھی اپنی ذات کے لیے۔ میں اسے 'پے بیک' کہتا ہوں یعنی جو وقت میں نے ڈولینو کے بیٹے کی خاطر جیل میں گزارا ہے، اس کی کمائی... سمجھے؟'' اس نے پستول میری طرف لہراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم جاؤ، داخل ہوجاؤ اس کے گھر میں۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پر خدا کے لیے ہمیں اس معاملے میں مت گھسیٹو۔''

''میں وہاں نہیں جاسکتا۔'' اس نے میری بات کے جواب میں جل کر کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک تو وہ پراپرٹی سڑک کے کنارے ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا بہت بڑا گیٹ ہے جسے عبور کرکے ہی اندر پہنچا جاسکتا ہے۔ اِردگرد باڑ لگی ہے اور ممکن ہے اس باڑ کے ساتھ الارم سسٹم نصب ہو۔ اگر ایسا ہے تو باڑ عبور کرنے سے پہلے ہی الارم بج سکتا ہے۔ سب ہوشیار ہوسکتے ہیں۔ وہاں جاکر خزانے کی تلاش تو دور کی بات، داخل ہونے سے پہلے ہی پکڑے جانے کا ڈر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور ناگواری سے ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔ ''میں کئی سال جیل میں گزار کر ابھی ابھی رہا ہوا ہوں۔ اب دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا... سمجھے؟'' اس کے لہجے سے غصے کا اظہار ہورہا تھا۔

''مگر میں کیا کروں؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''تم ہی کچھ کرسکتے ہو۔'' یہ سن کر وہ خباثت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔ ''تم اس پراپرٹی کے نگراں ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کس طرح ایسے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے کہ الارم نہ بجے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور قریب آکر میری کنپٹی پر پستول کی نال گڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کیوں کارل! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جو کچھ بھی کہہ رہے ہو وہ سب بھاڑ میں جائے۔'' اس کی بکواس سن کر میں جھلا اٹھا۔ ''مجھے کوئی نام بتاؤ، کوئی سا بھی نام۔ فکر مت کرو، چاہے وہ نام جعلی کیوں نہ ہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس نام ہونا چاہیے جس سے میں تمہیں پکار سکوں۔''

میری بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچنے لگا۔

''ایڈی... میرا نام ایڈی ہے۔ تم مجھے اس نام سے پکار سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' میں نے رسماً کہا، ورنہ اس میں شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ میرے لیے عذاب بنا ہوا تھا اور عذاب نازل ہونے پر شکریہ ادا کرنے کا دل نہیں کرتا مگر کیا کروں میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔

''دیکھو ایڈی...'' میں نے کچھ توقف کے بعد اسے مخاطب کیا۔ ''میں تمہیں اس پراپرٹی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''بکواس بند کرو۔'' یہ سنتے ہی وہ پستول لہراتے ہوئے غصے سے دہاڑا۔ ''کھڑے ہوجاؤ اور جب تک میں خود نہ پوچھوں، تمہیں کچھ بکنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''او کے۔'' میں نے دبی دبی آواز میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسٹیفنی کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔

''شاباش۔'' ایڈی نے کہا۔ ''اس دنیا میں بہت سارے لوگ تمہاری طرح کے ہوتے ہیں جو وہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں جس کا جاننا دوسرے کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم جو کچھ بتانا چاہتے ہو، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف اُس پراپرٹی میں بحفاظت داخل ہونا چاہتا ہوں جس کے تم نگراں ہو اور بس!'' یہ کہتے ہوئے اس نے پستول میری کنپٹی سے لگایا۔ ''تم عقل مند انسان لگتے ہو۔ ہرگز یہ نہیں چاہو گے کہ پستول سے گولی نکل کر تمہارے دماغ میں اپنا گھر بنالے۔''

اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی، اُس سے میں ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''بالکل درست۔'' میرے پاس ہاں کے سوا کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

''تو اب تم مجھے پراپرٹی کے اندر اس طرح پہنچاؤ گے کہ الارم نہ بجے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں اسٹیفنی کو گھورتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''میں تمہارا یہ کام کرسکتا ہوں مگر...''

''اگر مگر نہیں۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''جب تم چلنے پر تیار ہوگئے ہو تو پھر دیر کس بات کی ہے؟ چلو ابھی چلتے ہیں۔'' ایڈی نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

''مگر میری بیوی...'' اس کا حکم سنتے ہی میں نے کہا۔ ''یہ بے چاری ہمارے ساتھ نہیں چل سکتی، اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کا بھی تو کچھ کرنا پڑے گا۔'' وہ بڑبڑایا اور سوچ میں پڑگیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں خوف زدہ تھا کہ کہیں وہ اسے گولی نہ ماردے اور اپنا کام ہونے تک مجھے یرغمال نہ بنائے رکھے۔ اس کی خاموشی سے میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

''باتھ روم...'' اسٹیفنی نے گھگیائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا بکواس ہے؟'' اس نے اسٹیفنی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں... اس وقت باتھ روم یاد آرہا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' میں نے فوراً مداخلت کی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اسٹیفنی کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ اسے بھی خطرے کا احساس تھا۔

''تو تم صحیح سے سمجھادو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''صرف پانچ سیکنڈ میں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اسے باتھ روم میں بند کردو۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''وہاں نہ فون ہے اور نہ ہی یہ باہر آسکتی ہے۔ یوں تم ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔ تم اس کی بات مان لو۔ میں تمہیں پانچ منٹ میں ڈولینو کی پراپرٹی کے اندر بحفاظت پہنچادوں گا۔''

''اوہ... تو یہ بات ہے۔'' اس نے پیشانی کو ہتھیلی سے دباتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم اسے باتھ روم کے اندر پہنچا کر دروازہ باہر سے بند کردو۔ یاد رکھو، اس کام میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اسٹیفنی کی طرف بڑھا۔ وہیل چیئر کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے میں باتھ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باتھ روم بہت بڑا نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ اسٹیفنی اپنے ہی گھر میں مختصر سی قید وہاں کاٹ نہ سکے۔ باتھ روم سے ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے عقبی حصے کی طرف کھلتی تھی جس سے جھیل مونٹ بالکل صاف نظر آتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کھلی کھڑکی سے آنے والی تازہ ہوا سے حبس کا احساس نہیں ہوگا۔ جب میں اسٹیفنی کو باتھ روم کی طرف لے کر چلا تو پیچھے پیچھے ایڈی بھی چل رہا تھا۔ اسے ڈر ہوگا کہ کہیں میں اس سے کچھ ایسا نہ کہوں جو بعد میں اس کے لیے خطرناک ثابت ہو۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور نم تھیں۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ ''جتنا جلد ممکن ہوا میں واپس آتا ہوں۔'' اسے باتھ روم میں بند کرنے سے قبل میں نے کہا۔

''جلدی باہر آؤ۔'' ایڈی نے چلّا کر کہا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

''اب نکل بھی آؤ۔'' باتھ روم کے دروازے پر کھڑے ایڈی نے ایک بار پھر زور سے کہا۔

باتھ روم کے دروازے میں اندر کی طرف ایک بولٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے یہ گھر بنا بنایا خریدا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ گھر کے پرانے مالک نے لاک کے ساتھ وہ بولٹ کیوں لگایا ہے لیکن جب اسٹیفنی کو چھوڑ کر باہر نکلتے ہوئے میری نظر اس بولٹ پر پڑی تو اس کا استعمال سمجھ آگیا۔ ہمیں کبھی باتھ روم کو اندر یا باہر سے لاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اب لاک کرنا تھا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے غیر محسوس طور پر بنا آواز کیے بولٹ کھینچ دیا اور باہر نکل کر دروازہ لاک کردیا۔ مجھے علم تھا کہ باہر سے لاک کرنے کے باوجود بھی دروازہ اندر سے کھولا جاسکتا ہے۔ اس وقت مجھے اسٹیفنی کی ذہانت اور بروقت مشورہ بہت اچھا لگا۔

''چلو۔'' دروازہ لاک کرتے ہوئے میں نے کہا اور آگے کی طرف قدم بڑھایا۔

''رکو۔'' اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟'' یہ کہہ کر ایڈی پلٹا اور غور سے دروازے کے ہینڈل کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ ایک کرسی رکھی تھی۔ اس کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ میں نے یہ نیلامی سے خریدی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر ہینڈل کے ساتھ رکھی۔ کرسی کی پشت پر لکڑی کے کٹاؤ سے نمونے بنائے گئے تھے۔ اس نے کرسی کو زوردار لات ماری۔ کرسی کی پشت توڑتے ہوئے ہینڈل آگے کو نکل آیا تھا۔ یوں کرسی کی پشت میں وہ اس طرح پھنس گیا کہ اگر اب اندر سے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل گھمایا جاتا تو وہ ذرا سا بھی نہیں ہلتا۔ یوں اس بات کا اب امکان ہی نہیں تھا کہ دروازہ اندر سے کھل سکتا ہے۔

''اگر تمہاری بیوی کے پاس دوسری چابی ہوتی تو...'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''فی الحال میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ویسے اب تمہاری بیوی زیادہ محفوظ ہے اور میں بھی۔ واپس آؤ تو اسے نکال لینا۔ لاک کھولنے کا طریقہ تو تم سمجھ ہی گئے ہو۔'' اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ ''اب چلو، کام کرتے ہیں۔''

اس نے پستول سے ٹہوکا دیتے ہوئے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اسٹیفنی دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرے۔ مجھے خدشہ تھا کہ زور آزمائی کے باعث کہیں وہ وہیل چیئر سے گر نہ پڑے۔ اس طرح اسے چوٹ لگ سکتی تھی۔ باتھ روم کا فرش ٹھنڈا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگنے کا ڈر تھا اور خدانخواستہ گرتے ہوئے اس کا سر فرش سے ٹکرا گیا یا جسم کی کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹ گئی تو... میں اندیشوں میں گھرا ایڈی کے آگے آگے چل رہا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پستول کو اپنی پتلون میں اڑس لیا تھا۔ اب وہ بظاہر معزز

کاروباری شخص نظر آرہا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو بزنس مین ہی سمجھتا مگر میں اصلیت جانتا تھا۔ مسلح ایڈی میرے لیے بہت بڑی آفتِ ناگہانی بن چکا تھا۔

گھر سے باہر نکلتے ہی وہ ڈرائیو وے میں کھڑی میری کار کی طرف بڑھا۔ ''ہم پیدل جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں گھر کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔

''اوکے!'' مجھے عقب سے اُس کی آواز سنائی دی۔ گھر کے پچھواڑے سے باہر نکل کر میں داہنے ہاتھ مڑا اور وہاں سے درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔

''تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟'' چند منٹ تک وہ میرے پیچھے خاموشی سے چلتا رہا لیکن جب درختوں کا جھنڈ ذرا گھنا ہوا تو اس نے چیخ کر پوچھا۔

''یہ راستہ پراپرٹی کے عقبی گیٹ کی طرف جاتا ہے۔ وہیں سے میں تمہیں اندر پہنچاؤں گا۔''

''لیکن کیوں؟'' ایڈی کی آواز سے تشویش محسوس ہورہی تھی۔ ''تم مین گیٹ سے کیوں اندر نہیں جاسکتے؟''

''تم زیادہ سوالات مت کرو۔'' میں نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے پالش سے چمکتے جوتے دھول میں اٹ رہے تھے۔ ''اس وقت مین گیٹ کو کھولنا بہت مشکل ہوگا۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ''پچھلا گیٹ ہر لحاظ سے محفوظ اور اس سے اندر داخل ہونا زیادہ آسان ہے۔''

''تو یہ بات ہے۔'' اُس نے مطمئن انداز میں جواب دیا اور پھر میرے برابر آکر چلتے چلتے کہنے لگا۔ ''یاد رکھو... کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا، ورنہ میں ایک گولی تمہارے سر میں اتاروں گا۔ تمہاری جیب سے گیٹ کی چابیاں لوں گا اور اُس کے فوراً بعد واپس جاکر تمہاری بیوی کو بھی اوپر پہنچادوں گا اور پھر تالا کھول کر پراپرٹی میں داخل ہوجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ نہایت خباثت سے ہنسا اور پستول باہر نکال لیا۔ ''یہ یاد رکھنا کہ میرے پستول کی نال پر سائلنسر فٹ ہے۔ جب تک تم دونوں کی لاشیں ملیں گی، تب تک میں اپنا کام ختم کرکے لوٹ چکا ہوں گا۔''

''جانتا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے یہی توقع ہے۔''

''بالکل ٹھیک توقع ہے تمہاری۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس لیے میری بات یاد رکھوگے تو مزے میں رہوگے، ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔''

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ اس لیے خاموشی سے چلتا رہا۔

درختوں کا جھنڈ عبور کرکے ہم ایک پگڈنڈی پر ہولیے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ عام دنوں میں اس راستے پر کوئی نہیں آتا۔ ویسے بھی اس پگڈنڈی کے اختتام پر ڈولینو کی پراپرٹی تھی۔ اس سے پہلے اور نہ ہی بعد میں اس راستے پر کوئی گھر تھا۔ ایڈی چپ چاپ پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

''اب اور کتنی دور ہے؟'' اس نے جھلا کر پوچھا۔

''تھوڑا ہی دور ہے۔'' میں نے سکون سے کہا۔ ''ویسے اس نکتے پر تم نے سوچا؟''

''کون سا نکتہ؟'' اس نے جلدی سے کہا۔

''میں تمہیں پراپرٹی کے اندر صرف بحفاظت پہنچانے کا ذمّے دار ہوں...''

''یہی بات ہے۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''اب تک ہم دونوں ساتھ ہیں۔ تم میری وجہ سے اندر پہنچوگے اور اپنے مطلب کی شے تلاش کروگے؟'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسا ہی ہے۔''

''عقل مند آدمی لگتے ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اندر جاکر تمہاری مطلوبہ شے مل گئی تو اس کامیابی میں حصہ میرا ہوگا لیکن جو کچھ ملے گا، اُس پر سو فیصدی تمہارا حق ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر تم نے یہ سوچا ہے کہ باہر کیسے آؤگے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' وہ ایک بار پھر میرے برابر چلنے لگا تھا۔

''یہی کہ باہر آنے کے دو طریقے ہیں۔'' وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ ''ایک تو یہ کہ تم اپنا کام عمدگی سے کرکے خود نکل آؤ یا پھر تمہیں وہاں سے کوئی نکالے۔ خود نکلنا شاید تمہارے لیے زیادہ آسان کام نہیں ہوگا۔ الارم سسٹم، گارڈ...'' یہ کہہ کر میں ہنسا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے کہ میں کس نکتے کی وضاحت کررہا ہوں؟''

وہ کچھ نہ بولا مگر مجھے محسوس ہورہا تھا کہ وہ جتنی تیزی سے چل رہا تھا، اُس سے کہیں زیادہ تیز اُس کا دماغ سوچ کے میدان میں دوڑ رہا ہوگا۔

''بہتر ہوتا کہ تم مجھے گھر پر ہی بولنے کا موقع دے دیتے...''

''سیدھی طرح چلتے رہو منہ بند کر کے۔'' اس نے میرے کندھے پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

میں سہم گیا۔ اُس کے بعد ہم دونوں خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد ہم پراپرٹی کے عقبی دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ گیٹ سے پہلے ایک بھاری زنجیر کی رکاوٹ تھی جس کے ساتھ ایک بڑا بورڈ لگا ہوا تھا: ''پرائیویٹ پراپرٹی۔ اس میں گھسنے کی غلطی مت کریں۔ کیمرے، سیکیورٹی الارم اور گارڈ چوکس ہیں۔ اگر زنجیر کو چھونے کی کوشش کی تو الارم بج اٹھیں گے۔'' زنجیر کے پار کم از کم بارہ فٹ اونچی دیوار تھی جس پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔

''بڑی حفاظت کا انتظام کیا ہوا ہے اُس نے۔'' ایڈی نے چاروں طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس گیٹ سے اندر جائیں گے؟'' اس نے دیوار میں بنے قدِ آدم دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفساریہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے علاوہ کوئی اور دروازہ تمہیں یہاں نظر آرہا ہے؟'' میں نے اس پر طنز کا بھرپور وار کیا۔ یہ سن کر وہ کچھ بولا تو نہیں البتہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

''تم اتنی بڑی پراپرٹی اور پھر دوسری جائدادوں کی بھی نگرانی کرتے ہو۔ کیسے کر لیتے ہو یہ کام بوڑھے چوکیدار؟'' اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس دروازے کی چابی تلاش کرنے لگا۔ ''آجاؤ۔'' چابی ملتے ہی میں نے احتیاط سے پھلانگ کر زنجیر عبور کی اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے چابی لگائی۔ دروازہ کھولا اور ہم دونوں ڈولینو کی پراپرٹی کے اندر تھے۔ ایڈی نے پستول باہر نکال لیا تھا۔ وہ چاروں طرف چوکنا نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرے پیچھے چل رہا تھا۔

''رُک جاؤ۔'' اچانک ایڈی نے کہا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گیٹ لاک کر دو۔'' اس نے ہوا میں پستول لہراتے ہوئے حکم دیا۔

''او کے۔'' یہ کہتے ہوئے میں مڑا اور دروازہ بند کر دیا۔

''اب ٹھیک ہے۔'' اس کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ ''ممکن ہے کہ یہ گیٹ یا اس پراپرٹی کا کوئی اور گیٹ مقررہ وقت سے زیادہ دیر تک کھلا رہے تو پولیس اسٹیشن میں سیکیورٹی الارم بج جائے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ''سیکیورٹی کے نام پر تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا سوچ کر بول رہے ہو۔'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اب اگر تم مطمئن ہو گئے ہو تو ہم آگے بڑھیں؟'' میں نے اجازت طلب نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چلو۔'' اس نے ایک بار پھر پستول لہرا کر حکم دیا۔

اندر داخل ہونے پر ایک چھوٹی پہاڑی جیسی چڑھائی تھی۔ میں اس پر چڑھنے لگا۔ ایڈی میرے داہنے ہاتھ پر چل رہا تھا۔ چڑھائی پر پہنچنے کے بعد سامنے وہ عمارت تھی جس کی دیکھ بھال کے لیے گوتھم لمیٹڈ ٹرسٹ ہر ماہ مجھے باقاعدگی سے تنخواہ ادا کرتا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر سامنے پڑی، وہ چلایا ''رکو۔'' شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں اسے غلط جگہ لے کر پہنچا ہوں۔

''کیا تم اپنا ایک گردہ ضائع کر کے یہاں خون میں لت پت پڑے رہنا چاہتے ہو؟'' اس نے میری کمر میں پستول کی نال چبھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں گولی مار کر واپس جاؤں اور تمہاری معذور بیوی کو اوپر پہنچا دوں؟'' وہ شدید غصے میں تھا۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ میں کوئی چال چل رہا ہوں۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟'' اس نے نہایت درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ جگہ وہ نہیں جہاں مجھے ہونا چاہیے تھے۔'' وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

''یہی وہ جگہ ہے۔'' میں اس کی بکواس سن سن کر تنگ آچکا تھا۔ ''میں نے تو بتانے کی کوشش کی تھی مگر تم نے خود ہی کہا تھا کہ منہ بند رکھو۔'' میں نے بے بسی کے انداز میں وضاحت پیش کی۔ ''یاد کرو، تم نے ہی مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔''

''کیا بکتے ہو؟'' وہ غصے سے دہاڑا۔ ''اگر یہی ڈولینو کی پراپرٹی ہے تو پھر یہ سب کچھ...''

''دو مہینے پہلے...'' میں نے قطع کلامی کی۔ ''رات کے کسی پہر بجلی کا شارٹ سرکٹ ہوا تھا جس کے نتیجے میں آگ لگی اور جب یہ آگ باورچی خانے میں گیس کے چولہوں تک پہنچی تو... زوردار دھماکا ہوا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ اب تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔'' میں نے کہا۔

گوتھم لمیٹڈ ٹرسٹ کی یہ جائداد درختوں کے خوبصورت جھنڈ میں گھری ہوئی تھی۔ عقبی حصے میں خشک عمارتی لکڑی کا بڑا سا گودام تھا۔ بدقسمتی سے آگ لگی، دھماکا ہوا اور اردگرد آبادی نہ ہونے کے باعث جب تک فائر بریگیڈ کو اطلاع ملتی، تب تک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ بس عمارت کا بدصورت ڈھانچا کھڑا تھا جس پر پہلی نظر پڑتے ہی ایڈی کا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ میری بات پر یقین کرنے کو ہی تیار نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ میں کوئی چال چل رہا ہوں۔ میں اسے یہ بات گھر پر ہی بتانا چاہتا تھا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔

''مجھے یقین ہے کہ اس حادثے کے بارے میں تمہیں جیل میں کوئی اطلاع نہیں ملی ہوگی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ بات جان لیتے تو پھر یہاں آنے کی زحمت ہرگز نہیں کرتے۔''

''مگر سیکیورٹی الارم...'' ایڈی نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''وہ کام نہیں کر رہا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''جس رات یہ تباہی ہوئی، اُس شام بدترین طوفان آیا تھا جس کی وجہ سے بجلی کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اُس رات پورے قصبے میں بجلی نہیں تھی۔ کئی جگہوں پر تاریں گر چکی تھیں۔ گرڈ اسٹیشن نے کسی حادثے سے بچنے کے لیے بجلی کی فراہمی منقطع کر دی تھی۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''فائر بریگیڈ کا کہنا تھا کہ جب رات گئے بجلی بحال ہوئی تھی، تب شارٹ سرکٹ ہوا ہوگا جس کی وجہ سے سب سے پہلے کنٹرول پینل میں آگ لگی اور الارم سسٹم نے کام کرنا چھوڑ دیا۔''

''تم اس کی دیکھ بھال کے ذمے دار ہو، تم کیا کر رہے تھے؟'' ایڈی نے یہ سنتے ہی غصے سے کہا۔

''یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں جائداد کی دیکھ بھال کا ذمے دار ہوں، چوبیس گھنٹے کا چوکیدار نہیں۔''

میں محسوس کر سکتا تھا کہ پستول کی نال بدستور میری کمر میں دھنسے جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایڈی جس مقصد کے لیے یہاں پہنچا تھا اور جو کچھ اس نے دیکھا ہے، اس کے بعد پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ وہ کیا سلوک کرے گا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ وہ ہلکا سا دباؤ ڈالتا تو گولی میرے اندر اتر جاتی۔ اس کے بعد اسٹیفنی کا نمبر آتا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا، اس میں رتی بھر میرا قصور نہیں تھا مگر ایڈی... اس کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ مجھے وہ قصوروار سمجھتا ہے یا نہیں۔ وہ جرائم پیشہ تھا۔ مقصد میں ناکامی سے اُس کا پارا چڑھ چکا تھا۔ وہ غصے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔

''دیکھو...'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ کر سکتا ہوں کہ...''

''بکواس بند کرو، سمجھے؟'' وہ دہاڑا۔

''نہیں... اب تم خاموش رہو۔'' میں نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو۔ تم میری معذور بیوی سے خوف زدہ تھے۔ تم مجھے دھمکا کر یہاں لائے ہو تا کہ دولت لوٹ سکو۔ میں تمہیں یہاں لے آیا۔ لو، اب تم پراپرٹی کے اندر کھڑے ہو۔ میرا کام ختم۔ مجھے جانے دو۔ لوٹ لو جو لوٹنا چاہتے ہو۔ یہاں بچا ہی کیا ہے۔ اگر تم مجھے گھر پر منہ بند کرنے کا حکم نہیں دیتے تو دھول مٹی میں اٹ کر یہاں تک پہنچنے کی زحمت سے بچ جاتے۔'' یہ کہہ کر میں رکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اب ایک بار پھر میں تمہیں ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں مگر تم...'' یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اب ایک بار پھر مجھے چپ رہنے کا حکم دے رہے ہو۔ تم پچھلی بات سے آگے کے لیے کوئی سبق کیوں نہیں سیکھتے ایڈی؟'' میں خاموش ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے مجھ میں یہ سب کچھ کہنے کی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی سوچ کے آثار تھے۔ ممکن ہے کہ وہ میری اس ہمت پر حیران ہو رہا ہو کہ پستول کی زد پر ہونے کے باوجود میں کتنی بے باکی سے اُسے لتاڑ رہا تھا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''کوئی اچھی خبر سانا۔''

یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ تو ڈر رہا تھا کہ کہیں بک بک سن کر وہ مجھے گولی مارنے کا فیصلہ نہ کرلے۔

''میرے خیال میں تو یہ اچھی خبر ہوسکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے خودبخود میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ''آگ بجھائے جانے کے بعد میں نے بچا کچھا سامان اکٹھا کرنا شروع کیا۔ مجھے گیراج سے تین دھاتی صندوق ملے تھے جنہیں میں اپنے گھر لے گیا تاکہ جب ٹرسٹ منیجر آئے تو اس کے حوالے کردوں۔ وہ صندوق اب بھی میرے گھر کے گیراج میں موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن میں وہی خزانہ ہو جس کی تمہیں تلاش ہے۔'' مجھے محسوس ہوا کہ کمر پر پستول کی نال کا دباؤ کم ہوگیا ہے۔

''آگے بولو، ان صندوقوں میں کیا تھا؟'' ایڈی نے بے چینی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں نے اب تک انہیں کھول کر نہیں دیکھا ہے۔''

''وہ کس طرح کے صندوق ہیں؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''بتایا تو تھا کہ دھات کے بنے ہوئے ہیں۔ خاصے بڑے ہیں اور وہ لاک بھی ہیں۔''

''انہیں کوئی خاص نقصان تو نہیں پہنچا ہے؟''

گیراج کی دیوار گری تو وہ تھوڑا سا اُس کے تلے دب گئے تھے۔ بس اس کی وجہ سے تھوڑا سا پچکے ہوئے ہیں۔ وہ شاید کسی بہت ہی مضبوط دھات کے بنے ہوئے ہیں اس لیے انہیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔''

''وہ کب سے تمہارے پاس ہیں؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''ڈیڑھ مہینا ہوگیا ہے...''

''اور تم نے ابھی تک کھول کر نہیں دیکھا کہ اس میں کیا ہے؟'' ایڈی نے قطع کلامی کی۔

''میں اس پراپرٹی کا نگران ہوں، تفتیش کار نہیں۔'' میں نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''میں انہیں صرف اس لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ کہیں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ٹرسٹ والے آتے تو میں ان کے حوالے کردیتا۔''

''تو سمجھ لو وہ پہنچ گئے۔'' یہ سنتے ہی ایڈی نے مسکرا کر کہا۔ ''واپس چلو، تمہارے گیراج میں چل کر دیکھتے ہیں کہ ان صندوقوں میں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ...'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں نے کچھ کہے بنا واپسی کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ ہم پہاڑی ڈھلوان سے اتر کر اس دروازے کی طرف جارہے تھے جس سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

میں بدستور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں اپنے پیچھے پیچھے آنے والے ایڈی کے قدموں کی چاپ سنتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ گولی نہ چلادے۔ یہ تو وہ جان چکا تھا کہ میرے گھر کے گیراج میں تین دھاتی صندوق مقفل حالت میں موجود ہیں۔ اگر قسمت اس کا ساتھ دیتی تو وہ وہی خزانہ ہوتا جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ بصورتِ دیگر ناکامی تو اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ جیل جاچکا تھا۔ جرائم پیشہ تھا۔ کہیں ایسا نہ ہوتا کہ مجھے چلتے چلتے گولی مارتا اور گھر جاکر اسٹیفنی کا پتا صاف کرتا اور پھر اطمینان سے صندوقوں کے تالے توڑ ڈالتا۔ میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ ہر قدم پر ایسا لگتا تھا کہ بس اب گر پڑوں گا۔ میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

''جلدی کرو۔'' ایڈی نے ایک جگہ ٹوکا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیز تیز چلنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہم بغلی دروازے سے گیراج کی طرف جائیں گے۔ وہ زیادہ بہتر رہے گا۔'' جیسے ہی گھر نظر آیا، میں نے اُس سے کہا۔

''کیا کہا تم نے؟'' ایڈی نے غصے سے پوچھا۔ ساتھ ہی مجھے اپنی کمر پر ایک بار پھر پستول کی نال گڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''تم کوئی چال تو نہیں چل رہے۔'' اس کا لہجہ مجھے خوف زدہ کرگیا۔ میں نے منہ سے کچھ نہیں کہا، بس نفی میں سر ہلادیا۔

گھر کے احاطے میں دو گیراج بنے ہوئے تھے۔ اُن کے دروازے عام سائز کے تھے۔ ان کی دیواروں میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر میں نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے پر لگا تالا کھول دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اندر ایک کار کھڑی تھی جس پر گرد پوش ڈلا ہوا تھا۔

''اندر جاؤ اور صندوق نکال کر لاؤ۔'' ایڈی نے پستول سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

''بڑے بھاری ہیں وہ... تم بھی اندر آجاؤ۔'' میں نے مڑے بغیر منمناتی آواز میں کہا اور اندر داخل ہوگیا۔ کانپتے ہاتھوں سے بجلی کا بٹن دبایا۔ گیراج میں کار کے سوا دو بینچوں پر مختلف اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں اوپر تلے تین صندوق رکھے تھے۔ دوسرے کونے سے لکڑی کی سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ وہ حصہ تاریکی میں تھا۔ گیراج کی

چھت پر کچھ نہیں تھا۔ یہ سیڑھیاں گھر کی دوسری منزل پر بنے باورچی خانے میں نکلتی تھیں۔ اسٹیفنی وہی باورچی خانہ استعمال کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہاں گھٹن کا احساس کم ہوتا ہے۔

''یہ رہے صندوق۔'' میں نے ایڈی کو پکارتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی وہ اندر آگیا۔ ''یہ رہے۔'' اسے دیکھتے ہی میں نے انگلی سے اس طرف اشارہ کیا جہاں وہ تینوں صندوق رکھے ہوئے تھے۔

''میں باہر کا دروازہ بند کردوں؟''

''کیوں...؟'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''اکثر پڑوس کے بچے کھیلتے ہوئے اِدھر آجاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ دروازہ کھلا دیکھ کر کوئی اندر آئے اور تمہیں یہاں دیکھ لے۔''

میری بات سن کر وہ لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا۔

''جاؤ، جلدی سے بند کرکے واپس آؤ۔''

میں دروازہ بند کرکے پلٹا تو وہ کار کا گرد پوش اتار کر اس کا معائنہ کررہا تھا۔ ''بہت پرانی لگتی ہے؟''

''پراپرٹی کے گیراج میں کھڑی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ اس حادثے میں صحیح سلامت بچ گئی تھی، میں اسے اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کر یہاں لے آیا۔'' وہ کار میں محو تھا۔

''تم نے کتنی زور سے دروازہ بند کیا تھا، یہاں تک آواز آئی تھی۔'' اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے ناگواری سے اعتراض کیا۔

''سوری...'' میں نے آہستہ سے کہا اور اس کے قریب آگیا۔ ''اچھی ہے نا؟''

''بالکل بکواس۔'' اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے، تمہارے باس کو یہ بہت پسند ہے، تبھی اتنی اچھی حالت میں موجود ہے۔''

''وہ تو اپنے نکمے بیٹے کو بھی بہت پسند کرتا ہے۔'' اس نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''دیکھ لو، اس کے پیارے بیٹے کی بدولت مجھ پر کیا کچھ گزری ہے۔''

''آئی ایم سوری۔''

''کس لیے...'' اس نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ ''چلو جلدی سے صندوق اتار کر یہاں زمین پر رکھو۔'' اس نے پستول سے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے!'' یہ کہتے ہوئے میں صندوق اٹھانے لگا۔ ایک، ایک

نہیں تو

ایک گرجا کی دیوار پر لکھا تھا... ''اگر گناہ سے تھک گئے ہو تو اندر آجاؤ۔'' اس کے نیچے لپ اسٹک سے لکھا تھا۔ ''اگر نہیں تو اس پتے پر آجاؤ۔'' اس کے نیچے لڑکی کا نام اور پتا لکھا تھا۔

عورت

ایک نظر نہ آنے والی چیز جس کا نام نغمہ ہے یا دل ہے یا خوب صورتی ہے، اس نظر آنے والی چیز سے مات کھا جاتی ہے جس کا نام روپیہ ہے اور نغمہ روپے سے اس لیے کمتر ہے کیونکہ تم اسے بینک میں جمع نہیں کرسکتے اور جذبہ اس لیے کہ تم اس کے عوض بازار سے کچھ خرید نہیں سکتے اور خوب صورتی اس لیے کہ روپے کی طرح وہ کسی لکھ پتی کی مٹھی میں نہیں آسکتی۔ حیرت ہے کہ کس طرح کی دنیا ہے اور کیسی اس کی قدریں ہیں۔

عورت تو وہ آگ ہے جو دھیمے سلگنے والے فن کو شعلے کی طرح بھڑکا دیتی ہے۔

(حنا عزیز کی ڈائری سے)

عاشقی

ایک پڑوسن نے دوسری سے کہا۔ ''میرے شوہر تم پر عاشق ہوگئے ہیں۔''

یہ سن کر پڑوسن آپے سے باہر ہوگئی اور دوسری کے شوہر کو جی بھر کے گالیاں، کوسنے اور بددعائیں دیں۔ جب وہ اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرچکی تو پہلی ہمسائی نے کہا۔

''اپنے شوہر کو بھی ذرا سمجھانا، وہ مجھ پر عاشق ہے۔''

(مرسلہ، رقیہ خانم، کراچی)

کن لوگوں کے لیے

ایک پستہ قد تاجر انکم ٹیکس کے دفتر گیا۔ وہاں وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص نے کہا۔ ''جناب، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں، آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''کسی سے بھی نہیں۔'' تاجر نے کندھے ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں کن لوگوں کے لیے دن بھر کام کرتا ہوں۔''

(محمد نعمان پیار، تلمبہ)

کر کے فرش پر رکھنے لگا۔ جیسے ہی میں آخری صندوق رکھ کر کھڑا ہوا، اس نے ایک پرزور دار لات ماری۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

”یہ کیا ہے...“ اس نے کینہ توز نظروں سے مجھے گھورا۔ ”تم تو کہہ رہے تھے کہ صندوق دھات کے بنے ہوئے ہیں مگر یہ...“ اس نے پستول سے صندوقوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تو کارڈ بورڈ کے بنے ہوئے ہیں۔“

میں چپ رہا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور پھر تیزی سے ایک اور لات صندوق پر ماری۔ وہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے ڈھکن اتار کر غصے سے ایک طرف پھینکا اور جھک کر اندر کی طرف دیکھا۔ صندوق کے اندر پرانے رسالے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک اٹھایا اور اس کا سرورق دیکھنے لگا۔ ”یہ... یہ چالیس سال پرانے میگزین... یہ تم اٹھا کر لائے تھے وہاں سے... یہ ہے وہ خزانہ۔“ وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

”تم خزانے کے بارے میں جانتے ہو کہ وہ کیا ہے... کہاں رکھا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے ترش روی سے جواب دیا۔

”تو پھر مجھے کیا پتا، میں سمجھا کہ یہی خزانہ ہوگا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے میرا گلا خشک ہو رہا تھا، حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

”تم چالاک بڈھے...“ وہ میری طرف پستول تانے ہوئے ایک قدم آگے بڑھا۔ ”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تین دھاتی صندوق ہیں جن پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں قیمتی خزانہ ہوسکتا ہے... یہ تھے وہ دھاتی اور تالا لگے صندوق... بول چالاک بڈھے! چپ کیوں ہے؟“

”میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“ میں نے گھگیاتی آواز میں کہا۔ اب تو مجھے بھی لگ رہا تھا کہ بس گولی چلنے والی ہی ہے۔ خوف سے پورا جسم لرز رہا تھا۔

وہ پستول تانے ہوئے آگے بڑھا مگر اسی دوران میں کچن میں جانے والی سیڑھی پر اسٹیفنی نمودار ہوئی۔ اس جانب ایڈی کی پشت تھی۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکا۔ وہ سب سے اوپری قدمچے پر بیٹھی تھی۔ اسی دوران ایک کھٹکے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے مڑا مگر دیر ہوچکی تھی۔ اسٹیفنی کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ اس سے پہلے کہ ایڈی گولی چلاتا، اسٹیفنی نے اس کا خاتمہ کردیا۔ اس کے لیے ایک ہی فائر کافی ثابت ہوا۔ گھاؤ سینے پر لگا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

یوں جان بچتی دیکھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ”تم...“ چند لمحوں کے بعد میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ اپنا کندھا سہلاتے ہوئے بولی۔ ”پرانی شاٹ گن کی یہی خرابی ہے۔“

”جھٹکا زور سے لگا؟“

”نہیں...“ یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ ”بہت ہی زور کا لگا ہے۔“

”میرے خیال میں کسی نے فائر کی آواز سنی نہیں ہوگی۔“

”کس نے سنی ہوگی؟ پڑوس کے دونوں گھر تو کب کے خالی ہیں۔“ اسٹیفنی بدستور کندھا سہلا رہی تھی۔ ”اب مجھے برف سے ٹکور کرنا پڑے گی۔“

”بس، پانچ منٹ ٹھہر جاؤ پھر میں ٹکور کردیتا ہوں۔ یہ ٹھنڈا پڑ گیا تو اکڑ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں ایڈی کی لاش کے ہاتھ پاؤں موڑنے لگا۔ میرا ارادہ تھا کہ رات ڈھلنے پر لاش کو پراپرٹی پر لے جا کر ٹھکانے لگا دوں گا۔ ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ اسے کہاں دفن کرنا ہے۔ میری نظر میں وہ جگہ مناسب تھی جہاں پر بہت گہرا گڑھا کھودا گیا تھا تاکہ گیس کی پائپ لائن نکالی جاسکے۔ وہاں دفن کرنے سے میں اس کی قبر کھودنے سے بھی بچ جاتا۔ ویسے بھی اس نے یہاں آتے ہوئے نہ جانے کہاں اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ بازار سے لوٹتے ہوئے جب میں گھر پہنچ رہا تھا، تب راستے میں اور نہ ہی گھر کے قریب مجھے کوئی گاڑی نظر آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چوروں کی طرح میرے گھر میں گھسا ہوگا۔ اس نے خود یہ کوشش کی ہوگی کہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے کوئی نہ دیکھے۔ یہی وجہ ہوگی کہ اس نے کہیں دور گاڑی پارک کی ہوگی۔ اس کی یہی ہوشیاری میرے کام آگئی۔

کچھ ہی دیر میں، میں نے ایڈی کی لاش کو موڑ توڑ کر گٹھڑی کی طرح پیراشوٹ کے پرانے کار کور میں لپیٹ دیا۔ رات ہوتے ہی میں اسے لے جا کر دفنانے والا تھا۔

”چلو۔“ میں نے اسٹیفنی سے کہا۔ تقریباً پانچ منٹ کے اندر اندر سب کام نمٹ گیا تھا۔

☆☆☆

اسٹیفنی کو گٹھیا کا مرض تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے درد اٹھا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے لاچار ہوگئی تھی۔ میں نے قصبے کے ایک فلاحی ادارے سے ہفتہ وار کرائے پر وہیل چیئر اسے لادی تھی۔ ایڈی کے خاتمے کے بعد ہم کچن میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، تب اس نے پورا قصہ سنایا۔

اسٹیفنی نے بتایا کہ جب میں مارکیٹ گیا ہوا تھا، اس وقت وہ وہیل چیئر پر بیٹھی گھٹنوں پر مالش کررہی تھی کہ اچانک اسے وہ شخص نظر آیا۔ لباس سے وہ معزز نظر آرہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ مہذبانہ انداز میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے نام اور مکان نمبر بتا کر تصدیق کی تو میں سمجھی کہ شاید کوئی پراپرٹی ایجنٹ ہوگا۔ جب میں نے تصدیق کردی تو اس نے پستول نکال لیا۔ بس اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کے سامنے معذور بنی رہوں گی۔

”تم باہر کیسے نکلیں؟“

”باتھ روم کی عقبی کھڑکی سے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اور تمہارا گھٹنا؟“

”اب تو بہت ٹھیک ہے۔ درد بھی نہیں ہو رہا۔“ اس نے گھٹنے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے ورنہ...“

”ورنہ کیا؟“

”وہیل چیئر کے اگلے ہفتے کا کرایہ بھی دینا پڑتا۔“ میں مسکرادیا۔

”بکواس مت کرو۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”نہیں، واقعی میں ڈر رہا تھا کہ اگر تم نے وہ آواز...“

”سن لی تھی۔“ اس نے قطع کلامی کی۔ ”گیراج کا دروازہ زور سے بند ہونے سے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم پہنچ گئے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم جانتی ہو تیس برس پہلے میں نے تم سے شادی کیوں کی تھی؟“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ وہ شرماتے ہوئے بولی۔

”میرے اشاروں کو سمجھ جانے کی خوبی کے باعث۔“ میں نے محبت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ویسے بہت ہی بے وقوف تھا وہ۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”خزانے کی تلاش میں آیا تھا مگر بے وقوف کو معلوم ہی نہیں تھا کہ خزانہ اس کے سامنے ہے۔“

”اندھا تھا وہ۔“ اسٹیفنی نے جواب دیا۔

”چلو یہ اچھا ہوا۔ اسٹیفنی نے کافی کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”ڈولینو تو موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ٹرسٹ کو تو پتا ہے کہ پراپرٹی تباہ ہوچکی ہے، اب فی الحال تو یہاں کوئی آنے جانے والا نہیں۔ بیٹا اُس کا ناکارہ ہے۔ اسے تو علم ہی نہیں ہوگا کہ اس کے باپ نے بیش قیمت کار یہاں رکھ چھوڑی تھی۔ بس! اب تم جلدی سے اسے فروخت کر ڈالو۔“

”واقعی بہت بیش قیمت کار ہے۔“ یہ سن کر میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایڈی کی توجہ بھی دلائی تھی کار کی طرف مگر وہ تو عقل سے پیدل تھا۔ خزانہ سامنے تھا مگر وہ اسے ڈبوں میں، دیواروں میں تلاش کرنے آیا تھا... بے وقوف کہیں کا۔“

میں گزشتہ پندرہ برس سے گوتھم لمیٹڈ ٹرسٹ کی وہ پراپرٹی سنبھال رہا تھا۔ عمارت سے کافی فاصلے پر بنے گیراج میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں مگر سب سے بیش قیمت صرف ایک تھی۔ یہ وہ کار تھی جس کی اہمیت کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتا تھا۔ جب آتش زدگی کا واقعہ ہوا، تب میں نہایت خاموشی سے وہ کار اپنے ہاں لے آیا۔ یہ کار 1931ء میں بنائی گئی اسپورٹس کار تھی جسے اٹلی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کار کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی ساری مشینری ہاتھوں کے ذریعے دھاتوں کی ڈھلائی کر کے تیار کی گئی تھی۔ اس کی باڈی نہایت نفیس لکڑی سے تیار کی گئی تھی۔ دنیا بھر میں اب ایسی صرف دو کاریں تھیں جن میں سے ایک اس وقت میرے گیراج میں کھڑی تھی۔

”تم نے پتا چلایا اس کی قیمت کیا ہے؟“ اسٹیفنی نے باتوں باتوں میں سوال کیا۔

”ہاں...“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بیس لاکھ ڈالرز لگ گئے ہیں۔ میں نے پچیس کی ڈیمانڈ کی ہے اور لگتا ہے وہ مان جائیں گے۔“

”اور رقم...“

”براہِ راست بینک میں جمع ہوگی اور ہم کار اُن کے حوالے کرتے ہی نکل کھڑے ہوں گے۔“

”تو جلدی کرو۔“ اس نے تنبیہ کی۔ ”اب یہ موقع پھر نہیں ملنے والا۔“

”ملنے والا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آج رات ایڈی کی تدفین کے بعد دوسری کار بھی نکال لاؤں گا۔ دونوں ایک ساتھ بیچ کر نکل جائیں گے۔ میں نے اس کی بھی بات کرلی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اُس کے کتنے مل رہے ہیں؟“ اسٹیفنی نے پوچھا۔

”آٹھ لاکھ... یہ سودا ہوگیا ہے۔“

”اور...“ اسٹیفنی نے کہا۔ ”بے چارے ایڈی کا خزانہ...“

”کارل کو مل گیا۔“ یہ سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

سرورق کی پہلی کہانی

احمد اقبال

بوجھل اور کمزور لمحوں کا ایک قصہ جس میں پیچ در پیچ داستانیں چھپی ہوئی تھیں

اب سے تقریباً نصف صدی پہلے یہاں صرف سمندر تھا... تاحدِ نگاہ... لامحدود... جس کا دوسرا کنارہ آسمان سے ملتا دکھائی دیتا تھا۔ سال کے کسی حصے میں پرشور... متلاطم دہشت زدہ کرنے والی جھاگ اڑاتی غضب ناک لہروں والا بن جاتا... تو کبھی ہنستی کھیلتی لہروں والا پرسکون اور مہربان... یہاں بس سمندر کی موجودگی تھی۔

آج کے سی ویو کا 1965ء میں تصور بھی محال تھا۔ جہاں ساحل پر تاحد نگاہ پتھروں کی دیوار ہے اور چکاچوند پیدا کرنے والی روشنیاں ہیں جن کا عکس کنارے کی ریت پر جھلملاتا ہے... دورویہ سڑک پر سیکڑوں دوڑتی بھاگتی کاروں کے ساتھ ساحل پر ایک طرف پرشوکت بنگلوں کی قطار دکھائی دیتی ہے... دوسری طرف کمرشل پلازا سر اٹھائے کھڑے ہیں اور مہنگے ملکی اور غیر ملکی ریسٹورنٹ ہیں تو آواز لگا کے چائے یا قلفی بیچنے والے بھی... اور نصف شب کے بہت بعد تک سکون، تفریح یا عیاشی کے متلاشی مرد، عورتوں اور بچوں کا ہجوم رہتا ہے... بے چارہ سمندر تو اب بس منظر میں گم ہے۔

اس بڑے ویرانے کا وہ اکلوتا جھگی ہوٹل نبی بخش کے باپ خدا بخش کا وسیلۂ روزگار تھا۔

☆☆☆

اپنے چھٹی منزل کے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی رانی نے پھر افسوس کیا۔ اگر وہ دسویں فلور کے فلیٹ میں ہوتی یا اس بلاک میں نیچے سے اوپر تک آنے والے زینے کا راستہ ہی چھت تک ہوتا تو وہ سمندر کو دیکھ سکتی تھی جس کی آواز اس وقت بھی ایک گونج کی طرح اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی...

پاپا کی پریشانی مختلف تھی۔ وہ ہر روز اپنی کار کا معائنہ کرتے اور دکھ سے سر ہلاتے۔ دروازوں اور مڈگارڈ کے کناروں پر زنگ بڑھتا جارہا ہے... فلور کو زنگ کھا رہا ہے... رسٹ پروف کوٹنگ کرنے والے دھوکے باز بکواس کرتے ہیں کہ ایک سال کی گارنٹی... ابھی تین مہینے بھی نہیں ہوئے... باڈی گل جائے تو گاڑی دو کوڑی کی... اس سے تو بیل گاڑی بہتر... ایسے ہی دکھی جذبات کا اظہار وہ ائرکنڈیشنر، فریج اور دیگر آلات کو دیکھ کر اکثر کرتے تھے۔

ماما کے دکھ اپنے تھے۔ ”لو... آج پھر قبضہ نکل گیا... کیلوں کو زنگ کھا گیا... آخر یہ پیتل یا اسٹین لیس اسٹیل کی کیلیں کیوں استعمال نہیں کرتے؟“

پاپا اخبار سے نظر ہٹائے بغیر مسکراتے۔ ”میں بلڈر ہوتا تو میں بھی پیسا بچاتا میڈم... مہنگی چیزیں نہ استعمال کرتا۔“

”آخر ضرورت کیا ہے سمندر کے ساحل پر رہنے کی... کس نے کہا تھا کہ یہاں فلیٹ لو؟“

وہ آہ بھر کے بولے۔ ”مجھے خوش فہمی ہوگئی تھی کہ میں امیر ہوں... امیر بیچ پر رہتے ہیں... عالی شان محلوں میں... وہ کنڈی، قبضے اور گیزر یا گاڑی کیا... بیوی تک ہر سال بدل دیتے ہیں۔ پرانی چیزیں رکھتے ہی نہیں۔“

ماما نے ایسی ہی کسی بات پر جھلا کے اسے آواز دی۔ ”رانی۔“

بالکونی سے رانی نے بڑی فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔ ”آئی ماما۔“ مگر اس کے رپورٹ کرنے سے پہلے ماما کی چیخ سنائی دی۔

”یہ کم بخت بلی... نیچے چھوڑ کے آئی تھی میں خود... پھر آگئی مصیبت۔“ پھر ماما نے رانی کو دیکھا۔ ”رانی... سچ بتا... تو لائی ہے پھر اسے گھر میں؟“

رانی نے خاصی بہادری سے اقرار جرم کیا۔ ”وہ ماما... دروازے پر بھوک سے چلا رہی تھی۔“

”جھوٹ... ان فلیٹوں میں رہنے والی بلیاں بھوکی ہوتیں تو ایک چوہا نہ بچتا... چوہے الگ دندناتے پھر رہے ہیں... رانی! تو سمجھتی کیوں نہیں... اس نے کہیں گھر میں گھس کے بچے دے دیے تو نکالنا مشکل ہو جائے گا... یہ تو ڈھونڈ رہی ہے کوئی ٹھکانا... تجھے آرہا ہے اس پر پیار۔“

”ماما... بلی کے بچے کتنے کیوٹ ہوتے ہیں۔ ننھے منے... روئی کے بنے ہوئے۔“

”تجھے تو سب اچھے لگتے ہیں... کتے، بلی، خرگوش... کسی کے بھی ہوں... مگر وہ گندگی کتنی پھیلاتے ہیں؟“

”وہ تو انسان کے بچے بھی کم نہیں پھیلاتے ماما... اسی لیے تو پیمپرز ایجاد ہوئے... وہ بھی اچھے لگتے ہیں مجھے۔“

قرض کا فرض

دنیا کے بازار میں ہر شے کی قیمت ہے... کچھ کی کم، بعض کی زیادہ! کچھ کی ادائی نقدی سے تو بعض کے لیے نقدِ جاں درکار ہوتا ہے۔ کچھ قرض بن کر جسم و جاں سے چمٹ جاتے ہیں اور ان کی ادائی کے بوجھ سے مفر ممکن نہیں... مقروض جسم بھی ہوتا ہے اور ذہن بھی... عشق بھی ہوتا ہے اور حُسن بھی... ایک وفا پہ کیا موقوف جفا بھی قرض بن جاتی ہے... یوں تو زندگی بھی ایک قرض ہے۔ جسے کوئی ہنستے کھیلتے ادا کرتا ہے... کوئی روتے جھینکتے! یہ قرض جب انسان کے وجود کے گرد مکڑی کی طرح اپنا جال بن لیتے ہیں تو زندگی عذاب بن جاتی ہے... ایسے میں کچھ ہشیار اپنا بوجھ دوسروں کے سر لاد کر اپنا سفر طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں... اور وہ وقتی طور پر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں... لیکن ایک مرحلہ ایسا ضرور آتا ہے جب ہر ایک کو اپنے کیے کا سارا بوجھ، دوسروں کے سر سے اتار کر خود سنبھالنا پڑتا ہے...

”کیا؟ پیمپرز؟“ ماما نے برہمی سے کہا۔ ”الٹی سیدھی باتیں مت کیا کر میرے ساتھ... اتنی بڑی ہوگئی عقل کب آئے گی تجھے۔ دیکھ لفٹ خراب ہے... میں اتنی سیڑھیاں نہیں اتر سکتی... اس ہارڈ ویئر والے خان کو نمبر لکھوا کے آ... کسی کو بھیجے جو ایک بار ہی سب قبضے، کنڈیاں بدل جائے۔“

”آپ فون کر دیں۔“ رانی نے دبے لفظوں میں آسان راستہ بتایا۔

ماما بھڑک اٹھیں۔ ”افلاطون... اتنی عقل خدا نے مجھے بھی دی ہے... فون ٹھیک ہوتا تو میں تجھے بھیجتی؟“

رانی کے جانے کے بعد پاپا نے موافق حالات دیکھ کر کہا۔ ”یہ جو ابھی آپ نے دعویٰ کیا ہے عقل کے بارے میں... اس میں سرکاری بیان سے بھی کم صداقت ہے۔“

”تمہیں جو کہنا ہے صاف کہو۔“ ماما نے اپنے مجازی خدا کے سامنے ہاتھ کمر پر رکھ کے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

”بھئی یہ کون سی عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے آپ نے رانی کو خان کی دکان پر بھیج کے... اب وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں رہی۔“

”اسے نہ بھیجتی تو کیا کرتی... آپ جاتے...؟ دفتر کے کام سے فرصت ملتی ہے تو یہ اخبار ہے... ٹی وی پر کرکٹ کے میچ ہیں یا اس بے ہودہ ڈراما چینل پر ڈانس ہیں نرگس اور دیدار کے... انہیں کیا کہے کوئی جب دیکھنے والے آپ جیسے ہوں۔“

پاپا نے بہتر جانا کہ پھر اخبار کے پیچھے مورچا بند ہو جائیں... گولہ باری کے جواب میں کوئی توپ چلانے کے لیے نہ موقع تھا اور نہ موڈ... گزشتہ ہفتے کی جھڑپ سے پیدا ہونے والی کشیدگی زیادہ امن پسندی کا مطالبہ کرتی تھی... حقیقت اپنی جگہ... رانی کیا واقعی اب بچی نہیں رہی تھی؟

انہوں نے تمام باتوں کو ذہن سے دور دھکیلا۔ ”اوہ... آئی پی ایل میں آج شاہ رخ کی ٹیم کا مقابلہ پریتی زنٹا کی ٹیم سے ہے...“ انہوں نے ریموٹ اٹھالیا، اسی وقت بجلی نے خدا حافظ کہا۔ یو پی ایس نے ایک انرجی سیور کی ذمے داری سنبھالی مگر ٹی وی اسکرین بلینک رہی۔

☆☆☆

خان بابا نے اپنی لہراتی ریش دراز پر عادت کے مطابق ہاتھ پھیرا۔ ”ابھی بچہ... تم فون کرتا۔“

”ماما نے کل بھی فون کیا تھا، پرسوں بھی... آج فون خراب تھا۔ وہ آپ کا ریڈ الرٹ... میرا مطلب ہے لال بادشاہ سنتا ہے ایک کان سے اور دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔“

خان بابا نے سر ہلایا۔ ”خو، ہم اس تخم خنزیر کا ایک کان ایک دم بلاک کرا دے گا۔ اس سے وہ گانا سنتا ہے اپنا فون میں تار لگا کے... ابھی تم تھوڑا تکلیف اور کرو... وہ ادھر پیچھے والا گلی میں ہے... انیس نمبر بنگلا میں... ادھر سے اس کو پکڑو اور بولو تم ہمارا ساتھ نہیں جائے گا تو ہم گولہ مارے گا گولہ... وہ ایک دم جائے گا... ڈرپوک ہے ہم سے بھی زیادہ۔“

یہ تو کوئی مشکل نہیں... گولہ نہ سہی... گولی مارنے کی دھمکی دی جاسکتی ہے اور انیس نمبر بنگلے تک جانے میں سمندر کی

جھلک دکھائی دینے کا چارم اپنی جگہ ہے... خصوصاً اس خوش گوار موسم میں... وہ آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ گزشتہ سال تو آسمان سے ایک بوند نہیں ٹپکی۔ اس سے زیادہ تو ماما کی آنکھوں سے ڈرامے دیکھ کے آنسو برسے... روتے ہیں چھم چھم نین... اسٹار پلس والے بھی خواتین کو رلانے کے ایکسپرٹ ہیں۔

ایک سوزوکی پک اپ رکی تو اس نے نبی بخش کا عاجزی سے مسکراتا چہرہ دیکھا۔ ”رانی بٹیا... کہاں جارہی ہو پیدل؟“

رانی نے خوش دلی سے کہا۔ ”یہاں انیس نمبر بنگلے تک... لال بادشاہ وہاں کام کررہا ہے... اسے ساتھ لے جانا ہے۔“

اس نے عادت کے مطابق سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا... چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

”ارے نہیں نبی بخش... میں تو بس ایسے ہی پیدل چل پڑی... موسم اچھا تھا۔“

وہ پھر بھی کھڑا رہا۔ ”میرا وہ سفید خرگوش... اس نے بچے دیے ہیں... بالکل چوزے جیسے چھوٹے چھوٹے۔“ اس نے دو ہاتھوں کو اوپر نیچے رکھ کے چوزوں کے سائز کی وضاحت کی۔ ”اتنے پیارے ہیں... تم دیکھو گی؟“

رانی نے خرگوش کے بچوں کو ہتھیلی پر محسوس کرنے کی خواہش پر قابو پالیا۔ ”پھر سہی نبی بخش۔“

”چلو لال بادشاہ کو دیکھ لو... اگر وہ کہے کہ کام باقی ہے... تھوڑی دیر لگے گی تو اتنی دیر میں تم خرگوش کے بچے دیکھ لینا۔ چاہو تو پسند کرلینا ایک... ذرا بڑا ہوگا تو میں تمہیں دے دوں گا۔ خرگوش بڑے معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں۔“

یہ بات رانی کے دل کو لگی۔ وہ نبی بخش کو کئی سال سے جانتی تھی۔ وہ اپنی سوزوکی میں ان کے فلیٹوں سے کوڑا کرکٹ اٹھا کے لے جاتا تھا۔ اس احاطے کے اندر آمنے سامنے دو بلاک تھے۔ ہر بلاک میں سو فلیٹ تھے... بیس زینے... نبی بخش لفٹ میں اوپر جاتا تھا اور پھر ہر فلور کے دروازے پر رکھا ہوا پلاسٹک بیگ اٹھا کے نیچے اترتا جاتا تھا۔ آخری بیگ اٹھانے تک اس کی سوزوکی کا پچھلا حصہ پورا بھر جاتا تھا۔ سب اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ سب کی باتیں سن لیتا تھا اور ہنستا رہتا تھا۔ وہ چالیس سال کا تھا مگر اس کے چہرے پر اگنے والے بالوں میں سفیدی غالب نظر آتی تھی۔ وہ ہفتے میں یا دس دن میں ایک بار شیو بنواتا تھا۔ مہینے میں ایک بار سر پر استرا پھروا لیتا تھا... اس کا رنگ کالا تھا اور ناک پھیلی ہوئی... ہونٹ موٹے تھے اور دانت ناہموار... لیکن وہ دل کا بہت نیک اور اچھا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس کا دماغ کچھ کمزور رہ گیا تھا لیکن وہ پاگل ہرگز نہیں تھا۔ عورتیں اس پر پورا بھروسا کرتی تھیں۔ اسے پانچ سو ہزار کا نوٹ دے کر سامان کی ایک فہرست پکڑا دیتی تھیں... کچرے کے بیگ اٹھانے کے باوجود وہ اپنی گاڑی کو روز دھوتا تھا اور بالکل صاف رکھتا تھا... نبی بخش صبح سے رات تک نظر آتا تھا... سو فلیٹوں کی اس قلعہ بند سوسائٹی میں اس کا وجود اعتماد کی علامت تھا۔ اس کا دنیا میں ایک باپ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا اور باپ ستر سال کا ڈھانچا بستر پر پڑا رہتا تھا۔ اسے کھلانے پلانے سے نہلانے دھلانے تک کے سارے کام خود نبی بخش کرتا تھا۔ اس علاقے کے رہنے والے نبی بخش کے باپ سے بھی آشنا تھے اور نبی بخش کو بھی جانتے تھے چنانچہ ان باپ بیٹا کی مدد بھی کرتے تھے۔ تھری ایس سوسائٹی میں کئی نامور ڈاکٹر تھے۔ اگر نبی بخش خود اپنے باپ کو نہیں لا پاتا تھا تو وہ اس کے گھر جا کر بھی خدا بخش کو دیکھ لیتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ نبی بخش کے اصرار پر رانی اس کے ساتھ آگے بیٹھ گئی۔ انیس نمبر بنگلے کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ نبی بخش نہ ملتا تو وہ پانچ منٹ میں پہنچ بھی جاتی۔ اس کی گاڑی میں رانی کو شاید تین منٹ لگے کیونکہ دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے یوں دیکھتا تھا جیسے اس سنسان اسٹریٹ میں نہیں جس کے دونوں جانب کوٹھیاں ہیں بلکہ بے ہنگم ٹریفک والی کسی مین روڈ پر ہے... پھر وہ زیر لب کچھ پڑھتا اور اپنے دائیں بائیں پھونکتا تھا۔ اس کے بارے میں پاپا نے کہا تھا کہ بیٹا اس کا مذاق مت اڑاؤ... وہ بے چارہ نارمل نہیں ہے۔

”اگر وہ پاگل ہے...“

”نہیں... نبی بخش ہرگز پاگل نہیں ہے۔ اس کا دماغ کچھ سست ہے۔ اسے بات کو سمجھنے میں وقت لگتا ہے۔“

انیس نمبر بنگلے کی کال بیل خود نبی بخش نے بجائی اور ایک ملازمہ نمودار ہوئی تو اس سے کہا کہ لال بادشاہ یہاں کام کررہا ہے تو اسے بلاؤ۔

وہ سر ہلا کے اندر گئی اور لال بادشاہ آگیا۔ ”ابھی ہم کو ادھر آدھا گھنٹا لگے گا... پھر تمہارا ساتھ جائے گا۔“ اس نے رانی کی شکایت سن کے کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصلہ صادر کیا اور واپس اندر غائب ہوگیا۔

”رانی! آدھے گھنٹے تم خرگوش دیکھ سکتی ہو... اتنے پیارے بچے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں واپس چلی جاؤں، لال بادشاہ آجائے گا بعد میں۔“

”میں تمہیں واپس لے آؤں گا یہاں... اور لال بادشاہ کو بھی اسی گاڑی میں پہنچا دوں گا تمہارے گھر... ایک ساتھ تم اپنی ہتھیلی پر دو بچے رکھ سکتی ہو... روئی کے گالے ہیں سفید سفید... چار ہیں چار... اس نے انگلیاں دکھائیں۔“

رانی کے جذبات نے اس کی عقل کو مغلوب کرلیا۔

”چار... دو تم مجھے دو گے... تم نے کہا تھا۔“

”ہاں... لے جانا... مجھے دو کافی ہیں... اور بچے بھی ہوں گے کچھ دن بعد۔“ نبی بخش نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

رانی کو خیال تھا کہ ماما خفا ہوں گی مگر ماما تو خفا ہوتی رہتی ہیں کسی وجہ کے بغیر بھی... ان کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ میں خرگوش کے بچے دیکھنے گئی تھی... میں کہہ سکتی ہوں کہ لال بادشاہ معروف تھا... اس نے کہا دو منٹ ٹھہرو، میں کام ختم کر کے چلتا ہوں... دو منٹ کرتے کرتے اس نے بیس منٹ لگا دیے تو میرا کیا قصور ہے...

رانی نے گاڑی کو اس چار دیواری کے باہر رکتا دیکھا جس کے اندر نبی بخش رہتا تھا۔ یہ مشکل سے سو گز کا احاطہ تھا جو شروع سے خدا بخش کے قبضے میں تھا۔ اس سے آگے بھی پرانے لوگوں کی بستی تھی۔ سب ماہی گیر تھے جو اب کوٹھیوں میں مالی یا چوکیدار ہو گئے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں اندر جھاڑ پونچھ اور برتن دھونے کا سارا کام کرتی تھیں... بعض کھانا بھی پکانے لگی تھیں... دولت مندوں کی ہر آبادی کے ساتھ ان غریب نچلے درجے کے سارے کام کرنے والوں کی ایک بستی تھی... عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں... اور شاید ایسے ہی رہیں گی۔

صحن کے بعد دو کمرے تھے۔ ایک میں نبی بخش بہت سے کاٹھ کباڑ کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرے بالکل الگ کمرے میں اس کا باپ خدا بخش اکیلا پڑا کھانستا اور چلاتا رہتا تھا۔ رانی پہلے یہاں نہیں آئی تھی۔ وہ خدا بخش کی آواز سن کے سہم گئی۔ ”یہ کون چلا رہا ہے... تمہارا باپ؟“

”ہاں... اس کی پروا مت کرو... وہ چیختا رہتا ہے... گالیاں دیتا رہتا ہے مجھے۔“ نبی بخش بولا۔

”خرگوش کہاں ہیں؟“ رانی کا دل ان ننھے منے بچوں کو ہاتھ میں اٹھانے کے لیے بے تاب تھا۔

”وہ کمرے میں... جب بڑے ہوجائیں گے تو باہر بھاگنے لگیں گے... ان کی طرح۔“ اس نے اِدھر اُدھر پھدکتے خرگوشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ... ڈرو نہیں۔“

نبی بخش نے دروازہ کھولا۔ ”آؤ اندر آؤ۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”یہ... دروازہ کھلا رہنے دو۔“ رانی نے ایک بے نام سے خوف کو اپنے وجود میں اترتا محسوس کیا۔

”یہ دیکھو... لو اپنے ہاتھ میں لو... دیکھو چھو کے... کتنا نرم اور گرم ہے۔“

رانی نے خرگوش کو ہتھیلی پر رکھ لیا... نبی بخش نے دوسرا خرگوش اس کے دوسرے ہاتھ پر احتیاط سے رکھا۔ ”یہ تم لے جانا جاتے وقت... مگر انہیں دودھ میں پانی ملا کے پلانا... بوتل ہے تمہارے گھر میں؟“

رانی نے خرگوش واپس کردیے۔ ”ابھی نہیں... بعد میں لے جاؤں گی انہیں... اب چلو۔“

وہ مکروہ انداز میں ہنسا۔ ”اتنی جلدی کیا ہے... گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

رانی نے بدحواسی میں کہا۔ ”نہیں بس اب واپس چلو... ماما ناراض ہوں گی... بہت دیر ہوگئی۔“

”کوئی دیر نہیں ہوئی... لو... بارش شروع ہوگئی... اب تمہیں رکنا پڑے گا۔“

”میں جاؤں گی... تمہاری گاڑی جو ہے۔“ رانی نے ضد کی۔

وہ عجیب طرح سے ہنسا۔ ”گاڑی... میری گاڑی بارش میں بند ہوجاتی ہے... تھوڑی دیر انتظار کرلو۔“

وہ باہر نکل کے کھڑی ہوگئی۔ ”کوئی بات نہیں... تم نہیں جاؤ گے تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔“

”دیکھو ضد کرنا بُری بات ہے... بس یہ بارش رک جائے... اچھا رکو... میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں مگر بارش کتنی تیز ہے اور جس طرف سے ہم آئے تھے... ادھر نشیب ہے۔“

”نشیب کیا ہوتا ہے... میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ ”ادھر گلی نیچی ہے... سارا پانی ادھر جاتا ہے... گاڑی ادھر سے نہیں جاسکتی... تم بھی جاؤ گی تو ڈوب جاؤ گی... ہاں، بارش رکنے کے بعد پانی اتر جاتا ہے... اچھی بچی... اندر چلو۔“

وہ پھر اندر چلی گئی۔ ”دوسری طرف سے بھی تو راستہ ہو گا... جدھر وہ نہیں ہے... نشیب۔“

”ہاں... اگر بارش نہ رکی تو پھر ہم سیدھے آگے سے چکر لگا کے جائیں گے۔ یہ راستہ لمبا ہے۔ گلی آگے جا کے سمندر کی طرف گھوم جاتی ہے۔ ریت گیلی ہوگی ابھی... گاڑی پھنس جائے گی۔ کوئی دھکا لگانے والا بھی نہیں ملے گا۔ بس تھوڑی دیر

انتظار کرلو... یہ لو خرگوش... ان سے کھیلو۔" اس نے دروازہ بند کردیا۔

☆☆☆

حامد علی خاں ایک بے حد بھاگ دوڑ والی خطرناک لیکن دلچسپ نوکری کے پینتیس سال اور پھر کنٹریکٹ پر تین سال کی توسیع حاصل کرنے کے بعد بالآخر ساٹھ سال کی عمر میں گھر بھیج دیے گئے۔ اب وہ بالکونی میں بیٹھ کے بارش کا نظارہ کررہے تھے۔

صبح گھنٹا بھر عادت کے مطابق اخبار کی آخری سطر تک تمام اشتہارات، کالم اور اعلانات پڑھنے کے بعد انہیں خیال آتا تھا کہ اب کیا کریں۔ ہوم تھیٹر پر فلم لگائی تو گھنٹا بھر چلے گی پھر لوڈ شیڈنگ کا وقفہ... موسیقی تو ہے رات کی چیز... اخبار پڑھنے کے بعد کتاب پڑھنا ایسا لگتا تھا جیسے آئس کریم کھانے کے بعد قلفی کھانا... چودھری الطاف دوسرے تیسرے دن آتا تھا... وہ شطرنج کی بازی لگا کے بیٹھ جاتے یا گاڑی لے کر نکل جاتے تو شہر کی سڑکوں پر نظارے دیکھ کے کسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتے۔

چودھری خالص زمیندار تھا اور اس کے بیٹے صنعت کار بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے رہائش کے لیے گاؤں کے بجائے اسلام آباد کا انتخاب کیا تھا اور کراچی آتے جاتے رہتے تھے۔ چودھری کو انہوں نے بالکل چھٹی دے دی تھی کہ جہاں چاہے جائے، جو چاہے کرے۔ اب دونوں مل کر بیٹھتے تھے تو ایک ہی رونا ہوتا تھا کہ یار کہاں جائیں... کیا کریں... پیسا ہے تو خرچ کہاں کریں... عورت، شراب اور جوئے کی لت ہوتی تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑتا... اکیلے لندن یا سنگاپور جا کے بھی کیا کریں... دونوں کی بیویوں نے منہ سر لپیٹ کے پنج وقتہ نماز اور وظیفے شروع کردیے تھے اور وہ ان کے ساتھ عمرہ، حج بھی کرچکے تھے، اب بس باتیں رہ گئی تھیں۔ چنانچہ دونوں عمرِ رفتہ کو آواز دے کر دل بہلاتے تھے۔

ایک بال دھماکے سے میز پر گری۔ میز پر بچھی شطرنج کی بساط کے سارے مہرے بکھر گئے، کچھ نیچے گر گئے۔ بال کا دعویدار دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ "سوری... ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔" اس نے بال کرسی کے نیچے سے نکالی۔

وہ لاجواب ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ "کیا بات ہے؟"

"یہ لڈو آخر گول کیوں ہوتا ہے... برفی کی طرح چوکور کیوں نہیں ہوتا؟" وہ بیٹ گھمانے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم... اپنی ماما سے پوچھو۔" وہ مسکرا کے شفقت سے بولے۔

"ماما کہتی ہیں کاکا سے پوچھو... پولیس والوں کو سب معلوم ہوتا ہے... ورنہ وہ معلوم کرلیتے ہیں۔"

"اب میں پولیس والا نہیں ہوں۔ ڈیڈی سے پوچھو... وہ پولیس میں ہیں۔"

"پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں منہ گول ہوتا ہے... اس لیے لڈو گول بناتے ہیں مگر پھر برفی گول کیوں نہیں بناتے؟ یہ پوچھا تو ڈانٹ کے بھگا دیا کہ میں کوئی حلوائی نہیں ہوں... یہ حلوائی کیا ہوتا ہے کاکا؟"

اگر اسی وقت کال بیل نہ بجتی تو حامد علی خاں بھی اپنے لاجواب کرنے والے لاجواب پوتے کو ڈانٹ کر بھگانے پر مجبور ہوجاتے... وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میرا خیال ہے چودھری انکل آگئے... بارش کے باوجود۔"

اندر سے ان کی بہو نے پکارا۔ "ڈیڈ... آنٹی رضیہ اور انکل آئے ہیں۔" تو انہیں کچھ مایوسی ہوئی... وہ چودھری کے انتظار میں بساط جمائے بیٹھے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

کرامت علی اور ان کی بیوی رضیہ سلطانہ ایک ہی صوفے پر بالکل سیدھے بیٹھے تھے۔ پریشان اور بدحواسی کی تصویر بنے... کرامت علی اپنی انگلیاں چٹخا رہے تھے اور ان کی بیگم کی آنکھیں پھر برسنے کے لیے تیار نظر آتی تھیں۔ وہ تین سال سے ان کے زینے پر بالکل سامنے والے فلیٹ میں رہتے تھے اور بہت شریف اور بے ضرر ہمسائے تھے لیکن ان سے میل جول بہت کم تھا۔ میاں بیوی دونوں سوشل نہیں تھے اور گھر سے بھی بہت کم نکلتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی کبھی اسکول سے آتے جاتے نظر آجاتی تھی۔ گزشتہ تین سالوں میں ان سے ملاقات صرف عیدبقرا عید ہی ہوتی تھی چنانچہ حامد علی خاں کو اس وقت ان کے آنے پر تشویش کا لاحق ہونا جائز تھا۔

"خیریت ہے کرامت صاحب۔" انہوں نے ہاتھ ملانے کے بعد قریب والے صوفے پر بیٹھ کے کہا۔ "پریشان لگ رہے ہیں آپ۔"

"وہ... دراصل... ہماری بیٹی رانی... اسے دیکھا تو ہوگا آپ نے۔" کرامت صاحب نے گھبراہٹ میں کہا۔

باقی بات ان کی بیگم نے آنسوؤں کے ساتھ کی۔ "پتا نہیں وہ کہاں چلی گئی... تین گھنٹے بعد آئی ہے تو ایک نئی مصیبت۔"

"بیگم... میں بتاتا ہوں ساری بات۔" کرامت صاحب نے بیوی کو ہمدردی سے روکا۔

حامد صاحب نے سر ہلایا۔ "آپ روئیں نہیں... افشاں بٹیا ذرا پانی لاؤ... اور پھر چائے۔" انہوں نے دروازے تک جا کے کچن کی طرف رخ کرتے ہوئے آواز لگائی اور پھر اپنی جگہ آبیٹھے۔

"رانی... یہ ہماری بیٹی کا نام ہے۔"

"مجھے معلوم ہے... بہت پیاری بچی ہے... میرے پوتے کمال کے ساتھ بہت دوستی ہے اس کی۔"

"شام کو انہوں نے اسے بھیجا کہ ہارڈ ویئر شاپ سے کسی کو لے آئے... کچھ کنڈیاں اور قبضے گل گئے تھے... دراصل فون خراب تھا اور فون پر ایسے چھوٹے چھوٹے کام کے لیے وہ آتے بھی نہیں۔" کرامت صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں... کہ بچوں کو کہیں اکیلا بھیجتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

ان کی بیگم نے کچھ تردید کے انداز میں کہا۔ "یہ تو محلے کی بات تھی... ادھر بھی بچے بچیاں جاتے رہتے ہیں چھوٹا موٹا کام ہو تو۔"

کرامت صاحب نے پھر بات شروع کی۔ "خان بابا کی دکان تک کیا فاصلہ ہے... مشکل سے دس منٹ کا... اور بازار ہے... عورتیں ہی سب سودا سلف لاتی ہیں... کبھی ایسی کوئی بات ہوئی نہیں تھی آج تک... آدھا گھنٹا گزر گیا تو کچھ فکر ہوئی۔"

"میں تو بھائی حامد مجبور تھی... ایک گھٹنے میں اتنی تکلیف تھی ورنہ خود جاتی۔" رضیہ نے کہا۔

کرامت صاحب نے کہا۔ "لوڈ شیڈنگ نے الگ زندگی عذاب کررکھی ہے... لفٹ بند تھی... پھر بھی میں سیڑھیاں اتر کے گیا... خان بابا کی دکان پر بورڈ لگا تھا وقفہ برائے نماز... وہ عصر کی نماز پڑھ کے آیا تو میں نے پوچھا... وہ رانی کو جانتا ہے... اس نے کہا کہ وہ تو ایک گھنٹا پہلے آئی تھی... اور اس نے رانی کو بھیج دیا تھا انیس نمبر بنگلے پر... اگلی اسٹریٹ میں اس ہاتھ پر... وہاں اس کا پلمبر اور کارپینٹر لال بادشاہ کام کررہا تھا... رانی کو چاہیے تھا کہ پیغام چھوڑ کے واپس آجاتی... وہ چلی گئی انیس نمبر بنگلے پر... میں وہاں گیا تو ایک ماسی نے بتایا کہ ہاں کوئی لڑکی آئی تھی... لال بادشاہ سے بات کرکے چلی گئی تھی... میں نے کہا کہ اچھا لال بادشاہ کو بلاؤ تو پتا چلا کہ وہ تو کام نمٹا کے دس منٹ بعد ہی چلا گیا تھا۔"

حامد صاحب نے تشویش سے کہا۔ "کیا رانی ابھی تک گھر نہیں آئی ہے؟"

رضیہ نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کردیا۔ "حامد بھائی... ہم کیا کریں... رانی کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

افشاں ایک ٹرے میں پانی اور چائے کے کپ لے کر آئی۔ "کیا ہوا رضیہ آنٹی؟" اور ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

کرامت صاحب نے پھر انگلیاں چٹخائیں۔ "اس کا کچھ پتا نہیں... لال بادشاہ کا... وہ کہاں رہتا ہے... میں نے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں سے پوچھا... انیس نمبر بنگلے کے چوکیدار نے کہا کہ وہ نبی بخش سے بات کررہی تھی... اس کی گاڑی کے پاس کھڑی۔"

"یہ نبی بخش کون ہے؟"

"وہی جو یہاں سے کوڑا کرکٹ اٹھاتا ہے... گاڑی میں بھر کے لے جاتا ہے... ایک بہت پرانی سوزوکی پک اپ ہے اس کے پاس... نیم پاگل سا آدمی ہے۔"

حامد علی نے سر ہلایا۔ "اس کا دماغ کچھ کمزور ہے... کوئی پیدائشی عارضہ ہے... لیکن پاگل بہرحال نہیں ہے... اور وہ تو کئی سال سے آرہا ہے... سب جانتے ہیں اسے... ہر وقت یہیں تو نظر آتا ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے... اکثر مجھے وہی سودا سلف لا دیتا ہے... ذرا اسے سمجھانا پڑتا ہے... لکھ کر دیتی ہوں کہ کیا لانا ہے... کتنے پیسے لے کر جارہا ہے... گڑبڑ اس نے آج تک نہیں کی... ایک پیسا ادھر سے ادھر نہیں کیا مگر چالیس سال کا ہونے کے باوجود نہ شادی کی ہے اور باتیں بھی عجیب بچوں جیسی کرتا ہے... بڑی مشکل سے بات سمجھتا ہے۔"

"ہاں، یہ مسئلہ ہے اس کے ساتھ... مگر میں اس پر شک نہیں کرسکتا کہ وہ رانی کو لے گیا ہوگا... خود رانی اتنی سمجھدار ہے کہ اس کے ساتھ نہیں جاسکتی۔" کرامت صاحب نے کہا۔

"یہ نبی بخش رہتا کہاں ہے؟"

"آگے پرانے مچھیروں کی آبادی ہے... اس میں کہیں رہتا ہوگا۔ مچھلی پکڑنے تو اب کوئی نہیں جاتا شاید... وہاں جو رہتے ہیں سب گھروں میں کام کرتے ہیں... ہمارے آپ کے گھروں میں... چوکیدار نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ خدا بخش بھی ساتھ رہتا ہے۔ اسے سب جانتے ہیں... وہ بہت بیمار ہے اور بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ نبی بخش ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ خیر، میں تلاش کرتا نبی بخش کے گھر گیا... دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ انہوں نے رو رو کے بُرا حال کیا ہوا تھا۔ میں خود بھی سخت پریشان تھا... اوپر سے بارش شروع ہوگئی۔ خیر، میں اس کے گھر پہنچ گیا تو وہاں نہ نبی بخش تھا نہ رانی

تھی... ہاں اس کے مفلوج بیمار باپ نے کہا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ آیا تھا... اسے خرگوش کے بچے دکھا رہا تھا دوسرے کمرے میں... پھر وہ کہاں گیا... یہ خدا بخش کو بھی معلوم نہیں۔"

"خرگوش کے بچے؟" حامد صاحب نے کہا۔ "کیا رانی کو شوق ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے... وہ دیوانی ہے... کبھی بلّی کے پیچھے... اس نے بچے دے دیے تھے ہمارے گھر میں... اب پھر چکر لگا رہی ہے اور رانی پھر چاہتی ہے کہ انہیں پالے... کتنی مصیبت ہوتی ہے بلّی کو گھر میں رکھنا... مگر وہ سمجھتی ہی نہیں... مگر حامد بھائی... ابھی تو مجھے رانی کی فکر ہے۔"

"پریشان نہ ہو بھابی... وہ آجائے گی۔"

"کب آجائے گی؟" رضیہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ "تین گھنٹے ہو گئے... بارش بھی اب تو تھم چکی ہے مگر میری بچی کا کچھ پتا نہیں۔ وہ پاگل کہاں لے گیا اسے... سوچ سوچ کے میرے دل میں ہول اٹھتا ہے۔"

کرامت نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں... بچے اغوا ہو رہے ہیں... اور بہت کم عمر بچیاں... کیسی کیسی خبریں آتی ہیں اخباروں میں۔"

رضیہ نے ایک چیخ ماری۔ "خدا کے لیے ایسی بات منہ سے نہ نکالو... میری معصوم بچی... اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔"

گم صم بیٹھی افشاں نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا۔ "آنٹی پلیز حوصلہ رکھیں... اسے کچھ نہیں ہوگا..."

رضیہ نے پانی پی کے پھر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ "میں کیا کروں بھائی صاحب... کہاں تلاش کروں اسے؟"

کرامت نے کہا۔ "ہم آپ کے پاس مدد اور مشورے کے لیے آئے ہیں... کیا کرنا چاہیے ہمیں... پولیس میں رپورٹ لکھوانے جائیں تو بدنامی الگ... وہ کہیں گے ابھی تین گھنٹے ہی تو ہوئے ہیں۔"

حامد علی نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ "چوبیس گھنٹے سے پہلے وہ لاپتا ہونے کی رپورٹ نہیں لکھتے... میرے کہنے سے لکھ لیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں... وہ کچھ کریں گے نہیں۔"

کرامت نے کہا۔ "دس سال کیا عمر ہوتی ہے... وہ واقعی بچی ہے ابھی... مگر جو واقعات ہم نے سنے ہیں... ان سے تو لگتا ہے کہ انسان اب حیوان سے بھی بدتر ہو گیا ہے... اور جو اسے لے گیا ہے وہ تو ذہنی مریض ہے۔"

"کرامت صاحب... وہ ایسا نہیں ہے... میں پھر کہوں گا... میں اس کی حمایت نہیں کر رہا ہوں، میں نے دنیا دیکھی ہے۔ وہ خود ایک معصوم بے ضرر بچے جیسا ہے... پھر بھی وہی بتا سکتا ہے رانی کے بارے میں۔"

کرامت صاحب خلا میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "بس ایک بار وہ میرے ہاتھ آجائے... پھر سب پتا چل جائے گا۔"

کرامت صاحب کی بات ان کے ہونٹوں پر ٹوٹ گئی... رانی بڑی خاموشی سے اندر آئی اور انہیں حیرانی اور خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "ماما... آپ یہاں ہیں؟"

رضیہ بگولے کی طرح اٹھی... ایک چیخ مار کے اس نے رانی کو لپٹا لیا پھر روتے روتے اس نے رانی کو مارنا شروع کر دیا۔ "ماما کی بچی... کہاں تھی تُو... بول... کہاں گئی تھی؟"

کرامت نے ایک دم اٹھ کے رانی کو ماں سے چھڑایا اور اپنے ساتھ لپٹا لیا... رانی اپنی ماں کے اس سلوک کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ "ماما نے کیوں مارا ہے مجھے پاپا... بتائیں نا مجھے۔"

رضیہ نے کہا۔ "گلا گھونٹ دوں گی میں تیرا۔" وہ اب بھی رو رہی تھی۔

جذبات کا درجۂ حرارت معمول پر آیا تو رانی نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔ وہ خرگوش کے بچے دیکھنے نبی بخش کے ساتھ گئی تھی پھر بارش شروع ہو گئی... گلی میں نشیب کی طرف پانی بھر جاتا ہے... "نبی بخش مجھے واپس گھر چھوڑنے کے لیے آگے سے لمبا چکر لگا کے آیا۔ اس کی گلی آگے سے گھوم کے ساحل کی طرف نکل جاتی ہے... وہ ادھر سے آیا تھا... اور ڈر رہا تھا کہ اس کی گاڑی بند نہ ہو جائے۔"

"وہ ذلیل... شیطان تجھے لے کر ہی کیوں گیا تھا زبردستی؟" رضیہ نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"ماما... میں خود گئی تھی... اس نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی... مجھے خرگوش کے بچے دیکھنے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دو مجھے دے گا۔ وہ میں لے آئی ہوں... گھر میں ہیں مگر ماما..." رانی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

حامد صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔ "مگر کیا رانی! کیا نبی بخش نے کوئی ایسی بات کی جو تمہیں بُری لگی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "جب ہم واپس آرہے تھے..." وہ پھر رک گئی۔

"تو کیا ہوا... مجھے بتاؤ بیٹا۔" کرامت صاحب نے محبت سے اس کے سر پر پیار کیا۔

"پاپا... وہاں... سمندر کے کنارے... ایک عورت لیٹی ہوئی تھی... بارش میں... اور کوئی نہیں تھا... اور... اور پاپا... اس عورت نے کپڑے بھی نہیں پہن رکھے تھے... ایسے کون کرتا ہے... نبی بخش گاڑی سے اتر کے اسے دیکھنے گیا تھا... پھر واپس آگیا۔"

☆☆☆

ناشتے کی میز پر بوبی نے اعلان کیا۔ "کاکا! میں اسکول نہیں جاؤں گا۔"

حامد صاحب نے چائے کا گھونٹ لینے کے لیے اخبار ہٹایا۔ "کیوں بھئی... کیا ناراضی ہے اسکول سے؟"

افشاں نے اسے ڈانٹا۔ "ناشتا کرو جلدی سے... وین آنے والی ہے۔"

"جب مجھے اسکول جانا ہی نہیں تو ناشتا کیوں کروں؟" حامد صاحب کے پوتے نے اپنی دانست میں بڑی منطقی بات کی۔ "میں اسکول جاؤں گا اگر کاکا مجھے چھوڑنے جائیں... وین میں نہیں جاؤں گا۔"

حامد صاحب ہنسے۔ "کیوں... وین میں کیا خرابی ہے؟"

"صوفیہ روز میرے کان کھینچتی ہے... کہتی ہے کان چھوٹے ہیں اور ناک بڑی ہے۔ جب کان بڑے ہو جائیں گے تو وہ ناک کو پلاس سے دبا کے چھوٹا کرے گی۔"

"کل تم نے بھی تو اس کی چٹیا کھینچی تھی کہ چھوٹی ہے... چلو ختم کرو ناشتا۔" افشاں نے کہا۔ "اور بیگ اٹھاؤ۔"

"نو ماما... وہ آج پلاس لائے گی۔" بوبی نے فریاد کی۔

دادا کے ساتھ کار میں اسکول جانے کے لیے ایک دو بار بوبی کوئی ڈراما کرتا تھا... ان کے اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ خود بھی ہر روز اسے اسکول لانے لے جانے کی ذمے داری قبول کرتے... ان کے لیے اس ڈیوٹی میں بڑی خوشی تھی مگر ان کا بیٹا اور بوبی کا باپ اجازت نہیں دیتا تھا کہ حامد صاحب ایسا کریں۔ آسانی کے لیے وین ہے ورنہ یہ کام افشاں بھی کر سکتی ہے مگر بعض اوقات مشکل ہو جاتی ہے... کوئی کام پڑ جائے... طبیعت خراب ہو تو بوبی کیسے آئے گا۔ وہ کہتا تھا... تاہم ہفتے میں ایک آدھ دن وہ دادا پوتے کے درمیان حائل نہیں ہوتا تھا۔ بوبی کو یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ واپسی پر کاکا سے کچھ بھی ڈیمانڈ کر سکتا تھا... آئس کریم... پوپ کورن... برگر... اور اس کا مطالبہ پورا نہ کرنا حامد صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ بوبی کو چھوڑ کے واپس آئے تو افشاں نے دروازے پر ہی سرگوشی میں کہا۔ "چودھری انکل آئے بیٹھے ہیں۔"

حامد صاحب کو حیرانی ہوئی۔ "اتنی صبح صبح۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔ "اوئے چودھری... کیا بھابی نے صبح صبح گھر سے نکال دیا؟ یا رات بھر نیند نہیں آئی بازی ہارنے کے خوف سے... بوتھا کیوں لٹکا ہوا ہے؟"

خلافِ معمول چودھری کا بوتھا لٹکا رہا۔ "نہیں یار! یہ بات نہیں... وہ فاطمہ رات گھر نہیں آئی۔"

حامد صاحب کا ذہن ایک دم اپنے پڑوسی کرامت کی طرف گیا... اس کی بچی تین گھنٹے غائب رہی تھی تو میاں بیوی روتے پیٹتے ان کے پاس آگئے تھے اور صبح چودھری پہنچ گیا کہ بیٹی گھر واپس نہیں آئی... یک نہ شد دو شد... وہ پولیس افسر تھے مگر اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ لوگ پھر بھی ہر معاملے میں ان سے مدد مانگنے آجاتے تھے۔ چودھری کی بات بہرحال مختلف تھی، وہ ان کا دوست تھا۔

چودھری کے قریب بیٹھ کے انہوں نے پوچھا۔ "فاطمہ گئی کہاں تھی کہ تُو اتنا اپ سیٹ ہے؟"

چودھری نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "وہ کہہ کے گئی تھی کہ اس کے کالج کی ایک لڑکی ہے ثریا... میں جانتا ہوں اسے... اس کے بھائی کی منگنی ہو رہی ہے... لڑکی والے آرہے تھے اسے دیکھنے... ثریا نے فاطمہ کو بھی بلا لیا... رات بارش بھی ہوئی تھی... کھانا ختم ہونے اور مہمانوں کے رخصت ہوتے ہوتے گیارہ کے بارہ بھی بج جاتے ہیں... ہر جگہ دیر سے پہنچنا تو اب معمول ہو گیا ہے۔ خصوصاً شادی کی کسی بھی تقریب میں عورتیں اپنی تیاری میں اتنی دیر کرا دیتی ہیں... تو میں نے سوچا کہ فاطمہ وہیں رک گئی ہوگی۔ ثریا نے کہا ہوگا کہ صبح چلی جانا... اس کے بھائی کو ہی آنا پڑتا رات بارہ بجے کے بعد فاطمہ کو چھوڑنے... تو ہم نے بھی پروا نہیں کی... صبح اس کی ماں نے ثریا کے گھر فون کیا، ویسے بھی تشویش کی بات کوئی نہیں تھی... کالج سے فاطمہ بھی چھٹی کر لیتی تھی اگر ضرورت ہو ورنہ وہ ریگولر تھی... خیر... ثریا نے بتایا کہ فاطمہ تو آئی ہی نہیں تھی۔"

حامد صاحب چونکے۔ "کیا مطلب... وہ ثریا کے گھر کا کہہ کے گئی تھی مگر..."

چودھری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پریشانی یہی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتی کہیں جانے کے لیے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ایسی کسی جگہ جاتی ہی نہیں جہاں اس کا جانا مناسب نہ ہو۔ ہم نے بھی کبھی روکا نہیں... اس کے کالج میں ٹریننگ کے سیشن

ہوتے تھے... میچ ہوتے تھے... وہ وہیں ہوتی تھی لیکن یار... لڑکے ہوں یا لڑکیاں... ماں باپ سارے ہی اس خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ وہ بڑے سیدھے، سچے اور شریف ہیں... ہم خود چکر دیتے تھے ماں باپ کو بڑے معصوم بن کے۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد حامد صاحب نے کہا۔ ''تو نے ناشتا کیا؟''

اسی وقت افشاں نے انہیں بلا لیا۔ ''آجائیں ناشتا لگا دیا ہے۔'' اور حامد صاحب اپنے دوست کو کھینچ کر لے گئے۔

''تمہارے میاں جی کہاں ہیں؟'' حامد صاحب نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''وہ رات بہت دیر سے آئے تھے، سو رہے ہیں۔'' افشاں نے انہیں مطلع کیا۔ ''انکل کیا لیں گے آپ؟''

''پتر ہم دیسی بندے... یہ توس وغیرہ نہیں پراٹھے کھائیں گے تمہارے ہاتھ کے... اور ساتھ کیا ہے...؟ اچھا پائے ہیں... پھر تو واہ واہ ہو گئی۔'' چودھری نے کہا اور پھر اپنے موبائل فون کی گھنٹی پر متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں... میں ادھر ہوں حامد کی طرف اور کہاں... فاطمہ کا پتا چلا... اچھا رب خیر کرے گا... آجائے گی... آجائے گی... کوئی ننھی بچی نہیں ہے۔''

زبان سے ایسا کہنے کے باوجود اندر سے چودھری بھی مضطرب تھا۔ اس نے افشاں کے اصرار پر آدھا پراٹھا کھا لیا ورنہ وہ پائے کے ساتھ دو پراٹھے نگلنے والا بندہ تھا۔ اسے خاموش اور متفکر دیکھ کے حامد صاحب نے بھی ناشتا مختصر کیا اور چائے کا مگ لے کر واپس ڈرائنگ روم میں آگئے۔ چودھری نے کہا۔ ''یار حامد! سب جگہ سے تو پوچھ لیا میری بیوی نے... کیا پولیس میں رپورٹ لکھوا دیں... اس کا موبائل فون بھی بند جا رہا ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ...'' حامد صاحب نے ایک خیال کو نامکمل چھوڑ دیا۔

''میں سمجھ گیا تو کیا سوچ رہا ہے... وہ تو میں نے بھی سوچا ہے اور بہت زیادہ سوچا ہے اس بارے میں... ہر جوان لڑکی کے غائب ہونے پر ایسا سوچنا پڑتا ہے سب کو کہ وہ کسی کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔''

''بُرا ماننے کی ضرورت نہیں چودھری! کیا ایسا فاطمہ کے ساتھ ہونا کوئی ناممکن بات ہے... میں تیرا دوست سہی مگر پولیس والا بھی ہوں... میری اپنی بیٹی یوں چلی جاتی تو سب سے پہلے یہی خیال آتا۔''

''فاطمہ کسی کے ساتھ نہیں گئی۔'' چودھری نے دیوار کو گھورتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

''کیسے معلوم ہے؟''

چودھری نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس لیے معلوم ہے کہ وہ ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی... ماں باپ کے سامنے لڑکیاں ایسی بات نہیں کرتیں جیسے مغربی معاشرے میں اسکول کے وقت سے ان کے بوائے فرینڈ ہوتے ہیں تو وہ بڑے فخر سے سب کو بتاتی ہیں۔ انہیں گھر لاتی ہیں اور ان کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہیں... ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ... یہاں لڑکی بی اے، ایم اے ہو یا ڈاکٹر بن جائے... اتنی ہمت نہیں رکھتی کہ ماں باپ کے سامنے بات بھی کر سکے کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے۔''

''چودھری... تو جس دنیا میں رہتا ہے...''

چودھری نے برہمی سے کہا۔ ''بکواس مت کر میرے سامنے... وہی دنیا ہے میری بھی جو تیری ہے اور میں کھلی آنکھوں سے سب دیکھتا ہوں۔ یہ کیبل... انٹرنیٹ اور موبائل فون... ان سے کچھ نہیں ہوتا... ہم اور تم کون سے فرشتے تھے... اب آسانی زیادہ ہے اور پابندیاں کم ہیں... پھر بھی تیرے میرے خاندان میں کسی لڑکی نے پسند کی شادی کی؟ یا ہم سے کہا کہ میں خودمختار ہوں... آپ کون ہوتے ہیں زبردستی مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا فیصلہ کرنے والے... بے شک وہ دن بھی آجائے گا اگلی صدی کے آنے سے پہلے مگر ابھی وہ چیز عام نہیں ہے جسے ہم بے حیائی کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں۔''

''چودھری، فاطمہ کسے پسند کرتی تھی؟'' حامد صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چودھری نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہے ایک انجینئر... اچھا لڑکا ہے... میں ملا تو نہیں اس سے مگر دیکھا ہے... ہم نے جب فاطمہ سے شادی کی بات کی تو اس نے ٹالا کہ ابھی بی اے کر رہی ہوں... یا پھر ایم اے کرنا ہے مجھے... اس کے لہجے اور اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے شک ہوا... مواقع تو تھے اس کے پاس... وہ کالج جاتی تھی اور ہاکی ٹیم میں تھی... ٹورنامنٹس میں ٹیم کے ساتھ جاتی رہی ہے۔''

حامد صاحب نے اعتراف کیا۔ ''اس کی صحت اور فٹنس واقعی قابلِ تعریف ہے... ہاں... تو بتا رہا تھا اس لڑکے کے بارے میں؟''

''میں نے اس کا موبائل فون چیک کیا... اس کو بتائے

بغیر... تو مجھے ایک نمبر ملا... دن میں دو چار کالز ہوتی تھیں... ادھر سے بھی اور فاطمہ کی طرف سے بھی... وہ نمبر میں نے نوٹ کر لیا... پھر میں نے ایک دو ایس ایم ایس پڑھ لیے... بات معیوب سہی... مگر لڑکیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے یار... مجھے اس لڑکے کا پتا چل گیا... وہ کمپیوٹر انجینئر ہے... ماں باپ اور خاندان معلوم نہیں کہاں ہیں... یہاں کسی ہاسٹل میں پے انگ گیسٹ کی طرح رہتا ہے... کہاں جاب کر رہا ہے اور کتنی تنخواہ لے رہا ہے... یہ بھی پتا چل گیا مجھے... عجیب یہ لگا کہ فاطمہ کے مقابلے میں اس کی صحت بڑی خراب ہے... دبلا پتلا ہے اور عینک لگاتا ہے... پڑھاکو قسم کا لگتا ہے... مقصود نام ہے اس کا۔''

''اس سے پوچھا تو نے؟''

''میں نے تو نہیں پوچھا مگر پتا کر لیا... وہ رات بھی وہیں تھا... ہاسٹل میں... اور اس وقت بھی اپنے آفس میں ہے... اب بتا میں کیا کروں... رپورٹ لکھوا دوں لاپتا ہونے کی؟''

حامد صاحب نے کہا۔ ''ابھی ٹھہر... کل رات ہمارے پڑوسیوں کی دس سال کی بچی بازار گئی تھی... واپسی میں ذرا دیر ہو گئی تو وہ بھی مجھ سے یہی پوچھنے آئے تھے مگر وہ خود ہی آگئی تھوڑی دیر میں... چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے پولیس رپورٹ نہیں لکھتی۔''

''چوبیس گھنٹے بھی گزر گئے... پھر... میں کیا بتاؤں گا پولیس کو... وہ تو ایسے سوالات کرتے ہیں۔''

''حوصلہ رکھ یار... خدانخواستہ اس کی ضرورت پڑی تو یہ بھی کر لیں گے... میں تیرے ساتھ ہوں... اور اس علاقے کا تھانہ وہی ہے جہاں آج کل انور ہے... میرا بیٹا... ابھی ایسا کرتے ہیں کہ... مقصود سے ملتے ہیں۔''

''وہ کس لیے... یار! وہ مجھے پہچانتا ہوگا... جیسے میں اسے پہچانتا ہوں... میری عزت کا سوال ہے۔''

''اچھا پھر تو گھر جا... بھابی کے پاس کون ہے... عائشہ...؟''

چودھری اٹھا۔ ''نہیں، وہ اپنی خالہ کے پاس گئی تھی پرسوں۔۔۔۔ اس نے اپنے لڑکے کی بات کی تھی... دبئی میں ہے وہ... میری بیوی کو پسند نہیں... لیکن آج کل آیا ہوا ہے۔''

''عائشہ اس سے ملنے کے لیے گئی ہے؟''

''شاید... وہ ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہے... فاطمہ کے مقابلے میں... تو جانتا ہے۔'' چودھری دروازے سے باہر نکل گیا۔

حامد صاحب بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ فاطمہ اور عائشہ کسی حد تک ایک دوسرے کی ضد ہیں... عائشہ بہت شوخ... شوقین مزاج اور تیز طرار تھی... اسے بننے سنورنے، اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا جیسے کہ سب لڑکیوں کو ہوتا ہے... وہ فاطمہ سے ایک سال آگے تھی مگر فاطمہ اس کے مقابلے میں خاموش طبع اور بُردبار تھی... سادگی پسند تھی اور الگ نظر آتی تھی... صرف صورت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے ہی نہیں، فاطمہ دراز قد اور مضبوط تھی اور اس کا رنگ گورا تھا... عائشہ سانولی اوسط سے کم قد کی اور دبلی پتلی تھی۔ ایک کی طبیعت میں سادگی اور ٹھہراؤ تھا تو دوسری حد درجہ شوخ اور پُرتصنع تھی۔ فاطمہ کو کھیلوں سے دلچسپی تھی، عائشہ کو پاپ میوزک سے۔ اس کے کانوں پر ہر وقت ہیڈ فون نظر آتے تھے... کوئی نہ بتاتا تو دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سگی بہنیں ہیں... اور وہ تھی بھی نہیں...

☆☆☆

اس نے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا... اتنی سی دیر میں چھوٹی والی گیارہ کے ہندسے کو کراس کر چکی تھی اور بڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اٹھارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ آخری بار اس نے فاطمہ کو گھر سے نکلتے وقت دیکھا تھا جب اس نے دروازے میں رک کر کہا تھا۔ ''امی! میں ثریا کے گھر جا رہی ہوں... دیر ہوگی واپسی میں۔''

''واپس کیسے آؤ گی...؟ ہم لینے آجائیں گے... فون کر دینا۔''

''امی پتا نہیں وہ کب آئیں... میں کھانا کھا کے ہی آؤں گی... ثریا کا بھائی چھوڑ جائے گا۔''

''تم تو کپڑے بھی ایسے پہن کے جا رہی ہو... آخر ثریا کو دیکھنے آرہے ہیں لوگ تو سب اچھے کپڑوں میں ہوں گے۔''

''میرے کپڑے ٹھیک ہیں... وہ مجھے دیکھنے نہیں آرہے ہیں۔'' اس نے کسی خیال کے تحت بیگ کھول کے چیک کیا۔ ''کیمرا میں لے جا رہی ہوں۔''

عائشہ نے ایک دم سامنے آکے کہا۔ ''امی... کیسی لگ رہی ہوں میں؟'' اس نے رنگین دوپٹے کو اپنے پیچھے دونوں ہاتھوں میں بادباں بنایا اور انگڑائی کے پوز میں مسکرائی۔

ماں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''عائشہ... تم دیکھ رہی ہو میں کتنی فکرمند ہوں... کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سے پوچھا نہ ہو... پوچھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے اب تو کہ لوگ نہ

جانے کیا مطلب نکالیں گے... بات کو پھیلتے دیر نہیں لگتی۔“

”اماں... تم ایسے ہی فکر مند ہو... یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ثریا کے بہانے کہیں اور گئی تھی... پتا چل جائے گا کس کے ساتھ تھی... ابھی آجائے گی اس کے ساتھ چور بنی ہوئی... کہے گی اماں... ہم نے شادی کرلی ہے۔“ عائشہ ہنسی۔

ماں چلائی۔ ”شرم نہیں آتی عائشہ ایسی بات کرتے ہوئے... بہن ہے وہ تیری۔“

”بہن سے پہلے وہ ایک جوان خوب صورت لڑکی ہے... اور اب یہ کوئی فلمی سین نہیں رہا... ہر روز ایسا ہوتا ہے۔ لڑکیاں جسے پسند کرتی ہیں، ان سے چھپ کر شادی کرنے پر مجبور کردی جاتی ہیں... کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ پاپ...“

”عائشہ! بس کر خدا کے لیے بس کر... وہ تیری جیسی نہیں ہے۔“

”یہی تو خرابی ہے اماں... میں تو ہوں صاف گو... منہ پھٹ کہو یا بدتمیز۔“ وہ گھوم کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے سراپا کو دائیں بائیں گھوم کے دیکھتی رہی۔ ”یہ جو ماسی دا پتر ہے دبئی والا... شہزادہ گلفام جو سات سمندر پار سے آیا ہے مجھے اڑن کھٹولے پر اڑا کے ساتھ لے جانے... کیا صورت پائی ہے ماشاء اللہ سے... لوڈ شیڈنگ میں سب کے سامنے کپڑے بدل لے تو کسی کو پتا نہ چلے... بڑی تیاری کی ہوگی اس نے... مگر میں نے سب فلمیں دیکھ رکھی تھیں جن کے ڈائیلاگ وہ بول رہا تھا۔“

”عائشہ! کچھ ہوش کے ناخن لے لڑکی... فرید ہرگز تیرے لائق نہیں ہے... بات صرف صورت کی نہیں... وہ جاہل بھی ہے... دسویں میں فیل ہوگیا تھا... خود کو بی اے پاس بتاتا ہے جھوٹا۔“

عائشہ ایک ایڑی پر پلٹی۔ ”پھر کیا ہوا اماں... وہ بدشکل ہے... جاہل ہے یا جھوٹا... پیسا کتنا ہے اس کے پاس... بلڈر ہے دبئی میں آج... لاکھوں میں کھیل رہا ہے... میں نے اس کی گاڑی دیکھی ہے... بی ایم ڈبلیو سیون سیریز... اور اس کا گھر... محل ہے محل۔“

”پتا ہے اس کا کردار کیسا ہے... شراب پیتا ہے... نہ جانے کتنی لڑکیوں کو دھوکا دے چکا ہے اسی طرح۔“

”اماں! یہ سب کرتے ہیں جوانی میں... اور جس کے پاس اتنی دولت ہو، وہ کیا فارغ وقت میں جائے نماز پر بیٹھ کے تسبیح پھیرے گا؟ شراب پیسے والے ہی پیتے ہیں۔ ہم جیسے کوک پر گزارہ کرلیتے ہیں۔ میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے، اس سے شادی کرکے دبئی چلی جاؤں گی پھر عیش ہی عیش... دوسری لڑکیوں سے مجھے کیا... یہاں بیویاں کڑھتی جلتی رہتی ہیں کہ شوہر نے نئی سیکریٹری رکھ لی ہے... بزنس ٹور کے بہانے اسے ملائیشیا ساتھ لے جارہا ہے... میری طرف سے وہ باہر جو چاہے کرے۔ میں بھی ایسا باندھ کے رکھوں گی کہ اوّل تو اسے کہیں جانے نہیں دوں گی... اور گیا تو میں بھی آزاد... خوب زیور کپڑے، گھومنا پھرنا۔“

”تو... سچ مچ شادی کرے گی اس سے؟“ ماں نے ڈر کے کہا۔

”ہاں اماں... پہلے سے اس لیے بتارہی ہوں کہ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی... کیا کرنا ہے صورت کو اگر جیب خالی ہو اور پی ایچ ڈی ہو مگر پھر رہا ہو دھکے کھاتا بسوں میں... پاکٹ فل ہونی چاہیے ڈالرز سے اور پاؤنڈز سے... یہ لڑکے کون سی رعایت کرتے ہیں... مانگتے ہیں حور پری... خاندان... سلیقہ... تعلیم سب کو رکھتے ہیں جوتی کی نوک پر۔“

”خدا کے لیے عائشہ... دفع ہوجا یہاں سے... تجھے ذرا فکر نہیں بہن کی... میں سوچ سوچ کے پاگل ہورہی ہوں... ابھی تک تیرے ابا بھی نہیں آئے۔“

عائشہ ہوا کے جھونکے کی طرح اٹھلاتی باہر نکل گئی... وہ صبح اپنی خالہ کے پاس سے آئی تھی اور تب سے ایسی ہی باتیں کررہی تھی... اور فاطمہ اپنے باپ جیسی تھی... آج وہ یہ فرق محسوس کرسکتی تھی۔ معلوم نہیں اب عائشہ کا باپ کہاں ہوگا۔ اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ایک ہی شہر میں ہونے کی وجہ سے وہ سال چھ مہینے میں کہیں نظر بھی آجاتا تھا۔ ابھی تک اس کا گیراج بھی وہیں تھا۔ اس کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی... سوائے اس کے کہ وہ بڈھا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے سر کے بال سامنے سے ختم ہوگئے تھے۔ وہ چودھری صاحب کو منع تو نہیں کرسکتی تھی کہ اس سڑک سے بھی نہ گزریں لیکن ایک دفعہ بڑی پریشانی ہوگئی تھی... عین اس کی ورکشاپ کے سامنے ان کی گاڑی بند ہوگئی۔

چودھری نے اسے دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں سیلف کو گھمانا جاری رکھا اور ساتھ ساتھ گاڑی کو... گاڑی بنانے والوں کو اور گاڑی کے موجد کو... سب پر خفا ہوتا رہا۔

اس نے کہا۔ ”کیوں پریشان ہورہے ہیں آپ... مشین ہے... ایک تار بھی نکل جائے تو گاڑی رک جاتی ہے۔“

”کون سا تار... تمہیں معلوم ہے؟ مکینک ہونا تم۔“

”میرے پاس تو واقعی گدھا گاڑی تھی... پرانی

مہران... میں جانتی ہوں... آپ سیلف مارتے رہے تو بیٹری بیٹھ جائے گی... پھر دھکے سے بھی اسٹارٹ نہیں ہوگی... آپ بونٹ کھولیں... میں دیکھتی ہوں۔“

وہ ہنس پڑے۔ ”تم دیکھو گی؟ مجھے تو خیر بونٹ کا بھی پتا نہیں کہ کہاں سے کھلتا ہے۔“

”اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف نیچے دیکھیں... ہاں... اسے کھینچ لیں... نشان بنا ہوا ہے اس پر۔“

”رہنے دو رہنے دو چودھرائن... سڑک پر تماشا بناؤ گی میرا... لوگ کہیں گے بیوی گاڑی ٹھیک کررہی ہے اور اتنی لمبی لمبی مونچھوں والا ہڈ حرام شوہر بیٹھا ہے۔“ وہ بولے مگر اس کے اصرار پر چودھری صاحب بونٹ کھول کے اس کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔

اسی وقت سڑک کے پار سے جمال نے اسے دیکھا اور جس گاڑی پر وہ کام کررہا تھا، اسے چھوڑ کے سیدھا ان کی طرف آگیا... عابدہ کا دل بیٹھ گیا... وہ بڑی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا مگر عابدہ نے اس سے نظر نہیں ملائی۔ ”کیا ہوگیا... بیگم صاحبہ... یہ گاڑی بھی نہیں چل رہی۔“ اس نے معنی خیز کمینے پن سے کہا۔

چودھری نے کہا۔ ”یار! دیکھو اس منحوس کو۔“

جمال نے پھر ذومعنی بات کی۔ ”کون منحوس؟ اچھا یہ گاڑی... اتنی خوب صورت چیز کو منحوس کون کہتا ہے... میں بھی سوچ رہا تھا۔“ وہ پھر عابدہ کو دیکھ کے مسکرایا۔ ”آپ تشریف رکھیں بیگم صاحبہ... یہ آپ کے قابو نہیں آئے گی۔“

عابدہ اندر جا بیٹھی مگر اس کا دل ایک انجانے خوف سے کانپتا رہا... جمال اپنی زبان کی کاٹ سے اس پر وار کررہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں چودھری صاحب کو شک نہ ہوجائے... بے شک وہ جانتے تھے کہ عابدہ نے ایک بدکردار، جاہل اور سفاک شوہر کے مظالم سے تنگ آکے عدالت کے ذریعے خلع حاصل کی تھی اور پھر اپنی بیٹی عائشہ کے لیے بھی عدالت سے احکامات حاصل کرلیے تھے کہ وہ اس کی تحویل میں رہے گی... خلع کے کیس میں بھی عابدہ نے سارے ثبوت گواہ عدالت میں پیش کردیے تھے کہ وہ ایک کالج میں پڑھتی تھی جب جمال نے اپنے بارے میں غلط بیانی کرکے اس سے شادی کرلی تھی... شروع کے چند سال اچھے گزرے تھے مگر عائشہ کے بعد اس کی اولاد نہیں ہوئی تو جمال اس کو پریشان کرنے لگا کہ مجھے بیٹا چاہیے... اس نے عابدہ کو تین بار ماں بننے سے پہلے ہی مجبور کردیا کہ وہ ہونے والے بچے سے نجات حاصل کرلے ورنہ وہ دوسری بیٹی پر اسے طلاق دے دے گا... اس نے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کرلیا تھا کہ وہ پھر بیٹی کو جنم دینے والی ہے... آخری بار تو عابدہ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی اور ڈاکٹر نے جمال کو دھمکی دے دی تھی کہ اسے جیل بھجوادے گی مگر اس نے رشوت اور دباؤ سے معاملہ آگے نہیں بڑھنے دیا تھا... اس وقت بھی وہ مکینک تھا اور تھانے کے کچھ افسروں کی گاڑیاں ٹھیک کرتا تھا۔

گاڑی ٹھیک کرتے وقت جمال کے جذبات کیا تھے... عابدہ کو خوب اندازہ تھا... جس عورت کو وہ جوتے مار کے گھر سے نکال چکا تھا، وہ تیس لاکھ کی گاڑی میں چودھرائن بنی بیٹھی تھی اور وہ نوکروں کی طرح اس کی گاڑی ٹھیک کررہا تھا مگر اس مقصد کے لیے وہ سڑک پار کرکے نہیں آیا تھا۔ اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ وہ کینہ پرور شخص چاہتا تھا کہ عابدہ کی زندگی کو پھر جہنم بنادے... بدقسمتی سے جمال کو یہ موقع خود چودھری صاحب نے فراہم کردیا... وہ پیاس بجھانے کے لیے کہیں سے ٹھنڈی بوتل لینے چلے گئے۔

جمال نے موقع پاتے ہی کہا۔ ”بڑی مہارانی بنی بیٹھی ہے کتیا... ابھی بتاتا ہوں تیرے خصم کو تیری حقیقت۔“

عابدہ اپنا دفاع کرنے والی بلی کی طرح شیرنی بن گئی... اس نے اپنی آواز میں زہر بھر کے کہا۔ ”بتادے... جو تیرا دل چاہے کہہ... اور پھر دیکھ میں انہیں کیا بتاتی ہوں... سمجھتا کیا ہے چودھری صاحب کو تو دو ٹکے کے مستری... تیرا یہ گیراج بلڈوز کرا کے تیرے گھر میں بھی آگ نہ لگوادوں اور تھانے میں تجھ پر ڈکیتی کے الزام میں مقدمہ درج نہ کرادوں تو میرا نام بھی عابدہ نہیں... تھانے سے تیری لاش ہی نکلے گی کُتے۔“

جمال ڈر گیا، اس کی ساری بدمعاشی ایک دھمکی سے نکل گئی۔ پھر چودھری صاحب آگئے اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ عابدہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اینٹ کا جواب اس نے پتھر سے دیا ورنہ جمال سے کچھ بعید نہ تھا، جھوٹ سچ سے اس کی پُرسکون زندگی میں زہر گھول دیتا... وہ خاموشی سے سو روپے لے کر لوٹ گیا مگر جاتے جاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہہ گیا تھا۔ عابدہ ڈر رہی تھی کہ جمال فون پر اسے بلیک میل نہ کرے۔ وہ جانتی تھی کہ جمال میں اتنی ہمت نہ تھی، وہ کینہ پرور آدمی بزدل بھی تھا۔ چودھری صاحب کو واپس آتا دیکھ کے عابدہ نے پوری کوشش کی تھی کہ نارمل نظر آئے مگر کچھ آگے جا کے چودھری صاحب نے اچانک سوال کرلیا۔ ”جمال کیا کہہ رہا تھا تم سے...؟“

وہ اچھل پڑی۔ ”آپ... آپ جانتے ہیں اسے؟“

وہ ہکلائی۔

چودھری مسکرایا۔ ''چودھرائن... تم کدو کر یلے بھی لیتی ہو تو دیکھ کر اور چن کر... تو کیا میں نے ایک بیٹی اور ایک بیوی کو ایسے ہی لے لیا تھا... آنکھ بند کر کے۔'' پھر اس نے عابدہ کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔ ''میں جتنا بے وقوف اور شریف نظر آتا ہوں، اتنا ہوں نہیں... پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''وہ... اس نے دھمکی دی ہے۔'' عابدہ نے شوہر کو سب سچ سچ بتا دیا۔

''اور تم کیا اس کی منت سماجت کرتی رہیں... ہاتھ جوڑ کے خدا رسولؐ کے واسطے دیتی رہیں۔''

عابدہ نے پورے اعتماد کے ساتھ وہ بھی بتا دیا جو اس نے جمال سے کہا تھا پھر وہ اس واقعے کو بھول گئی۔ ایک مدت کے بعد عابدہ کا پھر اس سڑک پر سے گزر ہوا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر نے جمال اور اس کے گیراج کو تلاش کیا مگر اس کی جگہ ایک ریسٹورنٹ دیکھ کر وہ رک گئی... شک کی کوئی بات نہ تھی... اسے معلوم تھا کہ اس کے سابق شوہر کی ورکشاپ کہاں تھی۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل لینے کے بہانے وہ کاؤنٹر تک گئی جہاں ایک گنجا پہلوان ٹائپ شخص گاہکوں سے پیسے لینے کے لیے بیٹھا تھا۔

''یہاں ایک موٹر ورکشاپ تھی، اس کا مالک تھا جمال دین۔''

پہلوان نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''وہ تو جی جیل میں ہے... یہ جگہ میں نے اس سے لی تھی۔''

''کیا جرم کیا تھا اس نے؟''

''وہ جی گاڑیاں چوری کر کے ان کے پرزے ورکشاپ میں استعمال کرتا تھا اور جس حصے پر نمبر ہوتا تھا، اسے پھینک دیتا تھا۔ یہ جگہ بیچ کے جتنا پیسا ملا، وکیل اور پولیس والے کھا گئے... سات سال کی جیل پھر بھی کاٹ رہا ہے۔'' اس نے چودھرائن کو غور سے دیکھا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہی ہو جی...؟''

''وہ... میں گاڑی ٹھیک کرانے آئی تھی بہت عرصے بعد۔'' وہ فوراً پلٹ گئی۔ جمال کے ساتھ وہی ہوا تھا جو عابدہ نے کہا تھا۔ جمال نے صرف دھمکی دی تھی، عابدہ کے شوہر نے بیوی کی جوابی دھمکی پر خاموشی سے کارروائی کی تھی۔ اس کے پیسے اور اثر رسوخ کا ایک موٹر مکینک کہاں مقابلہ کر سکتا تھا... اس نے تو دھمکی کا جواب دھمکی سے دے کر قناعت کر لی تھی اور اس بات کو بھول چکی تھی... اب پھر خوف کا ایک کانٹا سا اس کے دل میں ٹوٹ گیا جس کی خلش نے اسے بہت عرصہ پریشان رکھا کہ جمال اپنی سات سال کی قید بامشقت کاٹ کے نکلے گا تو پھن کچلے سانپ سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ اس کی ذلت، اذیت اور بربادی کی ذمے دار عابدہ اور صرف عابدہ تھی، وہ بدلہ ضرور لے گا۔ اس قسم کے مرد انتقامی جذبات کی کسی بھی انتہا تک جا سکتے ہیں۔ وہ عابدہ کے چہرے پر تیزاب پھینک دے۔ اس کی گاڑی میں دھماکا خیز یا آتش گیر مادہ رکھ دے جو اسٹارٹ کرتے ہی گاڑی کو تباہ کر دے... لیکن کیا چودھری کو ان باتوں کا اندازہ نہیں ہوگا؟ ہر وقت ہنسی مذاق کا عادی اور بے وقوف نظر آنے والا چودھری انتہائی ہوشیار... پُراسرار اور خطرناک تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا... وہ سیاست کے پُرشور طوفانی سمندر کا پرانا شناور تھا اور اس کی نظر آگے ہی نہیں پیچھے بھی دیکھتی تھی۔ وہ دوستوں کی دشمنی اور دشمنوں کی دوستی کے ہر انداز کو سمجھتا تھا۔

چودھری خاموشی سے اس کے سامنے آ بیٹھا تو وہ چونکی اور اپنے خیالوں کی دنیا سے نکل آئی ـــ چودھری نے اس کی اشکوں سے بھری سوچی ہوئی آنکھوں کے سوال کا جواب ایک گہری ٹھنڈی سانس سے نفی میں گردن ہلا کے دیا۔

☆☆☆

''نیو سنچری بزنس سولیوشن'' کا بورڈ عمارت کے باہر والے حصے پر سڑک کی طرف تھا جہاں ایک درجن سے زائد دیگر چھوٹے بڑے بورڈ تین منزلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ نئی عمارت تھی جس کا چوتھا فلور مکمل تھا مگر خالی پڑا تھا اور ٹاپ فلور کے سریے نکلے پلر ظاہر کرتے تھے کہ ٹاپ فلور پر کنسٹرکشن رکی ہوئی ہے۔ گراؤنڈ پلس فور کی عمارت میں لفٹ لازمی نہیں تھی... وہ سیڑھیوں سے اوپر گئے اور کسی سے پوچھے بغیر سیکنڈ فلور کے کاریڈور میں ''این سی بی ایس'' کے آفس ڈور تک پہنچ گئے۔ اس چھوٹے سے کاروباری ادارے میں سیکیورٹی یا ریسیپشن پر نئے آنے والوں سے سوال جواب کا کوئی نظام نہ تھا۔ ایک چپراسی نے اشارے سے بتا دیا کہ مقصود کہاں ملے گا۔

وہ ایک چھوٹے سے کیبن بلکہ کیوبکل میں اکیلا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے آگے پیچھے ایسے بہت سے چار فٹ اونچے گلاس پارٹیشن والے کیبن تھے جن میں سب کو اپنی پرائیویسی میں یکسوئی سے کام کرنے کی سہولت حاصل تھی... کیبن کی لمبائی چھ فٹ تھی اور اس میں میز کے دوسری طرف صرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔

''مسٹر مقصود ملک؟'' حامد علی خاں نے اندر جھانک کر

کہا۔ ''میں آپ کا ایک منٹ لے سکتا ہوں؟''

اس نے سر اٹھا کے نو وارد کو دیکھا۔ ''آیئے پلیز... بیٹھیے۔''

''میرا نام حامد علی خاں ہے... ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔''

مقصود نے سر ہلایا۔ وہ واقعی خراب صحت کا مالک اور کمزور تھا۔ قمیص اس کے بدن پر ڈھیلی تھی اور پتلی سی گردن میں ٹائی مجبوری کے باعث پھانسی کا پھندا محسوس ہوتی تھی... اس کے بال بڑے اور بے ترتیب تھے اور سیاہ فریم والی بڑی شیشوں کی عینک اس کے فاقہ زدہ چہرے پر مضحکہ خیز لگتی تھی... اب وہ منتظر تھا کہ نو وارد خود ہی مقصدِ ملاقات واضح کرے۔

''مقصود صاحب! اگر میں نے آپ کو ارجنٹ کام میں ڈسٹرب کیا ہے تو سوری... لیکن میرا کام زیادہ ضروری تھا۔''

''جی... کیا کام ہے آپ کو مجھ سے... چائے لیں گے آپ یا کافی؟''

''کافی، اگر آسانی سے ملے۔'' حامد علی غور سے مقصود کے اطمینان کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہ کس حد تک اصلی ہے۔ ابھی تک انہیں اس کے رویّے میں کسی خوف، پریشانی یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ''میں ایک بہت پرائیویٹ معاملے پر بات کروں گا... تم فاطمہ خان کو جانتے ہو برخوردار۔''

وہ ایسے چونکا جیسے غلطی سے سلگتے سگریٹ سے کہنی چھو گئی ہو۔ ''فاطمہ... آپ کون ہیں؟''

''میں نے اپنا نام بتا دیا تھا... یہ کافی ہے... تم اب میرے سوال کا جواب دو... اسے کب سے جانتے ہو اور کیسے...؟''

مقصود سنبھل گیا۔ ''جب تک مجھے معلوم نہ ہو کہ آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں اور آپ کا فاطمہ سے کیا تعلق ہے... میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

''او کے، میں فاطمہ کا انکل ہوں... ریٹائرڈ ایس ایس پی اسپیشل برانچ، فاطمہ کہاں ہے؟''

مقصود کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ خوف اتر آیا۔ ''فاطمہ... یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں، وہ اپنے گھر میں ہوگی۔ مجھے اس کے فون سے رسپانس نہیں مل رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم فاطمہ سے شناسائی کا اعتراف کر رہے ہو...؟''

''آف کورس میں اسے جانتا ہوں... اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' اس نے اعتماد سے کافی کا کپ حامد صاحب کے سامنے رکھا۔ ''تقریباً دو... تین سال سے... اسے میں نے ایک میچ میں دیکھا تھا... اور وہ گرلز کالج کی دو ٹیموں کے کسی ٹورنامنٹ کا فائنل تھا... اس کی ٹرافی ہمارے چیئرمین نے اسپانسر کی تھی... اور وہ تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے... میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ فاطمہ کو پلیئر آف دی ٹورنامنٹ کا انعام ملا تھا۔ میں انعام پکڑاتا تھا چیئرمین صاحب کو... اور وہ ہاتھ ملا کر کسی لڑکی کو تھما دیتے تھے... مجھے نہیں معلوم جب چیئرمین صاحب تقریر پڑھ رہے تھے تو وہ کیوں میرے ساتھ والی کرسی پر آ کے بیٹھ گئی۔ وہ پسینے میں تربتر تھی۔ اس نے مسکرا کے مجھ سے پوچھا کہ یہ تقریر بھی آپ نے لکھی ہوگی جو مہمانِ خصوصی پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم؟ وہ بولی کہ اب تو معلوم ہو گیا... آپ لگتے ہیں بڑے پڑھاکو قسم کے۔ بہت اعتماد کرتے ہوں گے آپ پر چیئرمین صاحب۔ میں مزید حیران ہوا کہ یہ لڑکی کیسی باتیں کر رہی ہے... نہ جان نہ پہچان... اس وقت ایک سوال میں نے بھی کر لیا کہ یہ آپ کا جو کوچ ہے داڑھی والا... یہ کیسا آدمی ہے...؟ وہ بولی کہ اچھا آدمی ہے... پہلے کسی بینک کی ٹیم میں کھیلتا تھا... کپتان تھا شاید مگر بینک کے صدر صاحب سے نہیں بنی تو نکالا گیا... اس پر میں نے کہا کہ مس فاطمہ ریکارڈ کی درستی کے لیے بتا رہا ہوں... یہ شخص غبن کے الزام میں برطرف ہوا تھا... پھر اس پر ایک لڑکی نے زیادتی کا الزام بھی لگایا تھا جو اسی بینک کی کسی برانچ میں تھی... یہ گرفتار ہوا اور کافی دن جیل میں رہا۔ مار بہت کھائی تھی اس نے جیل میں مگر عدم ثبوت کی بنا پر ہائی کورٹ نے اسے بری کر دیا تھا... آپ ذرا محتاط رہیں اس سے۔'' وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

حامد علی نے اس کی گفتگو کا ہر لفظ پوری توجہ سے سنا۔ ''اس کے بعد...؟''

''ایک دن میں گھر جا رہا تھا... فاطمہ کالج سے نکلی، پریکٹس کے بعد وہ گراؤنڈ کے بیس چکر لگاتی تھی اور گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتی تھی۔ اس کا حال خراب تھا تھکن اور پسینے سے... میں نے گاڑی روک لی اور اسے بٹھا لیا... میں ذرا بزدل ہوں لڑکیوں کے معاملے میں... ایسے کسی بھی راہ چلتی لڑکی کو لفٹ نہیں دیتا مگر فاطمہ نے خود مجھے دیکھ کے سلام کے انداز میں ہاتھ ہلایا تھا... اور وہ کسی تکلف کے بغیر بیٹھ بھی گئی۔ اس کے بعد پھر ہم کئی بار ملے... میں نے پوچھا کہ اتنی محنت کیوں کرتی ہو تم... کون سا پاکستان ویمن ایسوسی ایشن کی

طرف سے اولمپک میڈل لینے جاؤں گی۔ وہ بڑی پُرعزم تھی کہ تم جیسے سارے دیکھیں گے مجھے ٹی وی پر... ایک دن میں اولمپک ہاکی میں پاکستان کی طرف سے کھیلوں گی... لیکن پھر معلوم نہیں کیا ہوا... اس نے ہاکی چھوڑ دی۔"

"تم نے پوچھا نہیں کیوں؟"

"پوچھا تھا... اس نے ٹال دیا کہ بس دلچسپی نہیں رہی... یہ سراسر جھوٹ تھا... اچانک وہ کچھ بدل سی گئی تھی۔"

"کیا بدل گئی تھی؟"

"بس... پہلے جیسے کھیلتی تھی... دوڑتی تھی... اچانک سیریس ہو گئی... خاموش اور گم صم سی رہنے لگی۔ بہت کریدا میں نے مگر وہ یہی کہتی رہی کہ تبدیلی تو سب میں آتی ہے عمر کے ساتھ۔"

"تبدیلی تمہارے ساتھ رویّے میں بھی آئی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں... بالکل بھی نہیں... مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"فی الحال جو میں پوچھ رہا ہوں برخوردار وہ بتاؤ... رہتے کہاں ہو تم؟"

"گلشن اقبال میں... اپنی ماں کے ساتھ... ایک بہن تھی اس کی شادی ہو چکی۔"

"اور والد؟"

"ان کا انتقال ہو چکا... سمجھ لیں۔" وہ کرسی کی بیک کا سہارا لے کر چھت کو دیکھنے لگا۔

"سمجھ لیں؟" حامد صاحب نے حیران ہو کے کہا۔ "میں تو وہی سمجھوں گا جو تم سمجھا رہے ہو۔ وہ زندہ ہیں یا مر چکے ہیں؟"

"میرے لیے وہ مر چکے ہیں۔" وہ آگے جھک کے بولا۔ "جب میں بہت چھوٹا تھا، تب انہوں نے میری ماں کو چھوڑ دیا تھا۔ اب امریکا میں وہ زندہ ہیں تو مجھے نہیں معلوم اور مر گئے ہیں تو مجھے کیا... یہ سب میں آپ کو اس لیے نہیں بتا رہا ہوں کہ آپ ریٹائرڈ ایس ایس پی اسپیشل پولیس کی حیثیت سے تفتیش کر سکتے ہیں... دو بار آپ نے برخوردار کہا ہے مجھے... اب مجھے بتائیے یہ سلسلہ کیا ہے؟"

"سلسلہ کیا تھا... فاطمہ کل رات ایک سہیلی کے گھر گئی تھی... یہ کہہ کر کہ اس کے بھائی کی منگنی ہے مگر صبح معلوم ہوا کہ وہاں تو فاطمہ گئی ہی نہیں۔"

وہ پریشان ہو گیا۔ "پھر کہاں گئی؟ اچھا... میں سمجھ گیا... اس کے گھر والوں کو شک ہوا کہ کہیں..."

حامد صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ بالکل فطری سی بات تھی۔ اس میں بُرا ماننے والی کوئی بات نہیں... ایسا ہو رہا ہے... لڑکیاں ماں باپ کو بتاتی نہیں اور خاموشی سے شادی کر لیتی ہیں... چودھری صاحب ذرا پرانے روایتی آدمی ہیں۔"

"انہوں نے بھیجا ہے آپ کو تفتیش کے لیے؟ اب آپ کیا کریں گے؟ خانہ تلاشی لیں گے یا شک میں مجھے تھانے بلوا کر تفتیش کرائیں گے؟" وہ تلخی سے بولا۔

حامد علی مسکرا کے اٹھے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے تو صرف فاطمہ کے لیے... میں پوری طرح مطمئن ہوں تمہاری طرف سے... خدا حافظ۔"

"سر... آخر فاطمہ کہاں گئی ہو گی؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمہیں کچھ پتا ہے تو بےخوفی سے اس کے گھر آ جانا۔ چودھری صاحب میرے دوست ہیں پرانے... انہیں میں سمجھا دوں گا۔"

جب وہ کیبن سے نکلے تو وہ بُت بنا کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنے سامنے خلا میں گھور رہا تھا۔ اس لڑکے نے اپنی راست گوئی سے حامد صاحب کو متاثر کیا تھا۔ پولیس کی نوکری کے طویل تجربے نے انہیں انسانوں کو پرکھنا سکھا دیا تھا۔ کوئی کتنا بھی چالاک ہو، ان کے سامنے جھوٹ کو سچ نہیں بنا سکتا تھا۔ مقصود کے رویّے میں، اس کے لہجے میں اور اطوار میں ایک سادگی والا بےساختہ پن تھا جو اس کے سچ کی گواہی دیتا تھا۔ فاطمہ اس کے ساتھ نہ سہی، کہیں اور بھی ہوتی اور اسے معلوم ہوتا تو وہ بےخوفی سے صاف بتا دیتا۔

وہ واپس اپنے گھر پہنچے تو دوپہر گزر چکی تھی۔ چودھری نے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ابھی تک فاطمہ لاپتا ہے ورنہ سب سے پہلے وہ حامد صاحب کو مطلع کرتا... خود ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ چودھری سے کچھ پوچھیں... پوچھنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا... حامد صاحب کی بہو میز پر کھانا چن رہی تھی۔ "میاں جی آج گھر پر ڈیوٹی دے رہے ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"وہ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔" افشاں نے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا۔

اسی وقت ان کا بیٹا اندر سے آیا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ پریشانی اس کی صورت سے بھی عیاں تھی۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے؟ پلیز بتائیے اباجی! بڑی افسوس ناک خبر ہے آپ کے لیے۔"

"کیا... فاطمہ کے بارے میں؟"

"جی... اس کی لاش ملی ہے ساحلِ سمندر پر... آج ہی صبح... وہ فاطمہ کی لاش ہو سکتی ہے۔"

"آپ بھی حد کرتے ہیں... اباجی کھانا تو کھا لیتے۔" افشاں نے ناراضی سے کہا۔

حامد علی خاں کی بھوک اڑ گئی اور پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔ "فاطمہ کی لاش... او مائی گاڈ... چودھری کو بتایا؟"

انور نے نفی میں سر ہلایا اور کہنیاں میز پر ٹکا کے آگے جھک گیا۔ "افشاں! تم اندر لے جاؤ اپنا کھانا۔"

حامد صاحب نے گلاس میں تھوڑا سا پانی ڈال کے کہا۔ "کسی نے قتل کیا ہے اسے؟ یا خودکشی کی ہے اس نے... کیا رپورٹ ہے؟"

انور نے کہا۔ "کل رات رانی نے ایک بات کی تھی۔ اس نے کسی عورت کو دیکھا تھا جو ساحل پر لیٹی ہوئی تھی بارش میں... اور اس نے کہا تھا کہ عورت نے کپڑے بھی نہیں پہن رکھے تھے۔ سب نے اسے اہمیت نہیں دی تھی... ماں باپ نے بھی چپ کرا لیا تھا... لیکن غالباً وہ عورت فاطمہ تھی... صبح اس کی لاش ساحل پر سے اٹھائی... میرے تھانے والوں نے... انہوں نے تصدیق کی کہ لڑکی کے جسم پر کچھ نہیں تھا... اس کے کپڑے سر کی طرف رکھے ہوئے تھے... شلوار، قمیص اور دوپٹا... بعد میں کسی نے اس پر ایک پرانی ڈینم کی واسکٹ ڈال دی... جو مردانہ اور بہت بڑی تھی۔"

"یہ خودکشی بھی تو ہو سکتی ہے..." حامد صاحب نے سر اٹھا کے بڑے رنج سے کہا۔

"نہیں اباجی... فون پر جس نے مجھے یہ اطلاع دی... اس نے لاش اٹھائی تھی۔ جائے واردات کا معائنہ کیا تھا، تصویریں بنائی تھیں اور واقعاتی شہادتوں کو نوٹ کیا تھا... اس نے ایک بڑے پتے کی بات کہی کہ خودکشی کرنے والا سمندر میں چلتا جاتا ہے یہاں تک کہ گہرائی میں گم ہو جاتا ہے اور موجیں اسے بہا لے جاتی ہیں... وہ اس طرح کپڑے اتار کے سرہانے ڈھیر کیسے کر سکتا ہے... کپڑے فاطمہ کے تھے۔ اگر اس نے پہلے سے اتارے تھے تو یہ بالکل ناممکن بات ہے کہ مرنے کے بعد موجیں لاش کو عین اسی جگہ چھوڑ جائیں۔"

"یو آر رائٹ... سمندر کی لہروں میں بہہ جانے والوں کی لاش اسی جگہ ملتی ہے لیکن چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد۔" حامد صاحب نے آہ بھری۔ "کیا اسے مار کے وہاں لٹایا گیا تھا؟"

"ایف آئی آر لکھنے کے بعد روٹین کے مطابق لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی تھی۔ ابھی اس کی شناخت نہیں ہوئی۔ جو حلیہ مجھے بتایا گیا ہے اس سے میں نے اندازہ کیا ہے۔ تھانے والوں نے گزشتہ تین دن میں لکھوائی جانے والی گمشدگی کی ہر رپورٹ کو دیکھا۔ چار لڑکے تھے۔ دو بڑی عمر کی خواتین جن کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ دو بچے۔ ان سب کے نام پتے موجود ہیں، کسی کا نام فاطمہ نہیں۔ انکل چودھری کو بلا لیں... ہم اسپتال جا کے دیکھتے ہیں پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا کہتی ہے۔ اگر وہ فاطمہ ہی ہے تو قانونی طور پر یہ ضروری ہے کہ کوئی وارث تصدیق کرے۔"

حامد صاحب نے کہا۔ "پہلے ہم دیکھ لیتے ہیں۔ وہ فاطمہ ہی ہو گی تو اسے بلائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔" انور نے کہا۔ "آپ کچھ تو کھا لیں۔"

"نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم کھا لو۔" حامد صاحب نے بےخیالی میں کہا۔

انور کو واپسی میں تھانے جانا تھا۔ اس نے وردی پہن لی اور ڈرائیونگ بھی کی۔ اسپتال کے مردہ خانے پہنچنے تک وہ حامد صاحب اور مقصود کی ملاقات کی تفصیل سنتا رہا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں خود حامد صاحب نے قتل اور خودکشی سے لے کر حادثات کا شکار ہو جانے والوں تک مرد عورت اور بچوں، بوڑھوں کی ان گنت لاشیں دیکھی تھیں۔ کچھ صحیح سالم، کچھ شکستہ حال، جلی ہوئی یا گلی ہوئی۔ وہ لاشوں سے دہشت زدہ نہیں ہو سکتے تھے مگر فاطمہ کو پوسٹ مارٹم ٹیبل یا مردہ خانے میں دیکھنا ان کے لیے ایک جذباتی امتحان ثابت ہو رہا تھا۔

انہیں کسی سے خود کو متعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انور کی وردی نے ان کے لیے ہر مشکل کو آسان کر دیا اور وہ سب دروازے کھول دیے جو عام آدمی کے لیے صرف رشوت کی چابی سے کھلتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے اور یہ اخلاقی گراوٹ کی انتہا تھی۔

فاطمہ کی لاش وہاں نہیں تھی۔ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے لیے انور نے فون کیا تھا اور حامد صاحب کا حوالہ بھی دیا۔ ورنہ ہر لاوارث لاش یہاں اس وقت تک پڑی رہتی تھی جب تک کہ وارث نہ پہنچ جائیں اور جلد از جلد پوسٹ مارٹم کرانے کی ارجنٹ فیس ادا نہ کر دیں۔ غریب آدمی کو ایک ہی جواب ملتا تھا۔ اپنی باری پر پوسٹ مارٹم ہو گا۔

حامد صاحب نے ایک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش دیکھی۔ وہ فاطمہ ہی تھی۔ یہ آخری امید بھی دم توڑ گئی کہ لاش کسی

اور کی ہوگی تو ان کا دل اپنے دوست کے خیال سے خون کے آنسو رونے لگا۔ ہمت کر کے انہوں نے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر سے بات کی۔ ”یہ قتل ثابت ہو گیا ہے؟“

ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”دیکھیے یہ اتنی تندرست و توانا لڑکی ہے۔ اس کو سمندر پر لے جا کے ڈبونے والا کوئی اجنبی نہیں ہو سکتا۔ رات کے وقت وہ اس کے ساتھ ویران سمندر پر کیوں جائے گی۔ کپڑے تو خیر اس نے بعد میں اتار دیے ہوں گے مگر اس کو ڈبو کے مارنے والے کا بہت طاقتور ہونا ضروری تھا۔ اس نے یقیناً مزاحمت کی ہوگی لیکن وہ زیادہ طاقتور تھا کہ اس نے لڑکی کے سر کو پانی کے نیچے دبائے رکھا... جب تک کہ وہ مر نہیں گئی پھر کنارے پر لا کے اس کے کپڑے اتارے اور لاش کے سرہانے چھوڑ کے غائب ہو گیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن بارش کی وجہ سے ساحل پر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب یہ پولیس کا کام ہے کہ قاتل کو پکڑے۔“

حامد صاحب نے کچھ پس و پیش کے بعد پوچھا۔ ”اس کے ساتھ کسی زیادتی کا ثبوت ملا؟“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جنسی زیادتی کے شواہد بہت واضح ہوتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لڑکی حاملہ بھی نہیں تھی لیکن ایک اہم بات ڈاکٹر شاہدہ نے نوٹ کی۔ وہ اس بارے میں خود بہتر بتا سکتی ہیں۔“

”کون ہیں یہ ڈاکٹر شاہدہ اور کہاں ملیں گی؟“

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی۔ ”آج تو نہیں، کل ملیں گی۔ ان کو میں نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ کیونکہ خواتین کے معاملے میں لیڈی ڈاکٹر کی رائے زیادہ مستند ہوتی ہے اور آپ کا حوالہ تھا اس لیے میں خانہ پُری والا کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔“

”رپورٹ کب ملے گی؟“ حامد صاحب نے پوچھا۔

”مل جانی چاہیے آپ کو دو گھنٹے میں... آئی ایم سوری، میری بھی چھٹی کا ٹائم ہو چکا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ رپورٹ کہاں سے ملے گی۔“ ڈاکٹر نکل گیا۔

”میرا خیال ہے، چودھری کو بلا لینا چاہیے۔“ حامد صاحب نے جیسے اپنے آپ کو قائل کیا۔ ”اسے بتانا تو پڑے گا۔“

انور نے باپ کا بازو تھاما اور انہیں احتیاط سے سنبھال کر باہر لے گیا۔

☆☆☆

وہ سینٹرل جیل کے اندر ایک دیوار سے ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں گم تھا۔ زندگی نے بار بار اس کے ساتھ دغا کیا تھا اور بالآخر اس سے سب کچھ چھین کے اسے جیل پہنچا دیا تھا۔

ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر اسے یقین تھا کہ اب سزا کی میعاد کے ساتھ یا اس سے پہلے ہی اس کی زندگی کا سفر بھی پورا ہو جائے گا۔ آزادی اسے جیل سے نہیں، زندگی کی قید سے ملے گی۔ اب پچھتانا بھی لاحاصل تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی میں اس نے کہاں غلطی نہیں کی تھی... شاید ہر قدم پر... اور ہر غلطی کی سنگینی کسی گناہ یا جرم سے کم نہیں تھی۔ یہ احساس اسے اب ہو رہا تھا جب اس کے پاس وقت بھی نہیں رہا تھا۔ سب کچھ گنوا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا...

جمال کو یقین تھا کہ بالآخر وہ زندگی کی آخری بازی بھی ہار چکا ہے۔ اس نے بڑی طویل اور سخت جدوجہد کی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے ایک بدترین اور بدنام ترین یتیم خانے میں ہوش سنبھالا تھا۔ اس کا مہتمم ایک بدشکل اور بدکردار شخص تھا جو سب کے سامنے اسے یاد دلاتا تھا کہ اس کی ماں کوئی بدکردار بے ضمیر سنگ دل عورت تھی جو اپنی ناجائز اولاد کو ان کے سر تھوپ کے بھاگ گئی تھی، کسی نئے آشنا کے ساتھ۔ غصے میں وہ اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی ایسی باتیں کہتا تھا جو کوئی بھی بچوں کے سامنے نہیں کرتا۔ دس بارہ سال کی عمر تک اس یتیم خانے میں جو کچھ نگرانوں اور ان کے زیر سایہ بڑے ہو جانے والے لڑکوں نے کیا، وہ ناقابل بیان تھا اور اس کا سوچ کر آج بھی جمال کا وجود آگ میں سلگنے لگتا تھا۔

یتیم خانے سے بھاگ جانے کی ہمت آتے ہی وہ بھاگ جاتا مگر اس نے انتقام کی خواہش پوری کرنے کے لیے کچھ دن اور اس جہنم میں گزارے۔ بالآخر ایک دن اس نے نگراں کو سر پر ڈنڈا مار کے ناک آؤٹ کیا اور ایک چھری سے ہمیشہ کے لیے اسے کسی اور کے ساتھ زیادتی کے ناقابل بنا کے بھاگ گیا۔ وہ اسے قتل بھی کر دیتا مگر یہ قتل اور عمر قید سے زیادہ سخت اور عبرتناک سزا تھی۔ قسمت نے اسے دربدر کیا۔ وہ کسی بھی بس میں بیٹھ جاتا اور بے ٹکٹ ہونے پر کہیں بھی اتار دیا جاتا۔ اس نے چھوٹی موٹی چوریاں کیں اور بھیک بھی مانگی۔ اس نے کراچی پہنچ کے تین جگہ ”چھوٹے“ کی حیثیت سے موٹر ورکشاپ میں کام کیا۔ دو جگہ اس کے ساتھ وہی ہوا جو یتیم خانے میں ہوتا تھا مگر تیسرا... مکینک صوفی استاد بڑا محنتی اور ماہر کاریگر تھا۔ وہ کام گاہک کی تسلی کے مطابق کرتا تھا چنانچہ اس کے گاہک بڑھ رہے تھے اور صوفی کی آمدنی بھی مگر پہلے اس کی دو بیویاں تھیں پھر اس نے تیسری شادی کر لی تھی۔ دوسری بھاگ گئی... کہتا وہ بھی یہی تھا کہ اس نے طلاق دے دی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

صوفی مکینک بہت چالاک اور دو چہرے رکھنے والا آدمی تھا۔ جمال کے نزدیک وہ کامیابی کی راہ پر اس کے آئیڈیل کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی دوسری شخصیت کئی سال بعد سامنے آئی جب وہ پکڑا گیا اور پولیس نے مار مار کے اس سے گزرے وقت کا سارا سچ اگلوا لیا اور ہر واردات کی تفصیل حاصل کر لی۔ ایک تو وہ گھوم پھر کے ایسی گاڑیاں دیکھ لیتا تھا جو کسی وجہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ ان کے مالک بیمار یا بوڑھے تھے اور گاڑی چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ کچھ پرانے ماڈل کی تھیں جن کا کوئی معمولی سا پرزہ نہیں ملتا تھا اور مالک کے پاس آئے دن کباڑی بازار کی خاک چھاننے کے لیے وقت نہیں تھا۔ کچھ کے مالک طویل عرصے سے باہر تھے۔ ایسی گاڑیاں ان پر پڑی ہوئی مٹی دھول کی وجہ سے جانوروں کی بیٹ یا ایک دو بے ہوا ٹائروں سے نظر میں آ جاتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ایسی گاڑیوں کا سارا کارآمد سامان نکال لاتا تھا جس میں بعض اوقات بالکل نئے ٹائر ٹیوب بھی ہوتے تھے۔ یہ کام وہ اپنی مہارت سے دو چار گھنٹے میں ختم کر لیتا تھا۔

بالآخر وہ پکڑا گیا اور اس کے ساتھ جمال نے بھی تھانے میں مشکوک ہونے کا پہلا تجربہ حاصل کیا۔ وہاں اسے اپنے استاد محترم کی اصل صلاحیت اور کامیابی کا راز معلوم ہوا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اور اس کا صوفی استاد اگلے تین سال فراغت سے جیل میں بسر کریں گے مگر حیرت انگیز طور پر مہینے بھر پولیس کے ”زیر تفتیش“ رہنے کے بعد ایک رات انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان کے خلاف جس شخص نے ایف آئی آر درج کرائی تھی، وہ ثبوت گواہ کچھ فراہم نہیں کر سکا۔ الٹا صوفی کی ”ایمان داری“ کے حق میں گواہی دینے والے بہت آ گئے اور خود مدعی مشکل میں پڑ گیا کیونکہ پولیس ہر روز اور ہر دوسرے تیسرے دن اسے تھانے میں بلا کے بٹھا لیتی تھی اور مختلف طریقوں سے ہراساں کرتی تھی۔ وہ کہاں تک آفس سے چھٹی لیتا اور کتنا خوار ہوتا۔ بالآخر اس نے خود ہی ہاتھ جوڑ کے اپنی درج کرائی ہوئی رپورٹ واپس لے لی۔ تھانے میں ایک شخص نے تعریفی انداز میں کہا... ”تم سمجھ دار ہو۔ افسرانِ بالا کو درخواست دینے کی غلطی کرتے تو بہت مہنگی پڑتی۔ لے جاؤ اپنی گاڑی۔“ اور وہ گاڑی کا کھوکھا لے کر چلا گیا کہ یہ بھی غنیمت ہے جو اس میں نہیں تھا، وہ ڈال کے گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ تھانے میں حاضریاں دینے سے زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی تھی۔

جمال نے اس ورکشاپ میں دس طویل سال گزارے تھے اور استاد کے نائب کا درجہ حاصل کر چکا تھا لیکن اس عرصے میں ایک کام اس نے جاری رکھا تھا۔ اس نے نائٹ اسکول میں پڑھ کے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ پھر ایف اے کیا اور جب وہ پکڑا گیا تو بی اے کا امتحان دے چکا تھا۔ رہائی کے چند روز بعد ہی اس کا نتیجہ آ گیا۔ اس زمانے میں وہ سخت مایوس اور برہم تھا۔ استاد کی وجہ سے شاگرد بھی پکڑا گیا تھا اور تھانے میں تفتیش کا زمانہ ایک بھیانک خواب تھا۔ وہ دوبارہ استاد کے ساتھ کام کرنے پر راضی نہیں تھا۔

جمال نے اسے بھی خوش نصیبی جانا کہ جب بی اے کا رزلٹ آیا اور وہ پاس ہونے کی خوشی میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو مٹھائی کھلا رہا تھا تو وہاں ایک خاتون اپنی گاڑی ٹھیک کرا رہی تھی۔ استاد اس کی طرف سے پہلے ہی مایوس تھا۔ اس نے سمجھایا تھا کہ تھانے میں جو ہوا اسے بھول کے وہ اپنا کام جاری رکھے اور خود بھی استاد کے نقش قدم پر چلے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ پولیس خود ہمیں بچائے گی کیونکہ ان سے کاروباری معاملات طے ہو گئے ہیں۔ اب وہ بھی حصے دار ہوں گے اور ہم ”ایمان داری“ سے ان کا حصہ تھانے پہنچاتے رہیں گے لیکن جمال کا دماغ پولیس کے وحشیانہ تشدد نے پلٹ دیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے تشدد سے ہلاک نہ ہونا قدرت کی طرف سے ایک وارننگ ہے اور ایک مہلت ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر آ جائے۔ بی اے میں کامیابی نے اس کے خیالوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ وہ سچ مچ سمجھنے لگا کہ گریجویٹ بن کے وہ تعلیم یافتہ بھی ہو گیا ہے اور اسے کوئی باعزت کام کرنا چاہیے۔

اسی وقت گاڑی ٹھیک کرانے والی خاتون نے پوچھا۔ ”تم نے واقعی بی اے کر لیا ہے؟“

جمال نے بونٹ سے سر اٹھا کے انہیں دیکھا۔ وہ چالیس سال کی باوقار اور دلکش خدوخال کی مالک خاتون ساڑی میں تھی اور اپنی عینک کے شیشوں سے جمال کو حیرانی آمیز خوشی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ ”جی میڈم۔“

”یہاں... یہ کام کب سے کر رہے ہو؟“

”دس سال تو ہو گئے۔ میں بارہ سال کی عمر میں یتیم خانے سے بھاگا تھا۔ پرائیویٹ امتحان دیتا رہا۔“

”اوہ... تو گھر بار نہیں ہے تمہارا۔ ماں باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ خاتون نے ہمدردی سے پوچھا۔

”معلوم نہیں میڈم۔“ وہ پھر بونٹ میں گھس گیا۔ ”بس اتنا معلوم ہے کہ... مر گئے تھے۔“

”یہ کام تمہیں پسند ہے... میرا مطلب ہے پڑھنے کا شوق ہے تمہیں... میرا خیال ہے اس کے بعد ایم اے کر

گے تم؟‘‘
’’بالکل پکا ارادہ ہے... انشاءاللہ۔‘‘
’’یہاں تو سب ان پڑھ ہوتے ہیں۔ یہ ورکشاپ بھی تمہاری نہیں ہے اور بنا لو تب بھی عزت کہاں ہے اس کام میں۔‘‘
’’یہ قصور تو ان کا ہے میڈم جو ایسا سمجھتے ہیں مگر بات آپ کی غلط نہیں ہے۔ اسی لیے میں یہ کام کرنا نہیں چاہتا لیکن نہ رہنے کا ٹھکانا ہے اور نہ آمدنی کا کوئی ذریعہ... آپ کی گاڑی ٹھیک ہوگئی... ٹرائی کرلیں۔‘‘
انہوں نے اپنے بیگ سے رقم نکالی ہی تھی کہ صوفی آگیا۔ ’’چھ سو دے دیں میڈم۔‘‘
’’دیتی ہوں... ذرا ٹرائی کرلوں... تم بیٹھو میرے ساتھ۔‘‘ خاتون نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کے جمال سے کہا۔
یہ ایک معمول تھا۔ ہر گاڑی کا مالک اپنے اطمینان کے لیے گاڑی کو چلا کے دیکھتا تھا اور ورکشاپ کا مکینک ساتھ اس لیے بیٹھتا تھا کہ گاہک پیسے دیے بغیر نہ نکل جائے۔ جمال ان خاتون کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد سڑک پر پہلے کٹ سے انہوں نے گاڑی کو واپس موڑا اور دوسری طرف روک لیا۔ انہوں نے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا اور جمال کو دیا۔ ’’یہ میں سب کے سامنے دینا نہیں چاہتی تھی، کسی وقت مجھ سے ملنا۔ رہائش کا اور ملازمت کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور ایم اے کرنے کا بھی۔‘‘
خاتون اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ایوننگ کوچنگ کلاس چلاتی تھیں۔ دن میں میاں بیوی اپنی اسٹیٹ ایجنسی چلاتے تھے ان کی کوٹھی میں چھت پر باتھ روم کے ساتھ کمرا خالی تھا۔ یہ سرونٹ کوارٹر تھا لیکن میاں بیوی لاولد تھے اور انہیں کسی ملازم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ کمرا جمال کو دے دیا گیا۔ اسے ایک کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنسی میں ملازمت بھی مل گئی۔ ایجنٹ ان کا پرانا دوست تھا۔ اس کا کمرا فرنش ہوگیا اور اسے ڈھنگ کے کپڑے بھی بنوا دیے گئے۔ اب وہ پینٹ شرٹ کے ساتھ ٹائی باندھ کے کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا اور کلائنٹس کے ساتھ انگریزی میں بات کرتا تھا۔ پبلک ڈیلنگ کے لیے یہ ضروری تھا۔
صنفِ نازک کے لیے وہ کتنا دلکش ہے، اس کا اندازہ اسے پہلے اپنے آفس میں ہوا جہاں پہلے ایک ٹیلی فون آپریٹر لڑکی اس سے بے تکلف ہوئی۔ جمال کی لائف اسٹوری نے اسے بہت متاثر کیا۔ وہ اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا لانے لگی اور بڑے اصرار سے کھلانے لگی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ آفس سے غیر حاضر ہوئی تو جمال پر انکشاف ہوا کہ وہ تو باس کے ساتھ بزنس ٹرپ پر ملائیشیا گئی ہے جیسے کہ پہلے بھی جاتی رہی تھی۔ اسے یہ اطلاع انہی لوگوں نے دی جن کے بارے میں جمال کا خیال تھا کہ وہ اس سے حسد کرتے ہیں۔ موقع پاتے ہی ریسیپشن پر بیٹھنے والی لڑکی اس پر مہربان ہوگئی۔ وہ معمولی شکل وصورت کی اور غریب گھرانے کی مگر شریف لڑکی تھی۔
لیکن اس کے ساتھ یہ ہوا کہ خود اس کی محسن خاتون نے جمال کو اپنی مہربانیوں کے جال میں گرفتار کرلیا۔ تب جمال کی سمجھ میں آیا کہ بے خودی بے سبب نہیں غالب۔ وہ جوان مرد تھا اور خاتون اس سے دگنی عمر کی سہی... دلکش جسم والی ایک بھرپور عورت تھی۔ پندرھویں شب کے چاند کی طرح زوال کی جانب رواں مگر مکمل اور چاندنی لٹاتا... غیر متوقع انداز میں جمال ایک دن اچانک محصور ہوگیا اور پھر خود اپنے جذبات کا الاؤ بھڑک اٹھنے سے مجبور بھی۔
یہ کھیل نہ جانے کب تک جاری رہتا لیکن عقل ونظر کے اندھے شوہر نے جسے اپنی بیوی کی وفا اور پے انگ گیسٹ کی سعادت مندی پر حد سے زیادہ اعتماد تھا، اسے خود ہی دمکتے چہرے کے ساتھ خوش خبری دی کہ بالآخر اللہ نے اس کی سن لی اور وہ شادی کے اٹھارہ سال بعد باپ بننے والا ہے۔ جمال کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے خوش قسمت ماں کی طرف دیکھا تو اس کی مسکراہٹ مزید حوصلہ افزا تھی کہ کھیل کا مزہ تو اب آئے گا جب ڈر کوئی نہیں رہا... جیسے چھپ کر امریکا میں زندگی گزارنے والے کو گرین کارڈ مل جائے۔ اس کی... بے باک مسکراہٹ میں ایک چیلنج بھی تھا کہ اب تو تم پھنس گئے۔
اگلے چند روز میں اس کا جذبہ سرد پڑ گیا اور لطف کی جگہ بدمزگی نے لے لی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دو طرفہ سازش کے ایک جال میں پھنسا نہیں، پھانسا گیا ہے۔ بے اولاد بیوی کی وارفتگی کا بھی یہی مقصد تھا اور محبت کرنے والے شوہر کی ’’بے خبری‘‘ کا بھی یہی۔ انہوں نے ازدواجی محبت کا پردہ تان کے پسِ پردہ ایک شرمناک جوا کھیلا تھا اور بڑی بے غیرتی سے بازی جیت کے دنیا کو صاحبِ اولاد ہونے کی مٹھائی کھلا دی تھی۔ عورت شاید بدستور ایک جوان مرد کی قربت سے لطف اندوز ہوسکتی تھی مگر جمال کو اپنے رقیب سے خطرہ محسوس ہوا۔ اب یقیناً وہ موقع ملتے ہی اسے کسی بہانے سے نکال باہر کرے گا کہ چلتے پھرتے نظر آؤ ہیرو... اب ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں... سرونٹ کوارٹر اب خالی ہی رہے گا... میاں بیوی کو اولادِ نرینہ

مبارک۔
حسبِ توقع جب اس نے اپنا سامان اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا تو عورت نے تھوڑی سی مایوسی کا اظہار کیا مگر مرد نے اسے ہنسی خوشی اجازت دی اور ساتھ ہی کہا کہ اب خیر سے تم برسرِ روزگار ہو... تمہیں اپنا گھر بسا لینا چاہیے... کسی اور بسے بسائے گھر میں پے انگ گیسٹ بننے کا خطرہ مول مت لینا۔
جمال نے ایسا ہی کیا۔ اسے کرائے پر مکان کوئی نہیں دیتا تھا۔ یہ مشکل آفس میں اس کی محبوبہ نمبر دو ریسپشنسٹ کی مدد سے حل ہوئی۔ وہ اس کی گلی میں رشتے کی ایک خالہ کے گھر کا نصف حصہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ یہ بات اس کی محبوبہ نمبر ون ٹیلی فون آپریٹر کو سخت ناگوار گزری جو پورے آفس کی آنکھ کا تارہ بن کے رہنا چاہتی تھی۔ ایک بدصورت لڑکی کو اس نے اسی لیے باس کے حکم سے نوکری دلوائی تھی۔ اس امید میں کہ وہ ہے تو اس کی طرف کون آنکھ اٹھا کے دیکھے... آفس کے سب سے ہینڈسم ہیرو شہزادہ گلفام کی مت ماری گئی کہ اس کلوپری پر عاشق ہوا۔ ایسا کہ دل کے بعد اس کی گلی میں جابسا۔ اسے تو سزا دینا ضروری تھا۔ جمال اپنے آفس کے ویئر ہاؤس سے ایک کلائنٹ کی شپ منٹ کا سارا مال نکالنے کا مجرم پایا گیا۔ اس نے خود ہی گیٹ پاس بنایا اور سارا مال مارکیٹ میں پہنچا دیا۔ کلائنٹ کے کیس پر وہ گرفتار ہوا اور دکان دار نے گواہی دی کہ مال سپلائی کرنے والا وہی تھا۔ شاید انہیں کچھ مال اس گواہی کی قیمت کے طور پر مفت دے دیا گیا ہوگا۔
جمال ایک بار پھر پولیس کے شکنجے میں آگیا اور اس بار واقعی تین سال جیل میں گزار کے نکلا۔ اس کا ایم اے کر کے باعزت زندگی گزارنے کا خواب خود اپنی نظر میں بے وقعت ہو گیا۔ جیل کے جرم پرور ماحول میں تجربہ کاروں نے اسے احساس دلایا کہ دنیا میں اب شرافت کا نام حماقت یا بزدلی ہے اور کامیاب وہی ہیں، عزت دار وہی ہیں جن کے پاس پیسا ہے۔ پیسا کہاں سے آیا؟ یہ کوئی نہیں پوچھتا اور پوچھنا ہی نہیں چاہیے۔ بھئی اپنے کام سے کام رکھو۔
ایک صوفی استاد کے ساتھ رہ کر حاصل ہونے والا تجربہ تھا۔ دوسرا ایک خاتون اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ رہنے کا تجربہ اور سینٹرل جیل کا تجربہ۔ سب کو سامنے رکھ کے جمال نے کامیاب زندگی کا پنج سالہ منصوبہ مرتب کیا۔ ایک بار پھر اس نے کلرکی جیسی باعزت ملازمت حاصل کی اور ایک شریف گھر کی پڑھی لکھی لڑکی کے لیے جال پھیلا دیا جو اس کی طرح لیکچرار بننا چاہتی تھی۔ چند ماہ میں وہ جمال کی دیوانی اور لیکچرار دونوں بن گئی۔ عزت دار ماں باپ نے پڑھا لکھا رزقِ حلال کمانے والا شریف لڑکا دیکھا جو گھر داماد بھی بننے کے لیے تیا[ر] تھا۔ جمال اب شیطان کو راہنما تسلیم کرچکا تھا۔ اس نے کچھ سسر کی کمائی لی اور کچھ شریکِ حیات کی جس پر وہ پورا حق رکھ[تا] تھا۔ اس نے بزنس کے نام پر موٹر ورکشاپ قائم کرنے کے لیے جگہ لی اور جم گیا۔ ایک عرصہ تو اس کی گھر والی کو معلوم ہی ن[ہ] ہوسکا کہ اس کا رفیقِ حیات ایک موٹر مکینک ہے۔ پھر اسے لوگوں نے بتایا اور دکھا بھی دیا لیکن اس کا شور وغوغا لاحاصل تھا۔ وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ اس کے ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو چکے تھے اور پھر ایک دن جمال نے اس مکان کی قیمت بھی وصول کرلی۔
خلافِ امید وہ کمزور اور لاوارث لڑکی اس کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹ گئی۔ جمال کے لیے بیوی ہی صرف ایک عورت تھی مگر ٹو ان ون۔ رات کو بیوی، دن میں گھر کی ملازمہ جو کھانے پکانے سے برتن کپڑے دھونے تک سب کرلیتی تھی۔ صوفی استاد کی زندگی کا چلن اس کے سامنے تھا جو گاڑی کی طرح بیوی کو کچھ عرصہ چلاتا تھا پھر بدل لیتا تھا۔ جمال نے استاد کے سکھائے ہوئے پیسا کمانے کے گر کو زیادہ ہوشیاری سے استعمال کیا مگر وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ اس نے پینا پلانا بھی شروع کردیا اور بیوی بدلنے کے بجائے یہ پالیسی اپنالی کہ گھر والی الگ باہر والی الگ۔ اس کی بیوی نے اصلیت کا علم ہوتے ہی اس کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اور مار کھا کے شکر ادا کرنے کے بجائے قانونی جنگ پر اتر آئی۔ اس نے عدالت کے ذریعے خلع بھی حاصل کرلی اور اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے گئی۔ جمال نے محفلِ یاراں میں جام لہرا کے کہا۔ ’’چلو تم روٹھے ہم چھوٹے... تم بھی آزاد ہم بھی آزاد... کیا ہوا ماں کے ساتھ بیٹی بھی گئی۔ یہ روگ کون پالتا۔‘‘
جمال اپنی اس بیوی اور بیٹی کو بھول چکا تھا۔ اس کی زندگی ایک بے ڈھب انداز میں گزر رہی تھی۔ اس کی خوش فہمیوں کے سارے خواب بکھر چکے تھے اور اب وہ جائز ناجائز کے فرق کو بھول چکا تھا۔ پیسا کمایا تھا اور اپنی دانست میں آزاد اور ذمے داریوں سے مبرا عیش کی زندگی گزار رہا تھا۔ مکر، فریب، عیاری اور چالاکی سب اس کے نزدیک کامیابی کی جنگ کے ہتھیار تھے۔ باقی خرابیاں بھی نچلے متوسط طبقے کی نظر میں غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی تھیں۔ اوپر والے باعزت طبقے کے معمولات کا حصہ تھیں۔ یہ سب جانتے بھی تھے اور مانتے بھی تھے۔ دوغلا پن یہ تھا کہ اپر کلاس کے لائف اسٹائل کو گناہ کی زندگی... ان کے اعمال کو مجرمانہ اور ان کی سوچ کو کافرانہ قرار دینے والے ہی انہیں ہاتھ اٹھا کے سلام بھی

کرتے تھے اور عزت بھی دیتے تھے۔

جمال سے زندگی کی سب سے بھیانک غلطی اس روز ہوئی جب وہ اپنی بہت پرانی بھولی ہوئی بیوی کو ایک شان دار گاڑی میں ایک باعزت شخص کے ساتھ بیٹھا دیکھ کے جذباتی ہو گیا۔ اس نے بلاوجہ اس عورت کو ذلیل کرنا چاہا جس کے سامنے وہ خود ذلیل تھا۔ اسے پریشان کرنے کے لیے دھمکی دی اور بلیک میل کرنے سے ڈرایا۔ اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ گھر جا کے اپنے موجودہ شوہر کو سب بتا دے گی اور شوہر اپنی بیوی سے بدگمان ہونے کے بجائے اس موٹر مکینک کو نمونۂ عبرت بنا دے گا۔ وہ بہت بااثر اور دولت مند آدمی تھا مگر اس سے زیادہ خطرناک اس کا ایک دوست تھا جو اسپیشل برانچ میں ایس ایس پی تھا۔

ایک دن وہ گیراج آیا تو مرمت طلب گاڑیوں کے ساتھ ایک اور گاڑی موجود تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ گاڑی کس کی تھی اور کون چھوڑ گیا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ رات یہاں سے گزرتے وقت کسی کی گاڑی بند ہوئی تو وہ دھکا لگا کے یہاں کھڑی کر گیا۔ اس کی قیاس آرائی تھوڑی دیر بعد درست ثابت ہوئی۔ کسی نے اسے فون کر کے کہا کہ رات ایئرپورٹ جاتے ہوئے اس کی کار خراب ہو گئی تھی۔ اس نے گاڑی نزدیک ترین گیراج پر کھڑی کی اور خود فلائٹ پکڑنے کے لیے ٹیکسی میں چلا گیا۔ اب وہ دو تین دن بعد دبئی سے آئے گا تو بتائے گا کہ گاڑی میں کیا کام ہے۔

جمال مطمئن ہو کے دوسرے کام میں لگ گیا۔ وہ گاڑی اسی طرح کھڑی رہی۔ دو تین دن کے بجائے مالک چار پانچ دن نہیں آیا اور پانچویں روز جمال کو اسی طرح صبح کے وقت ایک اور لاوارث گاڑی نظر آئی جو قطار کے دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس نے فرض کر لیا کہ یہ بھی وہی بات ہو گی مگر آدھے گھنٹے بعد پولیس نے چھاپا مارا اور اسے گرفتار کر لیا۔ ان دونوں گاڑیوں کی چوری کی رپورٹ کئی دن پہلے لکھوا دی گئی تھی۔ ان کے مالک نہ دبئی گئے تھے نہ کہیں اور... جمال پہلی مرتبہ کسی اور کے جرم میں تھانے گیا تھا۔ اس بار بھی اس جرم میں پکڑا گیا جو درحقیقت اس نے نہیں کیا تھا۔ شامتِ اعمال جب آتی ہے تو بہانے ساتھ لاتی ہے۔ تفتیش کے دوران جمال نے ہر چوری کی واردات کا اعتراف کر لیا۔ پولیس کے چکر میں اس نے ناکردہ گناہوں کو بھی مان لیا۔ تھانے والوں کے طریقۂ کار سے وہ واقف تھا مگر جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے تو وہ کیسے بچتا۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ ایس ایس پی صاحب تو اسے پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ خواہش ہے ان کے عزیز دوست کی جن کی عزیز بیوی وہی ہے جو کبھی اس کی بیوی تھی۔

اس نے سات سال کی قید بامشقت کاٹی۔ جیلر سے لے کر نیچے کے حکام تک جانتے تھے کہ اسے پھانسا گیا ہے مگر نوکری میں اوپر والوں کا حکم ماننا فرض شناسی کہلاتا ہے۔ شاید اس کے دشمن اسے پسِ دیوارِ زنداں پہنچا کے بھول چکے تھے... تمام تر سختی کے باوجود وہ زندہ رہا لیکن ان سات سالوں نے اسے چالیس سال کی عمر میں ساٹھ سال کا بوڑھا بنا دیا۔ اسے بہت سے امراض لاحق ہو گئے۔ بلڈ پریشر کا علاج نہ ہونے سے دل کے بڑا ہونے کا مرض لگ گیا تھا جو ناقابلِ علاج تھا۔ اس کے گردے ناکارہ ہونے لگے۔ اس کے ہاتھ پیروں میں رعشہ تھا اور کمر کے مہرے کھسک جانے سے وہ چل نہیں سکتا تھا۔

جب اس کی رہائی کا دن طے ہو گیا اور اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی زندہ سلامت پھر اسی دنیا میں پہنچ جائے گا تو اس کے اندر زندگی کی خواہش بھی مر چکی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی بربادی کی ذمے دار عورت کی زندگی بھی تباہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے قتل کرنا مشکل بھی تھا اور جمال کے نزدیک ہلکی سزا تھی۔ اس کو زندگی بھر رلانے کے لیے بہتر سزا یہ تھی کہ اس کی بیٹی چھین لی جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی اس کی بیٹی چھینی گئی تھی۔ ایک بیٹی اس کے پاس جمال کی تھی، دوسری چودھری کی۔ وہ بھی کالج میں پڑھتی تھی۔ خوب صورت اور صحت مند تھی۔ بالکل اپنی ماں کی تصویر۔ ماں کے کیے کی سزا وہ بھگتے گی۔

رہائی کے بعد اسے کچھ رقم ملی جو اس کی جیل کی کمائی تھی۔ وہ پرانے کپڑوں میں باہر نکلا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اسے کوئی جاننے والا مل جاتا، تب بھی نہ پہچانتا۔ اس کا نہ کوئی گھر تھا نہ ٹھکانا۔ بے اختیار اس کے قدم اپنے پرانے ٹھکانے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے ورکشاپ کی جگہ بیچ دی تھی کیونکہ ورکشاپ کو ناجائز تعمیر قرار دے کر گرا دیا گیا تھا۔ اسے جو رقم ملی، وہ پولیس والوں کی نذر ہو گئی یا وکیلوں نے ایک ایسے مقدمے کی فیس میں ہتھیالی جس کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب اس جگہ ایک ریسٹورنٹ تھا۔ وہ خاموشی سے ریسٹورنٹ پہنچا اور چائے پیتا رہا۔ تین دن بعد اس نے مالک کو خود ہی بتایا کہ وہ کون ہے۔ یہ گیراج کبھی میرا تھا۔

مالک نے سر اٹھا کے اس بوڑھے، بیمار نظر آنے والے اور فقیر ٹائپ شخص کو ہمدردی سے دیکھا۔ ''اچھا.. مگر اب تو یہ کئی سال سے میرا ہے۔ سنا ہے پہلے یہاں گیراج تھا جو غیر قانونی

طور پر بنایا گیا تھا۔''

''گیراج میرا تھا۔ آج میرے پاس رہنے کے لیے بھی جگہ نہیں ہے۔ سنو... کیا تم مجھے کوئی کام دے سکتے ہو؟''

ہوٹل کے مالک نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور قابلِ رحم تھا۔ ''کیا کام کر سکتے ہو تم؟''

''کچھ بھی... برتن دھونے کا... سروس... میرا گزارہ ٹپ سے ہو جائے گا۔ لوگ جو پیسے ترس کھا کے کسی غریب کو دیتے ہیں، اسے ہم خیرات کہتے ہیں... انگریزی ٹپ... تم مجھے بس سونے کی جگہ دے دو... میں رات کو کہیں بھی پڑ کے سو جاؤں گا۔''

مالک نے سر ہلایا۔ ''اچھا... میں سوچوں گا... تم بیٹھو۔''

جمال کو بالکل پتا نہیں چلا کہ ہوٹل کے مالک نے چودھری کو کب فون کیا اور کہا۔ ''چودھری صاحب! وہ بندہ جیل سے چھوٹ کے آ گیا ہے جی... جس کی جگہ آپ نے مجھے بٹھایا تھا۔ وہ بیٹھا ہے جی یہاں۔''

☆☆☆

مقصود نے تھکن کے احساس کو زائل کرنے کے لیے کمپیوٹر کی گھومنے والی کرسی کی پشت سے سر لگا کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی گردن کو کچھ سکون ملا۔ اسے ہر طرف گہری خاموشی اور گمبھیر سکوت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ گئی تھی ورنہ رات گیارہ بجے وہ پڑ کے سوتا تھا تو صبح آٹھ بجے ماں کے بار بار جگانے پر بھی بڑی مشکل سے اٹھتا تھا۔ اور اسے کبھی خواب نہیں آتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے دماغ کا وہ حصہ بھی سو جاتا تھا جو خواب تشکیل کرتا ہے۔ اب تو جاگتے میں بھی اس کی آنکھیں خواب دیکھتی تھیں... فاطمہ کے خواب۔ اس وقت کے ان گنت لمحوں کے خواب ایک ہی فلم کے فریم بن گئے تھے جو ہر رات اس کے دماغ میں چلتی رہتی تھی۔ یہ خاموش فلم نہیں تھی۔ اس میں فاطمہ کی آواز تھی۔ ہر لفظ محفوظ تھا جو اس نے کہا تھا۔

اس نے دوبارہ کمپیوٹر کے مانیٹر کو دیکھا جس پر فاطمہ کا چہرہ اپنی تمام تر دل آویزی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، اس کے لب، اس کے چہرے کے مانوس نقوش سب مسکرا رہے تھے۔ زندگی کی بھرپور توانائی کے ساتھ۔ یہ عکس مقصود نے اسکرین سیور کے طور پر محفوظ کر رکھا تھا اور اب مٹائے نہیں مٹتا تھا۔ ہر وقت وہ اس پر خندہ زن نظر آتی تھی۔ اس کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے چیلنج دیتی تھی کہ کیا ہوا مسٹر کمپیوٹر! اتنی جلدی ہمت ہار گئے۔ تم تو سافٹ ویئر کی طلسماتی دنیا کے جادوگر ہو... الیکٹرانک میموری کے سمندر سے گوہرِ نایاب نکال کے لا سکتے ہو... تم ناممکن کو ممکن کر سکتے ہو مسٹر جینئس... میرا پاس ورڈ ڈھونڈ لینا تو تمہارے لیے بچوں کا کھیل ہونا چاہیے۔ کم آن... وہ کیا ہے مکڑی اور کنگ رابرٹ بروس کی اسٹوری... ٹرائی ٹرائی اگین...

اس نے اپنے آٹھویں منزل کے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رات نے اس روشنیوں کے شہر پر اپنا دامن پھیلا رکھا تھا۔ بیشتر رہائشی علاقے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صرف اسٹریٹ لائٹس جاگ رہی تھیں اور شاہراہ فیصل پر اس وقت بھی گاڑیوں کی روشنیاں متحرک تھیں... ساتھ والے کمرے میں اس کی بوڑھی بیمار اس کے لیے ہر وقت متفکر رہنے والی ماں سو رہی تھی... یہاں آ کے وہ خوش نہیں تھی کیونکہ آس پاس رہنے والے اس کے لیے پھر اجنبی تھے جن کو آشنا بنانے کے لیے اسے مزید محنت اور مہلت درکار تھی لیکن مقصود کے لیے پرانے گلشن والے فلیٹ میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے بروقت ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر لی تھی۔ اس کے باوجود پولیس نے تفتیش کے نام پر اسے پریشان کرنا جاری رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ فاطمہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آبروریزی کا حوالہ بھی ہو تو وہ مقصود کا نام مشتبہ افراد میں شامل کر دیں۔ اس کے فاطمہ سے تعلق کی خبر سارے زمانے کو تھی۔ پھر وہ مقصود کے بھی ٹیسٹ کرا سکتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ رشوت کی چابی ہر قاتل کے لیے ہر زنداں کے دروازے کھول دیتی ہے۔ سرِعام قتل کرنے والے خود کو جائے واردات سے بہت دور ثابت کر کے صاف بچ جاتے ہیں مگر مقصود اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے نہ رشوت دینا چاہتا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔ ایسے معاملات ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں طے ہوتے تھے۔ اسے مجبوراً حامد صاحب سے ہی مدد لینی پڑی تھی۔

تھکن کے احساس کو مٹانے کے لیے اسے کافی کی طلب محسوس ہوئی۔ دبے پاؤں کچن تک جا کے اس نے کوئی آہٹ کیے بغیر اپنے لیے کافی تیار کی اور لوٹ کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ فاطمہ کی فیس بک کا پاس ورڈ معلوم کرنا بظاہر ناممکن سا لگتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ ہیکرز ناقابلِ یقین کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ سائبر کرائمز آج کے کمپیوٹر کی دنیا کا بڑا سنگین مسئلہ تھا۔ جو لوگ اپنے کمپیوٹر آن چھوڑ دیتے تھے ان کا ڈیٹا چوری ہو جاتا تھا۔ بینک اکاؤنٹس کی ساری رقم نکال لی جاتی تھی۔ ان کے نام سے لاکھوں کی شاپنگ ہو جاتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ ''آئی ٹی'' کے ماہرین جو شیطان کی طرح فطین

سمجھے جاتے تھے پینٹاگون کی فائلیں چرالی تھیں۔ کسی سرکاری ادارے کی ویب سائٹ کا چوری ہوجانا تو عام بات تھی۔

کمپیوٹر کی دنیا کے یہ شیطان جانتے بوجھتے کوئی وائرس چھوڑ دیتے تھے اور کوئی انجان آدمی کسی ای میل کا جواب دیتا تھا تو کمپیوٹر سے سب کچھ نکل کے اجنبی ہاتھوں میں پہنچ جاتا تھا۔ سافٹ ویئر بنانے والے بڑے بڑے ادارے ان ہیکرز کو جینئس تسلیم کرتے تھے اور ان کی تخریبی قوت کو تعمیر کے لیے استعمال کر کے جان چھڑاتے تھے۔ وہ انہیں اپنے اداروں میں سوفٹ ویئر بنانے پر ملازم رکھ لیتے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شہر کے ماہر مجرموں کو پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر رکھ لیا جائے کہ اب تم جرائم کا خاتمہ کرو۔ مجرموں کی اور ان کے اڈوں کی نشاندہی کرو۔ چور کو ہی کوتوال بنانے کی مثال تاریخ کا قصہ تھی۔

مقصود نے اب ہیکر بننے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ فاطمہ کے کمپیوٹر سے ساری انفارمیشن اپنے کمپیوٹر میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فرصت کے اوقات میں وہ کمپیوٹر سے کھیلتی تھی۔ ہر روز کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ شیئر کرتی تھی۔ ہاکی کے ہر میچ کی تصویر فیس بک پر ڈالتی تھی اور فیس بک ایک طرح سے اس کی الیکٹرانک ڈائری تھی۔ اس کے دوست زیادہ نہیں تھے مگر وہ چیٹنگ کرتی تھی اور اپنے کمنٹ ڈالتی تھی۔ سوال وہی تھا، آخر اسے کس نے مارا اور کیوں؟ اس کا خیال ایک یقین کا درجہ رکھتا تھا کہ فاطمہ کی زندگی کے آخری ایام کا کوئی حوالہ اس کی فیس بک سے ضرور ملے گا جو اس سوال کا جواب بنے گا یا جواب حاصل کرنے کی راہ دکھائے گا... مقصود سے اس نے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ شاید وہ سب کے لیے ایک کھلی کتاب جیسی تھی۔ اس کا جو ظاہر تھا، وہ باطن سے مختلف نہیں تھا۔ دشمنی کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا مگر دوستی میں بھی وہ ایک حد قائم رکھتی تھی۔ اس کی ساری دلچسپی اپنے گیم تک تھی۔ وہ کالج کی بہترین سینٹر فارورڈ تھی۔ اپنی کارکردگی کی بنا پر وہ سلیکٹرز کی نظر میں آچکی تھی اور اس کا یقین بظاہر غلط نہیں لگتا تھا کہ ایک دن وہ پاکستانی ٹیم میں ہوگی۔

کھیل کے لیے وہ فٹنس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے ہفتے میں بیس کلومیٹر دوڑنے کو معمول بنا رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گراؤنڈ کا ایک چکر کتنے میٹر کا ہے اور ہفتے میں کتنے چکر لگا کے وہ بیس کلومیٹر پورے کرلے گی۔ بلاشبہ اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس کا رنگ صاف تھا اور میک اپ کے بغیر بھی اس کی بے داغ جلد میں تازگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی خوراک کا بھی خیال رکھتی تھی لیکن مقصود کے ساتھ کوئی پرہیز نہیں تھا۔ ان کی پسند میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مقصود کڑاہی گوشت، کباب، تکے اور بریانی نہاری کا شوقین تھا۔ فاطمہ کو چائنیز، سی فوڈ اور سینڈوچ اچھے لگتے تھے اور وہ کولڈ ڈرنکس پر جوس کو ترجیح دیتی تھی۔ کبھی ان میں اس معاملے میں جھگڑا بھی ہوجاتا تھا۔ مقصود بگڑ جاتا تھا... ”آخر تمہیں میری صحت کی اتنی فکر کیوں ہے؟ میں شروع سے ایسا ہوں اور ایسا ہی رہوں گا... کچھ بھی کھانے سے مجھے فرق نہیں پڑتا... تم کھاؤ روکھا سوکھا بے مزہ... تمہیں تو گولڈ میڈل لینا ہے نا۔“

”ایسی عادتیں اثرانداز ضرور ہوتی ہیں... خواہ دیر سے ہوں۔“

”ٹھیک ہے... مجھ پر بڑھاپا جلدی آئے گا... میں جلدی مرجاؤں گا بیماریوں کا شکار ہو کے... تم تلاش کرو کوئی اپنے جیسا سو سال جینے والا۔“

لیکن سو سال جینے کا عزم رکھنے والی فاطمہ کی زندگی صدی کا ایک چوتھائی حصہ پورا ہونے سے بھی پہلے ختم ہوگئی تھی... کسی وجہ کے بغیر مقصود کو یہی سوال پریشان کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ فاطمہ نے اسے دھوکا دیا ہے۔ پہلے اس کے خوابوں کا ایک پورا نگر آباد کیا... پھر اسے ایک دھماکے سے ختم کردیا۔ وہ مرگئی تھی مگر خواب زندہ تھے۔ وہ مقصود کو پریشان کرتے تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ فاطمہ نے اسے کیوں چھوڑا؟ ظاہر ہے اپنی مرضی سے اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے بتانا نہ ہوتا تو وہ اپنے مستقبل کے کسی گھر کا نقشہ ہی کیوں بناتی... مقصود سے محبت ہی کیوں کرتی... یہ نکتہ بہت اہم تھا... محبت اس کو مقصود سے ہوئی تھی... پہل اس نے کی تھی۔ پھر مقصود اس محبت میں یوں گم ہوگیا تھا جیسے دریا سمندر میں گم ہوجاتا ہے اور اب وہ ایسے گم ہوگئی تھی جیسے روشن رات کا ستارہ ٹوٹ کر اندھیرے میں گم ہوجاتا ہے۔

مقصود کو اس سے پہلی ملاقات یاد تھی۔ کسی تعارف و تکلف کے بغیر وہ آکے اس کے ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور بات کرنے لگی تھی۔ دوسری بار وہ سڑک پر نظر آئی تھی اور مقصود کو یوں لگا جیسے اس نے سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھا کے اسے روکنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لفٹ دینے کی پیشکش کے بہانے لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے کا قائل نہ تھا حالانکہ اس کے ساتھی اس پالیسی پر کامیابی سے عمل کرتے تھے پھر بھی وہ رک گیا اور وہ بلا جھجک بیٹھ گئی۔ ”مقصود صاحب! آپ کوئی گیم کھیلتے ہیں؟“

وہ جھینپا۔ ”جی... کمپیوٹر پر بہت سے گیم ہیں... معاف کیجیے گا... آپ کا نام... کچھ یاد نہیں آرہا۔“

''فاطمہ... فاطمہ خان۔ انعام دیتے وقت پکارا تھا آپ نے مگر یاد نہیں رکھا۔ مجھے یاد تھا۔ میں آپ سے امپریس ہوئی تھی۔''

اس نے حیرانی سے فاطمہ کو دیکھا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''مجھے آپ بڑے افلاطون لگتے ہیں... جینئس قسم کے... میرا دماغ پڑھائی میں رکشا کی طرح چلتا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''پہلے بھی کسی نے امپریس کیا ہے آپ کو؟''

''ہاں... میرا جو کوچ ہے... ایسی ٹپس دیتا ہے اور ایسا جنون ہے اسے سکھانے کا۔''

''وہ ہے بھی کچھ جنونی سا... ایک بات بتاؤں اس کے بارے میں اگر آپ بُرا نہ مانیں... جو میرے ذاتی علم میں ہے۔''

کوچ کے بارے میں مقصود کی رائے سن کے بھی اس نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ جب وہ گھر کے پاس اترنے لگی تو اس نے مقصود سے اس کا فون نمبر پوچھا۔ ''مجھے رنگ دیں، میں سیو کرلوں گی اور پھر آپ کو رنگ کروں گی۔'' مطلب صاف ظاہر تھا کہ آپ بھی محفوظ کرلیں... دوسرے دن اس کا فون آگیا۔ ''آپ فیس بک پر ہیں۔''

''ہاں... بلاگ ٹویٹر... سب ہے۔''

''میری فیس بک پر آؤ... جوائن ایز اے فرینڈ۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔

اس رات وہ سوچتا رہا کہ آخر وہ فاطمہ کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے؟ پھر اس سے اگلی رات اس نے فاطمہ کو فون کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا، آپ ہیں۔ میں تو سمجھی تھی بھول گئے۔''

''کوشش کرتا رہا لیکن سچ یہی ہے کہ بھول نہیں پایا۔ اگر تم سو رہی تھیں تو سوری تمہاری نیند خراب کی۔''

''میں جاگ رہی تھی۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''کل بھی سوچا تھا کہ تمہیں فون کروں پھر خیال آیا کہ تم نہ جانے کیا سمجھو گے کہ عجیب بے شرم لڑکی ہے... پیچھے ہی پڑ گئی۔''

''عجیب لڑکی تو تم یقیناً ہو... تم میں کوئی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میرا خیال تھا کہ تم اتنے افلاطون ہو... سمجھ لو گے کہ جب ایک لڑکی خود اپنا فون نمبر دے رہی ہے تو کیوں... لڑکے تو بڑے جتن کر کے یہ معرکہ سر کرتے ہیں۔ فیس بک پر بھی انوائٹ کیا تھا میں نے تمہیں... آخر کیوں؟''

مقصود نے دہرایا۔ ''کیوں؟ معاف کرنا میں یہ فرض کرنے سے قاصر ہوں کہ مجھے بھی کوئی لڑکی لفٹ کرا سکتی ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟ لفٹ میں نے مانگی تھی تم سے... اور تم جو چاہو سمجھو۔ تم پہلی نظر میں مجھے پسند آگئے تھے۔ حالانکہ آج تک میں کسی کے چکر میں نہیں پڑی۔ اپنے کھیل کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔''

''میں ایسا کون سا شاہ رخ خان ہوں کہ تمہیں پہلی نظر میں مجھ سے محبت ہوگئی فلموں کی طرح؟''

''محبت؟ یہ کس نے کہا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں امپریس ہوئی ہوں۔''

''یعنی مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں؟ ایک جملہ آج کل بہت مقبول ہے، ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔''

وہ ہنسی۔ ''کیوں نہیں، اگر تم مجھے لنچ پر انوائٹ کرو پھر باتیں کریں گے۔''

وہ دم بخود رہ گیا۔ ''اگر میں کہوں کل... سی سائڈ پر ویلیج ریسٹورنٹ میں تو؟''

''مجھے پک کرلینا کالج کے باہر سے۔ میں پریکٹس سیشن چھوڑ دوں گی۔ ٹھیک ایک بجے۔''

اگلے دن اس نے آفس سے آدھا دن آف کیا اور ایک بجے فاطمہ اسے کالج کے گیٹ پر ملی۔ وہ کالج یونیفارم میں تھی۔ کتابیں اس نے گاڑی میں چھوڑ دیں۔ پھر بھی بہت سی معنی خیز نظریں مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف اٹھیں۔ وہ دو گھنٹے اس گوشے میں بیٹھے رہے جہاں سے سمندر بہت قریب لگتا تھا۔ درمیان میں شیشے کی دیوار ہونے کے باوجود موجوں کی سرسراہٹ اور نم آلود ہوا کی مخصوص بو محسوس ہوتی تھی۔ اس کے بعد کی ہر ملاقات کے بعد مقصود کے گرد فاطمہ کی محبت ایسے لپٹتی گئی جیسے ریشم کے کیڑے کے گرد اس کا اپنا بنایا ہوا ریشم کا تار لپٹتا جاتا ہے۔

محبت صرف اندر سے نہیں، باہر سے بھی انسان کو کیسے بدلتی ہے۔ وہ اپنے کپڑوں کا خیال رکھنے لگا۔ پرفیوم کا استعمال کرنے لگا۔ اس نے سنہری فریم کی نازک سی عینک بنوالی۔ فاطمہ نے جیسے کچھ بھی نوٹس نہیں کیا۔ خود اس کے ظاہر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی مگر وہ خوش رہنے لگی تھی اور بہت ہنسنے لگی تھی۔ وہ کبھی گھر سے آتی تھی تو اس کا لباس رنگین ہوتا تھا لیکن مقصود نے اس سے کہا کہ ''ساڑی پہنو، تمہارے جسم پر اچھی لگے گی۔''

اس نے انکار کر دیا۔ ''مقصود! اتنی بے شرمی نہیں کرسکتی میں اپنے گھر والوں کے سامنے۔''

''کیا انہیں معلوم نہیں؟''

''معلوم ہوگا۔ اتنا ملتے ہیں ہم تو نہ جانے کس کس نے دیکھا ہوگا مگر میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔ یقیناً میرے ابا نے اب تک تمہارے بارے میں پوری رپورٹ لے لی ہوگی۔ ان کے دوست حامد صاحب ریٹائرڈ ایس ایس پی ہیں۔ اسپیشل برانچ کے۔ یقیناً وہ مطمئن ہیں اور انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ ہو سکتا ہے انکل نے جاسوس چھوڑ رکھے ہوں ہمارے پیچھے لیکن انہوں نے کیا رپورٹ دی ہوگی؟ یہی کہ وہ ساحل پر جاتے ہیں... کھاتے پیتے ہیں... کیفے میں اور بس۔''

''کیا زندگی بھر ہمارا یہی معمول رہے گا؟''

''میں بی اے کرلوں پھر شادی بھی کرلیں گے۔ میرے ابا، اماں کو تو اعتراض ہو نہیں سکتا۔ ماشاء اللہ سے تم پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار ہو۔ اچھا کما رہے ہو... صرف ایک ماں ہے تمہارے ساتھ۔''

''ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ وہ بڑی مظلوم عورت ہیں۔ یہی کہیں گی کہ بیٹا جو تیری پسند... رہنا تجھے ہے اس کے ساتھ۔''

''مقصود!'' اس نے ایک دن ساحل پر ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟''

وہ چونکا۔ ''کوئی خاص نہیں بلکہ نہیں۔''

وہ ڈانٹ کے بولی۔ ''مجھے اچھے لگتے ہیں اور میں چاہتی ہوں پہلے سال میں دو ہوں۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔''

''پھر ہر سال دو... ٹوٹل نصف سنچری تو ہوگی ہمارے بوڑھا ہونے تک۔''

وہ ہنسی۔ ''نہیں... جب وہ آٹھ دس سال کے ہو جائیں تو پھر دو... یار! ایک بات کہی تھی کسی نے کہ بچوں میں بس ایک ہی خرابی ہوتی ہے... وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔''

بلاشبہ ان سب عہد و پیمان کے باوجود ان کی محبت کی بنیاد خلوص اور دوستی پر تھی۔ اس میں کبھی ہوس یا بدنیتی شامل نہ ہو پائی تھی اور شاید یہی ''خفیہ رپورٹ'' فاطمہ کے والدین کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔ نہ کبھی مقصود نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ فاطمہ اس کے ساتھ گھر چلے، کسی ہوٹل میں قیام کرے یا کسی دوست کے خالی گھر میں ملے۔ نہ فاطمہ کبھی اتنی جذباتی ہوئی تھی کہ مقصود کے ضبط کا امتحان ہوتا۔ ان کے ملنے کی ہر جگہ عام تھی۔ کوئی پارک، ریسٹورنٹ، ساحلِ سمندر وہ گھنٹوں بیٹھ کے باتیں کرتے یا صرف ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتے رہتے۔ موقع ملنے پر مقصود نے اسے چوما بھی تھا مگر دونوں نے جذبات کو اس حد تک بڑھنے نہ دیا تھا کہ پھر خلوت تلاش کرتے۔ مقصود کو شک تھا کہ وہ بلائے گا بھی تو فاطمہ آئے گی نہیں اور فاطمہ کا اعتماد اس لیے برقرار تھا کہ مقصود کی چاہت میں ہوس نہیں تھی۔ وہ شادی کے لیے ایک عہد کو خود اپنے ساتھ نبھا رہا تھا کہ ان کی شبِ عروسی ہی جسموں کے ملاپ کی پہلی رات ہوگی۔

تقریباً ایک مہینے پہلے مقصود کو اس کا رویّہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کوئی میچ ہارنے کے بعد اس کے موڈ میں غمگینی غالب آجاتی تھی۔ ایک بار اس کی ناوقت بیماری نے اسے ٹورنامنٹ سے آؤٹ کر دیا تھا۔ اسے ڈینگی فیور ہوا تھا اور نتیجے میں اس کی ٹیم ہی ٹورنامنٹ سے آؤٹ ہوگئی تھی۔ وہ کوارٹر فائنل بھی مشکل سے کھیل پائی تھی لیکن اس بار نظر آتے تھے آثار جدا... مقصود نے ہر طرح سے پوچھ لیا مگر اس کا جواب نفی میں رہا۔ نہیں، طبیعت ٹھیک ہے... نہیں ہم نے کوئی میچ نہیں ہارا... نہیں میری طبیعت خراب نہیں ہے۔ وہ جھلا گیا۔ ''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ کوئی نہیں۔''

''تم آج جھوٹ بول رہی ہو مجھ سے۔ کچھ چھپا رہی ہو۔ گھر میں کوئی بات ہوئی ہے؟ امتحان کا خوف ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''یار! وہ ببلو یاد آرہا تھا مجھے۔''

''ببلو کون؟''

''ہمارے قریب ہی رہتا تھا۔ چار پانچ سال کا چھوٹا سا گول مٹول بچہ۔ پیارا گڈے جیسا، مجھ سے بہت ہلا ہوا تھا۔ اپنی ماں سے بھی زیادہ۔ ٹافیاں تو میں سب کو دیتی ہوں۔ وہ ہر روز کھڑکی میں سلاخیں پکڑے میری راہ دیکھتا تھا۔ اکثر میں ان کے گھر چلی جاتی تھی کیونکہ اس کی ماں کسی جگر کے عارضے میں مبتلا تھی۔ دو تین بار اسپتال میں بھی داخل رہی۔ مجھے زیادہ بتاتی نہیں تھی۔ شاید خود اسے معلوم نہیں تھا، کہتی تھی جگر خراب ہے... رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی دو سال سے جاری تھا۔ اس کی حالت سنبھل جاتی تھی پھر بگڑ جاتی تھی۔ میں اس کی گھر کے کام میں اکثر مدد کر دیتی تھی۔ جب وہ اسپتال گئی تو ببلو میرے پاس رہا تھا۔ ایک بار پانچ دن، دوسری بار سات دن۔''

''کیا وہ غریب لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے گھر میں نوکر نہیں افورڈ کر سکتے؟''

''کرسکتے ہیں... شوہر کا شیر شاہ کی کباڑی مارکیٹ

میں بزنس ہے۔ دبئی سے اسکریپ کے نام پر گاڑیوں کے پارٹس اور اے سی کے نئے کمپریسر وغیرہ منگواتا ہے۔ لکھ پڑھ آدمی ہے مگر جاہل۔ ایک ماسی رکھی تھی بہت پہلے۔ پھر عورت نے اسے خود نکال دیا۔ اشاروں میں مجھے بتایا کہ وہ تو گھر پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ غالباً شوہر صاحب نے کچھ دلچسپی لی تھی اور وہ انہیں الو بنا کے لوٹ رہی تھی۔ بیمار عورت ڈرتی ہے کہ شوہر تنگ آ کے اس کی چھٹی نہ کر دے کہ جاؤ کہیں اور مرو... مجھے تو اپنے لیے صحت مند عورت چاہیے۔"

"میں معلوم کر سکتا ہوں اسے کیا بیماری ہے؟"

"جی، وہ میں بہت پہلے معلوم کر چکی ہوں... شکریہ۔ اسے ہیپاٹائٹس بی ہے۔ اسے انجکشن لگنے چاہئیں مگر وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں اور شوہر ہے سخت پردے کا پابند۔ بیوی کو صرف لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے یا زنانہ اسپتال۔ اور زنانہ اسپتال تو صرف میٹرنٹی ہوم ہوتے ہیں۔ وہاں صرف گائنی کی ڈاکٹر ہوتی ہیں۔ دم درود بھی کراتا ہے اور بس یوں سمجھو کہ وہ جیسے جا رہی ہے اور وہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک بچہ ماں کی عدم توجہی اور باپ کی سختی سے بگڑا ہوا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے مارتا ہے۔ وہ بھی بچہ ہے۔ ضد کرتا ہے اور بگڑتا ہے تو کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ چیخ چیخ کے سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتا ہے۔ چیزیں پھینکتا اور توڑتا ہے۔ ابھی اس کی بیوی تیسری بار اسپتال گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ببلو کو لے آؤں تو اس کے باپ نے مجھے جھڑک دیا کہ جاؤ اپنا کام کرو۔ اس نے کھڑکی بھی بند کر دی جس سے مجھے ببلو نظر آ جاتا تھا۔ پھر پتا چلا کہ باپ نے اسے نانی کے پاس بھیج دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کیوں یقین نہیں آتا؟ جب اس کا باپ کہہ رہا ہے تو۔"

اس کی یہ کیفیت وقتی تھی۔ دو چار دن بعد وہ ببلو کو بھول کے نارمل ہو گئی پھر ہنسنے کھیلنے لگی۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ فون پر اس نے پوچھا۔ "کہاں غائب ہو تم... فون بھی نہیں کیا؟"

وہ بولی۔ "کچھ نہیں بس کچھ طبیعت خراب تھی۔ ہمارے ایک فیملی ڈاکٹر ہیں انہوں نے کہا کہ ٹیسٹ کرا لو تو اسپتال چلی گئی تھی۔ فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہے۔"

وہ جب مقصود سے ملی تو بظاہر ٹھیک تھی اور اس نے خود کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی مگر مقصود کے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "کیوں ذرا سی بات کا ہوا بنا رہے ہو۔ بخار نہیں اترتا تھا۔ شک ہوا کہ ٹائیفائڈ تو نہیں۔ اس کے ٹیسٹ فوراً پازیٹو نہیں آتے۔ ہفتہ بھر میں کنفرم ہوتا ہے۔"

"ایسا پہلے ہوتا تھا۔ اب ڈاٹ ٹیسٹ ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم یہ سب۔ رپورٹ نیگیٹو آئی۔ بخار اتر گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا... کوئی اور بات کرو۔"

مقصود نے ایک ہفتے بعد پھر محسوس کیا کہ وہ کچھ بجھی بجھی اور افسردہ ہے۔ یوں جیسے اندر ہی اندر کوئی غم اسے کھائے جا رہا ہو مگر پوچھنے پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ "تم وہمی اور پاگل ہو... خود نارمل نہیں ہو۔"

"ایسا تم سمجھتی ہو؟"

"ہاں کیونکہ جو محبت کرتا ہے، وہ نارمل نہیں رہ سکتا۔" وہ ہنسی۔

چند دن مقصود کے سامنے وہ غیر معمولی طور پر خوش نظر آئی۔ یہ مقصود کو مطمئن کرنے کی کوشش تھی جس میں وہ کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ مقصود کو دس دن قبل ہوا جب اس نے بتایا کہ وہ ہاکی سے ریٹائر ہو رہی ہے۔

مقصود دنگ رہ گیا۔ "تم اتنی عمر رسیدہ ہو گئی ہو یا کوئی تمہاری جگہ لینے والا آ گیا ہے... میرا مطلب ہے آ گئی ہے؟"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ بس اب ہاکی نہیں کھیلنی۔ بیزار ہو گئی ہوں میں اس سخت روٹین سے۔ کیا ہر وقت پریکٹس، ٹریننگ میچ اور ٹورنامنٹ... میری عمر کی لڑکیوں کے شوق کچھ اور ہوتے ہیں۔"

"شوق ختم کیسے ہو سکتا ہے... کوئی کھیل ہو... موسیقی یا مصوری... یہ تو خون میں شامل ہوتی ہے۔"

"بور مت کرو... میں تو سمجھی تھی تم خوش ہو جاؤ گے۔ اب میں تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزاروں گی۔ اچھے اچھے کپڑے پہنوں گی... فیشن کروں گی اور میک اپ کے لیے بیوٹی پارلر جاؤں گی جیسے سب لڑکیاں جاتی ہیں۔"

"چلو، کچھ خیال تو آیا اپنا۔ اگر برا نہ مانو تو... ہم کچھ شاپنگ کر لیں آج؟ میں نے کبھی تمہیں کوئی گفٹ نہیں دیا... کسی موقع پر... آج میری سالگرہ ہے۔"

"ونڈرفل۔ پھر گفٹ میں کروں گی۔ پاپا نے مجھے پانچ ہزار روپے دیے ہیں۔ آج کی ٹریٹ میری طرف سے۔"

ایک ہفتہ کیا گزرا، فاطمہ واقعی بدل گئی تھی۔ اس نے بہترین فیشن کے ڈریس خریدے اور ایسا میک اپ کیا کہ مقصود دیکھتا رہ گیا۔ "یار! میں سمجھتا تھا تمہیں میک اپ کی ضرورت نہیں... تم اتنی حسین پہلے کبھی نہیں لگیں۔"

اب وہ سوچتا تھا کہ اس ایک ہفتے میں بھی وہ پوری طرح

خوش نہیں تھی۔ وہ خوش رہنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ کسی اندر کے خوف کو چھپانے کے لیے اس پر مصنوعی خوشی کے پردے ڈال رہی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ نہ جانے کیا سوچنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ذرا سی دیر کے لیے غم یوں اتر آتا تھا جیسے چاند پر بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا آئے اور گزر جائے۔ اس نے خود کو فٹ رکھنے کے لیے ریس لگانی بھی چھوڑ دی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ جب ہاکی نہیں کھیلنی تو پھر یہ سختی کس لیے اٹھانی... اسے حال ہی میں معلوم ہوا تھا کہ اس کا داڑھی والا کوچ فاطمہ کے گھر بھی گیا تھا۔ اسے سمجھانے اور باپ کی مدد سے قائل کرنے کہ اسے ہاکی کھیلنا نہیں چھوڑنا چاہیے مگر فاطمہ نے اسے بے عزت کر کے بھگا دیا۔ چودھری صاحب خود حیران تھے کیونکہ انہوں نے فاطمہ کو کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔

پھر وہ قتل ہو گئی۔ یہ مقصود کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ فاطمہ اتنی صحت مند تھی کہ کوئی اسے آسانی سے ڈبو نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے قاتل کا غیر معمولی طاقتور ہونا ضروری تھا۔ خودکشی کو تو خود پولیس نے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بعید از امکان قرار دیا تھا۔ اس کی آبرو ریزی بھی نہیں کی گئی تھی۔ کون تھا جس نے اس کو ڈبو کر ساحل پر لٹایا اور اس کے کپڑے اتار کے سرہانے رکھے؟ اور پھر اس کے بدن پر واسکٹ کس نے ڈالی اور کیوں ڈالی؟ گزشتہ ایک ماہ میں فاطمہ کے سمجھ میں نہ آنے والے رویے کی کلید اس کی فیس بک سے مل سکتی تھی یا شاید اس کے موبائل فون سے مگر موبائل فون تو پولیس کو بھی نہیں ملا تھا اور اب وہ فاطمہ کا پاس ورڈ معلوم کرنے کے لیے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

ایک نئے عزم کے ساتھ اس نے پھر کام شروع کیا۔ فاطمہ خان... ہاٹ میل... یاہو... جی میل سب اس کے پاس ورڈ مانگتے تھے۔ وہ مختلف کمبی نیشن ٹرائی کر رہا تھا۔ اسے بچے پسند تھے۔ کیا ببلو کا نام ہو سکتا تھا؟ نو۔ یہ بیج ڈسپلے نہیں ہو سکتا۔ چاندنی رات؟ نو، نام کے ساتھ شہر... کوئی عدد... سات سو چھیاسی... اس کا رول نمبر... فون نمبر... گاڑی کا نمبر... وہ کوشش میں مصروف رہا... پاس ورڈ چوری ہوتے ہیں پھر وہ چوری کیوں نہیں کر سکتا۔ وہ سوفٹ ویئر ایکسپرٹ ہے... ہیکر بن سکتا ہے... کیوں نہ وہ کسی پروفیشنل ہیکر کی خدمات حاصل کرے۔ ایسا کون ہے؟ اس نے ذہن پر زور دیا۔ ہارڈ ڈسک کا ڈیٹا کون پڑھ سکتا ہے؟ جہازوں کے بلیک باکس کا ڈیٹا بھی تو مخصوص ماہرین پڑھتے ہیں۔ اور بلیک بیری کے پیغامات... کوڈ اور پن نمبر... ریسرچ ان موشن والے بتا سکتے ہیں مگر اجازت پر... قانونی طور پر... اسے فاطمہ کی ڈائری دیکھنی ہے... ہر قیمت پر...

پھر اسے ایک شخص کا خیال آیا۔ وہ کئی بار دوسروں کے کریڈٹ کارڈز پر خریداری کر کے انہیں دیوالیہ کر چکا ہے اور اپنے کارنامے بڑے مزے لے لے کر سناتا ہے۔ بس... مگر وہ خود نہ پھنس جائے۔ کورٹ میں تو حامد صاحب کی وجہ سے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری ممکن ہوئی تھی۔ پراسیکیوٹر نے کہا کہ اس میں اتنا دم کہاں کہ اس لڑکی کو ڈبو کے ہلاک کر سکتا اور وجہ بہرحال کوئی نہیں۔ یہ تو شادی کرنے والے تھے۔ لڑکی کے امتحانات چل رہے تھے۔ اس کے بعد... اعتراض کسی کے والدین کو نہیں تھا۔

اس نے فون اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ ابھی وہ سو رہا ہوگا۔ صبح تو اب ہونے والی ہے... اسے بھی کچھ دیر سو جانا چاہیے۔

☆☆☆

ایک کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ فاطمہ کے قتل کی تفتیش معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل چکی تھی۔ تدفین ہو چکی تھی اور آج سوئم کے بعد گویا سوگ بھی ختم... لیکن ایک خلش نے ہر آنکھ میں آنسو بھر دیے تھے... کون تھا وہ سفاک قاتل اور قتل کی وجہ بھی تو ہو کوئی... ان گنت سوالات تھے جن کا نہ جواب تھا اور نہ جواب دینے والا۔ پولیس اپنے طور پر سب کو شامل تفتیش کر چکی تھی۔ مقصود بے گناہ ثابت ہو گیا تھا۔ ہاکی کے کوچ کی وضاحت کا مسئلہ زیر تفتیش تھا۔ نبی بخش سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ فاطمہ کے جیل سے رہا ہونے والے باپ کو حراست میں لے لیا گیا تھا مگر نتیجہ وہی صفر تھا۔

چودھری صاحب نے کہا۔ "یار حامد! تم نے اس لڑکے مقصود کو بچا لیا۔"

"چودھری! تیرے دکھ کو میں سمجھ سکتا ہوں... محسوس نہیں کر سکتا... میں نے اس کی مدد نہ کی ہوتی تو پولیس یقیناً اسے ملزم سے مجرم بنا دیتی۔ اس پر کڑی نظر رکھی خود میں نے اور دوسروں نے بھی۔ وہ حد درجہ شریف اور باکردار لڑکا ہے۔ وہ صرف فاطمہ کے بی اے کا امتحان دینے کے انتظار میں تھا ورنہ وہ شادی کر لیتے۔ جتنا عرصہ وہ ملتے رہے، اچھے دوستوں کی طرح ملے۔ میں نے تو اس کی ماں سے بھی معلوم کیا تھا۔ وہ ابھی تک فاطمہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مقصود اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ ان کا کوئی رشتے دار بھی موجود نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اب مقصود شادی کر لے۔ جہاں چاہے جسے پسند کرے مگر گھر میں کسی کو لے آئے کیونکہ پہلے وہ تنہا تھی۔ اب

آنکھوں کی بینائی سے بھی محروم ہونے لگی۔ کیا ہوتا اگر پولیس اسے مجرم بنا دیتی۔ اس کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔''

''صرف یہی سوچا تو نے...؟''

''نہیں، ایک پولیس افسر بن کے بھی سوچا۔ ایک تو وجہ کوئی نہیں۔ ہر قتل کا کوئی محرک ہوتا ہے۔ شوقیہ تو کوئی قتل نہیں کرتا۔ جنونی اور نفسیاتی مریض کے پاس بھی ایک جواز ہوتا ہے۔ یہ لڑکا سچ مچ فاطمہ کو پسند کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ اس سے شادی کرے۔ بس تھوڑی سی مہلت دے رہا تھا اسے کہ وہ بی اے کر لے۔ تُو نے دیکھا، وہ جسمانی طور پر تیرے میرے جیسا بھی نہیں ہے۔ فاطمہ جیسی تندرست لڑکی آسانی سے کسی کے قابو میں نہیں آسکتی تھی۔ مزاحمت ہر شخص کرتا ہے اگر اس کا گلا گھونٹا جائے یا اسے زبردستی ڈبویا جائے... اور مزاحمت کی یہ قوت عام حالات کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ فاطمہ اس کے قابو میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ عملاً یہ ناممکن تھا مگر سب سے بڑی بات پھر وہی کہ وجہ! دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ کوئی عورت ماں بننے کے قریب ہو اور کسی ہوس پیشہ کے کہنے پر ابارشن نہ کرائے یا اسے بلیک میل کرنے پر تلی ہو... تو وہ قتل کر سکتا ہے... یہاں تو اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ سو فیصد... کنواری تھی۔ میرا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے فاطمہ کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے... مگر میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اسے کس نے مارا اور کیوں...؟''

''میرے پاس وہ ہاکی کا کوچ بھی آیا تھا۔ اس نے بڑے اصرار سے کہا کہ میں فاطمہ کو سمجھاؤں... اسے قائل کروں کہ وہ ہاکی نہ چھوڑے۔ اس کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ وہ قوم کی امیدوں کا سرمایہ ہے وغیرہ وغیرہ... میں نے کہا کہ تمہاری بات ٹھیک ہوگی لیکن میں زبردستی تو نہیں کر سکتا... جوان بیٹی ہے... آج نہ سہی کل وہ ہاکی چھوڑتی... وہ شادی نہ کرتی۔ شادی کو کب تک التوا میں رکھا جا سکتا ہے... ہاکی تو وہ شاید مزید دس بارہ سال کھیلتی... چلو اب صبر کرو۔ لڑکیوں کے لیے اپنا گھر بسانا ہی قوم کی خدمت سے زیادہ اہم ہوتا ہے... گولڈ میڈل نہیں... تم نے اس کے بارے میں بھی شک کا اظہار کیا تھا۔''

''ہاں، اس کا ماضی کچھ ایسا ہی ہے... مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ جب وہ بینک میں ملازم تھا تو صدر سے اس کی پرخاش تھی اور اسی بنا پر ایک لڑکی نے اس پر تہمت لگائی تھی۔ وہ بینک کی طرف سے کھیلتا ہوگا مگر صدر سے اس کا کیا واسطہ تھا؟''

چودھری اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔ ''پھر؟ تُو نے کیا پتا چلایا؟''

''کام مشکل تھا کیونکہ بات پرانی تھی۔ پھر بھی اس بینک کے لوگوں سے ملا۔ زیادہ تر ادھر ادھر ہو چکے ہیں۔ کچھ ترقی پا کر اوپر چلے گئے ہیں جو ملے انہوں نے کہا کہ کچھ پتا نہیں۔ دنیا میں سب ہوتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ الزام غلط نہیں تھا۔ وہ لڑکی فریاد لے کر صدر کے پاس چلی گئی تھی، معلوم نہیں سچ بول رہی تھی یا بلیک میل کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور جو شخص اس کا ذمے دار ہے، وہ اب شادی سے انکار کر رہا ہے۔ تاہم ان کا چکر ضرور تھا۔ آخری بات وہ لڑکی کر سکتی تھی۔ اتفاق سے مخبروں کے ذریعے مجھے اس کا پتا چل گیا۔ اب وہ شادی شدہ عورت چار بچوں کی ماں ہے۔ میں نے فون پر کہا کہ مجھے اس سے ایک شخص کے بارے میں بات کرنی ہے جس کے ساتھ وہ بینک میں تھی۔ نام سنتے ہی وہ غصے میں آ گئی کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرتی، میں نے کہا کہ کیا پھر میں اس کے شوہر سے بات کروں؟ وہ گھبرا گئی اور منت سماجت پر اتر آئی کہ وہ پرانی بات ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے صرف دس منٹ اکیلے میں چند سوالات کے جواب دے دو گی تو کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ وہ مان گئی۔ میں نے گھر جا کے اس سے پوچھا۔ اسے بتایا کہ وہ شخص ایک اور لڑکی کے معاملے میں مشکوک افراد میں شامل ہے تو اس کے دل میں پرانی نفرت عود کر آئی۔ اس نے کہا کہ وہ کمینہ ایسا ہی ہے۔ مجھے بھی سبز باغ دکھائے تھے اس نے اور میں کم عمر نادان تھی۔ وہ اچھا ہینڈسم آدمی تھا اور خیال تھا کہ پاکستان ہاکی ٹیم میں آ جائے گا۔ میں اس کے چکر میں آ گئی۔ وہ بعد میں مکر گیا۔ میری تو زندگی برباد ہو جاتی۔ کسی نے مجھے کہا کہ میں سیدھی بینک کے پریذیڈنٹ کے پاس جا کے فریاد کروں۔ وہ تمہارا ذاتی معاملہ کہہ کر تمہیں برطرف بھی کر سکتا ہے اور تمہاری مدد بھی کر سکتا ہے۔ میں نے چانس لیا اور جیسے ہی وہ کار سے اتر کے لفٹ کی طرف بڑھا، میں اس کے پاؤں پڑ گئی۔ وہ گھبرا گیا۔ بہت سے لوگوں نے یہ تماشا دیکھا۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں بلوا لیا۔ پہلے بہت ڈانٹا کہ سب کے سامنے ڈراما کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ اس کے بغیر آپ تک کیسے پہنچتی۔ خیر، اس نے ہاکی پلیئر کو بلوایا اور کہا کہ اس لڑکی سے شادی کرو ورنہ لکھو استعفا... وہ اچھا پلیئر تھا اور اونچی ہوا میں اڑ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ جناب میرے ذاتی معاملات میں دخل کا اختیار آپ کو کس نے دیا اور استعفا لکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ میرٹ پر دوسرے بینک میں اسے رکھ لیا جائے گا یا کسی اور

محکمے کی ٹیم میں... لیکن بینک کا پریذیڈنٹ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت کا بیٹا تھا۔ ہاکی پلیئر کو جیل میں جگہ ملی۔ غبن کے کیس میں۔ اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا۔ اب کہیں دھکے کھا رہا ہوگا۔ وہ باقی بات گول کر گئی کہ اس نے اپنا مسئلہ پھر کیسے حل کیا۔ خیر، میرا اس سے تعلق بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کوچ سے بات کی۔ اس کی پوزیشن ایسی ہی ہے کہ وہ لڑکیوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ کم عمر لڑکیاں اپنے ٹیچر کی محبت میں آسانی سے گرفتار ہو جاتی ہیں جیسے لڑکے اپنی مس کے عشق میں۔ وہ کسی ٹیم میں نہ سہی، ابھی بھی فٹ ہے اور بہت صحت مند۔''

''تمہارا مطلب ہے، صرف اس بات پر وہ فاطمہ کو قتل کر سکتا ہے کہ فاطمہ نے اس کی بات نہیں مانی تھی؟ کھیلنا چھوڑ دیا تھا تو یہ ممکن تو ہے۔''

''اس میں ایک پہلو انا کا ہے۔ پہلے فاطمہ نے کوچ کو انکار کیا۔ پھر تم نے۔ اس کی پوزیشن خراب ہوئی کیونکہ ٹیم کوارٹر فائنل سے آؤٹ ہو گئی۔ ایک پلیئر کے نہ ہونے سے ٹیم کی کارکردگی نہ رہے تو سوال کوچ سے کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اسے نوکری خطرے میں نظر آئی ہو۔ ایک بار پھر بات کرنے کے بہانے وہ فاطمہ سے مل سکتا تھا اور فاطمہ اس کے ساتھ جانے میں خطرہ بھی محسوس نہ کرتی۔ معلوم نہیں فاطمہ نے کیا کہا۔ وہ کسی بات پر آ گیا اشتعال میں۔ وہ حراست میں ہے۔''

''پولیس نے نبی بخش کو بھی پکڑا اور چھوڑ دیا۔'' چودھری نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''نبی بخش پاگل تو نہیں مگر پاگل ہی کہیں گے اسے... وہ بے ضرر ہے۔ ذہنی معذوری کے باعث وہ بعض اوقات کنفیوز ہو جاتا ہے۔ ایک کام روٹین کے مطابق تو کر سکتا ہے، نئی اور مشکل سچویشن کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کا دماغ سلو ہے اور لوجیکل نہیں ہے۔ اس نے فاطمہ کو دیکھا تو جا کے اس پر اپنی جیکٹ ڈال آیا۔ اس کے دماغ نے کہا کہ سردی لگ رہی ہو گی، کپڑوں کے بغیر۔ یہ نہیں سوچا کہ ایسا کون کرتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا وہ زندہ ہے یا نہیں۔''

چودھری نے ایک آہ بھری۔ ''بس ایک بار قاتل پکڑا جائے... تو میں اس سے ایک ہی سوال کروں گا کہ آخر فاطمہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ کیوں قتل کیا اس نے آخر؟'' چودھری نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو ویسے ہی مرنے والی تھی۔''

حامد کچھ دیر سکتے میں بیٹھا رہا۔ ''مرنے والی تھی؟ یہ تُو کیا کہہ رہا ہے چودھری؟''

چودھری نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ پوری نہیں پڑھی تُو نے؟''

''میں کیا کرتا اسے پڑھ کے... جب ہماری بچی ہی نہیں رہی۔''

''اس میں لکھا تھا، ابھی کچھ دن پہلے وہ بیمار ہوئی تھی۔ اس نے کچھ ٹیسٹ کرائے تھے۔''

''ہاں... تقریباً ڈیڑھ مہینے پہلے۔''

''اس ٹیسٹ کے نتیجے میں فاطمہ پر ایک بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا تھا... اس کا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی ذکر ہے۔ اس کی زندگی بہت محدود ہو چکی تھی۔''

حامد علی ایک دم رو پڑے۔ ''میں نہیں مان سکتا... نہیں چودھری۔''

''یہ حقیقت ہے۔ اس کو قتل کرنے والے نے بے سبب جرم اور گناہ کیا۔ اسے تو مر ہی جانا تھا کچھ عرصے میں۔''

''یار چودھری! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اس بہادر لڑکی نے اتنا بڑا صدمہ اپنی ذات پر لے لیا، کسی کو دکھی نہ کرنے کے لیے۔ اس نے نوشتۂ تقدیر کو اسی طرح قبول کر لیا جیسے کسی ٹورنامنٹ کے فائنل میں شکست کو قبول کرتی تھی۔ پارٹ آف دی گیم... لائف از لائک دیٹ... ابھی تک میں نے تجھے بتایا نہیں... میں تیرا ری ایکشن دیکھ رہا تھا اور مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ بیگم کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ مزید دکھی ہوں گی۔''

حامد علی سکتے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ ''کینسر... ناقابلِ علاج سہی وہ کتنا عرصہ اور جیتی؟''

''شاید چند ماہ۔ کچھ دن اور وہ سب سے چھپا سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد... شاید وہ خودکشی کرتی۔ دوسروں کو تکلیف دینے اور خود ایک طویل تکلیف دہ موت کا عذاب جھیلنے سے یہ بہتر سمجھتی کہ خواب آور گولیاں کھائے اور سو جائے۔ الزام خود اس پر آتا۔ جو صدمہ ہوتا ایک بار ہوتا اور گزر جاتا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا کرتی مگر اس کی شخصیت، مزاج اور سوچ کو دیکھتے ہوئے یہ میرا اندازہ ہے... تم بھی کہتے تھے اور وہ لڑکا مقصود... وہ بھی بتا رہا تھا کہ فاطمہ بدل گئی تھی۔ ہاکی کھیلنا کیوں چھوڑا تھا اس نے آخر؟ شوق اور جنون سے یوں کون دستبردار ہوتا ہے... وہ اچانک اداس ہو جاتی تھی اور پھر چھپاتی تھی۔ اس نے میک اپ، فیشن اور اچھے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ کیسی عجیب لڑکی تھی یار... اس نے مقصود تک پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔''

''اور اب کیسے سکون سے قبر میں سوئی پڑی ہے... جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔''

چودھری رونے لگا۔ حامد علی چودھری کو بے بسی سے اور رحم آمیز نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ دونوں مٹی کے اس ڈھیر کے قریب ایک پرانی پختہ بنی ہوئی قبر پر بیٹھے تھے۔ مٹی کے اس ڈھیر پر کچھ تازہ پھول تھے۔ باقی مرجھائے یا سوکھے ہوئے... قبرستان کے سکوت میں ایک ماتمی شام اتر رہی تھی۔ وہ درختوں کے پتوں سے گزرنے والی ہوا کی سرگوشی سن سکتے تھے۔ اس میں ایک سوال تھا۔ آخر مجھے قتل کیوں کیا گیا؟ ڈیڈی... انکل... بتائیے... شام کے دھندلکے میں دور سے اذان کی صدا ابھری۔ وہ دونوں آہستہ سے اٹھے اور گیٹ کی طرف چلنے لگے۔

☆☆☆

مقصود کے سامنے پھر وہی چہرہ تھا جو اس کی ناکام کوشش پر کبھی خندہ زن محسوس ہوتا تھا تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی کرتا نظر آتا۔ ایک ہفتے سے وہ شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ آفس میں اس کی توجہ بار بار کام سے ہٹ جاتی تھی۔ یہ رات کو دیر تک جاگنے اور مسلسل کافی پینے کا نتیجہ بھی تھا۔ اب وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے ایک بے وقوف دوست نے کہا تھا کہ ٹینشن دور کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ سارے غم دھوئیں میں اڑا دو۔ یہ عادت اس نے بڑی مشکل سے ترک کی تھی۔ اسکول ٹائم میں اسے یہ لت لگی تھی۔ دو سال وہ ماں سے چھپ کے پیتا رہا۔ پھر ایک دن اس کی چوری پکڑی گئی اور ماں نے اسے بلیک میل کیا۔

”تُو سگریٹ پی رہا ہے؟ کب سے؟“ اس نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اس کے سامنے رکھ دی۔ ”جھوٹ مت بولنا۔“

”اب تو کئی سال ہوگئے۔“ وہ ماں سے نظر نہ ملا سکا۔

”کیوں پیتا ہے؟ اپنے باپ کی طرح تُو بھی کہے گا کہ غم غلط کرنے کے لیے... اس نے کچھ عرصے بعد نشے والی پینا شروع کردی تھیں... تُو بھی کرے گا؟“

”نہیں امی... آپ خوامخواہ فکر کرتی ہیں۔“

”خوامخواہ... سگریٹ کے بعد وہ آ گیا تھا شراب پر۔ دونوں اچھی نہیں ملتی تھیں تو وہ گھٹیا پیتا تھا۔ میں روکتی تو مجھے مارتا تھا۔ تُو بھی یہی کرے گا۔ کیا تُو بھول گیا ہے مقصود... نشے میں اس نے کیا کیا تھا؟ تُو بھی وہی کرنا چاہتا ہے؟“

”بات کا بتنگڑ مت بنائیں امی... مجھے کنٹرول ہے۔“

”آج تک کوئی نشے کی لت کو کنٹرول کرسکا ہے جو تُو کرے گا؟ ہمیشہ خود پینے والا بے بس ہوتا ہے... نشہ اسے کنٹرول کرتا ہے... دیکھ یہ کیا ہے؟“ اس نے گہرے سرخی مائل سیاہ داغ کا ایک کپڑا اس کے سامنے کیا۔ ”یہ خون ہے تیرے بھائی کا۔ سونگھ اسے... اس میں کس کے خون کی خوشبو ہے... تجھے نہیں آئے گی لیکن مجھے آتی ہے... یہ اس کے قاتل کا خون ہے جو اپنا حساب مجھ سے مانگتا ہے۔ انتقام کی آگ ہمارے خون میں کبھی سرد نہیں ہونی چاہیے... لیکن دیکھ میں نے تجھے بچا لیا... ورنہ میں تیرے ہاتھ میں وہی خنجر دیتی اور کہتی کہ جا اس قاتل کو تلاش کر اور اس کا کام تمام کر کے آ... اور جب تک یہ فرض پورا نہ ہو جائے مجھے اپنی شکل مت دکھانا... اب تُو قاتل کے پیچھے اس کی تلاش میں نہیں جارہا ہے۔ اس کے نقش قدم پر جارہا ہے، تو میں تجھے کیسے جانے دوں... میں نے پھر تجھے سگریٹ پیتا دیکھا تو تجھے کچھ بھی نہیں کہوں گی... اس خنجر سے اپنی کلائی کاٹ لوں گی... پھر کوئی نہیں ہوگا تجھے روکنے والا۔“

اس نے ماں کے ہاتھ سے وہ خنجر چھین لیا اور اس دن کے بعد سگریٹ نہیں پی۔ بات بہت پرانی ہوگئی تھی مگر اس رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ وہ رات پھر اس کی زندگی میں لوٹ آئی تھی جب اس کے باپ کے ہاتھوں اس کے بھائی کا قتل ہوا تھا۔ جوانی میں وہ بڑا انقلابی ذہن رکھتا تھا اور طبقاتی نظام کے خلاف تھا۔ سرمایہ دار کے ہاتھوں محنت کش کے استحصال نے اسے یونین لیڈری کی راہ پر ڈال دیا۔ ایک سیاسی جماعت کی حمایت سے وزیر بھی بن گیا مگر پھر حالات میں انقلاب آیا۔ اس کی لیڈری ختم ہوگئی۔ وہ گرفتار ہوا۔ اسے سرِعام کوڑے مارے گئے۔ پھر جیل میں اس کا سارا انقلابی جوش و خروش نکال دیا گیا۔ اس کی جائداد ضبط ہوگئی اور بہت سی ضمانتوں اور معافیوں اور یقین دہانیوں کے بعد جب وہ نکلا تو ایک ٹوٹا پھوٹا ناکارہ آدمی تھا جسے کسی نے ملازمت بھی نہیں دی۔ اس کا پرانا ریکارڈ خراب تھا۔ وہ ہڑتالیں کرا کے صنعتی امن خراب کراتا رہا تھا اور اب معتوب بھی تھا۔ اس کا حوصلہ ختم ہوگیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ریڑھی لگانے کی کوشش کی تو بھتے کے معاملے پر تھانے والوں نے اسے ڈنڈے مار کے بھگا دیا۔ مزدوری اس کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ جیل میں تشدد سے اس کی صحت برباد ہوگئی تھی۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لیے اس کی بیوی گھروں میں کام کرتی تھی اور گھروں سے بچا کھچا کھانا مانگ لاتی تھی۔

مقصود اور اس سے بڑا مرغوب میٹرک کر چکے تھے اور گھر کے حالات کا اثر ان کی زندگی پر بھی ہو رہا تھا۔ مقصود نے جیسے تیسے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا مگر مرغوب باغی ہوگیا۔ باپ نے سگریٹ کے بعد ہیروئن شروع کی اور گھر میں مار پیٹ گالی گلوچ کرنے لگا تو اس کا بڑے بیٹے سے جھگڑا شروع ہوا۔

میٹرک پاس مرغوب کو نوکری کیا ملتی۔ وہ چوری چکاری کر کے ماں کی مدد کرنے لگا۔ ترقی کر کے ڈاکو بننے سے پہلے ہی وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ ماں کے لیے دہری مشکل ہوگئی۔ ایک طرف شوہر دوسری طرف بیٹا... وہ کس کس کو سمجھاتی۔ لیکن انہی دنوں نہ جانے کیوں اور کیسے باپ کو مرغوب پر شک ہوگیا کہ وہ اس کی اولاد نہیں ہے۔ جب وہ جیل میں تھا اور اس کی بیوی گھروں میں کام کے لیے جاتی تھی تو کہیں سے ایک ناجائز اولاد کا تحفہ بھی لے آئی تھی جو اس نے رہائی کے بعد شوہر کو پیش کر دیا۔ دونوں بھائیوں کی فطرت میں ہی نہیں، صورت میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ مرغوب کا رنگ سیاہی مائل گہرا سانولا تھا اور اس کی صورت کے نقوش اور بال سب بلوچ مکرانیوں جیسے تھے۔ اس کے برعکس مقصود کا رنگ ماں باپ کی طرح صاف تھا جو نسلاً پٹھان تھے۔

ایک رات نشے میں اس نے بیوی کو مارا اور شاید اسے قتل کر دیتا۔ وہ بیوی سے ایک ہی سوال کا جواب چاہتا تھا کہ اس لڑکے مرغوب کا باپ کون ہے۔ بیوی کا جواب اسے جھوٹ لگتا تھا کہ وہی اس کا باپ ہے۔ اس جھگڑے میں مرغوب کی عزتِ نفس روز مجروح ہو رہی تھی۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ باپ کے سامنے ڈٹ گیا۔ ”ہاں، تُو میرا باپ ہے اور نہ میں تیرا بیٹا ہوں... میری ماں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اس کی جگہ تُو ہوتا، تو بھی یہی کرتا۔ وہ مجبور تھی اور کمزور تھی۔“ اگرچہ اس کی بات غلط نہ تھی مگر مرغوب کے باپ کا نشے میں دماغ الٹ گیا۔ اس نے اچانک قریب پڑی چھری اٹھائی اور مرغوب کے دل میں اتار دی۔ جب وہ نیچے گرا تو وہ اس پر پے در پے وار کرتا رہا اور اسے چیخ چیخ کے ناجائز کہتا رہا۔ مقصود نے عقل سے کام لیا اور ماں کو ساتھ لے کر جائے واردات سے فرار ہوگیا۔ قاتل خود بھی بعد میں فرار ہوگیا اور کبھی پکڑا نہیں گیا۔ مقصود اپنی ماں کے ساتھ حیدرآباد میں ایک رشتے دار کے گھر چلا گیا۔ اس نے خود کو اور ماں کو اس واردات میں ملوث ہونے سے صاف بچا لیا۔ ”ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ نہ ہم یہاں تھے نہ ہم نے کچھ دیکھا... باپ نے بیٹے کو کیوں قتل کیا اور خود کہاں گیا... ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔“

مقصود کی ماں تقریباً پاگل ہوگئی تھی مگر وہ دوسرے بیٹے کے سہارے پر اس کے لیے زندہ رہی۔ کئی سال بعد اسے شوہر کی خبر ملی۔ اس کے سینے میں انتقام کی دہری آگ جل رہی تھی۔ شوہر نے اس پر بدکردار ہونے کا الزام لگایا تھا اور اس کے بیٹے کو اس کی نظروں کے سامنے مارا تھا۔ وہ اپنے ہی خون میں غلطاں فرش پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ لیکن دوسرے

بیٹے کو بچانے کے لیے اس نے اپنے پٹھان خون کی پکار کو دبا دیا ورنہ وہ اس کے ہاتھ میں خنجر دے کر کہتی کہ بیٹا... جا... اپنے بھائی کے قاتل سے انتقام لے... ورنہ میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔

مقصود اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونکا۔ اس کا باس پیچھے کھڑا اسے بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ ”مقصود! گھر جاؤ... تمہاری ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی ماہرِ نفسیات سے ملو اور جیسا وہ کہے کرو... تمہیں دوا اور علاج کے ساتھ آرام اور چینج کی ضرورت ہے... ایسے تم کام نہیں کر سکتے۔ جب تک تم بالکل ٹھیک نہ ہو جاؤ، میری طرف سے چھٹی ہے۔ میں تم جیسے ورکر کو کھونا نہیں چاہتا۔“

اور تب سے وہ گھر میں کمپیوٹر پر ایک ہی کام کر رہا تھا لیکن ابھی تک فاطمہ کا پاس ورڈ تلاش کرنے میں اسے ناکامی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ فاطمہ کی الیکٹرانک میموری سے اسے قاتل کا سراغ ضرور مل جائے گا... اس نے اپنی ڈائری میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا... اسے پتا ہی نہ چلا کہ ماں کب سے اس کے پاس کھڑی ہے۔

”مقصود! آخر کب تک اس تصویر کو گھورتا رہے گا تُو... فاطمہ تو چلی گئی... وہ اب اس گھر میں نہیں آئے گی۔“ ماں نے محبت سے کہا اور اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ بیٹے نے اس کی دی ہوئی قسم توڑ دی تھی۔ وہ پھر سگریٹ پی رہا تھا، وہ ماں سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ اسی وقت باہر سے کسی نے کال بیل کا بٹن دبایا تو مقصود نے سکون کا سانس لیا۔ ماں پلٹ گئی۔ یہ اس کا وہی دوست ہوگا جو اپنی فنکاری سے لوگوں کے کریڈٹ کارڈز پر خریداری کرنے کا کارنامہ دو بار سرانجام دے چکا تھا اور اپنے مجرمانہ فعل پر ذرا بھی شرمندہ نہ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یار لاکھوں کے بینک بیلنس میں سے لاکھ دو لاکھ نکل جانے سے وہ غریب تو نہیں ہو گئے۔ غریب تو ہم ہیں جن سے مجبوری سب کراتی ہے۔ اس نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ مقصود کی بات سن کے اس نے کہا تھا کہ اچھا کچھ کرتے ہیں یار! دکھی مت ہو۔

لیکن اس وقت آنے والا مقصود کا دوست نہیں تھا۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔ ”ہائے ......!“ وہ چونک کر پلٹا۔

”کرن... تم یہاں؟“ وہ حیرانی سے زیادہ پریشان ہو کے اٹھا۔

کرن اس کی سوفٹ ویئر ڈیزائن کرنے والی کمپنی کے باس کی بیٹی تھی جو آئی ٹی کے شعبے میں ڈگری کے لیے ہارورڈ گئی

ہوئی تھی۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی جسے بالآخر جانشین کی حیثیت سے یہ سارا کاروبار سنبھالنا تھا۔ باپ کے ذہن نے تو بہت دور کا سوچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مقصود اور کرن مل کے اس کاروبار کو فرش سے عرش پر پہنچا سکتے ہیں... یہ کمپنی پاکستان کی سوفٹ ویئر ایکسپورٹ کرنے والی نمبرون کمپنی بن سکتی ہے۔

اس نے کرن کے لیے اپنی کرسی خالی کی اور اپنے لیے باہر سے ایک کرسی اٹھا لایا۔ اس نے دبے لہجے میں ماں کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا۔ ''باس کی بیٹی ہے امی... امریکا سے ایم ایس کر کے آئی ہے... آپ چائے نہیں کافی بنا دیں۔''

''آپ کے ایک ساتھی نے ڈیڈی کو بتایا تھا کہ آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے... مجھے واقعی بہت دکھ اور افسوس ہوا۔ یہی تھی آپ کی گرل فرینڈ۔'' اس نے بے تکلفی سے اسکرین پر نظر آنے والی فاطمہ پر تبصرہ کیا۔

''ہم شادی کرنے والے تھے۔'' مقصود نے شائستگی سے تصحیح کی۔

''آپ نیٹ پر اس کا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے پریشان ہیں۔ پاس ورڈ نہیں مل رہا ہے؟'' اس نے لیپ ٹاپ کو اپنے قریب کیا۔

مقصود تقریباً اچھل پڑا۔ ''آپ کو یہ کس نے بتایا؟''

''آپ نے کسی سے کہا ہوگا... اس نے رازداری سے ڈیڈ کو بتایا۔ پھر ڈیڈ نے مجھ سے ذکر کیا۔'' وہ اب کام میں مصروف ہو چکی تھی اور اس کی نظر اپنے سامنے اسکرین پر تھی۔ اس کی انگلیاں کسی جادوگر کی طرح متحرک تھیں۔

''آپ... یہ کر سکتی ہیں...؟''

''کوشش کر سکتی ہوں۔ وہاں ایک بہت بڑے فنکار نے مجھے یہ جادو بھی سکھا دیا تھا۔ لیکن پہلے اپنی ایک امانت وصول کر لیں۔'' اس نے بیگ میں سے ایک موبائل فون نکالا۔ ''پہچانتے ہو اسے؟''

مقصود نے سر ہلا کے موبائل فون لے لیا۔ ''یہ فاطمہ کا ہے۔ آپ کے پاس کیسے آیا؟''

''آفس میں کسی نے فون کیا تھا... کسی عورت نے... اس نے کہا کہ میری بات کسی عورت سے کرا دو... ڈیڈ کی سیکریٹری نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو اس نے کہا کہ آپ کون ہیں... کیا میں آپ پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ یہ بہت ضروری بات ہے۔ اس نے کال ڈیڈی کو دے دی اور آہستہ سے بتایا کہ کوئی عورت ہے۔ اپنا نام نہیں بتاتی... کہتی ہے کسی خاتون سے بات کروں گی... ڈیڈ نے اشارہ کیا کہ بات جاری رکھو مگر دوسرے فون پر خود بھی اس کی بات سنی۔ اس عورت نے کہا کہ میں اسپتال میں ہوں پتا نہیں زندہ رہوں نہ رہوں... ایک چیز ہے میرے پاس جو مجھے مقصود صاحب کو دینی تھی... مگر وہ آفس میں نہیں ہیں اور ان کا نمبر بھی مجھے نہیں مل رہا ہے... مل جاتا تب بھی یہاں کوئی عورت ہی آسکتی تھی۔ میں پرائیویٹ وارڈ میں ہوں اور میرے شوہر پردے کے سخت پابند ہیں۔ یہاں صرف نرس یا لیڈی ڈاکٹر آسکتی ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیڈ نے اپنی سیکریٹری کو بھیج دیا۔ لیکن اسے دیر ہوگئی۔ وہ عورت آئی سی یو میں پہنچا دی گئی تھی۔ ایک اسٹاف نرس نے یہ موبائل فون دیا۔ یہ تصدیق کرنے کے بعد کہ سیکریٹری کو مقصود صاحب نے ہی بھیجا ہے۔''

مقصود کی ماں نے کافی کے دو مگ ان کے درمیان رکھے۔ کرن نے اخلاقاً شکریہ کہا اور پھر مقصود سے مخاطب ہو گئی۔ ''اب بتائیں... فاطمہ کے درمیان ای ہے یا آئی... فاطمہ خان... یہی ہے نا پورا نام؟''

مقصود نے اقرار میں سر ہلایا اور اس جادوگرنی کو دیکھتا رہا جس کا اب تک اس نے صرف نام سنا تھا۔

☆☆☆

'رات ساڑھے گیارہ بجے کون آسکتا ہے؟' عجب گل نے حیرانی سے سوچا اور ننگے پاؤں دروازے تک گیا۔ مقصود کو اپنے سامنے دیکھ کے اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''تم! کیا بات ہے؟''

''عجب گل! تم جانتے ہو مجھے؟'' مقصود نے کہا اور اندر داخل ہوگیا۔

''بولو کیا بات ہے؟'' عجب گل نے ناراض لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں، میں تعزیت کے لیے آیا تھا۔'' اس نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے۔ ''تمہاری مرحومہ بیوی کی موت پر میں تمہارے غم میں شریک ہوں۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔'' مقصود نے رسمی انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

عجب گل کی نظریں اس پر مرتکز رہیں۔ ''بڑا مہربانی... اب تم جاؤ۔''

مقصود نے اطمینان سے کہا۔ ''دراصل مجھے دیر سے معلوم ہوا اس لیے دیر سے آیا ہوں ورنہ سوئم میں ضرور شریک ہوتا۔''

عجب گل نے جھنجلا کے کہا۔ ''ٹھیک ہے... ابھی ہم سوئے گا۔''

''خلل صاحب! آپ اکیلے رہتے ہو یہاں... میرا مطلب ہے ایک بیٹا بھی تھا آپ کا... ببلو۔''

عجب گل کی آنکھوں میں شک پر خوف غالب آنے لگا۔ ''کون ہے تم... ببلو کو کیسے جانتا ہے؟''

مقصود مسکرایا۔ ''بہت پیارا بچہ تھا۔ میرا مطلب ہے کہ... ہے۔''

''ہم نے اس کو نانی کے پاس بھیج دیا تھا۔''

مقصود نے سر ہلایا۔ ''ظاہر ہے یہاں اس کی دیکھ بھال کون کرتا۔ تم دن میں دکان پر چلے جاتے ہو... بیوی اسپتال میں داخل تھی۔ نانی کہاں رہتی ہے اس کی؟'' اس نے اچانک سوال کر دیا۔

عجب گل کے لیے غصے پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ ''خو کتے کا بچہ... کیا بکواس کرتا ہے... آدھی رات کو زبردستی گھر میں گھس کے... اٹھو۔'' وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

مقصود کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔ اس نے ایک دم فاطمہ کا موبائل فون نکال لیا۔ ''نہیں خان... گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔ پٹھان تو بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں... اسے پہچانتے ہو؟''

عجب گل کی حالت میں رونما ہونے والا تغیر بہت واضح تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے یوں رک گیا جیسے اچانک اس کے مہمان نے موبائل فون نہیں ریوالور نکال لیا ہو۔ ''یہ... تمہارے پاس... کس کا ہے یہ... ہم کو کیا معلوم؟''

''پھر اتنے بدحواس اور پریشان کیوں ہو... یہ تو تمہاری بیوی کے پاس تھا نا؟''

عجب گل اس پر وحشی درندے کی طرح جھپٹا۔ ''کتے کا بچہ...'' اس نے ایک گالی بکی اور موبائل فون چھین کر دیوار پر دے مارا۔ موبائل فون کے ٹکڑے اڑ کر کمرے میں بکھر گئے۔ مقصود صوفے کے پیچھے مورچا بند ہوگیا۔

''آہا۔'' مقصود نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اس موبائل فون میں ایک بڑی کارآمد ویڈیو فلم تھی۔ وہ تم نے ضائع کر دی۔''

''خنزیر کا بچہ... تم کو چھوڑے گا نہیں...'' عجب گل نے بڑی پھرتی سے ایک میز کی دراز میں سے ریوالور نکال لیا۔

مقصود اطمینان سے کھڑا رہا۔ ''ہاں... ایسا ہی کرو... اب کیا فرق پڑتا ہے قتل ایک ہو، دو یا تین... بلکہ میں تو تمہاری بیوی کی موت کو بھی قتل ہی شمار کروں گا۔ اسے تمہارے سلوک نے مارا۔ اگر تم اس کا صحیح علاج کراتے اور لیڈی ڈاکٹر پر اصرار نہ کرتے... چوتھا میرا ہو سکتا ہے۔ اگر تم ہمت کرو۔ چلاؤ گولی۔''

عجب گل نے اسے ایک اور فحش گالی دے کر ٹریگر دبایا۔ خوف سے زیادہ مقصود کی باتوں نے اس کے اشتعال کی آگ کو بھڑکایا تھا۔ ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی۔ کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ کوئی گولی نہیں چلی۔

مقصود نے کہا۔ ''یہ کیا ہوا؟ گولی کدھر گئی خاموشی سے... عجب گل! پھر کوشش کرو... میں کھڑا ہوں اپنی جگہ۔''

عجب گل نے جھنجلاہٹ میں کئی بار ٹریگر دبایا اور پھر ریوالور مقصود پر کھینچ مارا... مقصود غوطہ لگا کے صوفے کی پشت سے نیچے ہوگیا۔ ریوالور اس کے اوپر سے اڑتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ مقصود جب دوبارہ اٹھا تو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا مگر دوسرا...

''بس عجب گل... تمہارے کرنے کو اب کچھ نہیں رہا۔ باقی جو کرے گا وہ قانون کا ہاتھ کرے گا جو اس وقت میرا ہاتھ ہے۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے آئے تو گولی دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے تمہارے گھٹنے میں سوراخ کر دے گی... پھر تم پھانسی کے تختے تک بھی لنگڑاتے ہوئے جاؤ گے بغیر کسی کے سہارے۔'' مقصود نے اپنی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ایک فائر کیا اور پیچھے رکھے واٹر کولر میں سوراخ کر دیا۔ اس میں سے پانی کی دھار بہہ کر فرش پر بچھے قالین کو تر کرنے لگی۔

عجب گل کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ وہیں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میں نے آج دن میں تمہارے گھر کی تلاشی لی تھی۔ کون تھا مجھے روکنے والا لیکن مجھے پولیس کی آشیرباد... اجازت بھی حاصل تھی۔ میں نے تمہارا یہ ریوالور خالی کر دیا تھا اور بھی بہت کچھ دیکھا میں نے لیکن پولیس کے لیے چھوڑ دیا۔ میرے کام کی چیز کوئی نہیں تھی۔ اصل چیز تو یہ موبائل فون تھا جو خود تمہاری بیوی نے مجھے فراہم کیا۔ مرتے مرتے وہ تمہیں مار گئی۔ اس نے تم سے اپنا بدلہ بھی لے لیا اور اپنے بیٹے کا بھی... اور جیسے مرتے ہوئے شخص کا بیان حلفی عدالت میں درست تسلیم کیا جاتا ہے، ویسے ہی یہ موبائل فون تمہارے حق میں سزائے موت کا پروانہ بنا۔''

عجب گل نے تلخی سے کہا۔ ''کون سا موبائل فون؟''

مقصود مسکرایا۔ ''خان... تم ایک کباڑی ہو... تمہارا دماغ بھی ایک کباڑ خانہ ہے۔ میں انجینئر ہوں... کمپیوٹر انجینئر... اس موبائل فون میں دو دو منٹ کی ویڈیو فلمیں تھیں۔ ان کو تم نے صاف کر دیا تھا۔ اور بھی بہت کچھ

تھا۔ تم نے کچھ باقی نہیں رہنے دیا۔ اگر اس موبائل فون کو بھی چھوڑ دیتے تو کچھ نہ ہوتا۔ تمہارے خلاف ثبوت باقی رہتا۔ بلاوجہ تم لالچ میں آ گئے۔ تیس چالیس ہزار کا موبائل فون تھا۔ تم نے نئی سم ڈال کے بیوی کو دے دیا لیکن ایک چیز ہوتی ہے ''آئی ایم ای آئی'' نمبر جو دنیا کے ہر موبائل فون کا الگ ہوتا ہے۔ آدمی کے فنگر پرنٹس کی طرح۔ اس سے موبائل فون کا پتا چل جاتا ہے۔ فاطمہ نے اس کی رجسٹریشن کرا رکھی تھی مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اپنی طرف سے تم نے ویڈیو فلموں کو بھی تباہ کر دیا مگر وہ بے وقوف لڑکی نہیں تھی۔ اس نے موبائل فون سے فلموں کو اپنے کمپیوٹر میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ان فلموں کو دیکھا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ فاطمہ کو کیوں مرنا پڑا۔ تم کیوں اس کے قتل پر مجبور ہوئے جبکہ اس کی تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔''

''بکواس کرتا ہے تم۔'' عجب گل چلّایا۔

''تمہارا بیٹا ببلو... بابر خان اس کا اصل نام تھا۔ وہ فاطمہ سے بہت ہلا ہوا تھا۔ فاطمہ ہر روز تمہارے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی تو وہ انتظار کرتا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھا اس کی راہ دیکھتا تھا۔ فاطمہ اسے دو ٹافیاں دیتی تھی۔ ایک ببل گم... جب تمہاری بیوی بیمار ہوتی تھی تو وہ گھر آ کے اس کی دیکھ بھال بھی کر دیتی تھی۔ لیکن اس کا اصل مقصد ببلو کے ساتھ کھیلنا ہوتا تھا۔ کئی بار وہ اسے پارک لے گئی۔ اسے آئس کریم دلائی اور جھولوں پر بٹھایا۔ ببلو اس کا دیوانہ تھا اور وہ بچوں کی دیوانی تھی۔ دو دیوانے اس کھیل میں اپنی جان سے گئے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ تم نے ببلو کو مارا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔ ببلو اپنا نانی کے پاس گیا ہے۔''

''ہاں، اپنی نانی کے پاس مگر کس دنیا میں؟ نانی تو پہلے ہی دوسری دنیا میں تھی۔ اوپر اللہ میاں کے پاس۔ اس لحاظ سے تم واقعی سچ بول رہے ہو کہ ببلو نانی کے پاس چلا گیا۔ تم نے خود اسے پہنچا دیا۔ ایسا ظلم کیوں کیا تم نے خود اپنی اکلوتی اولاد پر عجب گل؟ تم تو اپنی بیوی کو بھی کڑے پہرے میں رکھتے تھے۔ اس پر کسی غیر مرد کا سایہ تک نہیں پڑنے دیتے تھے۔ کیا پھر بھی تمہیں شک تھا کہ وہ تمہارا نہیں کسی اور کا بیٹا ہے؟''

عجب گل چلّایا۔ ''ایسا بات مت بولو... وہ ہمارا بیٹا تھا... ہمارا ابی بی بہت شریف اور جنتی تھا۔''

''اس کی زندگی تم نے جہنم بنائے رکھی۔ اب وہ جنتی ہو گئی۔'' مقصود نے طنز سے کہا۔

''ہم بہت پریشان تھا۔ ہمارا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ بی بی بیمار تھا۔ اس کا جگر خراب تھا۔ ہم کو حکیم صاحب نے بتایا۔ ہم اس کو پیر صاحب کے پاس بھی لے گیا۔ وہ پانی دم کر کے دیتا تو مُردہ بھی زندہ ہو جاتا... ہر مرض میں شفا ہوتا۔''

مقصود نے تلخی سے کہا۔ ''پھر وہ جناح اسپتال میں کیوں نہیں بیٹھتے... وہاں مریضوں کو دوا نہیں ملتی؟ ڈاکٹر نہیں ملتے؟ ہزاروں لوگ روز شفایاب ہوتے... اصل بات یہ ہے کہ تم نے اس کا صحیح علاج نہیں کرایا کیونکہ تمہارے لاکھوں روپے خرچ ہوتے۔ اس سے کم میں تو تمہیں دوسری عورت مل سکتی تھی جو بیمار بھی نہ ہو... صحت مند اور خوب صورت ہو۔''

''ہم بولا نا ہمارا دماغ خراب ہو گیا تھا' اس کا بیماری سے۔ وہ ہر وقت روتا تھا چلّاتا تھا۔ تقدیر کو اور ہم کو بُرا کہتا تھا۔ گھر ہمارا واسطے جہنم ہو گیا تھا۔ بچہ خوار تھا۔ ادھر ہم کو کاروبار میں نقصان ہوا۔ ہمارا مال ضبط ہو گیا۔ ہم پولیس کو بتا دیتا تھا۔ ابھی دوسرا لوگ بھی آ گیا۔ کبھی ایک پارٹی کا کبھی دوسرا پارٹی کا... ہم اپنا بچہ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔''

''مگر وہ مر گیا۔ ایسے تم بھی مر جائے گا خان... اگر ہم تمہارے حلق میں روئی ٹھونسے گا۔ فاطمہ نے کالج جاتے ہوئے دیکھا تو ببلو کھڑکی میں نہیں تھا۔ وہ چلّا رہا تھا اور تم اس کے حلق میں کچھ ٹھونس رہے تھے۔ چلّا رہے تھے کہ کھا... اور کھا... فاطمہ کے پاس اس کا موبائل فون ہاتھ میں تھا۔ اس نے کیمرا آن کیا اور ویڈیو بنانے لگی۔ ایک کے بعد دوسری۔ اس کھڑکی میں سے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ پھر تم نے اسے دیکھ لیا۔ وہ بھاگ گئی۔''

عجب گل سکتے کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ ''وہ بہت ضدی اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اس دن بولا میں حلوا کھاؤں گا۔ میں نے حلوا پکایا جیسا بھی پکا، اس کے سامنے رکھا۔ اس نے ہاتھ مار کے نیچے گرا دیا۔ بولا میں حلوا نہیں پراٹھا کھاؤں گا... میں نے غصے میں بولا کہ حلوا کیوں بنوایا تھا۔ وہ چلّانے لگا پراٹھا کھاؤں گا... پراٹھا کھاؤں گا۔ میں نے برداشت کیا اور کہا اچھا ٹھہرو... میں بناتا ہوں... میں پراٹھا بنایا... ہم عورت نہیں ہے... اس کا ماں اسپتال میں تھا۔ جو بھی ہم پکایا... وہ پھر انکار کر دیا... بولا یہ کیسا بنایا ہے... ہم نہیں کھائے گا۔ ہم ڈبل روٹی کھائے گا۔ میں نے اس کو ایک تھپڑ مارا تو وہ گلا پھاڑ کے چیخنے لگا۔ ہم ڈبل روٹی کھائے گا۔ ڈبل روٹی کھائے گا۔ گھر میں ڈبل روٹی تھا۔ ہم اپنا واسطے لایا تھا۔ ہم اس کے منہ میں ایک پیس ڈالا کہ کھاؤ... ابھی تم کو کھانا پڑے گا... وہ پھر انکار کیا۔ ہم نے کہا کہ ابھی تمہارا باپ بھی کھائے گا۔''

''تم نے اس کے منہ میں ڈبل روٹی ٹھونسی۔ حلق تک بھر دی۔ غصے میں تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ایک بچہ ہے۔ اس

کے لیے سانس تک لینا ممکن نہ رہا۔ وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا مگر تم پر جنون سوار تھا۔ تم ایک کے بعد دوسرا سلائس اس کے حلق میں اتارتے گئے۔ ٹھونستے رہے... وہ دم گھٹنے سے مر گیا۔ ڈبل روٹی اس کی سانس کی نالی میں بھی بھر گئی۔ روئی کے مقابلے میں ڈبل روٹی بکھر جاتی ہے۔''

وہ رونے لگا۔ اپنا منہ چھپا کے ہچکیاں لینے لگا۔

''فاطمہ کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ ببلو ہلاک ہو جائے گا۔ اس نے صرف تمہاری زبردستی دیکھی تھی۔ بعد میں تم نے اسے بتایا کہ ببلو کو تم نے اس کی نانی کے پاس بھیج دیا ہے۔ اس کی ماں بھی اسپتال میں تھی۔ فاطمہ کو بالکل شک نہیں ہوا... اس سے پہلے دو بار جب ببلو کی ماں اسپتال گئی تھی تو اسے فاطمہ اپنے گھر لے گئی تھی۔ ببلو کی ماں کو تم نے کیا بتایا؟''

وہ چونکا۔ ''کچھ نہیں۔ وہ روز پوچھتا تھا۔ ہم بولتا تھا وہ گھر میں... فاطمہ کے پاس ہے۔''

''تمہیں ڈر تھا کہ فاطمہ نے اپنے موبائل فون کے کیمرے سے ببلو کے قتل کی فلم بنائی ہو گی لیکن ببلو کی موت بعد میں ہوئی۔ فاطمہ اس وقت جا چکی تھی۔ اسے شک بھی نہ تھا کہ تمہاری زبردستی نے ببلو کی جان لے لی ہو گی۔ یہ دیکھنے کے لیے تم نے فاطمہ کو بلایا۔ کہا کہ وہ ببلو کو اس کی نانی کے گھر سے اپنے گھر لے جائے... اس کی نانی کلفٹن میں رہتی ہے... ببلو وہاں خود بھی پریشان ہے اور نانی کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ تم نے فاطمہ کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا ہو گا... اس سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کی ہوں گی کہ وہ ببلو کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس کی اتنی مدد ہو جاتی ہے۔ ببلو اسے بہت یاد کرتا ہے اور روتا ہے۔ جذباتی ہو کے فاطمہ تمہارے ساتھ چلی گئی۔ آگے موت اس کے انتظار میں تھی۔ کلفٹن کے آخری حصے تک جاتے ہوئے بھی فاطمہ کو شک نہ ہوا۔ وہ خوش تھی کہ اب ببلو اس کے پاس رہے گا۔ جب تک کہ اس کی ماں پھر ٹھیک ہو کے واپس گھر نہیں آ جاتی۔ وہاں اچانک بادل آئے اور بارش شروع ہو گئی۔ فاطمہ تمہارے پھیلائے ہوئے موت کے جال میں پھنس گئی۔ تم نے اسے ڈبو یا۔ تم جیسا طاقت ور مرد ہی فاطمہ جیسی صحت مند لڑکی کو قابو کر سکتا تھا۔ تمہارا اصل مقصد تو موبائل فون حاصل کرنا تھا اور ایک چشم دید گواہ کو ختم کرنا... تم اتنے بے وقوف نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو... تم نے اس کے کپڑے اتار کے لاش کنارے پر چھوڑی... مقصد صرف کنفیوژن پھیلانا تھا کہ نہ یہ خودکشی کا کیس لگے نہ قتل کا... اس پاگل نبی بخش نے مزید بے وقوفی کی اور لاش پر اپنی جیکٹ ڈال دی۔ تمہاری طرف کس کا دھیان جا سکتا تھا؟ تھانے مجھے بلایا گیا۔ اس کا سوتیلا باپ زیرِ تفتیش ہے۔ اس کا ہاکی کا کوچ مار کھا رہا ہے۔ لیکن میرے ایک جرم نے تمہارے جرم کا راز فاش کر دیا۔ میرا جرم مختلف ہے۔ اسے سائبر کرائم کہتے ہیں۔ میں نے فاطمہ کا انٹرنیٹ اکاؤنٹ کھولنے کے لیے اس کا پاس ورڈ چوری کیا۔ اس کارِ خیر میں میری مدد کسی اور نے کی۔ یہ کام میرے بس کا نہیں تھا مگر تمہیں انجام تک پہنچانے کے لیے خدا نے کسی کو امریکا سے بھیج دیا۔ پھر اس نے وہ سب فلمیں دیکھ لیں جو فاطمہ نے کیمرے سے نیٹ پر ڈالی تھیں۔ میں نے ان کو ڈاؤن لوڈ کیا ایک سی ڈی پر۔''

''وہ سی ڈی ہم کو دے دو... تم کو کتنا پیسا چاہیے... بولو... ہم دے گا۔''

''پیسا سنبھال کے رکھو خان... ابھی تمہیں بہت لمبی قانونی جنگ لڑنی ہے اپنی زندگی کے لیے... سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک... بڑے وکیل بہت فیس لیتے ہیں... کاروبار پہلے ہی ختم ہو رہا تھا... اب زندگی بھی ختم ہو رہی ہے۔''

مقصود نے اپنا موبائل فون نکالا اور ایک نمبر ملانے لگا۔ دن میں وہ سارا انتظام کر گیا تھا۔ اس کی اور خان کی ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی۔ اپنی جیب میں موجود ایک ریموٹ سے اس نے کہیں کہیں ریکارڈنگ روکی بھی تھی۔ اس نے ایک بہت حساس ایف ایم مائک اپنی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ ریکارڈنگ باہر کار میں بیٹھی کرن نے کی تھی۔ ریموٹ وائرلیس مائک سے وہ ایف ایم ریڈیو پر آواز بھی بہت صاف سن سکتی تھی۔ اس نے مقصود کی آواز بھی سنی جو پولیس کو فون کر رہا تھا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز پر کرامت علی نے دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے نبی بخش کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو خرگوش کے بچے تھے۔

''نبی بخش... کیا بات ہے؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر... ہم یہ رانی بے بی کو دینے آیا تھا۔'' اس نے خرگوش کے بچوں کی نمائش کی۔

کرامت علی نے پلٹ کے رانی کو آواز دی۔ ''دیکھو تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' اور پھر اندر جا کے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ آئی پی ایل کا میچ اپنے آخری سنسنی خیز مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

سیدھی چال

کاشف زبیر

شامی اور تیمور کے کرداروں سے آپ بخوبی واقفیت رکھتے ہیں... ان کی حماقتیں اکثر و بیشتر انہیں کسی بھی جرم میں ملوث کرنے کا سبب بن جاتی ہیں... اس دفعہ بھی ان کی ایک سیدھی چال نے اچانک ہی ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا... دولت و زر کی خواہشات کے متمنی افراد کی یک جائی سے جنم لینے والا شاخسانہ... جو کسی شارٹ کٹ کے ذریعے اپنے لیے عیش پسندی کا سامان چاہتے تھے۔

اس چوہے کا قصہ جو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا چاہتا تھا

تیمور اتنا خوش تھا کہ شامی کو شبہ ہوا اسے اپنا ایم بی اے مکمل کیے بغیر انگلینڈ جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ یا پھر اسے اگلی سہ ماہی کے لیے پچھلی والی سے زیادہ اچھی گرل فرینڈ مل گئی تھی۔ تیمور گرل فرینڈ کے معاملے میں سخت احتیاط پسند تھا یعنی شامی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اس کی وجہ بھی وہ شامی کے سامنے بیان کر چکا تھا کہ اسے شامی کی محبت اور خلوص میں کوئی شک نہیں تھا لیکن کئی معاملات میں وہ کمینہ واقع ہوا تھا۔ اگر اسے تیمور سے کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ اسے بلیک میل کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ شامی نے جل کر کہا۔ ''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں بھی اتنا ہی کمینہ ہوں۔'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔ ''تو چاہے تو مجھے بھی اپنی گرل فرینڈ کے بارے میں نہ بتایا کر۔''

شامی مزید جل گیا۔ ''کیسی گرل فرینڈ... کہاں کی گرل فرینڈ؟ جب سے نوشی کا سایہ پڑا ہے، اچھی صورت والیوں نے پاس پھٹکنا کم کر دیا ہے۔ جو قسمت سے پاس آئے وہ چند دن بعد بھاگ جاتی ہے۔''

''اب یہ تیری قسمت، اس معاملے میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔''

بہرحال اس سہ ماہی میں شامی کی قسمت پچھلی سہ ماہی سے مختلف نہیں تھی۔ جو واحد لڑکی اس سے ملتی تھی وہ اچانک داغ مفارقت دے گئی، اس اطلاع کے ساتھ کہ اس کی چھ مہینے سے منگنی ہے اور دو مہینے بعد وہ شادی کر کے آسٹریلیا چلی جائے گی۔ شامی دم بہ خود رہ گیا۔ ''تب تم نے مجھ سے دوستی کیوں کی؟''

''وقت گزاری کے لیے...'' لڑکی نے بے نیازی سے کہا۔ ''میرا منگیتر آسٹریلیا میں میڈیکل میں ہے۔ اس کی ڈگری مکمل ہوگئی ہے اور وہ واپس آرہا ہے مجھے لے جانے کے لیے۔''

شامی بھنا گیا۔ ''تو نظر کرم مجھ پر ہی کیوں آئی؟''

''تم اچھے لڑکے ہو۔ فراخ دل ہو اور سب سے بڑھ کر ایک حد سے آگے نہیں بڑھتے۔''

شامی نے خود کو ایسا الو محسوس کیا جس کی مادہ اسے چھوڑ کر کسی زیادہ بڑے الو کے ساتھ فرار ہوگئی ہو۔ دیکھا جائے تو واقعتاً ایسا ہی ہوا تھا۔ شامی نے بعد میں اس منگیتر کی قسمت پر افسوس کیا جسے اتنی چالاک بیوی ملے گی اس نے نہایت کامیابی سے شامی کو بے وقوف بنایا تھا۔ شامی، فولاد خان سے نظر بچا کر لان میں تالاب کے پاس راکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ تالاب میں نواب صاحب نے نایاب نسل کی مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ شامی سوچ رہا تھا کہ اس بار گرمی کی چھٹیاں کہاں غارت ہوں گی کہ تیمور نازل ہوگیا اور وہ بہت خوش تھا۔ شامی نے وجہ پوچھ لی۔

''کیا بات ہے، تیرے دانت اندر نہیں جا رہے ہیں؟''

''تجھے منصور یاد ہے، کالج میں ہمارا کلاس فیلو تھا؟''

''بالکل یاد ہے۔ وہی جسے پروفیسرز کے سامنے اناالحق کہنے کا شوق تھا؟''

تیمور نے سر ہلایا۔ ''اسی لیے اکثر سولی پر چڑھا ہوتا تھا۔''

''اسے میں نے اترتے کم ہی دیکھا تھا۔ بہرحال، اس کا تیری خوشی سے کیا تعلق ہے؟''

''یار! وہ انٹر کے بعد کراچی چلا گیا تھا۔''

''خوش قسمت ہے۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''اپنی قسمت میں انجینئرنگ کر کے بھی شاید چن پور جانا لکھا ہے۔''

''بس بھائی نصیب کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔'' تیمور نے جوابی سرد آہ بھری۔ ''خیر تو فکر نہ کر میں جب انگلینڈ چلا جاؤں گا تو تجھ سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔''

شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ''میں کون سا سچ مچ چن پور جا رہا ہوں۔ اگر دادا جان نے بھیجا بھی تو میں درمیان سے غائب ہو جاؤں گا۔''

''اور درمیان سے غائب ہو کر کہاں جاؤ گے؟''

''یہ بعد کا مسئلہ ہے۔'' شامی نے اپنی خودی بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''خیر تو منصور کا ذکر کر رہا تھا کیا، اس نے کراچی جا کر بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی اور اگر نہیں چھوڑی تو اب تک زندہ کیسے ہے۔ سنا ہے وہاں سچ بولنے والا زیادہ عرصے جیتا نہیں ہے۔''

''وہ بہرحال زندہ ہے اور خاصا کامیاب بھی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنی عادت پر قابو پالیا ہے۔''

منصور ان کا کلاس فیلو اور ہم عمر تھا۔ نہایت بے چین اور پارا صفت لڑکا تھا۔ اسے سچ کا مرض لاحق تھا۔ پروفیسرز سے لے کر کالج کے لڑکوں تک سب کی اس سے ٹھنی رہتی تھی اور سب صرف اس لیے اس سے ڈرتے تھے کہ وہ سچ بولنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ انٹر کے بعد وہ کراچی چلا گیا اور یہ لوگ یونیورسٹیوں میں آگئے۔ اب تیمور اس کا ذکر کر رہا تھا۔ ''وہ زندہ ہے تو اس کا تیری خوشی سے کیا تعلق ہے؟''

''خوشی سے تعلق۔'' تیمور یک دم محتاط ہوگیا۔ ''نہیں خوشی سے تو اس کا تعلق نہیں ہے۔ وہ کالج چھوڑ کر ٹی وی میں چلا گیا تھا اور آج کل ڈرامے بنا رہا ہے۔''

شامی حیران ہوا۔ ''وہ ڈرامے بنا رہا ہے؟''

''تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے... آج کل ایسے ہی لوگ تو ڈرامے بنا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں میری اس سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس نے ایک کاٹھ کا الو تلاش کرلیا ہے جو اس کے اگلے ڈرامے کا فنانسر بن گیا ہے۔ اب اسے لوکیشن کی تلاش ہے۔''

''ڈراما کس قسم کا ہے؟''

''یہ چھوٹا سیریل ہے پانچ چھ قسطوں والا اور اسے ایک ہی لوکیشن پر بنانا ہے۔'' تیمور نے بتایا۔ ''موضوع کچھ ہارر اور تھرل ہے۔''

''نہ بھائی، اپنے ہاں یہ ڈرامے نہیں چلتے۔'' شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں تو سسرال پلس چلتا ہے جس میں یا تو بہو مظلوم ہوتی ہے یا پھر سب کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو اسرائیل نے پڑوسیوں کے ساتھ کر رکھا ہے۔''

''یار! ہمیں کیا، نہ تو ڈرامے دیکھتا ہے اور نہ مجھے شوق ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''بہرحال، منصور نے مجھ سے لوکیشن کے لیے کہا کیونکہ کہانی پہاڑی علاقے کی ہے۔ مجھے مری والی عمارت کا خیال آیا جسے دادا جان نے ہوٹل بنانے کے لیے خریدا تھا۔''

''مگر ہوٹل نہیں بن سکا۔'' شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر ہوٹل بن جاتا تو اس کا منیجر بننے

کے بہانے میں آدھا سال تو وہیں رہتا۔''

''ہوٹل منیجر کے لیے بزنس کی ڈگری چاہیے، انجینئرنگ کی نہیں۔'' تیمور نے اسے یاد دلایا۔

شامی کھسیا گیا۔ ''خیر تو کچھ فرما رہا تھا ڈرامے بازی کے بارے میں؟''

''میں نے دادا جان سے اجازت لے کر اسے بلوایا ہے۔ وہ فنانسر کے ساتھ لوکیشن دیکھنے آرہا ہے اگر اسے پسند آگئی تو وہاں ڈراما بنے گا۔''

''جس کا نام ہوگا بھوت ہوٹل۔'' شامی نے ٹکڑا لگایا۔ ''اور ہوٹل کا سلوگن ہوگا... ہم بھوتوں کو بھی سرو کر سکتے ہیں آپ کیا چیز ہیں؟''

تیمور نے اسے گھورا۔ ''لوگوں کو متوجہ کرنا ہے یا انہیں بھگانا ہے۔''

''یار! ہمارے ملک میں تفریح کی اتنی کمی ہوگئی ہے کہ اگر سچ مچ کہیں بھوت وغیرہ مل جائیں تو لوگ ان سے بھی تفریح کرنے پہنچ جائیں۔ یاد نہیں پچھلے دنوں کراچی میں طوفان کا خطرہ تھا۔ انتظامیہ نے ساحل پر رہنے والے.... .... لوگوں کو نکال کر دوسری جگہ پہنچایا تو ان سے زیادہ زندہ دل مرنے کے لیے سمندر کے کنارے پہنچ گئے تھے کہ طوفان آتا دیکھیں گے۔''

تیمور نے اس کی بات پر غور کیا اور قائل ہوگیا۔ ''یہ تو ہے۔''

''منصور اور اس کا فنانسر آرہا ہے؟''

''ہاں، بس وہی دو آرہے ہیں۔'' تیمور نے جلدی سے کہا تو شامی تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تیمور کے دانت بلا سبب باہر نہیں آرہے تھے۔ شامی نے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ تیمور سے اگلوالیا کہ وہ کل دوپہر میں آرہے تھے اور تیمور انہیں ائرپورٹ سے سیدھا مری لے جائے گا کیونکہ اگلے دن دوپہر میں ان کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ تیمور نے ایک بار بھی شامی سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا اور خود شامی نے بھی اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے وہ ہوشیار ہو جاتا۔ اس کے بجائے شامی نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں، دو تین دن ڈٹ کر آرام کروں۔ اس کے بعد سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے تب تک میں بھی واپس آجاؤں گا۔'' تیمور نے اس کی تائید کی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی فولاد خان آدھمکا۔ وہ خفا لگ رہا تھا۔

''شامی صیب! یہ اچھا بات نئیں اے۔''

''کون سی بات؟'' شامی نے انجان بن کر پوچھا۔

''آپ نے ام کو پچھلے دو مہینے سے قسط نئیں دیا اے... ابی آپ کا قرض دو ہزار سات سو روپے جمع سود چار ہزار دو سو روپے اے۔ کل ملا کر...''

''یہ ہوئے چھ ہزار نو سو روپے۔'' شامی نے کہا۔ ''دیکھو فولاد خان! تم جانتے ہو پچھلے کچھ عرصے سے ہاتھ تنگ ہے۔''

فولاد خان نے اس کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ''نئیں تو آپ کا ہاتھ ویسا ای اے بالکل بھی تنگ نئیں اے۔''

''میرا مطلب ہے مالی حالات خراب ہیں اس لیے تمہاری قسط ادا نہیں کر سکا اس لیے تم مجھے کچھ مہلت دو۔''

''ایسا بات کرو نا شامی صیب۔'' فولاد خان خوش ہو گیا۔ ''آپ کا واسطے مولت ہی مولت اے۔''

''ٹھیک ہے میں اگلے مہینے سے تمہیں ہزار روپے دیا کروں گا۔''

فولاد خان نے اپنے دماغ میں موجود دنیا کے تیز ترین حسابی کمپیوٹر سے رجوع کیا اور کھٹ سے حساب نکال دیا۔ ''آپ کا قرض دو سال اور چار مئینے میں ادا او جائے گا۔''

شامی دنگ رہ گیا۔ ''اٹھائیس ہزار روپے... فولاد خان! خدا کا خوف کرو۔''

''اسی کا خوف کر کے تو ام نے یہ مدت بتایا اے ورنہ کسی اور سے ام پانچ سال سے پہلے یہ رقم نئیں لیتا۔''

شامی نے سرد آہ بھری۔ ''فولاد خان! پچھلا والا حساب ہی ٹھیک ہے، اگلی بار جیب خرچ ملتے ہی میں تمہاری خدمت میں حاضر ہوں گا اور سارا قرض ایک ہی بار ادا کر دوں گا۔''

ظاہر ہے فولاد خان یہ سن کر خوش نہیں ہوا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ ''ایک مائینے بعد آپ کو سات ہزار نو سو روپے دینا او گا۔''

اس کے جانے کے بعد شامی سوچنے لگا کہ یہ ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف والے اندھے تھے جو انہیں فولاد خان جیسا نابغۂ روزگار نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس قابل تھا کہ اسے بیک وقت دونوں اداروں کا صدر بنا دیا جاتا تو وہ چند سالوں میں ساری دنیا کی دولت ان اداروں کی تجوریوں میں لے آتا۔

☆☆☆

جوجی کار سے اترا تو سامنے اپنی کوٹھی کے ٹیرس سے نوشی نے اسے دیکھ لیا اور وہیں سے چلائی۔ ''اے جوجی کے بچے... ادھر آؤ۔''

جوجی سخت جز بز ہوا۔ بے شک وہ جوجی کہلاتا تھا لیکن اتنے واشگاف انداز میں کہلانا پسند نہیں کرتا تھا اور نوشی اسے ویسے بھی پسند نہیں تھی۔ پچھلی بار اس نے جوجی کو اتنی سنائی تھیں کہ وہ اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے وقار ولا کے سامنے اترتے ہی اسے نوشی کو دیکھنا پڑا۔ اس کا ڈرائیور اسے چھوڑ کر روانہ ہوا تو جوجی بادلِ ناخواستہ نوشی کی کوٹھی کے اندر آیا۔ وہ ٹیرس سے اتر کر لان میں آگئی تھی۔ آج خاصی گرمی کے بعد بادل کھل کر برس چکے تھے اور موسم خوشگوار ہوگیا تھا۔ نوشی اسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جوجی نے خفگی سے کہا۔

''دیکھیں جی... آپ مجھے اس طرح نہ پکارا کریں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، اب میں تمہیں کا کا کہا کروں گی۔'' نوشی نے پچکار کر کہا۔

''آپ مجھے کچھ بھی نہ کہا کریں۔ جلدی بتائیں کیوں بلایا ہے؟ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

''دیر ہو رہی ہے۔'' نوشی نے اس کے شانے پر لٹکے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کا جائزہ لیا۔ ''تم کس کے ساتھ اور کہاں جا رہے ہو؟''

''شامی بھائی مری جا رہے ہیں، انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں گھر میں بور ہو رہا تھا اس لیے تیار ہوگیا۔''

نوشی نے آنکھیں گھمائیں۔ ''اچھا جی، تم دونوں چپکے چپکے مری جا رہے ہو اور مجھے بتایا بھی نہیں...''

جوجی گڑبڑا گیا۔ ''آپ کو نہیں بتایا... پھر تو جی مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں...''

''کیسے کوئی بات نہیں۔'' جوجی رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''شامی بھائی تو مجھے بھی چھوڑ جائیں گے۔''

''اس کی یہ جرأت۔'' نوشی بولی۔ ''تم جاؤ اور اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''دیکھیے اگر آپ ساتھ آگئیں تو ممکن ہے پروگرام ہی کینسل ہو جائے۔ اتنے دنوں بعد تو مری جانے کا موقع ملا ہے۔''

نوشی کو اس کی صورت دیکھ کر ترس آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ جاؤ۔ میں تمہارے پروگرام میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گی لیکن اتنا تو بتاتے جاؤ کہ کتنے دن کا پروگرام ہے؟''

''بس دو دن کا۔'' جوجی خوش ہوگیا۔ ''آج جانا ہے، پرسوں صبح واپس آجانا ہے۔''

جوجی وقار ولا میں آیا تو شامی تیار ہو چکا تھا۔ ''کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔''

''راستے میں دیر ہوگئی جی۔'' جوجی نے نوشی کا ذکر سرے سے گول کر دیا ورنہ اسے معلوم تھا کہ اس کی شامت آجاتی۔

''کپڑے اور چیزیں ساتھ لائے ہو نا؟''

''جی شامی بھائی سب لایا ہوں۔ ایک ہلکا سویٹر بھی رکھا ہے۔''

شامی نے چھوٹی سفاری جیپ میں سامان رکھ لیا تھا۔ جوجی کے آتے ہی وہ روانہ ہوگئے۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ شامی نے کسی طرح سے نواب صاحب سے اجازت لے لی تھی بلکہ زادِ راہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ جوجی نے باہر آتے ہی پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' شامی نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے نوشی کی زرد فراری... دکھائی دے رہی تھی جو اس کے باپ نے اسے حال ہی میں گریجویشن مکمل کرنے پر گفٹ کی تھی۔ یہ مہنگی اور منفرد کار دور سے نمایاں ہوتی تھی کیونکہ پورے اسلام آباد اور راولپنڈی میں اس جیسی ایک درجن کاریں بھی نہیں ہوں گی۔ شامی کوشش کر رہا تھا کہ ڈرائیور کی صورت دیکھ لے لیکن فراری کوئی ڈیڑھ سو گز پیچھے تھی اور مستقل مزاجی سے پیچھے ہی آرہی تھی۔ شامی کا خون رفتہ رفتہ کھولنے لگا۔ ڈرائیور کی صورت نظر نہیں آئی تھی پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ نوشی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے رنگ میں بھنگ ڈالنے آرہی تھی۔

تیمور کے رویے سے شامی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ منصور اور اس کے فنانسر کے ساتھ کوئی لڑکی بھی آرہی ہے اور تبھی وہ شامی سے اتنی رازداری برت رہا تھا۔ شامی نے چپکے سے اپنا منصوبہ بنایا اور نواب صاحب سے خاموشی سے اجازت لے لی۔ تیمور کی ائرپورٹ روانگی کے ساتھ ہی اس نے تیاری شروع کر دی۔ جوجی کو وہ ایک دن پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ فلائٹ بارہ بجے کی تھی اور تیمور ان لوگوں کو لے کر زیادہ سے زیادہ دو بجے تک مری پہنچ جاتا۔ تقریباً اسی وقت شامی بھی جوجی کے ساتھ وہاں قدم رنجہ فرماتا تو تیمور کی حالت یقیناً دیکھنے کے لائق ہوتی۔ شامی کو ابھی سے سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی لیکن اس کی ساری خوشی نوشی کی زرد فراری نے غارت کر دی تھی اور اب وہ کوفت کا شکار تھا۔ نوشی اس کے ساتھ وہی کر رہی تھی جو وہ تیمور کے ساتھ کرنے جا رہا تھا۔ اس کے

بار پیچھے دیکھنے پر جوجی نے بھی مڑ کر دیکھا۔ ''پیچھے کون ہے جی؟''

''موت۔'' شامی نے دانت پیس کر کہا۔

جوجی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''کہیں پھر تو اباجی اور انکل میں جھگڑا نہیں ہوگیا؟''

شامی نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں ہر وقت ان دونوں کی پڑی رہتی ہے۔''

جوجی کی جان میں جان آئی۔ ''وہ تو ہے ورنہ میری اور صاحبہ کی بات خراب ہوجائے گی۔ ویسے پیچھے کون ہے؟''

''میری شامت... عرف نوشی۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''آج کل یہ فارغ ہے اس لیے ہر وقت میری جاسوسی کرتی ہے۔ لیکن اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں اور تم مری جارہے ہیں؟''

جوجی بھانڈا پھوٹنے کے خیال سے فکرمند ہوگیا۔ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''ممکن ہے انہوں نے مجھے بیگ سمیت آپ کے پاس آتے دیکھ لیا ہو۔''

شامی نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ ہوسکتا ہے... نوشی بہت چالاک ہے اس نے اندازہ کرلیا ہوگا اور اب ہمارا تعاقب کررہی ہے۔ خیر یہ بھی کیا یاد کرے گی، اسے بھی مری لے جاؤں گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے جی... آپ کی بھی تفریح ہو جائے گی۔''

شامی اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ اس کی تفریح کرکری ہو جائے گی۔ ''یاد رکھو برخوردار! تفریح ہمیشہ محبوبہ کے ساتھ ہوتی ہے، بیوی کے ساتھ نہیں۔''

''لیکن نوشی تو آپ کی بیوی نہیں ہے۔''

شامی نے دانت پیسے۔ ''لیکن اس نے خود کو کچھ ایسا سمجھنا شروع کردیا ہے۔ خیر، اسے دیکھ لوں گا۔''

زرد فراری مستقل مزاجی سے جیپ کے پیچھے لگی تھی اور جیپ سے اس کا فاصلہ بھی برقرار تھا۔ ایک دو بار شامی نے رفتار کم کرکے اسے قریب آنے کا موقع دیا تو فوراً ہی اس کی رفتار بھی اتنی ہی کم ہوگئی۔ وہ مری تک ان کے ساتھ گئی تھی۔ اس کے بعد کہیں پیچھے رہ گئی یا کسی اور راستے کی طرف نکل گئی تھی۔ مری کے قریب جوجی نے بھوک کا شور مچایا تو مجبوراً شامی کو پہلے شہر کی طرف جانا پڑا۔ ایک ریستوران میں داخل ہوئے تو اس نے نوشی کو پہلے سے وہاں موجود پایا۔ وہ یقیناً کسی اور راستے سے وہاں پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ شامی کا غصے سے برا حال ہوگیا۔

☆☆☆

ائرپورٹ پر تیمور کے سامنے تین چہرے تھے۔ ایک اس کا سابق کلاس فیلو منصور تھا۔ وہ خاصا بدل گیا تھا۔ کالج میں وہ دبلا پتلا اور بھاری فریم کی عینک لگاتا تھا۔ اس کے سر کے بال ہمیشہ کنگھی سے دور رہتے تھے۔ اب جو منصور سامنے تھا وہ کسی قدر بھاری ہوگیا تھا۔ چہرہ بھی بھر گیا تھا لیکن ریم لیس عینک کی وجہ سے کم لگ رہا تھا۔ البتہ سر کے بال اب بھی بڑے اور کنگھی سے بے نیاز تھے۔ وہ حلیے سے ہی ڈراما پروڈیوسر لگ رہا تھا۔ دوسرا شخص جو سخت گھبرایا ہوا اور کسی قدر خوف زدہ بھی لگ رہا تھا، ڈرامے کا فنانسر چاند بھائی نکلا۔ اس نے سامان باہر لانے والے لوڈر کو رقم دینے کے لیے پرس نکالا تو مارے گھبراہٹ کے پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کی چیزیں زمین پر بکھر گئیں۔ چاند بھائی نے جلدی جلدی انہیں سمیٹ کر دوبارہ پرس میں رکھا اور ایک نوٹ لوڈر کے ہاتھ پر رکھا۔ چاند بھائی اسم بامسمیٰ تھے یعنی اس کا سر بالوں سے عاری ہورہا تھا اور سامنے سے چاند نمودار ہو چکا تھا جسے اس نے بڑی کوشش سے ہیئر اسٹائل بنا کر چھپایا ہوا تھا۔ سفیدی چھپانے کے لیے اس نے جو رنگ کیا تھا، اس کا اثر اب ختم ہونے کو تھا۔ وہ تقریباً پچاس برس اور موٹے نقوش والا چھوٹے قد کا شخص تھا۔ چاند بھائی کو ڈراموں کا تجربہ نہیں تھا لیکن عورتوں کا تجربہ اچھا خاصا تھا۔ یہ تجربہ اس نے بھاری سرمایہ کاری کے بعد حاصل کیا تھا۔ اس سرمایہ کاری کا نفع صیغۂ راز میں تھا۔ البتہ وہ اپنی نئی سرمایہ کاری ساتھ لایا تھا۔

یہ تقریباً تیس برس کی عورت تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور نہایت جاذب نظر نقوش تھے۔ بلی جیسی آنکھوں کا رنگ سرمئی تھا اور یہ بالوں کے رنگ سے ذرا کم تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں تیمور کو اس عورت کے نقوش عجیب سے لگے۔ اس کا نام بھی عجیب سا تھا۔ منصور نے چاند بھائی کے بعد اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ زوی ہیں... ہمارے ڈرامے کی ہیروئن...''

''یہ تو بہت موزوں ہیں۔'' تیمور نے بے ساختہ کہا پھر اسے یاد آگیا۔ اس نے کچھ دن پہلے ایک ہارر مووی دیکھی تھی، اس کی ہیروئن زوی سے بہت ملتی تھی۔ زوی نے بے تکلفی سے تیمور سے ہاتھ ملایا تو تیمور کا ہاتھ سنسنا اٹھا۔ ایسا لگا جیسے اس نے کسی ہلکے کرنٹ والے ننگے تار کو چھولیا ہے۔ چاند بھائی جو اب تک خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اس نے بدمزگی سے منصور سے کہا۔

''ایسے کب تک یہاں کھڑے رہیں گے... چلنا نہیں ہے کیا؟''

''جی... جی چلتے ہیں چاند بھائی۔'' منصور بولا۔ ''یہ تیمور ہیں، میرے کلاس فیلو رہے ہیں اور ہمیں لینے آئے ہیں۔ وہ عمارت انہی کی ہے۔''

''اچھا... اچھا۔'' چاند بھائی نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ زوی کی تیمور سے بے تکلفی اسے پسند نہیں آئی ہے۔ ان کے پاس مختصر سامان تھا لیکن زوی خاصا بڑا سوٹ کیس لائی تھی۔ تیمور احتیاطاً بڑی گاڑی لایا تھا۔ اس میں سارا سامان آگیا اور وہ مری کی طرف روانہ ہوگئے۔ تیمور کا خیال تھا کہ زوی پیچھے بیٹھے گی لیکن خلافِ توقع وہ آگے آگئی اور تیمور خوش ہوگیا جبکہ چاند بھائی ناخوش ہوا تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ منصور کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ زوی نے ان کی نظر بچا کر تیمور کو مسکرا کر دیکھا تو وہ ریشہ خطمی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ خاصی دیر بعد پیچھے سے منصور کھنکھارا تو تیمور نے چونک کر جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مری ہائی وے پر آنے کے بعد تیمور نے منصور سے کہا۔

''مجھے پتا ہی نہیں تھا تو ڈرامے کرنے لگا ہے۔''

''بس قسمت نے مہربانی کی۔'' منصور نے آہستہ اور محتاط لہجے میں کہا جیسے وہ چاند بھائی کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا ہو۔

''کتنے ڈرامے کرچکے ہو؟'' تیمور نے اس کی احتیاط نظرانداز کرتے ہوئے سوالات جاری رکھے۔

''کئی کیے ہیں۔'' منصور جزبز ہوکر بولا۔ ''اب چاند بھائی کے ساتھ یہ پہلا بڑا پروجیکٹ ہے۔''

صاف لگ رہا تھا کہ منصور انا الحق کو خیرباد کہہ کر شوبزنس کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ جھوٹ، فریب اور مصنوعی چمک دمک اس شعبے کے سنہری اصول ہیں۔ تیمور اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''چھ قسطوں کا بڑا پروجیکٹ... تو اس سے پہلے دو تین قسطوں والے پروجیکٹ بھی کیے ہیں۔''

اچانک زوی نے کہا۔ ''مجھے پیاس لگ رہی ہے، پانی ہے آپ کے پاس؟''

زوی کا مقصد تیمور کو اس موضوع پر بات کرنے سے روکنا تھا۔ ظاہر ہے گاڑی میں پانی نہیں تھا۔ اس نے گاڑی ہائی وے کے کنارے ایک چھوٹے سے ری فریش اسپاٹ پر روکی۔ یہاں چھوٹے موٹے کھانے کے ساتھ چائے، کافی اور کولڈ ڈرنک کا انتظام تھا۔ تیمور اتر کر گیا اور کولڈ ڈرنک ٹن لے آیا۔ ایک اس نے کھول کر زوی کو دیا اور دوسرا خود کھول لیا۔ پیچھے والوں کو اس نے ٹن پکڑا دیے کہ وہ سیلف سروس کریں۔ ''میری بدقسمتی کہ میں ٹی وی بہت کم دیکھتا ہوں اس لیے آپ کے دیدار سے محروم رہا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایک ادا سے ہنسی۔ ''یہ میرا بھی پہلا پروجیکٹ ہے۔''

''چاند بھائی کا بھی پہلا پروجیکٹ ہے۔'' منصور نے جلدی سے کہا جیسے وضاحت کرنا چاہ رہا ہو کہ اس کا یہ پہلا پروجیکٹ نہیں ہے۔ تیمور کبھی کبھی عقبی آئینے میں چاند بھائی کے تاثرات دیکھ رہا تھا اور وہ اسے خاصا برہم نظر آرہا تھا۔ شاید منصور اسے اشارے سے خاموش کرتا رہا تھا لیکن اس کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئی تھیں۔ اچانک عقب سے ایک اسپورٹس کار تیزی سے ان کے برابر سے گزری۔ انجن کی گرج سے چاند بھائی سہم گیا اور پھر یوں سیٹ پر نیچے ہوگیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ ابھی گزرنے والی کار سے کوئی ہتھیار نکال کر... گولی چلانے والا ہے۔ کار میں موجود اوباش لڑکوں نے قہقہے لگائے اور پھر انہوں نے زوی کو دیکھ لیا اور اپنی گاڑی تیمور کی گاڑی کے آگے لہرانے لگے۔ انہوں نے اپنی رفتار سست کرلی، مجبوراً تیمور کو بھی رفتار سست کرنا پڑی تھی۔

تیمور کا خیال تھا کہ لڑکے چند منٹ بعد آگے بڑھ جائیں گے لیکن جب ان کی شرارت خطرناک حد میں داخل ہونے لگی تو تیمور نے کار کے گلووکمپارٹ سے ایک پستول نکالا اور ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے پستول کا رخ اگلی کار کی طرف کیا۔ ایسا لگا جیسے وہ کار کے ٹائروں پر فائر کرنے جارہا ہے۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ باہر نکالا، اگلی کار کا انجن گرجا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پستول دیکھ کر اوباش لڑکوں کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ زوی دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ تیمور نے پستول واپس گلووکمپارٹ میں رکھا تو زوی بولی۔

''آپ شکار کا شوق بھی رکھتے ہیں؟''

تیمور نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''شکار ہم رائفلوں سے کرتے ہیں، یہ چیزیں تو کتوں اور اچکوں کے لیے رکھتے ہیں۔''

''اور اگر ڈاکو آجائیں تو...؟''

''ان کے لیے ہمارے چوکیدار کے پاس لائسنس والی مشین گن ہے۔ وہ خود بھی مشین گن سے کم خطرناک نہیں ہے۔''

تیمور نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہے اس

لیے وہ بھی اسے متاثر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ منصور نے اسے پہلے ہی زومی کے بارے میں ذرا چٹخارے دار انداز میں بتا دیا تھا۔ اسی لیے تیمور یہ بڑی اور شاندار کار لایا تھا۔ چاند بھائی جواب سنبھل گیا تھا، اس نے منصور سے پوچھا۔ ”کیا ہم لوگ ہوٹل میں رکیں گے؟“

وہ ناک میں بولتا تھا اس لیے آواز میں منمناہٹ زیادہ تھی۔ تیمور نے جواب دیا۔ ”نہیں... ہم نے اس عمارت کے ایک حصے کو رہائش کے قابل بنا لیا ہے، ہم وہیں رکیں گے۔“

”وہاں کیا ہوگا؟“ چاند بھائی حقارت سے بولا۔ ”زومی کو سہولتوں میں رہنے کی عادت ہے۔“

”ان کے لیے وہاں ہر سہولت مہیا کر دی جائے گی۔“ تیمور نے زومی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کہیں گی تو چاند تارے بھی توڑ کر لائے جا سکتے ہیں۔“

تیمور نے اس سے پہلے کوئی ڈراما پروڈکشن ٹیم نہیں دیکھی تھی مگر اسے یہ تینوں ڈراما پروڈکشن کا حصہ بھی نہیں لگ رہے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی لوکیشن دیکھنے آئے تھے۔ اس کے بعد ڈرامے کے دیگر مراحل شروع ہوتے۔ ڈھائی بجے کے قریب وہ مری پہنچ گئے۔ کھانے کے بارے میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سامان رکھنے کے بعد مری جا کر کھائیں گے۔ ان تینوں نے راستے میں جہاز پر لنچ کر لیا تھا اس لیے انہیں بھوک نہیں تھی لیکن تیمور نے دس بجے کا ناشتا کیا ہوا تھا اور پھر ڈرائیونگ نے اس کی بھوک چمکا دی تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ یہ تینوں جائیں بھاڑ میں، وہ انہیں چھوڑ کر خود کھانے کے لیے چلا جائے گا۔ اس نے گاڑی عمارت کی طرف جانے والے راستے کی طرف موڑی تو سب ہی خوف زدہ ہو گئے۔ ”یہ کیسا راستہ ہے؟“ زومی بولی۔

”بالکل محفوظ ہے۔“ تیمور نے اسے تسلی دی۔ ”خطرناک تو پہلے تھا جب ہم نے یہ لیا تو راستہ بھی دوبارہ اور مضبوط بنوایا ہے۔“

گاڑی راستہ طے کر کے عمارت کے سامنے پہنچی جو باہر سے ویسی ہی بے رنگ تھی۔ البتہ سامنے کا میدان پارکنگ کی جگہ چھوڑ کر خوش رنگ باغ میں بدل گیا تھا۔ باہر سے ویسی ہی نظر آنے والی عمارت میں اندر سے خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ہارن کے جواب میں عمارت کے عقب سے چوکیدار نمودار ہوا اور تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔ ”سلام صیب... کیسا اے... بہت عرصے بعد آیا۔“

وہ فولاد خان کا کزن تھا اور پہلے چوکیدار کو نکال کر نواب صاحب نے اسے یہاں رکھا تھا۔ وہ کزن سے زیادہ فولاد خان کا جڑواں بھائی لگتا تھا۔ ویسی ہی صورت اور قد و قامت، پھر بولنے کا انداز بھی فولاد خان جیسا تھا۔ اس کا نام محبت خان تھا۔ ”کیا حال ہیں محبت خان...؟“ تیمور نے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا یہاں...؟“

”سب ٹیک اے صیب۔“ محبت خان نے گاڑی کی ڈکی سے سامان نکالنا شروع کیا۔ ”ابی ادر کوئی پنگ بی نہیں سکتا اے۔“

”محبت خان! یہ مہمان ہیں اندر تین کمرے کھول دو۔“

اندر فی الحال صرف تین بیڈ رومز تھے۔ محبت خان ان کا سامان لے آیا۔ اس نے زومی اور چاند بھائی کا سامان الگ الگ کمروں میں رکھا جبکہ تیمور اور منصور کا سامان تیسرے بیڈ روم میں رکھ دیا۔ تینوں کمروں کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھے۔ ری فرنش حصے میں ان تین بیڈ رومز کے علاوہ ایک لاؤنج بھی تھا جس کے ساتھ کچن تھا اور ایک نشست گاہ بھی بنوائی گئی تھی۔ منصور فوراً واش روم میں گھس گیا اور تیمور موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔ ابھی وہ راہداری میں تھا کہ زومی بھی کمرے سے نکل آئی اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر تیمور کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کے ساتھ باہر آئی۔ اس نے وضاحت کی۔

”چاند بھائی کان لگائے بیٹھا ہوگا اس لیے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ تم کہیں باہر جا رہے ہو۔“

تیمور نے اس بے تکلفی پر خوش ہو کر اقرار کیا۔ ”ہاں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ اگر تم بھی...“

”مجھے بھوک نہیں ہے، میں مری دیکھوں گی۔“ وہ بولی۔ ”پہلی بار یہاں آئی ہوں۔“

”کیا دو کلومیٹرز پیدل چل سکتی ہو؟ گاڑی لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اوپر گاڑی لے جانے پر پابندی ہے۔“

”ہاں چل لوں گی۔“ وہ بولی۔ ”روزانہ تین کلومیٹر جاگنگ کرتی ہوں۔“

تیمور دیکھ رہا تھا، اس کا جسم کچھ زیادہ ہی متناسب تھا۔ جیسا باقاعدگی سے ورزش کرنے والی خواتین کا ہو جاتا ہے۔ وہ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ ”زومی تمہارا اصل نام ہے؟“

”نہیں، اصل نام تو خاصا اولڈ قسم کا ہے، میری گرینڈ ماما نے رکھا تھا۔ رضیہ سلطانہ... وہ فلم دیکھ کر آئی تھیں۔“

زومی نے منہ بنا کر کہا۔

”گڈ! یہ شوبزنس نیم ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ویسے تمہیں یقین ہے کہ اس شخص کے بنائے ڈرامے سے تمہیں کچھ حاصل ہوگا جو شاید دو جمع دو کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔“

”امید تو ہے۔“ وہ گول مول انداز میں بولی۔

”منصور سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی؟“

”منصور تمہارا دوست ہے، اس نے تمہیں نہیں بتایا؟“ زومی نے کسی قدر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”منصور دوست نہیں... صرف کلاس فیلو رہا ہے۔ وہاں بھی اس سے بہت زیادہ ملنا نہیں ہوتا تھا۔ میری اس سے چند مہینے سے فیس بک پر ملاقات ہوئی ہے۔“

وہ مری کے اونچے نیچے راستوں سے گزر رہے تھے۔ سڑک سے جانے کے بجائے تیمور اسے ایک شارٹ کٹ سے لے جا رہا تھا۔ ”یہ منصور کی پہلی پروڈکشن ہوگی۔“ زومی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”درحقیقت میں نے ہی اسے یہ پروجیکٹ دلوایا ہے۔“

تیمور نے اندازہ لگایا۔ ”میرا خیال ہے چاند بھائی صرف تمہاری خاطر یہ پروجیکٹ کرنے کو تیار ہوا ہے؟“

وہ دل کش انداز میں مسکرائی مگر اس نے کوئی انکار یا اقرار نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ریستوران میں داخل ہو رہے تھے تو تیمور دروازے پر ہی رک گیا۔

☆☆☆

شامی کا دل چاہ رہا تھا کہ نوشی کو قتل کر دے جو نہایت اطمینان سے ایک میز پر بیٹھی تھی اور شاید ویٹر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت وہاں خاصا رش تھا۔ صبح کی بارش کے بعد اس پورے علاقے میں موسم نہایت خوشگوار ہو گیا تھا اس لیے لوگوں کی بڑی تعداد مری کا رخ کر رہی تھی۔ جوجی کی حالت بھی خراب تھی، اسے خطرہ تھا کہ نوشی کہیں بھانڈا نہ پھوڑ دے کہ جوجی نے اسے بتایا ہے۔ شامی کچھ دیر دانت پیستا رہا پھر ایک جھٹکے سے نوشی کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی آمد سے باخبر ہو کر بھی انجان بنی بیٹھی تھی۔ جب شامی اس کے سامنے بیٹھا تو وہ چونکی۔ ”شامی تم... کیا سرپرائز ہے؟“

”بکو مت... تم شروع سے میرے پیچھے تھیں۔“ شامی دھیمی آواز میں غرایا۔ ”میں نے تمہاری زرد فراری دیکھ لی تھی۔“

”کیا زرد فراری صرف میرے پاس ہے؟“ نوشی نے نہایت اطمینان سے منرل واٹر کی بوتل کھول کر پانی نکال کر گلاس میں ڈالا۔ ”پانی پیو، تمہارا دماغ گرم ہو رہا ہے۔“

شامی نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ ”یہ بتاؤ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”تم کیوں آئے ہو؟“

شامی کچھ دیر کے لیے بوکھلا گیا پھر اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”انجوائے کرنے...“

”تو میں بھی انجوائے کرنے آئی ہوں۔“ نوشی بولی۔ ”تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”اعتراض یہ ہے کہ تم میرا پیچھا کرتی آئی ہو۔ کیوں جوجی میں نے ٹھیک کہا نا؟“

جوجی نے اس بکرے کی سی مظلومیت سے نوشی کی طرف دیکھا جو دو قصائیوں کے درمیان پھنس گیا ہو۔ ”جی... جی۔“

”کیا جی جی لگا رکھی ہے۔“ نوشی نے اسے ڈانٹا اور شامی سے بولی۔ ”میں تمہارے پاس نہیں آئی، تم میرے پاس آئے ہو اس لیے تمہارا الزام غلط ہے۔“

”شامی بھائی... لنچ۔“ جوجی نے منمنا کر کہا تو مجبوراً شامی نے ویٹر کو اشارہ کیا اور آدھے گھنٹے بعد وہ سب لنچ تناول کر رہے تھے۔ شامی کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ابھی وہ کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ شامی نے تیمور کو ایک حسین لڑکی نما عورت کے ساتھ ریستوران میں آتے دیکھا۔ تیمور نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اب رک کر اسے گھور رہا تھا۔ پھر نوشی بھی متوجہ ہو گئی۔

”تو یہ ہے اس طرح اچانک مری بھاگے آنے کی وجہ۔“ نوشی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یقیناً پہلے بھائی صاحب آئے ہیں اور پیچھے سے تم دوڑے چلے آئے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شامی نے کھسیا کر کہا۔ ”میں اس خاتون کو نہیں جانتا۔“

”تو اب جان لو گے۔“ نوشی نے تیمور کو عورت سمیت اپنی طرف آتے دیکھا۔ چند منٹ بعد وہ اسی میز پر تھے اور ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔ تیمور نے اپنے اور زومی کے لیے کھانے کا آرڈر کیا اور شامی کی طرف متوجہ ہوا۔

”جناب کس خوشی میں یہاں نظر آ رہے ہیں جبکہ میں صبح ائرپورٹ کے لیے نکلا تو آپ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔“

”میں بتاتی ہوں...“ نوشی نے کہا۔

”اس میں بتانے کی کیا بات ہے۔“ شامی نے نوشی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بس میرا دل چاہا۔ میں نے جوجی کو کال کی اور ہم مری آ گئے۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

''نہیں۔'' تیمور نے دانت پیسے۔ ''لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ اس سیزن میں یہاں کوئی خالی کمرا مشکل سے ہی ملے گا۔''

''کوئی بات نہیں، ہماری اپنی اتنی بڑی عمارت ہے۔'' شامی نے کہا۔

''اس میں صرف تین بیڈ رومز ہیں اور وہ سب فل ہیں۔ مزید گنجائش نہیں ہے۔''

''گنجائش پیدا کی جاتی ہے دوست۔'' شامی اب تیمور کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ ''جیسے میں اور جوجی نشست گاہ میں جگہ بنالیں گے۔''

''اور میں مس رضیہ سلطانہ یعنی زومی کے ساتھ رہ لوں گی۔'' نوشی نے کہا تو شامی کا سارا لطف غارت ہوگیا۔ اس نے بھنا کر کہا۔

''میرا خیال ہے، تم صرف گھومنے آئی تھیں۔''

''لیکن اب میرا رکنے کا موڈ بن گیا ہے۔'' نوشی اڑیل انداز میں بولی۔ ''ویسے نواب انکل نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ میں جب چاہوں، یہاں آکر رک سکتی ہوں۔ اگر کسی کو لانا چاہوں تو مجھے اس کی بھی اجازت ہوگی۔ اگر تم چاہو تو میں نواب انکل سے تمہاری بات کرا سکتی ہوں۔'' نوشی نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' شامی اور تیمور نے ایک آواز ہوکر کہا۔ نوشی نے محسوس کیا کہ زومی اسے کسی قدر ناپسندیدہ اور فکرمند نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کا یہاں رکنا اسے ناگوار گزرا ہو۔ تیمور شامی کی نسبت حالات کو جلد قبول کرلیتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئے اور پیدل واپس روانہ ہوئے۔ چار بجے بھی سورج خاصا بلند تھا۔ زومی نے راستے میں کہا۔ ''وہ جگہ تو بہت شاندار ہے، اب تک کوئی ہوٹل کیوں نہیں بنالیا؟''

''اگر ہوٹل بن جاتا تو تم یہاں ڈرامے کے لیے کیوں آتیں؟'' تیمور نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا تو وہ ادا سے ہنسی۔ شامی پیچھے چل رہا تھا اور جل رہا تھا۔ نوشی نے آہستہ سے اس سے کہا۔

''بے چارہ اچھا خاصا لٹّو ہو رہا ہے۔''

''تم نے دیکھا...'' شامی نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''اسے ذرا خیال نہیں ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اسے ذرا خیال نہیں ہے کہ تمہیں بھی موقع دے خاتون سے فری ہونے کا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اسے اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''لڑکیوں کے معاملے میں تم دونوں کی حیثیت کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔'' نوشی نے طنز کیا تو شامی نے دل ہی دل میں اسے بھاڑ میں جانے کا مشورہ دیا۔ وہ منہ سے یہ مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆☆

چاند بھائی کا موڈ خراب تھا کیونکہ زومی اسے بتائے بغیر تیمور کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ یہ اطلاع اسے محبت خان نے دی تھی۔ چاند بھائی اپنے کمرے میں آیا، اس نے اپنے بیگ سے ایک معروف لال شربت کی بوتل نکالی لیکن اس میں لال شربت کے بجائے کچھ اور تھا۔ پھر بیگ سے شطرنج کی بساط نکال کر اس پر مہرے سیٹ کرنے لگا۔ جب وہ فارغ ہوتا یا اس کا موڈ خراب ہوتا تو وہ خود سے شطرنج کھیلتا تھا۔ مہرے سنہری اور نیلے رنگ کے تھے۔ وہ پیتے ہوئے کھیلنے لگا۔ بارش کے بعد موسم خوشگوار ہوگیا تھا اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاند بھائی نے کھڑکی کھول دی۔ دوسرے گلاس کے بعد وہ موڈ میں آگیا اور پورے انہماک سے شطرنج کھیل رہا تھا تقریباً وہ خود کو شہ مات دینے والا تھا کہ کھڑکی سے کوئی چیز اندر آکر گری۔ چاند بھائی اتنا بوکھلایا کہ گلاس بساط پر الٹ گیا اور شراب بساط پر بہنے لگی۔ گلاس نیچے فرش پر گر چکا تھا۔ اس کی خوف زدہ نظریں باہر سے آنے والی چیز پر مرکوز تھیں۔ یہ ایک چھوٹے سے پتھر پر لپٹا ہوا سفید کاغذ تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے پتھر سے کاغذ الگ کیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس پر صرف ایک سطر لکھی تھی۔

''تم ہماری نظروں سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ بہتر ہوگا ہمارا مطالبہ مان لو... ورنہ...''

بے ساختہ چاند بھائی کے منہ سے گندی سی گالی نکلی اور اس نے زیرِلب کہا۔ ''دیکھ لوں گا تم لوگوں کو...''

الفاظ کے برعکس اس کے لہجے اور چہرے پر خوف تھا۔ اس نے جھپٹ کر کھڑکی بند کی اور پھر دروازہ بھی اندر سے بند کرلیا۔ اچھے خاصے سرد موسم کے باوجود اس کے چہرے پر پسینا پھوٹ آیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ پُرسکون ہوتا چلا گیا اس کی نظر بساط پر جمی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اچھل پڑا۔ ''کک... کون ہے؟''

''چاند بھائی! میں ہوں منصور۔'' باہر سے آواز آئی تو چاند بھائی نے پھرتی سے شراب کی بوتل بند کرکے بیگ میں

رکھی اور پھر ایک کپڑے سے بساط اور نیچے گری شراب بھی صاف کرکے بساط اور مہرے بھی اندر رکھ دیے۔ اپنے تاثرات درست کرتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔ منصور اندر آیا اور اس نے غور سے چاند بھائی کو دیکھا۔ ''خیریت تو ہے چاند بھائی... آپ پریشان لگ رہے ہو؟''

''وہ زومی بتائے بغیر چلی گئی ہے۔'' چاند بھائی خفگی سے بولا۔ ''مجھے اس کی فکر ہے۔''

''چاند بھائی! وہ بچی نہیں ہے اور دوسرے ہمیں یہ لوکیشن پسند آگئی تو ضروری نہیں ہے کہ تیمور آسانی سے مان جائے لیکن زومی اس کے ساتھ ذرا ہنس بول لے گی تو وہ مان جائے گا۔ میرے کالج کے زمانے کا دوست ہے، میں اسے جانتا ہوں۔''

چاند بھائی سوچ میں پڑ گیا۔ ''لوکیشن تو اچھی ہے اور مفت میں مل جائے تو اور بھی اچھی ہے۔''

''بس تو پھر کچھ دن کے لیے زومی کو آزاد چھوڑ دیں۔'' منصور نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ''ایک بات پوچھوں چاند بھائی...؟''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا تم کسی سے خوفزدہ ہو؟''

چاند بھائی نے پھر گالی دی۔ ''میں کسی... سے نہیں ڈرتا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم راستے میں کچھ ڈر رہے تھے جیسے کوئی ہمارا پیچھا کررہا ہے یا کوئی حملہ نہ کردے۔''

چاند بھائی پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''بابا آج کل حالات ہی ایسے ہیں کون نہیں ڈرتا... ابھی راستہ چلتے بم دھماکا ہوجائے تو ڈیڈ باڈی بھی نہیں ملتی ہے... لوگ گولی مار جاتے ہیں۔''

منصور اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن اس نے دوبارہ نہیں پوچھا۔ ''بس تمہیں یہی بتانے آیا تھا زومی کے معاملے میں مت بولو۔ ڈراما ہوجائے تو پھر کون ادھر آتا ہے۔''

چاند بھائی نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ ''ہاں بابا، دوبارہ ادھر کون آئے گا۔''

☆☆☆

واپسی میں وہ سب تھک گئے تھے اس لیے تیمور نے محبت خان کو چائے لانے کو کہا۔ وہ چائے کافی کے ساتھ کچن کے چھوٹے موٹے کام بھی جانتا تھا، بس کھانا نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی لے آیا۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں باغ تھا۔ یہاں لان چیئرز اور ایک خوب صورت ماربل ٹاپ والی گول میز بھی رکھی تھی۔ محبت خان چائے لے کر آیا تو شامی نے اس سے پوچھا۔ ''محبت خان! یہ باغ کس نے لگایا ہے؟''

''ام نے صیب۔'' اس نے شرما کر کہا۔ ''ادر فارغ اوتا اے اس لیے یہ کام کیا۔''

''بہت اچھا کام کیا ہے، میں دادا جان کو بتاؤں گا۔''

''شکریہ صیب! آپ پسند فرمایا امارے لیے یہ بوت اے۔''

نوشی کی موجودگی میں شامی کی زومی میں دلچسپی ویسے ہی ختم ہوگئی تھی اور پھر وہ پوری طرح تیمور کی طرف ملتفت نظر آتی تھی۔ چائے کے بعد نوشی کھڑی ہوگئی۔ ''جوجی! میرے ساتھ چلو۔ میں اپنی گاڑی لے آؤں، یہاں سے کچھ دور کھڑی ہے۔''

انمول پارے

محترم خاتون! اپنی نظر کے سامنے ہمیشہ پیسا کے ترچھے ٹاور کی مثال رکھیے۔ اگر وہ سیدھا ہوتا تو کوئی شخص بھی اس پر دوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کرتا...... دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے آپ بھی اپنے اندر تھوڑی سی انفرادیت پیدا کرکے ترچھی ہوجایئے۔

★★★

آج کے دور میں شوہر بننا کسی دوسری ملازمت سے مختلف نہیں ہے۔ اگر نک چڑھے باس کے احکامات کی بجا آوری کرسکتے ہو تو زندگی سکون کے ساتھ گزرے گی۔

عدم

پنڈت ہری چند اختر نے عبدالحمید عدم کو طویل مدت کے بعد کسی مشاعرے میں دیکھا لیکن پہچانا نہیں کیونکہ عدم صاحب بہت موٹے ہوچکے تھے۔ عدم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اختر صاحب نے انہیں پہچانا نہیں ان سے کہا:

''پنڈت جی! میں عدم ہوں۔''

اختر صاحب نے بے ساختہ فرمایا۔

''اگر یہی عدم ہے تو وجود کیا ہوگا؟''

(آسیہ سعید قریشی، کراچی)

★★★

"میں آرام کروں گی۔" زومی نے کہا اور اندر چلی گئی۔ تنہائی ملتے ہی شامی، تیمور پر چڑھ دوڑا۔
"تو اس لیے تم خاموشی سے سرک گئے تھے۔"
"تم نے بھی چالاکی دکھائی... میرا پیچھا کیا اور یہاں آگئے۔ حساب برابر ہوگیا۔" تیمور نے آرام سے جواب دیا تو شامی بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔
"تمہارا حساب برابر ہوگیا اور میرے پیچھے یہ بلا جو لگ کر آئی ہے۔"
"بھائی میں اس سلسلے میں قطعی بے بس ہوں۔ اس سے تم خود نمٹو۔" تیمور نے جلدی سے کہا۔ "ویسے بھی یہ لوگ کل صبح تک واپس چلے جائیں گے۔"
"چکر کیا ہے؟"
"چکر یہ ہے کہ منصور اور زومی نے مل کر چاند بھائی کو پھانسا ہے اور یہ ڈرامے کو فنانس کر رہا ہے۔"
"شکل سے تو یہ خود کنگلا نظر آتا ہے۔"
"شکل پر مت جاؤ... یہ کاروباری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "یہ دونوں اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"
"اگر انہوں نے اجازت مانگی تو دادا جان دے دیں گے؟"
"دادا جان میری درخواست پر اجازت دے چکے ہیں۔" تیمور نے اطمینان سے کہا۔ "جب تک ڈراما بنے گا، میں یہیں رہوں گا۔"
"وہ کیوں؟" شامی نے اعتراض کیا۔ "رہنے کو تو میں بھی رہ سکتا ہوں۔"
"بھائی یہ تمہارا نہیں میرا معاملہ ہے اس لیے تم ٹانگ مت اڑاؤ۔" تیمور نے کہا۔ "ایسا نہ ہو دادا جان تمہیں کہیں اور چھٹیاں گزارنے کے لیے بھیج دیں۔"
"مثلاً کہاں؟" شامی نے بے خیالی سے کہا کیونکہ وہ عمارت کے دائیں طرف والی ڈھلان کی طرف متوجہ تھا۔ اسے وہاں نیلی جیکٹ میں ملبوس ایک شخص دکھائی دیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس طرف سے واپس جا رہا تھا۔
"چین پور۔" تیمور نے کہا اور مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ شامی نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ محبت خان کی تلاش میں تھا۔ محبت خان اسے گاڑیوں کے پاس ملا۔ وہ کپڑے سے ان کی صفائی کر رہا تھا۔ وہ کام کرنے والا آدمی تھا اور اسے فارغ بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ عمارت کچھ اس طرح تھی کہ اس کے بائیں طرف اونچی پہاڑی تھی جبکہ عقب اور دائیں طرف نیچے جاتی تقریباً سیدھی ڈھلانیں تھیں اور سامنے چھوٹا سا میدان تھا جسے پلی نما راستہ سڑک سے ملاتا تھا۔
"محبت خان! کیا ان ڈھلانوں سے کوئی اوپر آسکتا ہے؟"
محبت خان نے سر کھجایا۔ "کوہ پیما آسکتا ہے عام بندہ نہیں آسکتا۔"
محبت خان کا مطلب واضح تھا۔ صرف ماہر کوہ پیما... ہی ان ڈھلانوں پر چڑھ اور اتر سکتے تھے۔ عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ شامی نے نیلی جیکٹ والے کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ اس کا وہم تھا کہ وہ عمارت کی طرف سے ڈھلان پر جا رہا تھا۔ شاید وہ کسی ضرورت سے ڈھلان پر تھوڑا بہت چڑھا ہوگا اور ضرورت پوری کر کے واپس جا رہا تھا۔ کئی سو گز تک تقریباً سیدھی پہاڑی پر چڑھنا کوہ پیما کا کام ہی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

تیمور نے اپنے اور منصور کے کمرے میں جھانکا لیکن وہ کمرے میں نہیں تھا۔ تیمور نشست گاہ میں آیا پھر لاؤنج اور کچن میں دیکھا۔ منصور اندر ہی آیا تھا۔ تیمور کو خیال آیا کہ کہیں وہ عمارت کا جائزہ نہ لے رہا ہو۔ وہ اسے عمارت میں تلاش کرنے لگا۔ بالآخر منصور اسے چھت پر مل گیا۔ وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ شاید نیچے سگنل نہیں تھے اس لیے وہ اوپر آگیا تھا۔ تیمور کو دیکھ کر اس نے جلدی سے کال منقطع کر دی اور بولا۔ "نیچے سگنل نہیں تھے۔"
"ہاں، یہاں سگنل پرابلم ہے۔ یہ جگہ شہر سے کچھ ہٹ کر ہے۔"
تیمور اصل میں منصور کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس نے اپنے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں تیمور نے سوالات کی مدد سے جو معلومات حاصل کیں، ان کا لب لباب یہ تھا کہ منصور نے اس سے پہلے کوئی ڈراما پروڈیوس نہیں کیا تھا۔ ہاں وہ بعض ڈراموں کی ٹیم میں شامل رہا تھا لیکن ساتھ ہی اس نے اعتراف کیا کہ اس کی شمولیت غیر سرکاری تھی۔ یعنی اس کا نام کہیں نہیں آیا تھا۔ ٹی وی... میں بھی وہ کوئی خاص ملازمت نہیں کرتا ہے۔ منصور کے مطابق وہ کوآرڈینیٹر تھا۔ اس سے بھی اس کی ملازمت کی وضاحت نہیں ہوتی تھی۔ تیمور نے اس سے پوچھا۔
"تم ڈراما کس چینل کے لیے بنا رہے ہو؟"
"ابھی طے نہیں کیا ہے۔"

"یہ صرف چھ قسطوں کا ڈراما ہے اس کے لیے کسی سے بات کرنے میں کیا دشواری ہے؟"
منصور پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "ابھی میرا نام نہیں ہے اس لیے کوئی بھی چینل ڈراما دیکھ کر ہی خریدے گا۔"
تیمور کو اندازہ ہونے لگا کہ منصور کوئی چکر چلا رہا ہے۔ وہ اس بہانے چاند بھائی سے رقم اینٹھنا چاہتا تھا یا اس کی رقم سے اپنا ڈراما بنانے کا شوق پورا کر رہا تھا۔ تیمور نے اس سے کہا۔ "تم اگر یہاں ڈراما بنانا چاہو تو اپنے پروڈکشن ہاؤس کے لیٹر ہیڈ پر درخواست دے دو۔ دادا جان اسے اپرود کریں گے، تب تم اس جگہ کو استعمال کر سکو گے۔"
منصور نے سر ہلایا۔ "کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں کراچی جاتے ہی یہ کام کر دوں گا۔"
مغرب کی طرف جھکتے سورج کا منظر بہت خوب صورت تھا مگر ساتھ ہی موسم تیزی سے سرد ہونے لگا۔ تیمور عام کپڑوں میں تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی اس لیے وہ نیچے جانے لگا۔ منصور نے کہا۔ "مجھے ایک کال اور کرنی ہے، میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔"
تیمور نیچے آیا، محبت خان کچن میں چائے بنا رہا تھا۔ نوشی اور جوجی آگئے تھے۔ وہ رات کے کھانے کے لیے پیزا اور کولڈ ڈرنک لے آئے تھے اور ابھی چائے کی فرمائش کی تھی۔ شامی ان کے ساتھ تھا۔ تیمور زومی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اسے لاؤنج سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتی دکھائی دی۔ تیمور اسے آواز دینے والا تھا کہ اس کا پُر اسرار انداز دیکھ کر رک گیا۔ زومی دبے قدموں جا رہی تھی۔ تیمور خاموشی سے اس کے پیچھے آیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر چلی گئی اور تیمور دروازے کے پاس رک گیا۔ منصور ابھی تک چھت پر تھا اور شاید وہ زومی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ "کہاں رہ گئی تھیں تم...؟"
"میں آئی تھی تو تم تیمور سے بات کر رہے تھے۔ میں آدھا گھنٹا انتظار کر کے واپس چلی گئی۔ تم اسے ٹالنے کے بجائے احمقوں کی طرح اس کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ اس نے تمہارے بارے میں تقریباً سب معلوم کر لیا۔"
"اسے کچھ نہیں معلوم۔"
"وہ تم سے دس گنا زیادہ ذہین ہے۔" زومی حقارت سے بولی۔ "اس نے اس طرح اگلوایا کہ تمہیں احساس بھی نہیں ہوا... مجھے یقین ہے اس نے جان لیا ہوگا کہ ہمارا ڈراما بنانے کا ارادہ نہیں ہے کیونکہ تمہیں ڈرامے کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔"
"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" منصور بھنا گیا۔ "دوسرے میں نے جب ڈراما بنانا ہی نہیں ہے تو اس کی اے بی سی بھی کیوں سیکھوں؟"
"اس لیے کہ جب کوئی دوسرا پوچھے تو تمہارا پول نہ کھلے۔" زومی بولی۔ "آدمی کو اپنا ہوم ورک مکمل رکھنا چاہیے۔"
"چھوڑو اس فضول... بحث کو... میں نے چاند بھائی سے کہہ دیا ہے کہ لوکیشن ٹھیک ہے۔"
"وہ اس طرح نہیں مانے گا۔" زومی ہنسی۔
"پھر کس طرح مانے گا؟"
"تمہیں پتا ہے وہ کس طرح مانے گا۔ ابھی ترپ کا پتا میرے ہاتھ میں ہے اور جب میں اسے استعمال کروں گی تو وہ ایک کروڑ روپے ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے گا۔" زومی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ ترپ کا پتا وہ خود تھی۔
"رقم وہ ڈرامے کے لیے دے رہا ہے۔" منصور نے کسی قدر کھسیا کر کہا تو زومی زور سے ہنسی۔
"تم چاند بھائی کو کیا سمجھتے ہو... وہ اس تالاب میں پیدا ہوا ہے جس میں تم نے ابھی اپنے پاؤں بھی نہیں بھگوئے ہیں۔ وہ ڈرامے پر ایک روپیا بھی نہیں لگائے گا لیکن میری وجہ سے ایک کروڑ روپے دے گا۔" زومی نے یقین سے کہا۔ "لیکن فار گاڈ سیک... اپنا ہوم ورک ٹھیک رکھو۔ تم کہیں سے بھی ایک ڈراما پروڈیوسر تو کیا ایکسٹرا بھی نہیں لگتے ہو۔"
"وہ میں ہوں بھی نہیں۔" منصور برا مان کر بولا۔ "لیکن تم یہ یاد رکھو، یہ سارا پلان میرا ہے۔"
"پلان تمہارا ہے اور تمہیں بتانا پڑ رہا ہے کہ کیا کرو اور کیا نہ کرو۔" زومی کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "تم مان لو کہ میرے بغیر تم کچھ نہیں ہو۔ اگر میرا سہارا نہ ہوتا تو تمہیں ٹی وی کی یہ جاب بھی نہ ملتی اور اب تمہیں ڈراما پروڈیوسر بننے کا موقع مل رہا ہے۔"
"ٹھیک ہے بی بی! تم ہی سب کچھ ہو۔" منصور بھنا گیا۔ "میں صرف احمق ہوں اور تمہارا غلام ہوں۔"
"اب کی نا تم نے اصل بات... میرے پیارے سے بھالو۔" زومی اس طرح ہنسی کہ تیمور کا خون جل گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو زومی نے منصور کے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں اور وہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

☆☆☆

شامی نوشی اور جوجی سے جان چھڑا کر نشست گاہ میں

صوفے پر لیٹا ہوا ٹانگیں ہلا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بلا وجہ یہاں آنے کی زحمت کی۔ زومی تو تیمور کے سوا کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی ہے اور اوپر سے نوشی اس کے سر پر سوار ہے۔ وہ سخت کوفت محسوس کر رہا تھا۔ جوجی اور نوشی لاؤنج میں لوڈو کھیل رہے تھے۔ ساتھ ہی جوجی نوشی کو اپنی داستانِ محبت سنا رہا تھا جو اگرچہ خاصی دکھی تھی لیکن نوشی مسلسل ہنس رہی تھی۔

شامی وہاں سے اٹھ آیا۔ جوجی کی یہ داستان وہ اتنی بار سن چکا تھا کہ اسے حفظ ہو گئی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور باہر تاریکی چھا رہی تھی۔ اب سردی ہو گئی تھی لیکن اتنی نہیں تھی کہ آتش دان جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ تیمور اندر آیا تو شامی نے اس کی صورت سے تاڑ لیا کہ وہ خاصا برہم ہے۔ شامی نے ٹانگیں ہلانا موقوف کیں اور پوچھا۔ ’’کیا ہوا بھائی... یہ تیوری پر بل کیسے ہیں؟‘‘

تیمور دوسرے صوفے پر گر گیا۔ ’’مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ منصور اتنا کمینہ آدمی نکلے گا تو میں اسے یہاں آنے کی دعوت ہی نہ دیتا۔‘‘

’’بھائی اس نے کیا کمینگی دکھائی ہے، آخر مجھے بھی تو بتاؤ۔‘‘

تیمور اس کے پاس آیا اور سرگوشیوں میں اسے ساری بات بتائی۔ شامی کا دل باغ باغ ہو گیا لیکن اس نے ... سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی تھی کہ زومی تیمور کو بھی دھوکا دے رہی تھی اور اسے صرف استعمال کر رہی تھی۔ ’’ٹھیک ہے وہ دونوں مل کر چاند بھائی کے ساتھ کوئی چکر چلا رہے ہیں تو ہم کیا کریں؟‘‘

’’ہم چاند بھائی کو ان کی اصلیت بتا سکتے ہیں۔‘‘ تیمور جوش سے بولا کیونکہ وہ اس وقت جوش میں تھا اس لیے اسے ہوش کی باتیں نہیں سوجھ رہی تھیں۔

’’یار! وہ ہماری بات پر کیوں یقین کرے گا؟‘‘ شامی نے کہا۔ ’’منصور اور زومی ہمیں صاف جھٹلا دیں گے اور وہ ان کی مانے گا۔‘‘

تیمور نے غور کیا۔ ’’تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟‘‘

’’کچھ کرنا ضروری ہے؟ کل انہوں نے ویسے ہی چلے جانا ہے اور دوبارہ یہاں نہیں آنا ہے۔‘‘

’’ڈراما...‘‘

’’اوہ بھائی تم بھول رہے ہو، ان کا مقصد چاند بھائی سے ایک کروڑ روپے ٹھگنا ہے... تاکہ سچ مچ کا ڈراما بنانا۔ میرا خیال ہے یہ ایک کروڑ روپے لے کر نو دو گیارہ ہو جائیں گے اس لیے اگر تم ان سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو آسان طریقہ ہے کہ عمارت دینے سے انکار کر دو۔‘‘

’’یہ کوئی اور عمارت تلاش کر لیں گے۔‘‘ تیمور فکرمند تھا۔

’’ہماری بلا سے تلاش کر لیں۔‘‘ شامی جھنجلا گیا۔ ’’ہمیں تو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ ورنہ کل کو یہ احمق لٹ کر یہاں دوڑا نہ آئے اور بات دادا جان تک چلی جائے۔‘‘

اب بات تیمور کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ’’میں انہیں منع کرتا ہوں بلکہ ابھی ان کو یہاں سے چلتا کرتا ہوں۔‘‘

شامی کا دل چاہا کہ سر پیٹ لے۔ مارے غم کے تیمور عقل سے پیدل ہوا جا رہا تھا۔ ’’میرے یار! ابھی صرف مجھے پتا ہے کہ لڑکی نے جناب کو الو بنایا ہے۔ آپ سارے زمانے کو یہ بات کیوں بتانا چاہ رہے ہیں؟‘‘

’’سارے زمانے کو کیسے پتا چلے گا؟‘‘

’’سارے زمانے کو ایسے پتا چلے گا کہ جناب تیمور کی دال نہیں گلی اس لیے انہوں نے پہلے مہمان بنایا اور پھر بے عزت فرما کر رخصت کر دیا۔‘‘

’’تو پھر کیا کروں؟‘‘ تیمور نے نقشِ فریادی بن کر کہا۔ ’’مجھ سے ان لوگوں کا وجود یہاں برداشت نہیں ہو رہا ہے۔‘‘

’’بھائی صبر کر اور اگر نہیں ہو رہا ہے تو مت کر... بلکہ جو مرضی آئے وہ کر لیکن پھر نتائج کی ذمے داری بھی تیری ہو گی۔‘‘

تیمور نے دوبارہ غور کیا اور خود کو شامی سے متفق پایا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ’’تو ٹھیک کہتا ہے۔‘‘

’’بس بیٹا، اسے اپنی حماقت کی سزا سمجھ کر قبول کر لے۔‘‘

’’کیسی حماقت؟‘‘

’’جو تو نے مجھے ساتھ نہ لا کر کی اور اب اس کی سزا پا رہا ہے۔‘‘ شامی نے کہا۔ ’’ویسے تو فکر نہ کر اب مجھے بھی غصہ آ گیا ہے۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی تجھے اس طرح سے استعمال کرنے کی۔ ان کو کوئی نہ کوئی سزا تو ملنی چاہیے۔‘‘

’’ہے نا۔‘‘ تیمور خوش ہو کر بولا۔ ’’میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’لیکن جو کرنا ہے نہایت ہوشیاری سے کرنا ہے۔ وہ سب نہیں کرنا جو تو سوچ رہا ہے... اور اگر کوئی ترکیب نہیں سوجھی تو مجبوراً انہیں معاف کر دیں گے۔‘‘

رات کا کھانا انہوں نے محبت خان سے منگوا لیا تھا کیونکہ دوپہر میں وہ مری ہو آئے تھے اور اب کسی کی ہمت نہیں تھی دوبارہ جانے کی، گاڑی سے جانے کی صورت میں بھی انہیں پیدل چل کر اوپر جانا پڑتا۔ نوشی کو زومی کے ساتھ کمرا شیئر کرنا پڑا تھا دونوں ہی اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھیں لیکن مجبوری تھی۔ ڈبل بیڈ خاصا بڑا تھا وہ آسانی سے شیئر کر سکتی تھیں۔ مگر اپنے ناپسندیدگی کے جذبات کا کیا کرتیں۔ نوشی کو زومی جیسی شکاری عورتوں سے نفرت تھی جبکہ زومی کو نوشی جیسی شریف زادیاں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

دس بجے وہ سب لاؤنج میں جمع ہو کر کافی پی رہے تھے۔

کافی پی کر انہوں نے کچھ دیر گپ شپ کی کوشش کی لیکن سارا دن سفر کے بعد سب ہی تھک گئے تھے۔ اونگھنے لگے تو باری باری سب ہی سونے کے لیے اٹھ گئے۔ ان میں صرف چاند بھائی نہیں تھا، وہ کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ جوجی اس کے لیے کافی لے کر گیا تھا لیکن اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ شامی چاند بھائی کے ساتھ سوئے گا۔ تیمور اور منصور کمرا شیئر کریں گے اور نوشی زومی کے ساتھ ہو گی جبکہ جوجی کو نشست گاہ میں سونا تھا۔ شامی سب سے آخر میں اٹھا تھا اور تیمور والے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے ہلکی سی دستک دی جس کے جواب میں تیمور نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ شامی اندر آیا، منصور بستر پر پڑا منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔

’’یہ سو گیا ہے؟‘‘ شامی نے پوچھا۔

’’سو فیصد... کان میں بال گھمانے سے بھی نہیں ہل رہا۔‘‘

لیکن شامی مطمئن نہیں ہوا جب تک اس نے منصور کی ناک میں دھاگا بل دے کر نہیں گھما لیا۔ ’’اس کا مطلب ہے دوا نے اثر دکھایا ہے۔‘‘

’’لیکن چاند بھائی نے کافی نہیں پی ہے۔‘‘ تیمور نے اسے یاد دلایا۔

شامی فکرمند نظر آنے لگا۔ ’’اصل میں تو اسے پلانی تھی۔‘‘

’’چلو پہلے ان دونوں کو دیکھ لیں۔‘‘

شامی اور تیمور نے مل کر احتیاط سے منصور کے سامان کی تلاشی لی۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی جب اس کے پاس سے ایسی کوئی چیز نہیں نکلی جس سے انہیں کچھ پتا چلتا۔ اس کے پاس بارہ ہزار کی کیش رقم، ایک اے ٹی ایم کارڈ، ایک کریڈٹ کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، آئی ڈی کارڈ اور ایک ریٹرن ٹکٹ تھا مگر ڈرامے سے متعلق کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ نوشی اور زومی والے کمرے کی طرف آئے۔ مگر وہ اندر سے بند تھا اور وہ بھول گئے تھے کہ لڑکیاں سونے سے پہلے لازمی کمرا اندر سے بند کر لیں گی۔ بدقسمتی سے نوشی نے بھی کافی پی لی تھی اور اب وہ دونوں یقیناً خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ تیمور سے زیادہ شامی مایوس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اسی بہانے وہ زومی کو ذرا قریب سے دیکھ سکے گا۔ اس نے خفت سے کہا۔

’’ان لوگوں کو دروازہ اندر سے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘

’’اب چاند بھائی رہ جاتا ہے۔‘‘ تیمور بھی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

’’اس کا کیا ہو سکتا ہے وہ جاگ رہا ہو گا یا سو رہا ہو گا۔ بہرحال میں اس کے سامان کی تلاشی نہیں لے سکتا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں، ایک کوشش تھی جو ناکام رہی۔‘‘ تیمور بولا۔

اس سازش میں جوجی برابر کا شریک تھا اس لیے اس نے اپنی، تیمور اور شامی کی کافی میں نیند کی دوا شامل نہیں کی تھی۔ دوا انہوں نے محبت خان سے منگوائی تھی۔ میڈیکل اسٹور سے بہ آسانی مل گئی تھی۔ شامی چاند بھائی والے کمرے کی طرف آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چاند بھائی سو رہا ہو گا لیکن وہ بستر پر نہیں تھا۔ شامی پورا دروازہ کھول کر اندر آیا اور اچھل پڑا۔ چاند بھائی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا بیگ یوں بکھرا ہوا تھا جیسے اس میں بم پھٹا ہو۔ لال شربت کی بوتل زمین پر پڑی تھی۔ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ کاغذات فرش پر بچھے ہوئے تھے اور خاص چیز صوفے کے سامنے میز پر رکھی شطرنج کی بساط تھی جس پر اب صرف چار مہرے تھے۔ سنہری مہروں میں شاہ اور وزیر تھے جبکہ نیلے مہروں میں شاہ اور سوار تھے۔ شاہ گرا ہوا تھا اور بساط پر خون جمع تھا۔

اسی طرح فرش کے عین وسط میں پھیلا ہوا خون کا خاصا بڑا دھبا تھا۔ یہ خون تازہ تھا۔ کمرے کی عقبی طرف والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شامی واش روم کی طرف جھپٹا لیکن وہ خالی تھا۔ چاند بھائی نہایت پُراسرار انداز میں غائب ہو گیا تھا۔ شامی نے تیمور کے پاس جانے سے پہلے کھڑکی کے باہر بھی جھانک لیا۔ ہلکی چاندنی میں دور تک منظر صاف تھا اور اس میں کہیں بھی چاند بھائی شامل نہیں تھا۔ تیمور سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ شامی نازل ہوا۔ وہ کسی قدر بدحواس تھا۔ منصور بے خبر سو رہا تھا اس کے باوجود شامی تیمور کو کونے میں لے گیا اور

اس کے کان میں گھس کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کسی نے چاند بھائی کا مرڈر کر دیا ہے۔“

تیمور اچھل پڑا۔ ”مرڈر... شامی تو نے صبح والی کافی پی تھی نا؟“

”میں نے سو فیصد صحیح کافی پی تھی لیکن چاند بھائی مرڈر کے بعد غائب ہو گیا ہے۔“

تیمور سمجھ نہیں پا رہا تھا اس لیے اسے سمجھانے کے لیے۔ شامی اسے چاند بھائی والے کمرے میں لایا اور تیمور نے وہاں موجود گڑبڑ کو خود ملاحظہ کیا اور شامی سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ چاند بھائی کا مرڈر ہو گیا ہے؟“

”یہ خون نہیں دیکھ رہے ہو؟“

”اتنا خون تو پچھلے دنوں میرا انگوٹھا کٹ جانے سے نکل گیا تھا۔“ تیمور بولا۔ اس نے جھک کر بساط پر موجود خون سے انگلی لگائی اور اسے سونگھا۔ ”یہ خون ہی ہے اور شاید آدھا پون گھنٹا پہلے یہاں گرا ہے۔“

شامی نے چاند بھائی کے سامان کا جائزہ لیا۔ ”اس کے کپڑے موجود ہیں لیکن جوتے نہیں ہیں۔ پرس بھی ظاہر ہے لباس میں ہوگا۔ یہاں صرف اس کے کپڑے ہیں۔“

”یہ کاغذات کیسے ہیں؟“ تیمور نے زمین پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے۔ یہ ایک فائل سے اڑے تھے۔ تیمور نے سمیٹ کر دیکھا۔ بہ ظاہر یہ کسی سرمایہ کاری کے کاغذات تھے۔ یہ معاہدہ ... تھا جو چاند بھائی اور تین دوسرے افراد کے درمیان ہوا تھا۔ ان لوگوں نے چاند بھائی کو مجموعی طور پر ڈھائی کروڑ کی رقم دی تھی جو چاند بھائی اپنے بزنس میں لگاتا اور ان تینوں کو ان کے شیئرز کے تناسب سے منافع دیتا۔ معاہدہ سال بھر پہلے ہوا تھا۔ سوائے کاغذات کے انہوں نے اور کسی چیز کو نہیں چھیڑا تھا۔

”مجھے تو یہ پولیس کیس لگ رہا ہے۔“

”اتنی جلدی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”پہلے ہمیں دادا جان کو بتانا ہوگا۔“

”دادا جان۔“ شامی نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”اگر دادا جان کو بتایا تو باقی ان کو خود پتا چل جائے گا۔“

”ان کو کیسے پتا چل سکتا ہے۔ لیکن ابھی تو ان سب کو اٹھانا پڑے گا۔“

”ایسا کر تو انہیں اٹھا اور میں جاتا ہوں کافی بنانے... تو جانتا ہے، میں کتنی بھیانک کافی بناتا ہوں۔ پی کر بندہ کیا، مردہ بھی جاگ اٹھے۔“

منصور تو پانی کے ایک ٹھنڈے گلاس سے منہ دھو کر اٹھ گیا تھا، اصل مرحلہ نوشی اور زومی کو اٹھانے اور پھر ان کے حواس بحال کرنے میں پیش آیا۔ تلخ اور گرم کافی پی کر وہ صحیح معنوں میں جاگے تو شامی اور تیمور نے صورتِ حال ان کے سامنے رکھی۔ زومی اور منصور یہ سن کر ہی بدحواس ہو گئے تھے جبکہ نوشی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اس طرح زبردستی جگائے جانے پر برہم تھی۔ اس نے شامی سے کہا۔ ”یہ بات تم صبح بھی تو بتا سکتے تھے۔“

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے یہ پولیس کیس لگ رہا ہے اور شاید ابھی پولیس کو بلانا پڑے۔“

شامی محبت خان کو اٹھا لایا۔ وہ عمارت کے عقبی حصے میں واقع اپنی کوٹھری میں سو رہا تھا۔ کمرا دیکھ کر وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ ”یہ کیا اے صیب... ابی یہ صیب کدر گیا؟“

”یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ تیمور نے پوچھا۔ ”دیکھو یہ کھڑکی کھلی ہے اور آنے والا یا والے اسی کھڑکی سے اندر آئے۔ انہوں نے چاند بھائی کے ساتھ کچھ کیا۔“

”کیا کیا صیب؟“

”مثلاً مرڈر۔“ شامی نے جواب دیا۔

”مرڈر۔“ زومی سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”جیسا کہ نظر آ رہا ہے۔“

”آپ کا مطلب اے کوئی ادر کڑکی سے اندر آیا... صیب کا مرڈر کیا اور لاش لے گیا؟“ محبت خان نے صورتِ حال کو چند لفظوں میں بیان کیا۔

”میرا خیال ہے ایسا ہی ہوا ہے۔“ شامی بولا۔ ”تم کب اپنے کمرے میں گئے تھے؟“

”کوئی دس بجے۔“ محبت خان نے کہا۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل نے محبت خان کے کوٹھری میں جاتے ہی اپنا کام دکھا دیا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی سے اندر آیا اور کسی خاموش طریقے سے چاند بھائی کو قتل کیا اور پھر اس کی لاش لے کر غائب ہو گیا۔ مگر تیمور کے خیال میں کئی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ اول تو خون صرف فرش اور بساط پر پڑا تھا اور باقی جگہوں پر نہیں تھا۔ اس طرح کمرے میں صرف چاند بھائی کے بیگ کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ بیڈ صاف ستھرا تھا۔ کھڑکی اور اس کے آس پاس بھی کسی قسم کی کشمکش کے آثار نہیں تھے۔ انہوں نے کمرا جوں کا توں بند کیا اور نشست گاہ میں آ گئے۔ شامی نے محبت خان سے چائے بنانے کو کہا۔ آوازیں سن کر جوجی جاگ گیا اور یہ سن کر وہ اچھل پڑا کہ یہاں ایک ممکنہ قتل ہو گیا ہے۔

ماحول گمبھیر تھا اور سب پریشان تھے۔ صرف شامی اور تیمور کسی قدر مطمئن نظر آ رہے تھے وہ اس قسم کے حالات کے عادی تھے۔

”ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔“ منصور نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے چاند بھائی کو اغوا کیا گیا ہے۔“

”اغوا... وہ کیوں؟“ تیمور بولا۔

”دولت مندوں کو آج کل کیوں اغوا کیا جاتا ہے؟“ منصور نے سوال کیا۔ محبت خان چائے بنا کر لے آیا تھا پھر وہ شامی کی ہدایت پر پوری عمارت کی کھڑکیوں اور دروازوں کا جائزہ لینے چلا گیا۔ نوشی نے منہ بنایا اور کھڑی ہو گئی۔

”میں سونے جا رہی ہوں، مہربانی کر کے مجھے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

نوشی چلی گئی اور وہ چائے پینے لگے۔ زومی اور منصور پریشان تھے کہ وہ اتنے سکون سے کیوں بیٹھے ہیں۔ زومی نے کہا۔ ”تم پولیس کو انفارم کیوں نہیں کرتے؟“

”کرتے ہیں مس زومی۔“ تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ذرا ہمیں خود بھی تفتیش کرنے دو۔“

”یہ بتاؤ کہ چاند بھائی کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی؟“

”اگر تھی تب بھی ہمیں نہیں معلوم۔“ منصور نے جواب دیا۔

”ہمیں۔“ تیمور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم زومی کی طرف سے بھی جواب دے رہے ہو؟“

”وہ میرا مطلب ہے... ہم چاند بھائی کو اتنا ہی جانتے ہیں۔“

”چاند بھائی یہاں آتے ہوئے اتنا خوف زدہ کیوں تھا؟“

”یہ بھی ہم نہیں جانتے۔“

”کوئی بات نہیں۔ جو تم نہیں جانتے، وہ پولیس جان لے گی۔ ہماری پولیس کو تو تم جانتے ہو، پتھر کے مجسمے سے اعترافِ جرم کرا لیتے ہیں۔“ شامی نے کہا تو ان دونوں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ محبت خان نے آ کر رپورٹ دی کہ سوائے چاند بھائی کے کمرے کی کھڑکی کے باقی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔

”ٹھیک ہے تم باہر رہو اور کوئی مشکوک فرد آس پاس نظر آئے تو ہمیں بتانا۔“ شامی نے اسے ہدایت کی۔ ”اپنی گن نکال لو۔“

محبت خان عقبی طرف سے گیا تھا۔ کچن سے باہر جانے والے دروازے کی چابی اس کے پاس تھی۔ وہ اسی طرف سے اندر آتا جاتا تھا۔ شامی تیمور کو ایک طرف لایا۔ ”مجھے دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔“

”اور مجھے صرف کالا نظر آ رہا ہے۔“ تیمور بولا۔ ”یہ دونوں کچھ جانتے ہیں جو چھپا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”سب سے پہلے تو چاند بھائی کے کمرے کی ایک بار پھر تلاشی لینی چاہیے۔ ممکن ہے وہاں سے کوئی کام کی چیز مل جائے جس سے اس کی پُراسرار گمشدگی پر روشنی پڑے۔“

”فرض کرو اگر ایسی کوئی چیز مل جاتی ہے پھر...؟“

”پولیس سے پہلے دادا جان کو مطلع کرنا لازمی ہوگا۔ پھر وہ جو ہدایات دیں ان پر عمل کرنا ہوگا۔“

وہ چاند بھائی کے کمرے میں آئے۔ سوائے کاغذات کے تمام چیزیں ویسی ہی پڑی تھیں۔ کاغذات انہوں نے فائل میں کر کے دوبارہ بیگ میں رکھ دیے تھے۔ شامی نے اس بار بیگ کی ذرا تفصیل سے تلاشی لینے کے لیے اسے اٹھایا تو اس کے نیچے سے کاغذ کا ایک چھوٹا پرزہ نکلا۔ تیمور نے پرزہ اٹھایا، اس پر ایک سطر میں لکھا تھا۔

”تم ہماری نظروں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ بہتر ہوگا ہمارا مطالبہ مان لو... ورنہ...“

”یہ تو کسی نے دھمکی دی ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”اور شاید چاند بھائی کو ہی دی ہے۔“ شامی نے کہا۔ ”اس کے بعد سے وہ غائب ہوا ہے یا کیا گیا ہے۔“

”اس رقعے سے ثابت ہوتا ہے اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ میرا خیال ہے، اب ہمیں دادا جان سے بات کر لینی چاہیے۔“

”یہاں موبائل سگنل نہیں آتے۔“

”چھت پر آتے ہیں۔“ تیمور نے کہا اور رقعہ واپس اسی جگہ رکھ دیا۔ ”اس پر بیگ رکھ دو... باقی کام پولیس پر چھوڑ دو۔“

وہ باہر آئے، سیڑھیاں لاؤنج کے پاس تھیں مگر جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئے وہاں انہوں نے دو مسلح افراد کو موجود پایا۔ انہوں نے چہروں پر رومال لپیٹ رکھے تھے۔ شامی اور تیمور کچھ دیر کے لیے ششدر رہ گئے پھر شامی نے سنبھل کر کہا۔ ”کون ہو تم اور اندر کیسے آئے؟“

”ادھر چلو۔“ ان میں سے ایک بولا۔ وہ انہیں نشست گاہ میں لے آئے جہاں ایک مسلح آدمی اور موجود تھا اور اس

نے باقی سب کو ہینڈز اپ کرا رکھا تھا۔ جوجی صوفے پر سہما بیٹھا تھا لیکن زومی کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ منصور اس الو کی طرح آنکھیں جھپکا رہا تھا جسے دن میں باہر نکال دیا گیا ہو۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہا۔

''یہ لوگ اچانک ہی اندر گھس آئے۔''

''تم لوگوں نے ہمارے چوکیدار کے ساتھ کیا کیا ہے۔'' شامی کو محبت خان کی فکر لگ گئی تھی۔ اسے خیال آیا تھا کہ یہ لوگ اندر کیسے آئے کیونکہ چابی صرف محبت خان کے پاس تھی۔

''اس کی فکر مت کرو، وہ آرام سے سو رہا ہے۔ صبح تک جاگ جائے گا۔'' اسی شخص نے کہا جو پہلے بولا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی خاموش تھے۔ ''ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے... صرف چاند بھائی کو لے جانے آئے ہیں۔''

شامی اور تیمور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شامی بولا۔ ''اگر اب تم اسے لینے آئے ہو تو وہ کون تھے جو اسے لے گئے ہیں... زندہ یا مردہ۔''

وہ آدمی چونکا۔ ''زندہ یا مردہ... کیا مطلب؟''

''مطلب سمجھنے کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ چاند بھائی کے کمرے تک چلنا پڑے گا۔''

وہ تینوں ایک جیسی سیاہ پتلون اور سیاہ رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ منہ پر رومال باندھ کر انہوں نے سر پر سیاہ رنگ کی ہی ہلکی گرم ٹوپیاں چڑھا رکھی تھیں۔ یہ حلیہ مری کے موسم کی مناسبت سے ٹھیک تھا۔ بولنے والا غرایا۔ ''بکواس مت کرو... سیدھی طرح بتاؤ چاند بھائی کہاں ہے؟''

''اسے تم لوگ ہی تو اغوا کر کے لے گئے ہو۔'' زومی ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''اب ہم سے پوچھ رہے ہو وہ کہاں ہے؟''

نقاب پوش نے زومی کی طرف دیکھا۔ ''خاتون! اپنا والیم کم رکھو ورنہ اسے کسی اور طریقے سے کم کرنا پڑے گا۔''

''تمہیں شاید یقین نہیں آ رہا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے چاند بھائی اپنے کمرے سے غائب ہو گیا اور ہم اس کے بارے میں پولیس کو بتانے جا رہے تھے۔''

تیمور نے سر ہلایا۔ ''کہ تم لوگ آن ٹپکے... یہ بتاؤ کہ چاند بھائی کے پیچھے تمہارے علاوہ بھی کوئی پارٹی ہے؟''

اس اچانک سوال پر نقاب پوش نے غیر ارادی طور پر نفی میں سر ہلایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''بکو مت... چاند بھائی کا کمرا دکھاؤ۔''

نقاب پوش باقی سب کو وہیں چھوڑ کر صرف شامی کو چاند بھائی کے کمرے تک لایا۔ اس نے کمرے کا بہ غور معائنہ کیا پھر خون دیکھا۔ ''یہ خون ہے۔''

''اچھا... ہم تو لال شربت سمجھ رہے تھے۔'' شامی نے ایک طرف پڑی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ نقاب پوش نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کی نظر شطرنج کی بساط پر لگی تھی پھر اس نے شامی سے کہا۔

''یہ شطرنج چاند بھائی کی ہے؟''

''ظاہر ہے کیونکہ ہم میں سے کسی کو شطرنج کا شوق نہیں ہے۔''

نقاب پوش نے نیلا شاہ اٹھا کر اپنی جگہ رکھا اور بولا۔ ''شہ مات۔''

شامی نے دیکھا، سنہری شاہ کو مات ہو رہی تھی۔ لیکن عین موقع پر گڑبڑ ہو گئی۔ اچانک نقاب پوش کے منہ سے گالی نکلی۔ ''حرامزادہ۔''

شامی کو غصہ آ گیا۔ ''دیکھو تم مسلح ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ...''

''نواب زادہ صاحب! میں نے تمہیں نہیں چاند بھائی کو گالی دی ہے۔'' نقاب پوش بولا اور اسے لے کر واپس نشست گاہ میں آیا جہاں اس کے ساتھی پوری طرح چوکس کھڑے تھے۔ لیکن ان کے شریفانہ رویے سے جوجی، منصور اور زومی کسی قدر مطمئن تھے۔ نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''نکلو یہاں سے...''

''لیکن...'' ان میں سے ایک پہلی بار بولا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' وہ دہاڑا۔ ''چلو یہاں سے۔''

نقاب پوش نے جانے سے پہلے ان لوگوں کو خبردار کیا۔ ''دس منٹ تک کوئی عمارت سے نہ نکلے ورنہ اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہو گا۔ تم لوگ چاہو تو پولیس سے ہمارا ذکر کر سکتے ہو۔''

''شکریہ، ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔'' تیمور نے جواب دیا۔ وہ تینوں باہر نکل گئے۔ شامی نے باہر جانا چاہا لیکن تیمور نے اسے روک دیا۔ ''دس منٹ بعد... یہ لوگ خطرناک ہیں۔''

خود شامی کو بھی یہ لوگ خطرناک لگے تھے۔ نوشی دریافت ہو جاتی مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔ دس منٹ بعد شامی اور تیمور نے باہر جا کر دیکھا۔ محبت خان اپنی کوٹھری کے سامنے

بے بس پڑا تھا، انہوں نے اسے اس وقت قابو کیا جب وہ رائفل لے کر باہر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن وہ حرکت نہیں کر پا رہا تھا اور نہ بول پا رہا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر لے آئے۔ بہ ظاہر اس کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ شامی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اسے کوئی دوا دی گئی ہے۔''

''کچھ سونگھایا بھی جاسکتا ہے۔''

''اس صورت میں اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا۔''

کچھ دیر میں محبت خان کی حالت سدھری تو اس نے انکشاف کیا۔ ''کسی خنزیر کا بچہ نے ام کو کرنٹ لگایا۔''

''کرنٹ... وہ کیسے؟'' شامی نے کہا۔

''یار! آج کل ہمارے بھی ایسے آلے ملنے لگے ہیں جو کرنٹ مارتے ہیں، باہر کے ملکوں میں پولیس استعمال کرتی ہے۔''

محبت خان جیسے ہی اپنی کوٹھری سے رائفل لے کر نکلا کسی نے اس کی گردن سے کچھ لگایا اور اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا۔ کچھ دیر تو اسے ہوش ہی نہیں رہا اور جب ہوش آیا تب بھی وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

انہوں نے آس پاس دیکھ لیا تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ تینوں اگر کسی گاڑی میں آئے تھے، اسے انہوں نے پل کے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ تیمور نے چھت پر جا کر موبائل سے وقار ولا کال کی۔ کال نظام دین نے ریسیو کی اور بڑی مشکل سے اسے نواب صاحب تک ٹرانسفر کرنے پر راضی ہوا۔ نواب صاحب گہری نیند سے اٹھے تھے اس لیے کسی قدر جھنجلا گئے۔ ''برخوردار! یہ کون سا وقت ہے کال کرنے کا...؟''

دادا حضور! معاملہ ہنگامی ہے اور آپ کے علم اور راہنمائی کا متقاضی ہے۔'' تیمور نے نہایت احتیاط سے کسی قدر گاڑھی اردو میں کہا۔ اس وقت وہ انگریزی کا کوئی لفظ بول کر نواب صاحب کو مزید مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ارشاداتِ عالیہ کے بعد نواب صاحب اس کی بات سننے پر آمادہ ہوگئے۔ بات سن کر انہوں نے مزید بہت کچھ فرمایا۔ جب غصہ کسی قدر سرد ہوا تو بولے۔ ''ہم علاقے کے ایس ایس پی سے رابطہ کررہے ہیں، وہ خود آگے معاملہ دیکھ لے گا۔ آپ لوگ پولیس سے تعاون کریں... ہاں، وہاں اور کون ہے؟''

''جوجی اور نوشی بھی ہیں لیکن یہ ہمارے بعد آئے تھے۔'' تیمور نے شامی کو بچا کر کہا۔

''ٹھیک ہے انہیں پولیس کی آمد سے پہلے وہاں سے نکال دیں۔''

''اتنی رات گئے...؟''

''کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیں۔'' نواب صاحب خفگی سے بولے۔ ''کیا آپ اپنی عقل یہیں چھوڑ گئے ہیں... اور خود کو بیان تک محدود رکھیں۔ اس سے آگے اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جی دادا جان۔'' تیمور نے گلوخلاصی ہونے پر سکون کا سانس لیا۔ نیچے آکر اس نے شامی سے کہا۔ ''نوشی کو اٹھاؤ۔ دادا جان نے کہا ہے کہ پولیس کی آمد سے پہلے نوشی اور جوجی کو یہاں سے چلتا کرو۔''

''وہ اس وقت کہاں جائیں گے؟'' شامی نے وہی سوال کیا۔

''کسی ہوٹل میں۔'' تیمور نے بھی نواب صاحب والا جواب دیا۔ ''اپنی عقل کیا ولا میں چھوڑ آئے ہو؟''

شامی نوشی کو اٹھانے چلا گیا اور جوجی نے سنا کہ اسے نوشی کے ساتھ جانا ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا، وہ میری بے عزتی کرتی ہیں۔''

''تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔'' تیمور نے روانی میں کہا، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ جوجی اچھلا۔

''کیا مطلب جی، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میرے ابا جی ضرور بدمعاشی کرتے ہیں لیکن میں شریف آدمی ہوں۔''

''اچھا یار! تم شریف ہو... لوگ تو تمہارے ابا جی کو بھی شریف کہتے ہیں۔ لیکن نوشی کے ساتھ جانا پڑے گا ورنہ...''

''ورنہ کیا جی؟''

''ورنہ پولیس لے جائے گی... پولیس تو تمہیں کچھ نہیں کہے گی لیکن پھر بات جائے گی تمہارے ابا جی تک، اس کے بعد...''

''میں نوشی باجی کے ساتھ جارہا ہوں۔'' جوجی نے فوراً یوٹرن لیا۔

نوشی نیند سے اٹھائے جانے پر جھنجلائی ہوئی تھی۔ ''پولیس... جہنم میں جائے... پاپا ایک کال کریں گے...''

''مجھے معلوم ہے تمہارے پاپا کتنی بڑی توپ ہیں لیکن یہ دادا جان کا حکم ہے۔ اب اپنا سامان سمیٹو اور کسی ہوٹل میں جا کر رکو۔''

نوشی بادلِ ناخواستہ تیار ہوئی لیکن جیسے ہی اسے پتا چلا کہ اسے جوجی کے ساتھ رکنا ہے تو اس نے انکار کر دیا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو، لوگ مجھے کیا سمجھیں؟'' وہ بھڑک کر بولی۔

''کچھ نہیں سمجھیں گے۔'' شامی نے اسے تسلی دی۔ ''اول تو دو الگ کمرے لینا اور اگر نہ ملیں تو جوجی کو بھائی بنا لینا ویسے ہے تو تمہارا چھوٹا بھائی۔''

نوشی بڑی مشکل سے مانی تھی۔ شامی ان کو کمرا دلانے کے لیے لے کر گیا۔ نوشی اپنی کار لے گئی تھی شامی اپنی منی سفاری میں گیا۔ پیچھے تیمور رہ گیا زومی اور منصور کو رٹانے کے لیے کہ انہیں پولیس کو کیا بیان دینا ہے۔

شامی واپس پہنچا تو تیمور کے ساتھ زومی اور منصور کے منہ بنے ہوئے تھے۔ منصور اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

''ہم پولیس سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے... تم ان دونوں کو کہاں لے گئے ہو؟''

''اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔'' شامی نے بدمعاشوں کی طرح غرا کر کہا۔ ''اگر تم نے وہ نہیں کہا جو ہم کہہ رہے ہیں تو پھر ہم پولیس کو وہ کہیں گے جو تمہیں پسند نہیں آئے گا۔''

منصور اور زومی فکرمند نظر آنے لگے۔ ''تم کیا کہو گے پولیس کو؟''

''ہم کہیں گے کہ چاند بھائی کو تم دونوں پھانس کر لائے تھے اور تم ہی اس کی گمشدگی اور ممکنہ قتل کے ذمے دار ہو۔ یہاں کا ایس ایس پی دادا جان کو اچھی طرح جانتا ہے اس لیے پولیس ہماری بات پر اعتبار کرے گی اور تمہیں لے جائے گی۔''

''تمہیں بھی پتا چل جائے گا کہ ہماری پولیس کس طرح تفتیش کرتی ہے۔ آج تک تم نے صرف ڈراموں میں دیکھا ہوگا۔'' تیمور بولا۔

تیمور اور شامی نے مسلسل بول کر ان کا حوصلہ پست کر دیا اور وہ مان گئے کہ پولیس کو وہی بیان دیں گے جو تیمور نے انہیں بتایا تھا۔ شامی نے سر ہلایا۔ ''شاباش، اسی میں تمہاری بچت ہے۔''

''میرا خیال ہے چاند بھائی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ اس کے دشمن ہوں گے۔'' تیمور نے کہا۔ ''ایسے دشمن جو اس سے اپنا کوئی حساب برابر کرنا چاہتے ہوں یا کوئی بات منوانا چاہتے ہوں۔ تم دونوں کو یقیناً معلوم ہے لیکن تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ چاند بھائی کے یہ دشمن تمہارا اپنا بھی صاف کر سکتے ہیں، چاند بھائی کے ساتھ۔''

تیمور کی بات سن کر ان دونوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ محبت خان اب بالکل ٹھیک تھا اور ان لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے بے چین بھی تھا جنہوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ وہ جب ان کے پاس آتا جاتا تو لازمی اعلان کرتا تھا۔ ''ام ان کو چوڑے گا نہیں۔''

''تم فکر مت کرو وہ ملے تو تم ہرگز مت چھوڑنا۔'' شامی نے اسے تسلی دی۔

پولیس ایک گھنٹے بعد آئی تھی۔ ایس ایس پی کی طرف سے براہِ راست حکم آنے کے بعد پولیس پارٹی اس طرح مستعد تھی ایک درجن پولیس والے آتے ہی عمارت کے چاروں طرف پھیل کر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ پارٹی کی قیادت ایک کام چور قسم کا انسپکٹر کر رہا تھا... ''ہمیں ایس ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ آپ یقیناً شامیر صاحب اور تیمور صاحب ہیں۔'' اس نے زبردستی ان سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ فکر ہی نہ کرو، بندہ اور مجرم بچ کر جا ہی نہیں سکتے۔''

''ہاں تم لوگوں سے بچ کر کون جا سکتا ہے۔'' شامی نے طنز کیا۔ ''ویسے بندہ نارمل قد و قامت کا تھا۔ کوئی بونا نہیں تھا۔ یہ تمہارے آدمی گڑھوں اور پودوں کے پیچھے کیا تلاش کر رہے ہیں؟''

وہ شرمسار ہوئے بغیر بولا۔ ''اوہ جی، گمشدہ بندے کا کچھ پتا نہیں کہاں پایا جائے۔ خود میرا ماما گم ہوگیا تھا۔ دو دن تلاش کیا۔ دو دن بعد اپنی منجی کے نیچے سے نکلا۔''

انسپکٹر صورت اور باتوں سے دیہاتی لگتا تھا لیکن تیس سال کی سروس کے بعد اسے واردات کی تفتیش کے طریقے آگئے تھے۔ اس نے چاند بھائی کے کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا پھر کھڑکی کے باہر کی زمین کا جائزہ لیا۔ بیگ کے نیچے سے برآمد ہونے والے رقعے کو اس نے غور سے دیکھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی اس نے زومی میں لی تھی اور تقریباً آدھے گھنٹے اس کا انٹرویو لیتا رہا۔ تین گھنٹے بعد وہ کمرے کو سیل کر کے روانہ ہوگیا۔ اس نے تفتیش کے نتائج سے شامی اور تیمور کو آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ نہ اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی خاص نتیجے پر پہنچا ہے۔ چاند بھائی کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ بندہ اب فوت ہوگیا ہے اور جلد یا بدیر اس کی لاش کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی۔

زومی اور منصور پولیس کو نمٹاتے ہی سونے کے لیے چلے گئے تھے کیونکہ انسپکٹر کو اوپر سے ہدایت دے کر بھیجا گیا تھا اس لیے وہ سب سے نہایت شرافت سے پیش آیا تھا۔ ایف آئی آر اس نے منصور کی مدعیت میں کاٹی تھی۔ اگرچہ وہ

اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن شامی اور تیمور نے زبردستی اسے آگے کر دیا۔ اس نے شور بھی مچایا کہ چاند بھائی سے صرف اس کا بزنس کا تعلق ہے، وہ مدعی نہیں بن سکتا لیکن شامی نے انسپکٹر کو اشارہ کیا تو اس نے بھی منصور کو مدعی بنا کر رپورٹ لکھ لی۔ تیمور اس معاملے سے بیزار ہو گیا تھا۔ لیکن شامی اب فکر مند تھا۔ اس نے تیمور سے کہا۔ ''یار! ہمیں اس معاملے کو ایسے ہی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ کچھ لوگ اس طرح دندناتے ہوئے ہمارے گھر میں گھس آئیں۔ ایک بندہ غائب کر دیں یا قتل کر دیں اور پھر آ کر ہمیں بھی گن پوائنٹ پر دھمکائیں۔ آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد ایسی باتوں پر کٹ مرتے تھے۔''

تیمور نے پھر جماہی لی۔ ''لگتا ہے تو آباؤ اجداد میں شامل ہونے کے لیے زیادہ ہی بے قرار ہے۔ تیری مرضی بھائی، میں تو سونے جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

جوجی سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ نئی جگہ تھی اور کچھ خوف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں چاند بھائی کو اغوا کرنے والے یہاں بھی نہ آ جائیں۔ وہاں تو بہت سارے لوگ تھے، یہاں وہ اکیلا کیا کرے گا؟ انہی فکروں میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور اب وہ پچھتا رہا تھا کہ نوشی کے ساتھ ایک کمرے میں رہ لیتا تو اکیلے پن کا خوف تو نہ ہوتا۔ ویسے نوشی بھی اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی۔ اس لیے رہنا تو اسے اکیلے ہی تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ صبح ہوتے ہی وہ واپس شامی اور تیمور کے پاس چلا جائے گا۔

اسے نیند تو نہیں آئی لیکن کچھ اور آنے لگا تھا۔ یہ دیر تک جاگنے کا منطقی نتیجہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ نہیں تھا اور واش رومز اس راہداری کے آخری سرے پر تھے جس میں اس کا کمرا تھا۔ جوجی کچھ دیر برداشت کرتا رہا لیکن جب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو اسے اٹھنا پڑا۔ وہ ہمت کر کے باہر آیا۔ باتھ روم کونے میں تھا اور اندر کئی واش رومز ایک ساتھ بنے ہوئے تھے۔ وہ ان میں سے ایک میں داخل ہوا اور اندر سے دروازہ بند کر کے کموڈ پر بیٹھ گیا۔ فطرت کی پکار کا جواب دے کر وہ اٹھ رہا تھا کہ اس نے واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور ایک سے زیادہ افراد اندر آئے۔ جوجی ساکت ہو گیا۔ اندر آنے والوں میں سے ایک بولا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ یہیں ہے؟''

''سو فیصد یقین ہے۔ کلرک نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ اسی کا ہو سکتا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ جوجی کا اب سانس بھی رک گیا تھا کیونکہ اسے اس آدمی کی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی جو نقاب پوش بن کر آیا تھا اور چاند بھائی کی تلاش میں تھا۔ پہلے والے کی آواز جوجی کے لیے اجنبی تھی۔

''اس کا مطلب ہے یہ اس... کا پلان تھا۔'' پہلے نے درمیان میں گالی فٹ کر کے کہا۔

''وہ صرف صورت سے احمق لگتا ہے لیکن ہے نہیں۔'' نقاب پوش بولا۔ ''وہ اسی فلور پر کمرا نمبر تین سو بارہ میں مقیم ہے۔''

''دیکھو، ہم یہاں کچھ نہیں کر سکتے اس لیے اس کی نگرانی جاری رکھو۔'' پہلا آدمی بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے اس کے سامنے والا کمرا لے لیا ہے۔ شفقت نیچے والے فلور پر ہے۔''

''میں دوسرے ہوٹل میں ہوں۔'' پہلے آدمی نے کہا اور ہوٹل کا نام اور اپنے کمرے کا نمبر بتایا۔ ''حالات میں کسی تبدیلی کی صورت میں مجھے فوراً بتانا اور یاد رکھنا، یہ ہاتھ سے نکلا تو...''

جوجی کو احساس نہیں ہوا کہ اس کے گھٹنے کانپ رہے ہیں اور اس کا دایاں گھٹنا دیوار سے لگا تو ہلکی سے آواز پیدا ہوئی۔ وہاں خاموشی تھی اس لیے یہ ہلکی سی آواز بھی ان دونوں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ نقاب پوش چوکنا ہو گیا۔ ''یہاں کوئی ہے۔''

جوجی نے پستول کے سیفٹی کیچ کی آواز سنی تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ان لوگوں نے اسے یہاں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا۔ قطار میں کل تین واش رومز تھے۔ وہ آخری میں تھا۔ باہر نکلتا تو ان لوگوں کا کام آسان ہو جاتا۔ وہ آنکھ بند کر کے بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں دبے قدموں پہلے واش روم تک آئے اور جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ آواز سن کر جوجی کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا لیکن آنکھ کھولنے پر اس نے اپنے واش رومز کا دروازہ بدستور بند پایا۔ اتنے میں وہ دونوں دوسرے واش روم کا دروازہ بھی کھول چکے تھے۔ اب کوئی امید باقی نہیں تھی۔ وہ اس آخری واش روم کا دروازہ کھولتے تو اسے پا کر وہیں لمبا لٹا دیتے، شاید ہمیشہ کے لیے کیونکہ وہ ان کی ساری باتیں سن چکا تھا۔ مگر عین اس وقت جب وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا ایک معجزہ ہو گیا۔

☆☆☆

نوشی سو رہی تھی مگر اجنبی جگہ اور پھر کسی قدر ٹینشن کی وجہ سے اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی آہستہ سے بول رہا ہو۔ آواز نوشی کو اپنے سرہانے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات ایسی تھی کہ وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیڈ کے سرہانے کا جائزہ لیا۔ نوشی نے ذرا اوپر ہو کر عقبی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار کے پار دوسرا کمرا تھا اور اس میں کوئی شخص مقیم تھا اور وہ اس وقت کسی سے بات کر رہا تھا۔ بولنے کا انداز دھیما تھا، اس کے باوجود آواز نوشی تک آ رہی تھی۔ نوشی نے جلد وہ سوراخ تلاش کر لیا جو دیوار میں آر پار تھا اور غالباً کچھ لٹکانے کے لیے دیوار میں کیل ٹھونکی گئی تھی مگر کیل نکل گئی تھی اور سوراخ رہ گیا تھا۔ آواز اسی سے آ رہی تھی، الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن جب نوشی نے کان لگائے تو الفاظ بھی سمجھ میں آنے لگے۔

''ان لوگوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے... ہاں کم سے کم ایک کو میں نے خود دیکھا ہے... لازمی بات ہے، ابراہیم کو بھی پتا چل گیا ہوگا... ہاں وہ اکیلا نہیں ہے۔''

نوشی نے چاند بھائی کی آواز پہچان لی۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ جسے وہ مردہ یا مغوی سمجھ رہے تھے، وہ یہاں ہوٹل میں مقیم تھا۔ اب وہ فون پر کسی کو بتا رہا تھا۔ ''مجھے ان کا پیغام مل گیا تھا... وہ مجھ پر کراچی سے نظر رکھے ہوئے ہیں... اس لیے میں ڈراما کر کے وہاں سے نکل گیا... ہاں، میں نے ایسا کیا جیسے مجھے قتل یا اغوا کر لیا ہو... لیکن انہوں نے دھوکا نہیں کھایا۔'' چاند بھائی کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''خیر، دیکھ لوں گا ان لوگوں کو... تم صبح تک یہاں پہنچ جاؤ... مجھے یقین ہے ہوٹل میں یہ کچھ نہیں کریں گے... یہ میرے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔'' چاند بھائی اس وقت اپنے مخصوص انداز کے بجائے عام اور تعلیم یافتہ انداز میں بات کر رہا تھا جبکہ ان کے سامنے وہ مخصوص قسم کے کاروباری اور کم تعلیم یافتہ آدمی کے انداز میں بات کرتا تھا۔

نوشی کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شامی اور تیمور پولیس کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ انہیں اس کی فوری اطلاع دینی تھی۔ نوشی بستر سے نکل آئی۔ اس نے جیکٹ اور جوتے پہنے اور باہر آئی۔ جوجی کا کمرا سامنے تھا اور اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر نہیں تھا۔ نوشی ایک لمحے کے لیے چکرائی کہ جوجی اس وقت کہاں چلا گیا پھر اسے خیال آیا کہ وہ واش روم گیا ہوگا۔ اس کے کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ نہیں تھا۔ نوشی اتنی بے تاب ہو رہی تھی کہ اس نے انتظار بھی نہیں کیا اور خود واش روم کی طرف چلی آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سامنے دو مردوں کو پا کر وہ جھجکی لیکن پھر اس نے انہیں نظر انداز کر کے جوجی کو آواز دی۔ ایک مرد نے دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی اپنا ہاتھ پشت پر کر لیا تھا جیسے کچھ چھپا رہا ہو۔ فوراً ہی جوجی آخری واش روم سے برآمد ہوا اور یوں باہر کی طرف لپکا جیسے کموڈ سے اچانک شیر نکل آیا ہو۔ جوجی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ نوشی کے پاس سے بھی گزر گیا اور واش روم کے باہر موجود دونوں افراد بھی ہکا بکا رہ گئے۔ نوشی کی موجودگی میں وہ جوجی کو روک بھی نہیں سکے تھے۔ نوشی اس کے پیچھے لپکی۔

''جوجی... ارے رکو۔''

مگر جوجی رکنے کے بجائے اس کے کمرے میں گھس گیا۔ نوشی اندر آئی تو وہ کمرے میں یوں چکر لگا رہا تھا جیسے جنگل سے تازہ تازہ لایا جانے والا جانور چڑیا گھر کے پنجرے میں ٹہلتا ہے۔ نوشی کے اندر آتے ہی اس نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''آج آپ... نے مجھے بچا لیا... ورنہ میرا مرڈر ہو جاتا...''

''وہ کیسے؟'' نوشی فکر مند ہو گئی۔

''وہ جو آپ نے باہر دو خطرناک آدمی دیکھے تھے وہ قاتل ہیں۔ میں نے اتفاق سے ان کی باتیں سن لیں۔ وہ چاند بھائی کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں انہیں یقین ہے چاند بھائی یہاں موجود ہے۔''

''آہستہ۔'' نوشی نے جوجی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''وہ منحوس شخص برابر والے کمرے میں موجود ہے اور میں نے اسے فون پر گفتگو کرتے سنا ہے۔ میں تمہیں لے جانے آئی تھی لیکن تم غائب تھے۔''

جوجی ابھی تک کانپ رہا تھا۔ ''نوشی باجی! یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جو چاند بھائی کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے منہ پر رومال باندھ کر۔ آپ پولیس کو کال کریں۔'' جوجی نے اسے ان دونوں کی باتیں بھی سنائیں۔

''پولیس کو کال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' نوشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم ان کے خلاف کیا کہیں گے؟''

''کم سے کم اسے تو پکڑوا سکتے ہیں جو خود غائب ہو کر یہاں چھپا بیٹھا ہے۔'' جوجی کا اشارہ چاند بھائی کی طرف تھا۔

''ہاں لیکن اس سے پہلے شامی اور تیمور کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ وہی فیصلہ کریں گے اب کیا کرنا ہے۔'' نوشی بولی۔ ''سنو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

جوجی فکر مند ہو گیا۔ ’’یہاں سے نکلے تو باہر وہ موجود ہوں گے اور مجھے تو وہ فوراً فوت کر دیں گے۔‘‘

یہ خیال نوشی کے ذہن میں بھی تھا۔ اس وقت اس نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب جوجی کی بات سن کر اسے وہ دونوں ہی خطرناک لگ رہے تھے۔ اگر ان میں وہ بھی تھا جو چاند بھائی کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے، نوشی نے انہیں نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھی اور انہوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن ابھی وہ جوجی کو تلاش کرتی ہوئی گئی تو انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا بھی باہر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لیکن انہیں جانا تو تھا وہ یہاں بھی نہیں رک سکتے تھے۔ اس کا خطرہ بھی تھا کہ وہ ان کے کمرے میں گھس آئیں۔ نوشی نے سوچا اور پھر انٹر کام اٹھا کر نیچے سروس کال کی۔

’’کمرا نمبر تین سو گیارہ میں دو کافی بھجوا دیں۔‘‘

جوجی بھنا گیا۔ ’’آپ کو نکلنے کے بجائے کافی کی پڑی ہے۔‘‘

’’تم ذرا خاموش ہو کر بیٹھو۔‘‘ نوشی نے کہا اور دوبارہ انٹر کام اٹھا کر تین کافی کا آرڈر کمرا نمبر تین سو بارہ کے لیے دیا۔ جوجی اچھل پڑا۔

’’یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟‘‘

’’جوجی! اپنی چونچ بند رکھو۔‘‘ نوشی نے کہا اور تیسری بار کمرا نمبر تین سو دو کے لیے دو چائے اور دو کافی کا کہا۔ جوجی سخت پریشان ہو گیا۔

’’نوشی باجی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟‘‘

’’یہاں سے نکلنے کی تدبیر کر رہی ہوں۔‘‘ نوشی نے کہا۔ ’’دیکھو، میں نے آرڈر ایک ساتھ دیے ہیں۔ لازمی بات ہے اوپر کم سے کم تین ویٹر آئیں گے اور خاصا ہجوم ہو جائے گا۔ ہم اسی ہجوم کی آڑ میں نکل جائیں گے۔‘‘

جوجی کی تسلی نہیں ہوئی۔ ’’اگر اس کے باوجود انہوں نے روکنے کی کوشش کی...؟‘‘

’’تب کی تب دیکھی جائے گی۔ اب تم تیار رہو۔‘‘

جوجی تیار ہی تھا۔ اس کا سامان اس کے کمرے میں پڑا تھا لیکن وہ بہر حال جان سے بڑھ کر نہیں تھا اس لیے جوجی کو خیال بھی نہیں آیا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر یہ لوگ پیچھے آئے تو کیا ہوگا؟ اتفاق سے تینوں ویٹر ساتھ آئے۔ سب نے الگ الگ ٹرے اٹھا رکھی تھیں۔ جیسے ہی نوشی کے کمرے پر ویٹر نے دستک دی، نوشی نے جوجی کو اشارہ کیا اور وہ ایک ساتھ باہر آئے۔ نوشی نے دروازہ لاک کیا اور جوجی کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چل پڑی۔ کافی لانے والا ویٹر ہکا بکا رہ گیا پھر ان کے پیچھے لپکا۔ ’’آپ نے تو کافی منگوائی تھی۔‘‘

’’ہاں، اب موڈ بدل گیا ہے۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔‘‘ نوشی نے رکے بغیر کہا تو ویٹر بھی بڑبڑاتا ہوا ان کے پیچھے آنے لگا۔ اس دوران میں چاند بھائی اور اس کے دشمن دوسرے ویٹروں سے الجھ رہے تھے کہ انہوں نے کوئی آرڈر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے نوشی اور جوجی کو نکلتے دیکھ لیا تھا لیکن تین ویٹروں کے ہوتے ہوئے وہ انہیں روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ باہر آتے ہی نوشی نے پارکنگ میں کھڑی اپنی فراری کو ریموٹ سے ان لاک کیا اور اندر گھس گئی۔ جوجی دوسری طرف سے اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ اس نے شیشہ بجا کر فریاد کی۔

’’مجھے کہاں چھوڑے جا رہی ہیں؟‘‘

نوشی نے دروازہ کھولا۔ ’’کاش کہ میں تمہیں چھوڑ جاتی لیکن تم ان دشمنوں کو سیدھا وہیں لاتے اس لیے ساتھ لے جا رہی ہوں۔‘‘

’’آپ کا بس چلے تو واقعی ایسا ہی کریں۔‘‘ جوجی نے خفگی سے کہا۔ ’’آئندہ میرے باپ کی توبہ جو کہیں اس جگہ گیا جہاں آپ بھی موجود ہوں۔‘‘

نوشی نے تیزی سے گاڑی نکالی۔ اسے مال روڈ سے ہٹ کر گزرنا تھا اس لیے عقبی گلیوں میں چکرا رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ لوگ پیچھے نہ آئیں، لازمی بات ہے ان کے پاس بھی گاڑی ہوگی اور ان پیچیدہ راستوں پر فراری کی اسپیڈ نوشی کے کام نہیں آسکتی تھی۔ نیچے آتے ہی اس نے رفتار تیز کی۔ جوجی پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ عقب میں روشنی لہرائی تو اس نے بے ساختہ کہا۔ ’’وہ آرہے ہیں۔‘‘

’’فکر مت کرو، وہ اب ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔‘‘ نوشی نے کہا۔ اس دوران میں وہ مین روڈ پر نکل آئے تھے، اب انہیں عمارت تک جانا تھا۔ گھوم کر جانے کی وجہ سے یہ فاصلہ کوئی تین کلومیٹرز بنتا تھا ورنہ پیدل مسافت ایک کلومیٹر سے بھی کم تھی۔ بہر حال، ابھی تو وہ فرار ہو رہے تھے اور دو ٹانگوں کی نسبت چار پہیوں پر فرار بہتر ہی ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد وہ عمارت کے سامنے تھے۔ جوجی نے اتر کر یوں دروازہ پیٹنا شروع کر دیا جیسے بدمعاش پیچھے پیچھے وہاں تک آگئے ہوں۔ محبت خان نے یہ شور سن لیا تھا اور وہ سمجھا کہ بدمعاش دوبارہ آگئے ہیں۔ وہ دوسری طرف سے خاموشی سے آیا اور جوجی کی گردن دبوچ لی۔ ’’خانہ خراب! اب ام تم بچ کر نہیں جائے گا۔‘‘

جوجی کی سانس رک گئی۔ وہاں اندھیرا تھا اس لیے محبت خان کو نظر نہیں آیا وہ تو نوشی آگئی اور اس نے جوجی کی گردن چھڑوائی۔ ’’محبت خان! یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘

اس نے بوکھلا کر جوجی کو چھوڑ دیا۔ ’’صیب! یہ آپ اے... ابی ام کو مافی دو... ام آپ کو فوت کرنے کا کوشش کیا۔‘‘

’’شکر ہے آپ آگئیں ورنہ ان سے بچ کر آگیا لیکن یہاں مارا جاتا۔‘‘ جوجی نے گردن مسلتے ہوئے کہا۔ محبت خان عقبی راستے سے انہیں اندر لے آیا۔ شامی اور تیمور کے بارے میں اس نے بتایا۔

’’وہ تو سو رہے ہیں۔‘‘

نوشی نے محبت خان سے کہا۔ ’’ہوشیار رہو اور تمام دروازے اندر سے بند کر لو۔‘‘

محبت خان ہوشیار ہو گیا۔ ’’خطرے کا بات اے بی بی؟‘‘

’’ہاں جو لوگ پہلے آئے تھے، وہ دوبارہ حملہ کر سکتے ہیں۔‘‘ نوشی نے بیڈ رومز کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے باری باری شامی اور تیمور کے کمروں کا دروازہ بجا کر انہیں اٹھایا۔ دونوں ہی بھنائے ہوئے نکلے۔ شامی نے غرا کر کہا۔

’’اتنی جلدی کیا تھی... صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے وہاں...؟‘‘

’’ضرور کر سکتے تھے لیکن اس صورت میں تمہیں کل صبح وہاں ہماری لاشیں ملتیں۔‘‘ نوشی نے جوابی غراہٹ کے ساتھ کہا۔ شامی کا موڈ آف رہا لیکن تیمور کا ماتھا ٹھنکا۔

’’کیا مطلب... کیا ہوا وہاں؟‘‘

’’مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ دیر میں وہ لوگ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے خود یہاں آکر تمہیں سب بتائیں گے۔‘‘ نوشی نے طنز کیا۔

’’کون لوگ؟‘‘

’’وہی جو پہلے بھی آئے تھے اور چاند بھائی کا پوچھ رہے تھے۔‘‘

’’وہ تمہیں کہاں مل گئے؟‘‘

جوجی، نوشی کے انداز پر جھنجلا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ’’آپ بتا کیوں نہیں دیتیں؟‘‘

’’ان کو اپنی اہمیت جتانے کا موقع مل رہا ہے۔‘‘ شامی نے سر ہلایا۔ ’’خیر، ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے، ان کے پیچھے آنے والے بتا ہی دیں گے۔‘‘

’’وہ سب کو ٹھنڈا کر دیں گے۔‘‘ جوجی بولا۔ ’’بہت خطرناک قاتل ہیں جی۔‘‘

منصور اور زومی اس شور سے جاگ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پھر کسی نے حملہ کیا ہے لیکن نوشی اور جوجی کو دیکھ کر وہ دوبارہ سونے چلے گئے۔ تیمور نے انہیں اٹھانا مناسب نہ سمجھا، وہ سب نشست گاہ میں آگئے۔ آج نیند ان کے نصیب میں نہیں تھی۔ محبت خان نے تمام دروازے اور کھڑکیاں ایک بار پھر چیک کیں، وہ رائفل سمیت عمارت میں آگیا تھا۔ اس نے ان کے لیے چائے بنائی۔ اس دوران میں جوجی اور نوشی نے انہیں اپنی آپ بیتی سنائی۔ چاند بھائی کے زندہ سلامت ہونے کا سن کر وہ حیران ہوئے لیکن اس کے دشمنوں کے عزائم کا سن کر وہ پریشان بھی ہو گئے۔ شامی نے کہا۔ ’’میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ چاند بھائی ایک نمبر کا چکر باز ہے۔‘‘

’’وہ کسی کے ساتھ چکر چلا کر بھاگا ہے اور یہاں آگیا۔‘‘ تیمور نے کہا۔

’’یہ دونوں احمق سمجھ رہے تھے کہ چاند بھائی کو ڈرامے کا چکر دے رہے ہیں۔‘‘ شامی نے طنز کیا۔ اس کا اشارہ زومی اور منصور کی طرف تھا۔ ’’مگر وہ خود انہیں استعمال کر رہا تھا۔ وہ یہاں تک آیا اور جب اس نے دیکھا کہ دشمن بھی آگئے ہیں تو وہ ڈراما کر کے خود غائب ہو گیا۔‘‘

’’لیکن اس کے دشمن بھی کم نہیں ہیں۔ انہوں نے اس کا ڈراما سمجھ لیا اور اسے تلاش بھی کر لیا۔‘‘ تیمور نے کہا۔

’’اب وہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔‘‘ نوشی گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔ ’’جوجی بچ گیا... ورنہ انہوں نے اس کے سر میں سوراخ کرنے کے لیے پستول بھی نکال لیا تھا۔‘‘

جوجی نے برا منایا۔ ’’اتنا آسان بھی نہیں ہے جی سر میں سوراخ کرنا۔‘‘

’’یار! فضول باتوں کے بجائے یہ سوچو کہ اب کرنا کیا ہے؟‘‘ تیمور نے کہا۔ ’’وہ مسلح لوگ ہیں، ان کے پیچھے یہاں آگئے تو دو پستولوں اور ایک رائفل کے ساتھ ہم اپنا دفاع کیسے کر سکیں گے؟‘‘

’’سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آئیں گے؟‘‘ شامی نے پوچھا۔

’’احمق، وہ جوجی کو سب سنا چکے ہیں اور انہیں پتا چل گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ چاند بھائی ہمارے ہاں رکا تھا اس لیے وہ اس چکر میں ہمیں بھی شامل سمجھ سکتے ہیں۔‘‘

’’اس لیے وہ سیدھے ادھر ہی آئیں گے۔‘‘ جوجی نے

نشست گاہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

"یہ بی بی بھی پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے یہاں بھاگی چلی آئیں۔" تیمور نے نوشی کی طرف دیکھا تو وہ خفا ہو گئی۔

"تو میں پولیس کو کیا بتاتی؟" وہ بولی۔ "اور پولیس میری بات کا کیوں یقین کرتی؟"

"جب تم اپنے توپ پاپا کا نام لیتیں تو پولیس کا باپ بھی یقین کرتا اور ان سب کو چاند بھائی سمیت اندر ڈک دیتا۔ اب تو پولیس آنے تک ہم اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔"

جوجی جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، رو دینے والے انداز میں بولا۔ "تیمور بھائی! آپ کا منہ تو اچھا ہے پر بات ہمیشہ بری کرتے ہیں... وہ آگئے ہیں۔"

وہ سب جھپٹ کر کھڑکی کے پاس آئے۔ پل والے راستے سے گاڑی کی روشنی آرہی تھی۔ شامی نے تیزی سے کہا۔ "کم سے کم دو گاڑیاں ہیں۔"

فوراً ہی پہلی گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بڑے سائز کی لگژری جیپ تھی۔ وہ ان کی گاڑیوں سے کچھ پہلے رک گئی اور اس سے چار افراد اتر کر ادھر ادھر پوزیشن سنبھالنے لگے۔ ان سب کے پاس بڑی رائفلیں تھیں، چھوٹا اسلحہ بھی ہوسکتا تھا۔ دوسری گاڑی پل والا راستہ ختم ہوتے ہی رک گئی۔ لیکن اس میں سے کوئی نہیں اترا۔ اترنے والے چار مسلح افراد یوں پھیل رہے تھے جیسے ان کے فرار کا راستہ بند کر رہے ہوں۔ تیمور نے سر پر ہاتھ مارا۔ "دشمنی کسی اور کی اور مارے ہم جا رہے ہیں۔"

جیسے ہی گاڑیوں کی آمد کا شور ہوا تھا، شامی نے نشست گاہ کی تمام لائٹس آف کر دی تھیں۔ محبت خان یہ جان کر بے تاب ہوگیا کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اسے کرنٹ لگایا تھا۔

محبت خان فکر مند ہوگیا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ اسے فکر تھی کہ کہیں وہ اپنی ذمّے داری پوری نہ کر سکے۔ اس نے شامی سے کہا۔ "صیب! آپ پولیس کو اطلاع فرماؤ، جب تک ام ان لوگوں کو روکتا اے۔"

"اس کے لیے چھت پر جانا ہوگا اور گولی کسی طرف سے بھی آکر لگ سکتی ہے۔" شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ "فی الحال میرا شہید ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تیمور! تم جاؤ۔"

"میں..." تیمور بدکا۔ "میں کیوں جاؤں گولی کھانے؟"

"یہ بھی ٹھیک کہا ہے، ایسا کرتے ہیں ان دونوں کو اٹھا کر بھیجتے ہیں جو چاند بھائی نامی مصیبت کو یہاں لائے تھے۔" شامی نے کہا اور بیڈ رومز کی طرف روانہ ہوا لیکن فوراً ہی بوکھلایا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی۔ "وہ دونوں اپنے سامان سمیت غائب ہیں۔"

☆☆☆

منصور نے نوشی اور جوجی کی گفتگو سن لی تھی۔ اس نے ایسا تاثر دیا جیسے سونے جا رہا ہو لیکن جیسے ہی وہ سب نشست گاہ میں گئے، منصور کمرے سے نکلا اور اس نے زومی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجایا۔ وہ جھنجلا کر باہر آئی۔

"اب کیا... مصیبت..."

منصور نے اس کا منہ دبایا۔ "شش... ہم خطرے میں ہیں۔ چاند بھائی کے دشمن یہاں آنے والے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" زومی نیند میں پوری بات نہیں سمجھ سکی۔

"کیونکہ ہم بھی اس کے ساتھی ہیں اور وہ جو چاند بھائی سے معلوم کرنا چاہتے ہیں، وہ ہم سے بھی معلوم کر سکتے۔ تم نے سن لیا ہوگا چاند بھائی یہاں سب کو دھوکا دے کر ہوٹل میں جا کر چھپ گیا ہے۔"

"جہنم میں جائے چاند بھائی۔" زومی نے منہ بنایا۔

"وہ ہمیں بھی بے وقوف بنا رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈرامے والا پلان تو فیل ہو گیا ہے۔ اب اس سے پہلے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔"

"صبح نہیں ابھی۔" منصور نے کہا۔ "پانچ منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ، سامان سمیت ہم یہاں سے نکلیں گے۔"

زومی متفق نہیں تھی لیکن منصور نے اسے قائل کر لیا۔ انہوں نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور دبے قدموں لاؤنج اور کچن سے ہوتے ہوئے عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ اس طرف پہاڑی کی اوپر جاتی ڈھلان تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ پل والے راستے کی طرف جانے لگے۔ زومی اپنی اونچی ہیل کے جوتے میں صحیح سے نہیں چل پا رہی تھی اس لیے جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔ اندھیرے میں بار بار اسے ٹھوکر لگتی۔ اگر منصور نے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ کئی بار گر چکی ہوتی۔ بمشکل وہ پل نما راستے تک پہنچے۔ یہ بھی بہت اچھی حالت میں نہیں تھا۔ صحیح راستہ انہیں سڑک تک پہنچ کر ملتا لیکن سوال یہ تھا کہ رات کے اس پہر وہ کہاں جاتے؟ منصور نے کہا۔ "ہم درختوں میں رات گزار لیں گے اور صبح ہوتے ہی جو پہلی گاڑی ملے گی، اس سے اسلام آباد چلے جائیں گے۔ کسی ہوٹل میں تو جگہ نہیں ملے گی۔"

زومی کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ اس قسم کی مشکلات کی عادی نہیں تھی۔ وہ جیسے ہی پل نما راستے سے سڑک کے پاس پہنچے۔ سامنے سے دو گاڑیاں نمودار ہوئیں، بڑی والی تو ان کے برابر سے گزر گئی لیکن چھوٹی ان کے سامنے رک گئی اور اس میں سے کسی نے کہا۔ "اوہ! تو یہ تم دونوں ہو... چلو اندر آجاؤ۔"

آواز کے ساتھ کھڑکی سے ایک پستول کی نال بھی جھانکنے لگی... زومی اور منصور ہکا بکا رہ گئے لیکن انہیں گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ منصور نے ہکلا کر کہا۔ "ج... جناب! ہمارا چاند بھائی سے بس اتنا تعلق ہے... کہ ہم مل کر ڈراما بنا رہے تھے۔"

"اب تم بتاؤ گے چاند بھائی کہاں ہے؟" اس آدمی نے سرد لہجے میں کہا۔ "کیا وہ اسی عمارت میں ہے؟"

منصور دنگ رہ گیا۔ "اس عمارت میں... وہ تو کسی ہوٹل میں تھا؟"

"وہ وہاں سے بھاگ نکلا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اسی عمارت میں آیا ہے۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس عمارت میں نہیں ہے اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

مگر وہ اتنی آسانی سے یقین کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

☆☆☆

شامی ان لوگوں کو حرکت کرتے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے عمارت کو یوں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ اب ان کی نظروں سے بچے بغیر کوئی یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے تیمور سے کہا۔ "یار! مجھے یہ پیشہ ور اور تربیت یافتہ لوگ لگ رہے ہیں۔ ہم صرف ایک رائفل اور دو پستولوں کی مدد سے انہیں نہیں روک سکتے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ کہیں ان کا تعلق چاند بھائی کے بجائے شکیلہ والے معاملے سے تو نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے... وہ بہت اونچے درجے کے جاسوسوں کا چکر تھا۔ دادا جان نے اس معاملے میں سختی سے زبان بندی کا حکم دیا تھا۔ اگر یہ وہی معاملہ ہے تو پھر شکیلہ کی مخالف پارٹی ہوسکتی ہے۔"

"شاید... لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ان کا تعلق چاند بھائی سے ہی ہے۔" تیمور نے کہا۔ "مجھے سامنے تین افراد حرکت کرتے نظر آرہے ہیں، چوتھا کہاں ہے؟"

"شاید وہ عقب میں کہیں چلا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں پولیس کو کال کرنے اوپر جا رہا ہوں۔ تم اور محبت خان ہوشیار رہو۔ اگر کوئی اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اسے روکنا۔ خود سے فائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اتنی عقل ہمارے پاس بھی ہے، آپ جائیں۔" شامی نے کہا۔ تیمور کے جانے کے بعد اس نے نوشی اور جوجی کو لاؤنج میں جانے کو کہا کیونکہ وہ محفوظ جگہ تھی۔ خود اس نے نشست گاہ کی ایک کھڑکی میں پوزیشن سنبھال لی اور محبت خان دوسری کھڑکی میں مورچا بنا کر بیٹھ گیا۔

تیمور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا اور جیسے ہی اس کا سر باہر آیا۔ کوئی چیز سنسناتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اس کی سمجھ میں ذرا تاخیر سے آیا اور وہ بے ساختہ پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا۔ کسی نے اس پر بے آواز فائر کیا تھا اور فوراً ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ چوتھا آدمی کہاں تھا۔ اس نے عمارت کے بائیں جانب اونچی پہاڑی پر کسی ایسی جگہ پوزیشن لی ہوئی تھی جہاں سے وہ نہ صرف چھت بلکہ سیڑھیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا اور اس کا مقصد انہیں موبائل کے استعمال سے روکنا تھا۔ اصل میں شہر اس پہاڑی کے دوسری طرف تھا اور موبائل ٹاورز بھی اسی طرف تھے اس لیے چھت پر آنے کی صورت میں سگنل ملتے تھے اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ تیمور نے دل ہی دل میں ان لوگوں کو سنائیں اور موبائل نکال کر دیکھا۔ اس پر صرف ایک سگنل تھا اور اس صورت میں کال ملنا محال تھا۔ اس نے پھر بھی کوشش کی اور پولیس کا ہنگامی نمبر ملایا۔

کچھ دیر بعد بیل جانے لگی پھر کال ملی لیکن آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس کے باوجود تیمور نے اپنی بات سنا دی۔ ممکن ہے پولیس آپریٹر سن رہا ہو مگر دوسری طرف سے کہی جانے والی بات ناقابلِ فہم رہی اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ چھت کے چاروں طرف مشکل سے فٹ بھر اونچی باؤنڈری تھی اور وہ سیڑھیوں سے نکلتے ہی اس نامعلوم شخص کے نشانے پر آجاتا۔ تیمور کو یقین تھا کہ نشانچی نے وارننگ شاٹ مارا تھا ورنہ وہ چاہتا تو اس کے سر میں گولی مارتا۔ اس چیز نے تیمور کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ آکر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اگر ان کا مقصد ان سب کا صفایا کرنا ہوتا تو وہ اب تک کر چکے ہوتے۔ اتنے مسلح اور تربیت یافتہ قاتلوں کا وہ کسی صورت مقابلہ نہیں

کر سکتے تھے۔ تیمور نیچے آ گیا۔

"کیا ہوا؟" شامی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "پولیس کو کال کی؟"

"نہیں یار... اپنی کال اوپر ملتے ملتے رہ گئی۔" تیمور کھڑکی کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے شامی کو بتایا تو وہ بھی فکر مند نظر آنے لگا۔

"یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا خیال ہے، چل کر نہ پوچھ لیں؟"

"ایسا نہ ہو کہ پوچھنے جائیں اور پکڑے جائیں۔" شامی بولا۔ "کیا خیال ہے، کچھ دھوم دھڑکا نہ کر کے دیکھیں؟ ممکن ہے پولیس آ جائے۔"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے پاس زیادہ خطرناک اسلحہ ہے۔ جب تک پولیس آئے گی، ہم سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں گے اور زندہ بچ گئے تو دادا جان نہیں چھوڑیں گے۔"

دوسری بات نے شامی کو زیادہ متاثر کیا۔ "یہ تو ہے، تب کیا کریں؟ یہ خود سے جاتے نظر نہیں آ رہے۔"

"ممکن ہے، یہ صبح کا انتظار کر رہے ہوں تا کہ ہم سے بات کی جائے۔" تیمور نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اتنا تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہاں فائرنگ کا مطلب سارے مری کو مطلع کرنا ہے۔ پولیس کو حرکت میں آنا پڑے گا اور یہاں سے نکلنے کے راستے محدود ہیں۔"

"تب اس طرح محاصرہ کر کے بیٹھ جانے کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مقصد ہمیں پولیس سے رابطہ کرنے سے روکنا ہے۔ اگر بات پولیس تک چلی گئی تو یہ پکڑے جائیں گے یا نہ بھی پکڑے جائیں لیکن چاند بھائی سے اپنے طور پر نہیں نمٹ سکیں گے۔"

شامی نے غور کیا۔ "ایک بات اور ہے اگر انہیں چاند بھائی کی کمیں گاہ کا پتا ہے اور یہ اسے وہاں سے نکال چکے ہیں تو اب تک انہیں باقی تمام باتوں پر لعنت بھیج کر چلے جانا چاہیے، انہیں اصل مطلب چاند بھائی سے ہے نہ کہ ہم سے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے... اس کا مطلب ہے چاند بھائی ان کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔"

اسی لمحے ایک اور خیال الہام کی طرح شامی پر نازل ہوا اور اس نے چلّا کر کہا۔ "تیمور... یہ سمجھ رہے ہیں کہ چاند بھائی منحوس دوبارہ یہاں آن مرا ہے اور وہ اصل میں اس کے چکر میں آئے ہیں۔"

تیمور نے پُرتحسین نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔ "یہ منصور اور زومی کتنے چالاک نکلے، ہمیں تاثر دیا کہ سونے جا رہے ہیں اور خود خاموشی سے بھاگ نکلے۔"

"ممکن ہے اب تک اسلام آباد پہنچ گئے ہوں۔" تیمور نے سرد آہ بھری۔ "ہمیں پھنسا کر خود بچ نکلے ہیں۔"

"اگر یہاں سے بچ نکلے تو ان کو چھوڑنا نہیں ہے۔" شامی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "بس ذرا ان سے نمٹ لیں۔"

لیکن تیمور کو آثار بس نمٹ لینے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور کچھ دیر میں اجالا ہو جاتا۔ وقت رفتہ رفتہ گزرتا گیا اور پانچ بجے روشنی ہونے لگی۔ یہ عمارت بلندی پر تھی اس لیے یہاں پہلے ہی روشنی ہو گئی تھی۔ اچانک نوشی کی گاڑی کے پیچھے موجود فرد نے کہا۔ "ہیلو... تم لوگ میری آواز سن رہے ہو... ہم تمہیں نائٹ ویژن کی مدد سے دیکھتے رہے ہیں۔ اس وقت بھی کھڑکی پر دو آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔"

شامی اور محبت خان بے ساختہ نیچے ہو گئے۔ آدمی نے کہا۔ "چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم رات بھر ہماری نظر میں رہے ہو۔ ہم صبح کا صرف اس لیے انتظار کر رہے تھے کہ رات کی تاریکی میں تم کوئی حماقت نہ کرو۔"

"شکر ہے ہم نے نہیں کی۔" شامی نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن اب یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"جواب دو، کیا تم لوگ میری بات سن رہے ہو؟"

تیمور نے شامی کی طرف دیکھا۔ نوشی بھی آ گئی تھی اور جوجی سو گیا تھا۔ شامی کا اشارہ پا کر تیمور نے جواب دیا۔ "ہاں سن رہے ہیں۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ۔ ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم نے ہمیں احمق سمجھا ہے؟ باہر آ جائیں اور تم آرام سے ہمیں مار دو۔" تیمور نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مارنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ رات کو جو گولی تم میں سے ایک کے سر پر سے گزری، وہ سر میں بھی لگ سکتی تھی لیکن ہمیں صرف چاند بھائی سے مطلب ہے، ہم اسے لینے آئے ہیں۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں بھی دھوکا دے کر یہاں سے جا چکا ہے۔"

"جھوٹ مت بولو... وہ ہوٹل سے غائب ہے اور اس کے پاس یہی ایک ٹھکانا ہے۔ اس کے ساتھی ہم نے پکڑ لیے ہیں۔"

یہ انکشاف خوش کن تھا کہ منصور اور زومی پکڑے گئے تھے۔ "اصل قصوروار یہی لوگ ہیں اور یہی تمہیں چاند بھائی کا پتا بتا سکتے ہیں۔ یقین کرو، وہ یہاں نہیں ہے۔"

"جب تک ہم خود نہ دیکھ لیں، ہم یقین نہیں کر سکتے۔"

"یہ ہر صورت ہمیں قابو کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" شامی نے کہا۔ "اسے دھمکی دو کہ اگر یہ یہاں سے نہیں گئے تو ہم فائرنگ کریں گے اور جلد پولیس آ جائے گی۔"

تیمور کی دھمکی کے جواب میں اس آدمی نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن ہم فائر نہیں کریں گے۔ ہم کیا کریں گے ابھی تمہیں اس کا نمونہ دکھاتے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں روشنی خاصی تیز ہو گئی تھی۔ اس آدمی نے کار کے عقب سے کوئی چیز اچھالی جو پھولوں کی ایک کیاری میں آ کر گری۔ ایک سیکنڈ بعد کیاری سے ایک شعلہ برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پوری کیاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے آس پاس سوائے گھاس کے کچھ نہیں تھا اس لیے آگ صرف کیاری تک محدود رہی اور اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے ہرے بھرے پودوں اور پھولوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ سب کچھ لمحوں میں راکھ ہو گیا لیکن آگ اب بھی بھڑک رہی تھی۔ آدمی کی آواز آئی۔ "یہ فاسفورس کی آگ ہے۔ جب تک یہ کیمیکل پوری طرح جل نہیں جاتا، یہ آگ لگی رہے گی۔"

تقریباً پانچ منٹ بعد آگ مدھم پڑنے لگی اور پھر بجھ گئی۔ وہ اس لیے صبح کا انتظار کر رہے تھے کہ اپنا یہ حربہ استعمال کر سکیں۔ رات میں تو میلوں دور سے یہ آگ سب کو متوجہ کرتی لیکن صبح کی روشنی میں شاید ہی کسی نے اسے دیکھا ہو۔ آگ بجھ گئی تو اسی آدمی نے کہا۔ "اب اگر تم لوگ اپنے ہتھیار ڈال کر باہر نہیں آئے تو اس پوری عمارت کو آگ لگانے کے لیے چند بم کافی ہوں گے۔ جب تک کہیں سے مدد آئے گی، تم سب خاک ہو چکے ہو گے۔ اب تمہارے پاس باہر آنے کے لیے صرف پانچ منٹ ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اندر چھ لوگ ہیں۔ پیچھے کی طرف سے نکلنے کی مت سوچنا ہمارا آدمی پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے۔ فرار کی کوشش کرنے والا ہر فرد مارا جائے گا۔"

نوشی کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ آگ میں زندہ جل کر مرنے کے تصور سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ شامی اور تیمور بھی مضطرب نظر آنے لگے۔ ان لوگوں کے عزائم واضح تھے اور وہ ان کی دھمکی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ عمارت میں لکڑی کے سامان اور چیزوں کی بھرمار تھی۔ فاسفورس کی آگ تو پتھروں اور دھات کو بھی چاٹ جاتی ہے۔ باہر سے آواز آئی۔ "تین منٹ رہ گئے ہیں۔"

تیمور اور شامی دونوں فیصلے کی ذمے داری سے بچنا چاہتے تھے اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نوشی نے انہیں جھنجوڑا۔ "تم لوگ کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ بم پھینک دیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ہتھیار ڈالنے ہی ہوں گے۔" شامی نے کہا تو تیمور نے فوراً اس کی تائید کی۔

"ہاں، ورنہ یہ اپنی دھمکی میں سنجیدہ لگتے ہیں۔"

محبت خان ہتھیار ڈالنے کے خیال سے آزردہ تھا۔ "صیب! ام شرم سے زمین میں زندہ دفن ہونا چاہتا اے۔"

"تم کیوں فکر کرتے ہو؟ یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔" شامی نے اسے تسلی دی۔

"ایک منٹ رہ گیا ہے۔"

"رکو۔" شامی چلایا۔ "ہم باہر آ رہے ہیں۔"

انہوں نے عجلت میں اپنے پستول ایسی جگہ چھپائے جہاں وہ آسانی سے دریافت نہ ہو سکیں اور پہلے محبت خان رائفل لیے باہر گیا۔ اس نے رائفل زمین پر رکھ دی۔ اس کے پیچھے وہ چاروں بھی باہر نکل گئے۔ جوجی کو نوشی نے اٹھایا تھا۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا لیکن رونے دھونے سے گریز کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر آئے اور ہاتھ اٹھا کر ایک طرف کھڑے ہوئے فوراً ہی کاروں کے پیچھے چھپے تین مسلح افراد نے انہیں گھیر لیا۔ پہلے کی طرح انہوں نے اپنے چہرے رومالوں سے چھپا رکھے تھے۔ شامی کا اندازہ تھا کہ بولنے والا پہلے بھی یہاں آ چکا تھا... اسی نے پوچھا۔

"چاند بھائی کہاں ہے؟"

"تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ چاند بھائی یہاں نہیں ہے لیکن تم یقین نہیں کر رہے تھے۔" تیمور منہ بنا کر بولا۔ "اب خود جا کر اسے تلاش کر لو۔"

نقاب پوش نے اپنے پاس چھوٹے سے واکی ٹاکی میں کسی کو اطلاع دی اور ایک منٹ بعد پیچھے رہ جانے والی کار بھی وہاں آ گئی۔ اس سے زومی اور منصور کے ساتھ دو افراد اور اترے۔ ان میں ایک خوش پوش اور اپنے انداز سے اوپری طبقے کا نظر آ رہا تھا۔ وہ ان کی طرف آیا اور اس نے تیمور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "نواب زادہ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

تیمور نے اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔ "لیکن مجھے تم سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔"

وہ ذرا بھی خفیف نہیں ہوا۔ ''کوئی بات نہیں، ہم اب کام کی بات کرتے ہیں تا کہ تمہارا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ چاند بھائی کہاں ہے؟''

''دیکھ لو۔'' تیمور نے شانوں سے عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں شک تھا کہ وہ یہاں ہے۔''

''وہ وہیں ہوگا۔'' نوشی بولی اور ہوٹل کا نام لیا اور کمرا نمبر بتایا۔

''مجھے معلوم ہے مس لیکن وہ وہاں سے غائب ہے۔ تمہارے نکلنے کے کچھ دیر بعد اس کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کس راستے سے نکل گیا اور مجھے شبہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہی تمہاری کار میں یہاں تک آیا ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے۔'' نوشی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں اس منحوس صورت کو اپنی گاڑی میں کیوں لاؤں گی؟''

شامی نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھیوں کے سخت رویے کی وجہ سے بات غلط سمت میں جارہی تھی۔ آنے والے تمام افراد محاورے کے مطابق دانتوں تک مسلح تھے۔ وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھے اور وہ پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھے۔ اس نے درمیان میں مداخلت کی۔ ''ایک منٹ مسٹر نامعلوم... کیا میں تم سے کچھ باتیں پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں لیکن یہاں نہیں، اندر چلو۔''

آنے والوں میں سے تین پہلے ہی اندر جا چکے تھے اور اب خوش پوش شخص کے ساتھ صرف ایک مسلح شخص تھا لیکن اپنی خوفناک مشین گن کے ساتھ وہی سب کے لیے کافی تھا۔ وہ انہیں اندر نشست گاہ میں لائے۔ خوش پوش شخص کے بقیہ ساتھی عمارت کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ ان سب کو محبت خان سمیت صوفوں پر بٹھا کر مشین گن والے نے ایک کونے میں اس طرح پوزیشن سنبھال لی کہ سب اس کی نظر میں تھے۔ خوش پوش شخص ان کے سامنے ٹہلنے لگا پھر اس نے شامی کی طرف دیکھا۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟''

''چاند بھائی اور تمہارے درمیان کیا مسئلہ ہے؟''

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ اسے ہماری کچھ رقم دینی ہے۔ یہ اس کے پاس امانت تھی۔ معمولی سی رقم تھی چند کروڑ کی لیکن وہ ٹال مٹول سے کام کر رہا تھا۔ ہم نے ذرا سختی کی تو اس نے غائب ہونے کی کوشش کی اور یہاں آگیا لیکن وہ ہماری نظر میں رہا۔ جب اسے اندازہ ہوا تو اس نے چکر دینے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ پکڑا گیا۔''

''اور پھر بھاگ گیا۔'' شامی نے طنز کیا۔ ''تمہارے آدمیوں کی نظروں کے سامنے سے نکل گیا۔''

خوش پوش شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ میرے آدمیوں کی نظروں سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا، اسے یہ لڑکی یہاں لائی ہے۔''

''یہ بکواس ہے۔'' نوشی نے برہمی سے کہا۔ ''تم ان لوگوں سے کیوں نہیں پوچھتے جو چاند بھائی کے اصل ساتھی ہیں اور اس کے ساتھ آئے تھے۔ یہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ وہ کہاں ہے۔''

''ہم کچھ نہیں جانتے۔'' منصور جلدی سے بولا۔

''یہ بھونک رہی ہے۔'' زوی نے نفرت سے کہا تو نوشی بے قابو ہو کر اس کی طرف بڑھی لیکن شامی نے اسے روک لیا۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔''

''تب اس کتیا سے کہو اپنی زبان بند رکھے... دو ٹکے کی بازاری عورت!'' نوشی غرائی۔

''لیڈیز۔'' خوش پوش شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''لڑائی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اس پر غور کریں کہ مجھے بہر صورت چاند بھائی درکار ہے اور اسی صورت میں آپ لوگوں کو چھٹکارا مل سکتا ہے۔''

اس دوران میں مسلح افراد نے پوری عمارت چھان ماری تھی اور انہوں نے آکر رپورٹ دی کہ چاند بھائی کہیں نہیں ہے۔ خوش پوش شخص کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں گیا؟''

''معلوم نہیں سر لیکن وہ یہاں سے نکلا نہیں ہے۔ ہمارا گھیرا مکمل تھا۔'' نقاب پوش نے کہا۔

''تمہارا گھیرا تو ہوٹل میں بھی مکمل تھا۔'' اس نے طنز کیا۔

''وہاں ہم کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے لیکن یہاں حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ یہاں سے اس کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

خوش پوش شخص نقاب پوش کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور اپنے طور پر سرگوشی میں بولا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟''

''میرا اندازہ ہے سر... اگر ان کے ساتھ آتا تو یہیں ہوتا۔''

شامی اور تیمور ان کی بات سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ شامی نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ آسانی سے جان چھوڑتا

نظر نہیں آرہا ہے۔"

"ہاں... لیکن جب ہمیں ایک شخص کے بارے میں علم ہی نہیں ہے تو اسے کہاں سے لاکر دیں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ دونوں بھی چاند بھائی کے بارے میں نہیں جانتے۔" شامی بولا تیمور نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ خوش پوش شخص واپس آیا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے چاند بھائی اس عمارت میں موجود نہیں ہے لیکن وہ کہاں ہے، تم میں سے کسی کو معلوم ہے؟"

"کم سے کم میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں چاند بھائی کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔" تیمور نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"میں اور زومی بھی نہیں جانتے۔" منصور نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"تم میں سے کوئی نہیں جانتا؟" اس نے زور دے کر پوچھا۔ پھر اس نے تیمور کی طرف دیکھا۔ "تم نے اپنے ساتھیوں کو آدھی رات کے بعد ہوٹل کیوں بھیجا تھا؟"

"میں نے پولیس کو کال کی تھی اور ان دونوں کو غیر ضروری پریشانیوں سے بچانے کے لیے ہوٹل منتقل کیا تھا۔"

"اسی ہوٹل میں اور اس فلور پر جہاں چاند بھائی پہلے سے چھپا ہوا تھا؟" اس نے طنز کیا۔ "کیا میں یہ نہ سمجھوں کہ تم لوگ اصل میں اس کی مدد کرنے گئے تھے۔"

"یہ غلط فہمی ہے، چاند بھائی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" تیمور نے کہا۔ اس موقع پر منصور نے وہ حرکت کی جس کا تیمور اور شامی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ چاند بھائی سے اصل میں اسی کا تعلق تھا اور اسی نے ہمیں یہاں بلایا تھا۔ چاند بھائی ہمیں لوکیشن دکھانے کے بہانے یہاں لایا تھا۔"

خوش پوش شخص نے دم بہ خود تیمور کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کہتے ہو برخوردار؟"

"یہ بکواس کرتا ہے۔" تیمور برہمی سے بولا۔ "اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور یہی چاند بھائی کو لایا تھا۔ اس سے پوچھو، یہ میرا کالج فیلو نہیں رہا ہے؟"

"ہاں رہا ہوں لیکن چاند بھائی ہمیں کس کے پاس لا رہا ہے یہ تو یہاں آکر پتا چلا تھا۔" منصور عیاری سے بولا۔ "چاند بھائی کا تم لوگوں سے کچھ خاص تعلق تھا جو وہ ہم سے بھی چھپاتا تھا۔"

خوش پوش شخص نے تیمور کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ "اس کا جھوٹ تو ایک منٹ میں پکڑا جا سکتا ہے۔ اس سے میری فیس بک پر بات ہوتی رہی ہے اور وہ ساری گفتگو میرے پاس محفوظ ہے، اس سے یہ کس طرح انکار کر سکتا ہے۔ اس میں اس نے خود مجھ سے بات کی تھی اور میں نے اسے ڈرامے کے لیے اس عمارت کو استعمال کرنے کی آفر کی تھی۔ چاند بھائی کا اس نے خود بتایا تھا، اب یہ اسے ہمارے سر تھوپ رہا ہے۔"

منصور کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ یہ تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ خوش پوش شخص نے اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے نقاب پوش کو کوئی اشارہ کیا اور اس نے اچانک منصور کو صوفے سے کھینچ کر نیچے قالین پر گرا دیا۔ اس کا ہاتھ مروڑ کر پشت پر کیا اور اپنی جیب سے ایک سگار تراشنے والا آلہ نکالا۔ اس نے منصور کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی آلے کے سوراخ میں پھنسائی۔ خوش پوش شخص نے منصور کے لمبے بال پکڑ کر اس کا سر بلند کیا اور بولا۔ "اگر تم بتا دو کہ چاند بھائی کہاں ہے تو اپنی انگلی بچا لو گے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" منصور سر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا۔

خوش پوش شخص نے سر ہلایا اور نقاب پوش نے کھٹ سے آلہ دبا کر منصور کی چھوٹی انگلی کی پہلی پور کاٹ ڈالی۔ اس نے بھیانک چیخ ماری جیسے اس کی انگلی نہیں، کسی نے ہاتھ ہی کاٹ دیا ہو۔ اس کے بعد وہ مسلسل چیخنے لگا لیکن اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز نقاب پوش اس کی دوسری انگلی آلے میں پھنسا رہا تھا اور دیکھنے والوں کا دہشت زدہ ہونا لازمی تھا۔ زومی نے تو بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ شامی اور تیمور مداخلت کرتے اگر منصور نے یہ گھٹیا حرکت نہ کی ہوتی۔ وہ خود اپنے بچھائے جال میں پھنس گیا تھا۔ جیسے ہی خوش پوش شخص نے اس کا جھوٹ پکڑا، وہ تشدد پر اتر آیا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ چاند بھائی تک رسائی کے لیے کتنا بے چین ہے۔

"اب بھی تم چاہو تو بتا دو کہ چاند بھائی کہاں ہے۔ ایک انگلی کی محرومی دو انگلیوں کی محرومی سے اچھی ہوتی ہے۔"

"مجھے... نہیں معلوم۔" منصور سر پٹختے ہوئے بولا۔ "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔"

لیکن وہ قسموں پر اعتبار کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ خوش پوش شخص کے اشارے پر نقاب پوش نے دوسری بار سگار کٹر کا غلط استعمال کیا اور منصور اپنی دوسری انگلی کی پہلی پور سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ابھی اس کی چھوٹی انگلی سے خون پچکاریوں کی صورت میں نکل رہا تھا۔ دوسری انگلی کٹنے پر اس

کے حلق سے دھاڑ نکلی اور پھر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس بار تیمور سے رہا نہیں گیا۔ اس نے خوش پوش شخص سے کہا۔ "اگرچہ یہ شخص اسی قابل ہے لیکن میں اسے جانتا ہوں اگر اسے معلوم ہوتا تو یہ لازمی تمہیں بتا دیتا۔"

"اگر اسے بھی نہیں معلوم ہے تو پھر کسے معلوم ہوگا کہ چاند بھائی کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ نکل گیا ہے اور تم لکیر پیٹ رہے ہو۔" شامی نے کہا۔ "بہتر ہے اسے مری سے باہر تلاش کرو۔ تم اس کے دشمن ہو اور تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔"

"جاتا تو اسے ملک سے باہر ہے۔" اس نے کہا۔ "اس ملک میں وہ ہم سے بچ نہیں سکتا۔"

"شاید اس نے تم لوگوں کی رقم بھی بیرونِ ملک منتقل کر دی ہو گی۔" تیمور نے کہا۔ "لیکن پھر وہ یہاں کیوں آیا... وہیں سے باہر کیوں نہیں نکل گیا؟"

"ممکن ہے اسے خطرہ ہو کہ تم لوگ یہ جان کر کہ وہ کہاں گیا ہے، اس کا پیچھا کرو گے۔" شامی نے کہا۔ "اس لیے وہ یہاں آیا تاکہ خاموشی سے یہاں سے نکل جائے۔"

گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران میں کوئی بات رہ رہ کر تیمور کے ذہن میں کھٹک رہی تھی لیکن وہ شعور کی سطح پر نہیں آرہی تھی مگر جب خوش پوش نے چاند بھائی کے باہر جانے کا ذکر کیا تو وہ بات لاشعور سے شعور میں آگئی۔ تیمور نے خوش پوش شخص کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ تشدد سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم خود سوچو ہمارا چاند بھائی جیسے دو نمبر آدمی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ اس شخص کی بے وقوفی ہے کہ لالچ میں اسے یہاں لے آیا۔"

"وہ تم سب کو بے وقوف بنا رہا تھا۔" خوش پوش شخص نے حقارت سے کہا۔

"صرف ان دونوں کو۔" شامی نے زومی اور منصور کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمیں چاند بھائی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ ڈرامے کے لیے اس سے رقم نکلوانا چاہتے تھے۔"

"وہ... انہیں ایک روپیا نہیں دیتا۔" اس نے خلافِ توقع چاند بھائی کے لیے ایک ناقابلِ بیان لقب استعمال کیا۔ "وہ صرف لینے والوں میں سے ہے۔"

تیمور سوچ رہا تھا کہ اس بات کو جو اسے اب یاد آئی تھی، کس طرح اپنے حق میں استعمال کرے۔ اسے معلوم تھا کہ چاند بھائی اگر دھوکے باز ہے تو خوش پوش شخص اس سے بڑے درجے کا مجرم ہے۔ ان کے پاس خطرناک اسلحہ ہے اور تربیت یافتہ آدمی ہیں۔ ان سے جان چھڑانا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے مطلب کے لیے کس حد تک جا سکتا تھا، اس کا ہلکا سا نمونہ اس نے انہیں دکھا دیا تھا۔ شامی نے خوش پوش شخص سے کہا۔ "اب تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہم چاند بھائی کے بارے میں نہیں جانتے اس لیے ہماری جان چھوڑ دو۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" وہ بولا۔ "اگر تم چاند بھائی کے بارے میں نہیں جانتے، تب بھی پولیس کو ہمارے بارے میں بتا سکتے ہو۔"

شامی جلدی سے بولا۔ "ہم تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لیے پولیس کو کیا بتائیں گے۔"

جوجی فکرمند ہو گیا۔ "آپ کیا کریں گے جی؟"

"دیکھو، ہم میں سے کوئی معمولی حیثیت کا نہیں ہے۔ ہمارے بارے میں تم جانتے ہو۔ مس نوشین کے والد بیوروکریٹ ہیں۔ اس لڑکے کے باپ کا نام سن کر شاید تم خود کو ہلکا محسوس کرو گے۔"

"اچھا، اتنا بڑا بدمعاش ہے۔" خوش پوش شخص نے استہزائیہ انداز میں کہا مگر جب شامی نے جوجی کے باپ کے بارے میں بتایا تو وہ فکرمند نظر آنے لگا۔ "ٹھیک ہے، تم سب بڑے لوگ ہو لیکن اس وقت میرے قابو میں ہو اور میں اتنی آسانی سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"دیکھو، یہ ہمارا شہر اور ہمارا علاقہ ہے۔ یہاں جو کام ہم آسانی سے کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا بہت مشکل سے بھی نہیں کر سکتا۔"

تیمور کی بات پر خوش پوش چونکا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہم چاند بھائی کی تلاش میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر تیمور کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

تیمور خود بھی اس سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ منصور اور زومی کے سامنے بات کرتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج میں آئے۔ خوش پوش شخص نے اپنے کوٹ سے ایک عدد چھوٹا بریٹا نکال لیا، یہ نہایت مہلک ہتھیار تھا۔ اس کا مقصد تیمور کو جتانا تھا کہ وہ نہتا نہیں ہے۔ "میں خود بھی تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

"میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تمہارے پاس کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ میں چاند بھائی کو پکڑوا سکتا

ہوں۔"

خوش پوش شخص کی آنکھوں میں چمک آگئی.....

"کیسے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ ہاں راہنمائی کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھیوں کو چھوڑنا ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ سیدھے پولیس کے پاس جائیں گے۔"

"میں انہیں سمجھا دوں گا۔" تیمور نے کہا۔ "وہ میری واپسی کا انتظار کریں گے۔"

خوش پوش شخص نے سوچا اور بولا۔ "میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تب میں تمہارے کام نہیں آسکوں گا۔" تیمور نے کہا۔ "مجھے اس کام کے لیے باہر جا کر ذاتی طور پر اپنا اثر رسوخ استعمال کرنا پڑے گا۔ بے شک تم یا تمہارا ساتھی میرے ساتھ رہے لیکن میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو۔"

"تم اصرار کیوں کر رہے ہو؟ میں سب کو ایک ساتھ چھوڑ دوں گا۔"

"معاف کرنا، کوئی احمق ہی تم پر پورا اعتبار کرے گا۔" تیمور نے صاف گوئی سے کہا۔ "اگر تمہارا کام نکل گیا اور تم نے پھر بھی ہم سب کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو ہم تمہارا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔"

"یہ ہم نہیں کرسکتے۔" تیمور نے کہا۔ "دیکھو، تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آج شام تک کا وقت ہے، اس کے بعد چاند بھائی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

خوش پوش شخص سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جس طرح منصور پر بے دریغ تشدد کرایا تھا، اس طرح وہ ان پر نہیں کرسکتا تھا۔ شاید اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔ وہ سوچتا رہا اور تیمور بہ ظاہر سکون سے کھڑا رہا لیکن اندر ہی اندر وہ سخت پریشان تھا۔ اگر خوش پوش شخص اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا اور تشدد پر اتر آتا تو وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ یہ شخص مان جائے اور چاند بھائی کا کیا دھرا انہیں نہ بھگتنا پڑے۔ بالآخر اس کی دعا قبول ہوئی اور نقاب پوش نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھیوں کو چھوڑ دیتا ہوں لیکن..." اس کا لہجہ سفاک ہوگیا۔ "اگر مجھے چاند بھائی پھر بھی نہ ملا تو میں نے اس کے لیے جو قبر کھدوائی ہے، اس میں تمہیں دفن کردوں گا۔"

تیمور کے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ سفاک شخص ایسا ہی کرے گا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں پوری کوشش کروں گا۔ میں نے ایک اندازہ لگایا ہے، ممکن ہے وہ صحیح نکلے اور ممکن ہے وہ غلط نکلے اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔"

وہ واپس نشست گاہ میں آئے۔ خوش پوش شخص نے اپنے ساتھیوں کو روانگی کی تیاری کے لیے کہا۔ وہ اپنا پھیلاوا سمیٹنے لگے۔ منصور کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور اس نے کٹی ہوئی انگلیوں پر رومال لپیٹ لیا تھا۔ وہ ابھی تک کراہنے والے انداز میں رو رہا تھا۔ تیمور شامی کو ایک طرف لے گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے خوش پوش شخص سے طے ہونے والے معاہدے کے بارے میں بتایا۔ شامی فکرمند ہوگیا۔

"تیمور! اس میں بہت خطرہ ہے، یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔"

"اسی لیے میں نے اس سے یہ معاہدہ کرلیا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "یہ مجھے لے جارہا ہے اور تم لوگ بھی یہاں سے نکل جانا لیکن میری واپسی تک کچھ نہیں کرنا ہے۔ یہ بات نوشی اور جوجی کو بھی سمجھا دینا۔"

شامی، تیمور کی تجویز سے متفق نہیں تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے سب کی بچت کا۔ اس نے منصور اور زومی کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کا کیا کرنا ہے؟"

"انہیں بھی چلتا کرنا۔ محبت خان کو کہنا کہ عمارت کو لاک کردے اور فی الحال چھٹی کر کے چلا جائے۔"

شامی نے سر ہلایا۔ خوش پوش شخص ان کی گفتگو سن رہا تھا، اس نے شامی سے کہا۔ "تم نے سمجھ لیا ہے نا کہ کسی قسم کی گڑبڑ کی صورت میں خمیازہ اسے بھگتنا ہوگا۔"

شامی پریشان تھا۔ تیمور نے اچانک اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ اس نے خوش پوش شخص سے کہا۔ "تم بھی یاد رکھنا اگر تیمور کو کچھ ہوا تو تم بھی نہیں بچو گے۔"

"فکر مت کرو اگر اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

دس منٹ میں وہ سب گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ شامی اور دیگر افراد باہر نکل آئے تھے اور بے بسی سے انہیں جاتا دیکھ رہے تھے۔ تیمور خوش پوش شخص کے ساتھ اس کی گاڑی میں تھا۔ دس منٹ بعد وہ مری شہر سے نکل کر اسلام آباد کی طرف رواں دواں تھے۔ تیمور نے اس سے پوچھا۔ "یہ لوگ تمہارے ساتھ کراچی سے آئے ہیں؟"

"نہیں، یہ جان پہچان والے ہیں لیکن ان کا تعلق

یہیں سے ہے۔"

"گویا کرائے کے آدمی ہیں۔" تیمور نے کہا، ڈرائیور نے اسے گھورا۔

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔"

ایک گھنٹے بعد وہ اسلام آباد کی ایک پوش آبادی میں واقع ایک خوب صورت کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے لیکن یہاں لانے سے پہلے انہوں نے تیمور کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اس لیے وہ کوٹھی کا محل وقوع نہیں دیکھ سکا۔ اندر لا کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ یہاں اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور کچھ دیر بعد اسے وہیں دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد اسے خوش پوش شخص کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے تیمور کو سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "ہاں، اب بتاؤ کہ تم کس طرح چاند بھائی تک میری راہنمائی کرسکتے ہو؟"

☆☆☆

راولپنڈی کے چکلالہ ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر تیمور خوش پوش شخص کے ساتھ اس کی کار میں موجود تھا۔ اب کار میں دو عدد مسلح افراد بھی تھے لیکن اب انہوں نے چھوٹے ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ یہ حساس علاقہ تھا اور یہاں بڑے ہتھیار مشکل کا سبب بن سکتے تھے۔ اسی سڑک پر پیچھے خوش پوش شخص کے دوسرے ساتھی دوسری گاڑی میں موجود تھے۔ وہ ائرپورٹ کی طرف آنے والے ٹریفک پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دونوں گاڑیوں کا آپس میں ریڈیو کی مدد سے رابطہ تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ آج اسلام آباد میں بھی شدت کی گرمی تھی۔ اگر انہوں نے انجن اسٹارٹ کر کے اے سی نہ چلایا ہوتا تو سب کا گرمی سے حشر ہو جاتا۔ اچانک خوش پوش شخص کے پاس موجود ریڈیو کھڑکھڑایا۔ اس نے ریڈیو اٹھا کر کہا۔

"یس۔"

"وہ ابھی گزرا ہے... یلو کیب میں ہے۔ نمبر..."

دوسری طرف سے نمبر نوٹ کرایا گیا۔

"ٹھیک ہے، تم لوگ بھی آؤ لیکن فاصلے پر رہنا، جب تک ہم اسے پکڑ نہیں لیتے۔"

"او کے باس۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ یہ اطلاع یقیناً چاند بھائی کے بارے میں دی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد مطلوبہ نمبر کی یلو کیب ان کے سامنے سے گزری اور فوراً ہی وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ خوش پوش شخص کے بقیہ ساتھی پیچھے آرہے تھے۔ ائرپورٹ سے پہلے وہ دونوں گاڑیوں کو اوورٹیک کرتے چلے گئے۔ خوش پوش شخص کی گاڑی بدستور پیچھے رہی۔ تیمور نے کہا۔

"دیکھو جو میں نے کہا تھا، وہ کر دیا۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو اور مجھے جانے دو۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" تیمور کے ساتھ بیٹھے خوش پوش کے گرگے نے تیمور کے پہلو سے اپنا پستول لگاتے ہوئے کہا۔ "جلد تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

تیمور کو اس کے لہجے سے خطرے کی بو آنے لگی۔ چاند بھائی کو دیکھتے ہی ان لوگوں کے تیور بدل گئے تھے مگر وہ بے بس تھا۔ کچھ دیر میں ان کی گاڑی یلو کیب کے پیچھے ائرپورٹ کی پارکنگ میں داخل ہوئی۔ وہاں دوسری گاڑی میں موجود لوگ پہلے ہی چاند بھائی والی یلو کیب کو گھیر چکے تھے۔ انہوں نے آسانی اور صفائی سے چاند بھائی کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا، اس طرح کہ ٹیکسی ڈرائیور کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اسے رخصت کر دیا گیا۔ جب خوش پوش شخص کی گاڑی وہاں رکی تو ٹیکسی جارہی تھی۔ اگر ڈرائیور نے خطرہ محسوس بھی کر لیا تھا تو ظاہر نہیں کیا تھا اور جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرار میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ البتہ چاند بھائی کے منہ پر اڑتی ہوائیاں دور سے نظر آرہی تھیں۔ خوش پوش شخص کو دیکھتے ہی اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"ابراہیم بھائی! میں خود آپ کے پاس آرہا تھا۔"

"مڈل ایسٹ جانے والی فلائٹ کے ٹکٹ پر تم میرے پاس آرہے تھے؟" ابراہیم نے طنز کیا۔ "لے چلو اسے۔"

"میری بات تو سنو۔" چاند بھائی بولا لیکن اسے گھیرنے والے دوسری گاڑی کی طرف کھینچ کر لے جانے لگے۔ تیمور مایوس ہوا، شاید اسے توقع تھی کہ کچھ ہوگا مگر اس کی توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ گاڑی کے پاس آئے تھے کہ اچانک ہی خاموش نظر آنے والی پارکنگ میں ہلچل سی مچی اور بیک وقت کئی پولیس کاریں وہاں داخل ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہاں پہلے سے چھپے ہوئے پولیس والے بھی سامنے آگئے۔ یہ پولیس کمانڈوز تھے جو پوری طرح مسلح اور ہر صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر اس طرح پوزیشنیں سنبھال لیں کہ دونوں گاڑیوں میں موجود افراد براہِ راست ان کی زد میں آگئے تھے۔ پھر کسی نے میگافون پر گاڑی والوں کو نیچے اترنے اور ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ تیمور ابھی گاڑی کے باہر تھا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا کیونکہ اس کا خطرہ تھا کہ ابراہیم کے آدمیوں میں سے کوئی فائر کر دیتا تو پولیس بھی تامل نہیں کرتی اور دونوں

طرف کی فائرنگ میں وہ بے گناہ مارا جاتا۔ جیسا کہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ مقابلہ مجرموں اور پولیس میں ہوتا ہے اور اس میں غیر متعلقہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ مگر ابراہیم اور اس کے ساتھی عقل مند ثابت ہوئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پولیس نے انہیں پوری طرح گھیر لیا تھا اور فرار کے تمام راستے پہلے ہی بند کیے جا چکے تھے۔ وہ مقابلہ کرتے تو مارے جاتے۔ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

نواب صاحب کی اسٹڈی سے باہر آکر تیمور اور شامی نے ماتھے سے پسینہ پوچھا اور سکون کے چند طویل سانس لیے۔ نظام دین زیرِ لب استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا کیونکہ وہ محرمِ راز اچھی طرح جانتا تھا کہ اندر ان دونوں پر کیا گزری ہوگی۔ اس سے نظریں چراتے وہ دونوں اپنے کمروں کی طرف چلے آئے۔ شامی نے طمانیت سے کہا۔ ''آج تو بس ایسا لگ رہا تھا کہ چن پور روانگی ہے۔''

تیمور نے تائید کی۔ ''اور مجھے لگ رہا تھا کہ دادا جان مجھے ای سی ایل میں لسٹ کرا دیں گے تا کہ انگلینڈ جانے کا کوئی چانس ہی باقی نہ رہے۔''

''بال بال بچے آج۔'' شامی کمرے میں آکر بستر پر گر گیا۔ ''میرا شکریہ ادا کر کہ تیری ڈاکٹروں جیسی تحریر سے بھی درست مطلب نکال لیا۔ تحریر بھی وہ جو تو نے میری ہتھیلی پر لکھی تھی۔''

''واقعی تجھ میں یہ صلاحیت ہے۔'' تیمور نے اعتراف کیا۔ ''اگر کوشش کے بعد بھی انجینئرنگ کی ڈگری نہ مل سکی تو تو کم سے کم کمپاؤنڈر بن سکتا ہے۔''

شامی نے اسے گھور کر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''جب میں نے ڈرتے ڈرتے دادا جان کو تیرے بارے میں بتایا تو ایک لمحے کو انہیں سکتہ ہو گیا۔ میں تو ڈر گیا کہ ابھی تیرا کیس ہی حل نہیں ہوا ہے، کہیں دادا جان بھی آئی سی یو کا قصد نہ کریں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ وہ سکتے سے نکل کر یک دم ہی آتش فشاں بن گئے اور تجھے... میرا مطلب ہے ہمیں بے نقط سنائیں۔ بہرحال جب ان کا غصہ سرد ہوا اور انہوں نے صورتِ حال پر غور فرمایا تو انہوں نے بھی پولیس کو رپورٹ کرانے سے گریز کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اندرونِ خانہ انہوں نے اپنے رابطے استعمال کیے اور اسی وجہ سے پولیس کی بھاری نفری ائرپورٹ پہنچی تھی۔ دادا جان نے ڈی آئی جی تک اپروچ کی تھی۔''

''اسی وجہ سے یہ مسئلہ پُرامن طریقے سے حل ہوا ورنہ اگر چند پولیس والے ایک دو گاڑیاں لے کر وہاں آتے تو یہ بدمعاش اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتے۔'' تیمور نے سر ہلایا۔ ''کمانڈوز کو بڑی تعداد میں دیکھ کر ہی انہوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔''

''لیکن تجھے کیسے پتا چلا کہ چاند بھائی اس وقت ائرپورٹ پہنچے گا؟''

''جب میں ان لوگوں کو لینے ائرپورٹ گیا تو چاند بھائی نے پورٹر کو رقم دینے کے لیے پرس نکالا تھا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے پرس گر گیا اور اس سے ایک ائر ٹکٹ نکل آیا تھا۔ یہ ایک غیر ملکی ائرلائن کا ٹکٹ تھا اور اتفاق سے میں نے اس پر تاریخ اور وقت دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ جب ابراہیم نے چاند بھائی کے فرار کا ذکر کیا تو مجھے یاد آ گیا اور میں نے چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ چاند بھائی اس ٹکٹ پر ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔''

''لیکن ان دونوں کا کمینہ پن دیکھا... پولیس کو بیان دیا ہے کہ ان میں کوئی دشمنی یا اختلاف نہیں ہے۔ پولیس سے بچنے کے لیے ایک ہو گئے۔''

''پولیس کو اس سے غرض بھی نہیں ہے۔ اس نے چاند بھائی کو بھی ابراہیم کے ساتھ شامل کر کے ان پر حساس علاقے میں ناجائز اور مہلک اسلحے کی برآمدگی کا کیس بنایا ہے۔ اب سال بھر تو پیشیاں بھگتنے میں لگے گا، اس کے بعد ہی کچھ ہو گا۔''

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کچھ نہیں ہو گا میرے بھائی... چند مہینے بعد ہم بھی بھول چکے ہوں گے تو اس کے بعد کوئی جج خاموشی سے ان کی ضمانتیں منظور کر لے گا۔ دوسرے لوگ پولیس کی تحویل میں رہیں گے اور سارا ملبا ان پر ڈال دیا جائے گا۔ ممکن ہے وہ خود بھی قبول کر لیں۔ بڑوں کی لڑائی میں ہمیشہ چھوٹے مارے جاتے ہیں۔ چاند بھائی اور ابراہیم پھر سے آزاد ہوں گے۔''

تیمور نے سوچا اور سرد آہ بھری۔ ''ٹھیک کہتے ہو بھائی کیونکہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

''بس ہم ہی سدھرے ہوئے ہیں۔'' شامی نے معصوم سی صورت بنا کر کہا تو تیمور اسے گھور کر رہ گیا۔